U5403 . 3-12-91

Title - Tazkira Hazaar Dastaan Maroof Ba Khamkhana Javed

Author - Lala Sureer Ram

Publisher - Ray Gulab Singh Press (Lahore).

Date - 1911

Pages - 8 + 16 + 604

Subject - Urdu Shayari Tanqeed; Tazkira Shora.

تذکرہ ہزار داستان

خمخانۂ جاوید

۱۳۲۵ ہجری

مؤلفہ

جناب لالہ سری رام صاحب ایم-اے

سابق منصف دہلی خلف الصدق

عالیجناب آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال صاحب سی آئی ای

T.W. & Co. LAHORE

مرتب کا دیباچہ

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

لالہ سری رام مؤلف خمخانۂ جاوید کی وہ شخصیت تھی کہ ان کو بہت سے یاد کرتے ہیں۔ اور گاہ گاہ نہیں اکثر یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ غیر معمولی اوصاف کے مالک تھے۔ خاندان کو دیکھیے تو ان کا سلسلہ اکبر اعظم کے نورتن کے ممتاز فرد راجہ ٹوڈرمل تک پہنچتا ہے۔ لالہ سری رام کے ایک بزرگ لالہ جیون لال محمد شاہ کے دربار کے ایک نامی گرامی منصبدار تھے۔ ان کے والد آنریبل رائے مدن گوپال بہادر ایم۔ اے بیرسٹرایٹ لا دہلی اور لاہور میں بہترین قانوندان سمجھے جاتے تھے۔ ان کے تایا رائے بہادر ماسٹر پیارے لال دہلی میں نئے طرز کی لٹریری سوسائٹی کے بانی اور پنجاب میں اُردو کی تدوین اور اشاعت کرنے والوں میں سے تھے۔ لالہ سری رام کا قدیم خاندانی مکان وہاں تھا جہاں اب چاندنی چوک میں بیپٹسٹ گرجا (Baptist Chapel) بنا ہوا ہے۔ ایسے باغ میں جو ہونہار برِوا پیدا ہو اُس کے پات چکنے کیوں نہ ہوتے۔

لالہ سری رام ۴ر دسمبر ۱۸۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی اور لاہور میں ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کی ایم۔ اے کی ڈگری انگریزی میں حاصل کرکے جلد ہی آپ منصف کے عہدے پر فایز ہوگئے۔ مگر ۱۹۰۴ء میں ادبی مصروفیتوں کی وجہ سے سرکاری ملازمت چھوڑ دی۔ اور اُردو ادب و شاعری کی خدمت کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے وہ خود شاعر نہ تھے لیکن بے نظیر سخن فہم و سخن شناس اور شاعر نواز تھے۔ اساتذہ کے سلسلوں یعنی مشہور شاعروں کے ادبی تعلقات اور اُن کے حلقۂ تلامذہ کے بارے میں

جو تحقیق اور واقفیت ان کی تھی اس کی نظیر میرے دیکھنے میں نہیں آئی یہی کمال اُن کو شاہی خاندانوں اور اہلِ ریاست کے گھرانوں کی تاریخی معلومات میں حاصل تھا۔

لالہ سری رام کا مطالعہ نہایت وسیع اور متنوع تھا شعر میں مضمون کی چوری اس پھرتی سے پکڑتے کہ پُرانے استاد دنگ رہ جاتے۔ کوئی دیوان یا مجموعۂ کلام غرض اُردو نظم کی کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو اُن کے کتب خانے میں موجود نہ ہو اور ان کی نظر سے نہ گزری ہو ابھی ذکر آیا ہے کہ انھوں نے شعر کبھی نہیں کہا۔ لیکن زمانہ اور مخزن کے ابتدائی دور میں متعدد مضامین ان نامی رسالوں میں لکھے جو ٹکسالی فصاحت اور تحقیق کے اعتبار سے نہایت قابلِ قدر تھے۔ اور تذکرہ خمخانۂ جاوید کی جلدوں میں تو ان کے سحر نگار قلم نے وہ گلکاریاں کیں جو اہلِ مذاق کے دماغ کو ہمیشہ تفریح اور تازگی بخشتی رہیں گی۔

ادب کی خدمت کا مختصر حال یہ ہے کہ انور مرحوم کا دیوان طالب علمی کے ہی زمانہ میں حاصل کر کے شایع کر دیا تھا۔ اگر یہ نہ کرتے تو انور جیسے نغز گفتار شاعر کا کلام چند اشعار کے سوا جو لوگوں کو یاد تھے اس کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا معقول رقم دے کر مہتاب داغ کا حقِ تصنیف خریدا اور اسے بڑے اہتمام سے چھپوایا۔ یادگار داغ کے بعد فصیح الملک کا اور کلام جو فرد فرد تھا فراہم کر کے ضمیمہ یادگار داغ کے نام سے چھپوا کر شایع کیا مرزا محمد تقی بیگ مائل کے کلام کا مجموعہ مرتب کیا۔ مولانا حسرت موہانی نے جو مختصر سا دیوان مائل کا شایع کیا ہے اس کا ماخذ وہی مجموعہ ہے جس کا ابھی ذکر ہوا منشی بہاری لال مشتاق کا کلیات چھپوانے ہی کو تھے کہ آخری بیماری میں مبتلا ہو گئے۔

لالہ سری رام کا کتبخانہ ادب اور آرٹ کا عجائب گھر تھا۔ فارسی۔ عربی۔ اُردو اور ہندی کی کتابیں ہزاروں تھیں جن کے موضوعوں کی نوعیت گوناگوں تھی۔ قلمی کتابیں جنھیں آجکل مخطوطات کہتے ہیں سیکڑوں تھیں۔ ان میں بہت سی بالتصویر تھیں چھپی ہوئی کتابوں اور انگریزی کتابوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ایک بڑی تعداد ان کتابوں کی تھی جو کمیاب اور نایاب میں یہی کیفیت

قلمی تصویروں کی تھی۔ ایسی تصویریں پانسو سے زیادہ تھیں۔ خطاطی یعنی مختلف رسم الخط کے نمونے قطعوں۔ وصلیوں اور مرقعوں کی شکل میں بہت سے تھے۔ پرانے شاہی فرمان بھی خاصی تعداد میں تھے۔

لالہ سری رام کی ادب نوازی کے کئی طریق تھے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ لکشمی اور سرستی کے آپس میں حد کا بیر ہے۔ لالہ سری رام پر دونوں کی نظرِ عنایت تھی۔ اس بارے میں وہ معدودے چند خوش نصیب مستثنیات میں سے تھے۔ وہ یہ کرتے کہ جس نومشق شاعر کو دیکھا کہ اُس نے اچھی اور ہونہار طبیعت پائی ہے اس کی دل افزائی کرتے۔ بے روزگاری کی صورت میں اس کے لیے شغل مہیا کرتے۔ شہر اور باہر کے مشاعروں میں اسے ساتھ لے جاتے دنیائے ادب سے اس کا تعارف کراتے۔ ایسا بھی اکثر ہوا ہے کہ ایک شخص نے اپنی تصنیف یا تالیف ان کو دکھائی اور انھیں پسند آگئی تو اس کی طباعت و اشاعت میں امداد فرماتے۔

لالہ سری رام کا ذوقِ سلیم اُردوئے ادب اور شاعری سے متعلق مقامی اور ملّی امتیاز سے مبرا تھا۔ ذاتی برتاؤ میں جو رواداری اور موالات کا جوہر حاوی تھا وہی ادبی معاملات میں بھی موجود تھا۔ دہلی اور لکھنؤ دکن اور پنجاب۔ اہلِ زبان اور زباندان۔ ہندو اور غیر ہندو کے امتیاز اور اختلاف کو نہ اُن کے ادبی شعور اور ذہنیت میں دخل تھا نہ سوشل برتاؤ اور فیض رسانی میں۔ وہ خود اپنے مراسم اور اعتقادات کے شد کے ساتھ پابند اور عامل تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اتنے وسیع المشرب اور فراخدل تھے۔ اس قدر ملنسار اور اخلاقِ حمیدہ کے مالک تھے کہ ہندو مسلمان ان کی نظر میں ایک تھے۔ ہاں دوستوں کے تعلقات کے بارے میں زود رنج اور ذکی الحس ضرور تھے۔ اس ذیل میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو میری ذات سے متعلق ہے۔ میں روزگار کے چکر میں برسوں سے دہلی سے باہر تھا ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں منصبی ضرورت سے دہلی آیا۔ کام نہایت اہم اور عجلت کا تھا اس سے

فارغ ہوکر فوراً واپس چلا گیا۔ ان سے ملنے تک کی مہلت نہ ملی۔ ان کو میرے آنے جانے کی خبر مل گئی۔ میں جب دہلی آتا اعزّا و اقربا کو چھوڑ کر انھیں کے پاس ٹھیرتا۔ خیر اس کے بعد جو میں آیا تو آپ بولتے نہیں۔ میں ہاتھ بڑھاتا ہوں تو ان کا ہاتھ جیب میں چلا جاتا ہے۔ سامنے ڈٹ جاتا ہوں تو پیٹھ موڑ لیتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ پچھلی دفعہ میرے آنے کی انھیں خبر لگ گئی۔ اسی کا رنج ہے کہ ملا تک نہیں اور چلا گیا۔ میں نے پھر اُن کی طرف رُخ نہ کیا۔ چائے منگوا کر پی اور ملازم سے حقہ لانے کو کہا۔ بس پھر کیا تھا ٹھنڈے ہو گئے۔ پانوں کی ڈبیا میرے آگے سرکا کر پوچھا جب کیسے آئے تھے؟ میں نے جواب دیا آتے گئے کچھ نہیں۔ اُستاد کے قول کا ثبوت آج ملا ہے۔ پوچھا وہ کیا؟ میں نے کہا استاد ذوق جو فرما گئے تھے کہ:۔

بے محبت نہیں لے ذوق شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں لے ذوق محبت کے مزے

ہنس دیے اور لپٹ گئے۔ لوگوں کی بے تمیزی اور دوستوں کی بے رُخی انھیں بہت تکلیف دیتی تھی۔ چونکہ خود بے ریا اور مخلص طبیعت پائی تھی کسی کی عیاری کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اپنے زمانے میں وہ سب سے زیادہ کثیر الاحباب شخص تھے۔ شعرا اور ادبی مذاق والوں کا تو ملجا و ماوا تھے ہی عمائد اور سربرآوردہ اصحاب اور والیان ریاست میں بھی وہ اجنبی نہ تھے۔ ان کے دوستوں کے وسیع حلقہ میں مذہب و ملت اور بڑے چھوٹے کی تمیز نہ تھی۔

لالہ سری رام کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان کارنامہ تذکرہ ہزار داستان معروف بہ خمخانۂ جاوید ہے۔ یہ اُردو شاعروں کا بسیط اور جامع تذکرہ ہے۔ اس کی چار جلدیں وہ اپنی زندگی میں شایع کر گئے۔ اور باقی جلدوں کا کم وبیش مسالہ فراہم کر کے اُن کی اشاعت کا انتظام کر گئے۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ پہلے اس تذکرہ کی نسبت کچھ سُن لیجیے۔

لالہ سری رام کو ابتدا سے شاعری سے بدرجۂ اتم دلچسپی تھی اور تاریخ چونکہ ان کے مطالعہ کا

خاص موضوع تھا اس لیے اُس وقت تک کے تذکرے بھی نظر سے گزرے لیکن ان میں سے کوئی اس معیار پر پورا نہ اُترا جو اُن کے ذہن میں قایم ہو چکا تھا۔ یہ علّتِ غائی تھی اِس جدید تذکرہ خمخانۂ جاوید کی تصنیف کی۔ تذکرہ کی پہلی جلد کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"یہ جنون یہاں تک بڑھا کہ۔۔ اساتذۂ سلف وحال کی خوش کلامی کو مونس اور اُن کے حالات کو اپنا وظیفہ قرار دیا۔ اور دل میں ٹھیرالیا کہ جملہ اساتذہ و دلدادگان سخن کی ایک مجلس منعقد ہو اور ان کے کلام کا لبِ لباب یکجائی صورت میں مہیّا کیا جائے۔"

یہ سامان کس طرح مہیّا کیا گیا اس کو خود انھیں کے الفاظ میں سُنیے۔ فرمایا ہے:۔

"جس دوست یا بزرگ کی خدمت میں باریابی ہوئی شعرا کے حالات اور کلام کا ذکر میرا مشغلہ ٹھیرا۔ بات کوئی ہوتی مگر میری زبان سے اُس کے جواب میں کسی شاعر کا کلام یا اس کا ذکر نکل جاتا۔"

اِس انتہائے شوق وشغف کا کیا ٹھکانا۔ سترہ برس کے تفحص اور انہماک وعرق ریزی کے بعد پہلی جلد اس تذکرے کی شایع ہوئی۔ دنیائے ادب نے جس تپاک اور گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا وہ اُن تبصروں سے ظاہر ہے جو ہر جلد کے آخر میں چھپے ہیں۔ اس بارے میں 'یار فروشی' کے الزام سے بچنے کے لیے میں اپنی زبان سے کچھ نہ کہوں گا۔ اور صرف دو تین رایوں سے مجمل انتخاب پیش کروں گا۔ یہ اُن بزرگوں کے نقد و نظر کا ماحصل ہے جو ادب کے بہت ہی محتاط اور سخت نقاد تھے۔ شمس العلما منشی ذکاء اللہ نے فرمایا:۔

"اِس خداداد فہم مستقیم اور مذاقِ سلیم کے سبب سے انھوں (لالہ سری رام) نے ادنیٰ اور متوسط شاعروں کے کلام میں سے ایسے تھوڑے اشعار منتخب کئے کہ استادوں کے کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اعلیٰ شاعروں کے کلام میں سے بہت سے اشعار ایسے منتخب کئے کہ اِن سے بہتر اور اشعار اُن کے کلام

میں نہیں پائے جاتے......... غرض یہ مصنف کا بڑا احسان اہل زبان پر ہو کہ اُس نے اُردو لٹریچر پر اپنے اس تذکرے کی تصنیف سے ایسا بے بہا اضافہ کیا ہو کہ پہلے کبھی نہیں ہوا......"

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی برسوں سے نئی کتابوں پر تنقید و تبصرہ لکھنا چھوڑ چکے تھے لیکن اس تذکرے کے محاسن نے اُن کے اِس معمول میں ایک مستثنیٰ قایم کیا فرماتے ہیں:-

"جس صفائی اور سلاست سے اس میں شعرا کے حالات لکھے گئے ہیں اور جس سلیقہ سے اُن کا کلام بہم پہنچایا گیا ہو اور جس ادب و احترام کے ساتھ قدما سے لے کر معاصرین تک سب کا نام لیا گیا ہو ان سب باتوں کو تمام نے تسلیم کیا ہو اور سب سے بڑھ کر میں صدق دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ یہ تذکرہ جامعیت کے لحاظ سے بلا مبالغہ شعرائے اُردو کی ایسی سائیکلو پیڈیا ہو کہ جس کی نظیر اُردو تذکروں میں نایاب سمجھی جائے گی۔ اور اُردو زبان میں یہ ایک ایسا اضافہ ہوگا جس کا تمام اہل ملک کو ممنون ہونا چاہیے"

لکھنؤ کے ادیب اعظم منشی احمد علی شوق قدوائی نے اس تذکرے کو دیکھ کر یہ رائے قایم کی جو غور کے قابل ہو۔ فرماتے ہیں:-

"اُس تذکرے میں صرف اتنا ہی نہیں کہ شعرا کے نام جمع کر دیئے گئے ہوں۔ بلکہ مناسب حد تک یا یوں کہو کہ جس قدر مل سکی اُس قدر، ہر شاعر کی لائف بھی موجود ہو۔ یہ ایک ایسی بات ہو جس کی قدر شاعری کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی کی جائے گی...... ایک بڑا لطف یہ ہو کہ عبارت سلیس، فصیح، متین اور سنجیدہ تحریر فرمائی جس نے مذاقِ نظم کے ساتھ مذاقِ نثر کو بڑھا کے حسنِ سخن کو دو بالا کر دیا"

لالہ سری رام مرحوم اس عدیم المثال تذکرے کے لیے یعنی اس کی تکمیل کے لیے کیا

انتظام کر گئے اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

انھوں نے مرض لاحقہ کو پیچیدہ دیکھ کر ایک وصیت کی۔ اور امور سے قطع نظر جو وصیت میں درج تھے یہاں دو کا ذکر کیا جائے گا۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی تمام عمر کا علمی اور ادبی اندوختہ یعنی بے نظیر کتبخانہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے معہ تمام قلمی تصویروں وغیرہ کے بنارس یونیورسٹی کو دے گئے۔ کہا گیا کہ وہاں اس کتبخانہ سے پورا فائدہ نہیں اُٹھایا جائیگا تو فرمایا کہ اسی لیے تو وہاں جانا چاہیے تاکہ جہاں اُردو سے کافی دلچسپی نہیں وہاں دلچسپی پیدا کی جائے۔ چنانچہ لالہ سری رام کی رحلت کے چند سال بعد وہ تمام علمی اور فنی خزانہ بنارس چلا گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ تمام کتابیں فہرست میں باقاعدہ درج ہوکر تو تعمیر لائبریری کے ایک کمرے میں رکھی گئی ہیں۔ اپنی مطبوعات کا کاپی رائیٹ اور اسٹاک بھی جو موجود تھا وہ بنارس یونیورسٹی ہی کو دے گئے۔

تذکرے کی تکمیل کا انتظام بھی وصیت میں کیا گیا اور اس کی ترتیب و تکمیل کے لیے راقم کو نامزد کر گئے۔ چنانچہ تذکرہ خمخانۂ جاوید کی پانچویں جلد مطبع میں اختتام کے قریب ہے۔ چند ناگزیر موانع ایسے پیش آگئے کہ اس کام میں اتنا توقف ہوا جن میں بڑا حصہ اُس عذرداری کا ہے جو عدالت میں وصیت کے خلاف دایر کی گئی۔ خود میں بھی خاصی مدت تک تکرداہات زندگی میں مبتلا رہا جس کا علم اکثر احباب کو ہے۔

لالہ سری رام اپنے دوستوں کے سچے دوست اور مخلص تھے تو دوسروں کے ساتھ ہمدرد اور فیاض تھے۔ زندگی میں بہت سی بیواؤں اور یتیموں اور نادار طلبہ کی معقول امداد کرتے رہے۔ اور وصیت میں بھی اس کا لحاظ رکھا۔ اچھے شعرا کے بے شمار اشعار نوکِ زبان تھے اور مناسب موقع شعر پر شعر ان کی زبان سے سامعہ نواز ہوتے۔ مرحوم اس تہذیب اور کلچر کا بہترین نمونہ تھے جو ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی شائستگی اور ادب کے اتحاد سے وجود پذیر ہوئی۔ وہ خوش رو۔ خوش پوش اور خوش گفتار تھے۔ اخلاص پرستی

اور دوستداری اور ادب نوازی ان کا شیوہ تھا۔ ریاکاری اور تصنّع سے قطعاً نا آشنا تھے۔ جو دل میں ہوتا زبان پر آتا۔ آخر یہ راجہ ٹوڈرمل کی یادگار شعروسخن کا مربی۔ اور شاعری کے حق میں مسیحائی کرنے والا ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

تذکرے کی جلد پنجم جو اس وقت دنیائے ادب کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ اُن خوبیوں کی حامل ہے جو پہلی چار جلدوں کا مابہ الامتیاز متصور ہے۔ پرانے مسودوں کے مندرجات کو تا حال اور مکمل کرنے میں بہت دقتیں پیش آئیں۔ اصحاب متعلق سے خط وکتابت شروع ہوئی۔ اکثر کے جواب ہی نہ آئے کئی سفر اس سلسلے میں کیے گئے جن کا نتیجہ پورے طور پر اطمینان بخش نہ ہوا۔ اس اثنا میں ملک کے حالات اور اہلِ وطن کے مذاق میں انقلابِ عظیم وارد ہوگیا تھا۔ ادب دوست احباب نے ترتیب سے متعلق نئی نئی تجویزیں پیش کیں۔ اگر ان سب پر عمل کیا جاتا تو اس جلد کا ڈھانچہ ہی اپنی ماسبق جلدوں سے بالکل مختلف ہوتا۔ مناسب یہی سمجھا گیا کہ نوعیت میں فرق نہ پیدا کیا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ جو نام اس جلد میں ایزاد کیے گئے ہیں اُن سے متعلق نگارش اور تبصرہ کا طرز سابقہ جلدوں کے مندرجات سے مختلف ہے۔ کیونکہ میرا قلم اس سحر کاری اور معجز نگاری سے محروم ہے جو مرحوم کا حصّہ تھا۔

آخر میں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس جلد میں جہاں جہاں **مولف** کا لفظ آیا ہے وہاں لالہ صاحب سے مراد ہے اور جہاں **مرتب** یا **راقم** جیسے الفاظ آئے ہیں وہاں مراد اس خاکسار سے ہے۔

برجموہن دتاتریہ کیفی

نمبرا۔ دریاگنج۔ دہلی



لالہ سری رام جی اِس تصنیف کے وقت

فہرست شعرا مندرجہ تذکرہ خمخانۂ جاوید جلد پنجم

تذکرۂ ہزار داستان

المعروف بہ

خمخانۂ جاوید

جلد پنجم

شعلہ

شعلہ۔ منشی سیّد محمدؐ سلطان صاحب خلف سیّد مرتضےٰ حسین و نبیرہ جلیس الدّولہ بہادر مرحوم لکھنوی مصاحب حضرت واجد علی شاہ۔ آپ کو محشر لکھنوی سے تلمذ ہے۔ ۱۰ جمادی الاوّل ۱۳۱۱ھ کو بمقام کلکتہ پیدا ہوئے۔ اب لکھنؤ بنجاری ٹولہ میں سکونت ہے۔ ابتداء میں نوحہ کہنے کا شوق تھا۔ مگر جب حزن و ملال میں تغزّل کی جھلک پائی گئی تو ان کے استاد نے یہ رائے دی کہ غزل کہا کرو۔ شعرگوئی کا شوق خاص رکھتے ہیں مضامین عاشقانہ سے طبیعت کو مناسبت ہے۔ بے محل تشبیہات فضول استعارہ سے پرہیز ہے۔ صاف ستھرا شعر کہتے ہیں۔ انتخاب کلام یہ ہے: ؎

سب سُننے کو بیٹھے ہیں تیرے غم کی کہانی	وہ کون ہے شعلہ کہ جو رو کر نہ اُٹھے گا
ممنون ہوں تیرے ستم جاں گداز کا	مُنہ دیکھنا پڑا نہ مجھے چارہ ساز کا

آتشِ شوق اور اے موسیٰ اگر کچھ بڑھ گئی
جان لینا آج کوہِ طور سارا جل گیا

دستِ جنوں انہیں بھی ٹھکانے لگا دے اب
کام آئینگے یہ چند گریباں کے تار کیا

گئے وہ دن کہ جب نالوں سے کچھ تسکین ہوتی تھی
مداوا اب تو خاموشی ہے اپنے دردِ پنہاں کا

اگر اے چارہ گر دشوار ہے دردِ جگر جانا
تو پھر ہر وقت کی تکلیف سے بہتر ہے مر جانا

شریکِ درد کوئی بھی نہیں اپنے زمانے میں
یقیں کیونکر کریں بالیں پہ سب غمخوار بیٹھے ہیں

لئے چلتے ہیں بزمِ دوست میں آگے مقدر ہے
یہاں تک تیری خاطر اے دلِ ناشاد کرتے ہیں

یہ کہہ کے مر گیا کوئی صبحِ شبِ فراق
اب ان کا انتظار عبث ہے وہ آ چکے

ہمراہِ داستانِ وفا ہم بھی ختم ہیں
تھوڑی سی رہ گئی ہے بہت سی سنا چکے

مر گئے ہم تو کھلا بابِ قفس اے صیاد
کیا یونہی قید سے آزاد کیا کرتے ہیں

یہی بہتر ہے نہ آئیں وہ عیادت کیلئے
دیکھ کر حالتِ بیمار پریشان ہونگے

کلیم طور پہ دیکھ آئے تھے جسے شعلہ
ازل کے دن سے وہ جلوہ مری نگاہ میں ہے

درد کی ایذا دمِ شدت کبھی ایسی نہ تھی
کیا کہوں جیسی کہ اب حالت کبھی ایسی نہ تھی

حشر تک اب تو اندھیرے میں بسر ہونی ہے
شمع تربت پہ جلائے گا کہاں تک کوئی

مدد اے ضبط نہ اُف منہ سے نکلنے پائے
ظلم سے باز نہ آئے گا کہاں تک کوئی

دلِ بیتاب ٹھہرنے نہیں دیتا شعلہ
اپنی محفل میں بٹھائے گا کہاں تک کوئی

نہ چھیڑ اے خندۂ صبحِ قیامت
ابھی سوئے ہیں جاگے رات بھر کے

شعلہ

شعلہ - منشی محمد خلیل الرحمٰن خاں خلف الصدق جناب محمد عوض خاں صاحب مرحوم آپ یکم جنوری ۱۸۹۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اکابر خاندان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں اعلیٰ مراتب پر سرفراز تھے۔ آپ کا خاندان مدت دراز سے شہر دہلی میں محلہ بلیماراں کٹرہ بجواڑیاں میں سکونت پذیر ہے۔ آپ نے اینگلو عربک ہائی سکول دہلی میں تعلیم پائی فی الحال آپ پوسٹل آڈٹ آفس دہلی میں ملازم ہیں۔ آپ نے جناب میر شرافت علی صاحب

کُشتہ سے تلمّذ اختیار کیا۔ جناب کشتہ کے انتقال کے بعد آپ نے جناب نوح ناروی سے اصلاح لینی شروع کی۔ اب آپ جناب نوح کے شاگردوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

جناب شعلہ نہایت خلیق اور منکسر المزاج ہیں۔ دہلی کے مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے رہتے ہیں۔ آپکے ایک عزیز نے درج تذکرہ ہونے کیلئے جو کلام روانہ فرمایا ہے اُس کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔ آپکے کلام میں حضرت امیر احمد مینائی کا رنگ نمایاں ہے۔ مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کا شوق ہے۔ معاملہ بندی کا عنصر آپ کے اشعار میں غالب رہتے ہیں۔

فرطِ حیا سے بزم میں مجھ سے خموش تھا ۔۔۔ بے پردہ ہو کے اور بھی وہ پردہ پوش تھا
بچپن ہی خوب تھا ترے عہدِ شباب سے ۔۔۔ کب تجھکو اس زمانہ میں پردہ کا ہوش تھا
میری فغاں سے چونک کے پوچھا عدو نے کون ۔۔۔ اس نے کہا کوئی نہیں اِک دِل فروش تھا
بعدِ فنا کوئی بھی نہ رہا سرِ مزار ۔۔۔ اِک تھا چراغ گور سو وہ بھی خموش تھا
آیا نہ میرے کام کوئی اور پیرہن ۔۔۔ دو گز کفن ہی بعد فنا پردہ پوش تھا
بچپن سے روتے آئے نہ ہم زار زار کب ۔۔۔ اِن موتیوں کا پہنا نہ شعلہ نے ہار کب
آتے ہی میرے گھر میں انہیں نیند آ گئی ۔۔۔ میرے نصیب جاگیں گے پروردگار کب
دردِ فراق۔ رشکِ عدو۔ یاس بیکسی ۔۔۔ چاروں ہوئے نہ ہجر میں مجھ سے دوچار کب
اُن کی بلا سے ہو نہ ہو تُربت پہ روشنی ۔۔۔ روشن کرینگے شعلہ وہ شمع مزار کب
حیا کی۔ ناز کی۔ رفتار کی گفتار کیصورت ۔۔۔ مصوّر کس طرح کھینچے ادائے یار کیصورت
تعجب ہے کہ اس صورت پہ ہو انکار کیصورت ۔۔۔ تمہاری شکل کہتی ہے کہ مَیں ہوں پیار کیصورت
ہمیں ہر دم حضوری ہے جدائی کسکو کہتے ہیں ۔۔۔ تصوّر میں یہاں پیشِ نظر ہے یار کیصورت
اہلِ جہاں پہ بار نہ اپنا وجود ہو ۔۔۔ اس باغ میں رہے تو رہے کوئی بنکے پھول
ہمارے قلبِ وحشت دوست کو تسکین کیا ہوگی ۔۔۔ لباسِ زندگی کی ہم نہ جب تک دھجیاں کرلیں
نظر تصویر پہ ہو دھیان اپنا ہو مصوّر پہ ۔۔۔ یہ عینِ حق پرستی ہے جو یُوں یادِ بتاں کرلیں

ہمیشہ کوہ و صحرا کے بہت تنکے چُنے ہم نے ‌ ‌ ‌ چمن کی چار پتّوں کو بھی زیبِ آشیاں کرلیں
کہاں تک سوزِ باطن کا فسانہ وہ سُنتے جائیے ‌ ‌ ‌ زباں بند آپ اپنی شعلۂ آتش بیاں کرلیں
فنا پہ بھی غم بے مائیگی نہ مجھکو رہا ‌ ‌ ‌ بگولے آئے کفن دینے وحشتِ غربت میں
نہ چھوٹے کشمکشِ رنج و غم سے مرکر بھی ‌ ‌ ‌ کہ آسمان پہ ہے رُوح جسم تربت میں
شبِ غم میں نے منصوبہ نہیں کاٹیں رنج کی گھڑیاں ‌ ‌ ‌ اگر یوں ہو تو اچھا ہو۔ اگر یُوں ہو تو بہتر ہو

عمرِ شباب چشم زدن میں گذر گئی ‌ ‌ ‌ بادِ نسیم تھی اِدھر آئی۔ اُدھر گئی
لازم ہے بقا کیلئے تعلیم فنا بھی ‌ ‌ ‌ جینے ہی میں آنے لگے مرنے کا مزا بھی
شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا انکو ذرا بھی ‌ ‌ ‌ نقشہ تو بہت کھینچا تصوّر نے کھینچا بھی
ہیچ ہے یہ مثلِ ٹوٹی کی بوٹی نہیں آتی ‌ ‌ ‌ بیکار ہے فانی کیلئے آبِ بقا بھی
مانندِ نقشِ پا اِدھر اُبھرا اُدھر مٹا ‌ ‌ ‌ مارا ہے مجھ کو ہستیِ بے اعتبار نے
پہنچا دیا ہے بعد فلک پر مرا غُبار ‌ ‌ ‌ پایا یہ رُتبہ مرکے تیرے خاکسار نے

ہے خیال ہجر میں وصل کا ہر خوشی کا دھیان ملال میں ‌ ‌ ‌ یہ طلسم عشق تو دیکھئے کہ خزاں میں فصلِ بہار ہے
وہ جو ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے کہ ہے قبر شعلہ کی کس طرف ‌ ‌ ‌ انہیں بیکسی نے بتا دیا۔ یہ مزار ہے۔ یہ مزار ہے

شعور:۔ شیخ عبد الرؤف بلگرامی مقیم لکھنؤ۔ حضرتِ مصحفی کے شاگرد تھے۔ صاحبِ دیوان تھے کلام سے پختگی ظاہر ہے۔ زبان شُستہ اور روزمرہ صاف ہے بہت منجھی ہوئی طبیعت پائی چند شعر جو دستیاب ہوسکے درج ذیل ہیں :؂

بادۂ عشرت تہی دستوں کی قسمت میں کہاں ‌ ‌ ‌ اشک خوں سے بھر گیا آیا جو ساغر ہاتھ میں
یار کی تصویر سے ہے دیدہ و دل کو سُرور ‌ ‌ ‌ رات بھر سینہ پہ ہم رکھتے ہیں دن بھر ہاتھ میں
دیا ہے حُسن میں یہ مرتبہ اللہ نے تجھ کو ‌ ‌ ‌ پری تیرے قدم چُومے لگائے حُور آنکھوں سے
نہ پہنچیں نرگس و شمشاد ہرگز چشم و قامت کو ‌ ‌ ‌ وہ ہے رفتار سے مجبور۔ یہ معذور آنکھوں سے

شفا:۔ سیّد شریف الدین حسین خلف جناب حکیم سیّد شاہ کاظم حسین مغفور

سجادہ نشین خانقاہِ داناپور زیور علم سے آراستہ ہیں۔ علم طبابت میں اچھا دخل ہے۔ شاہ محمد اکبر صاحب ابوالعلائی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ گلدستہ نالۂ عشاق میں آپ کا کلام نظر سے گذرا۔ چند شعر حاضر ہیں:-

ہے تصور کبھی خط کا تو کبھی گیسو کا
ہم بھی ہر وقت نیا اِک خفقان رکھتے ہیں

نقش برآب ہے اِنساں کا وجودِ موہوم
اپنی ہستی صفت وہم وگماں رکھتے ہیں

آگ لگ جائے زمانے میں کریں اُف جو شفاؔ
دِل میں ہم وہ شررِ عشق نہاں رکھتے ہیں

شفا **شفاؔ:-** حکیم محمد ولایت حسین خاں صاحب۔ آپ لکھنؤ کے قدیم باشندے ہیں۔ میر دوست علی خلیل اور میر وزیر علی صبا کی مجالس مشاعرہ میں شریک رہے ہیں اور اُن سے اصلاحیں لی ہیں۔ غدر کے بعد سے آپ نے لکھنؤ کو چھوڑ دیا۔ اور ریاست رامپور میں ملازم ہو گئے۔ جب نواب کلب علی خاں کا انتقال ہو گیا تو آپ حضرت داغ کے ہمراہ دہلی چلے آئے۔ مختلف مقامات کا سفر کرتے ہوئے اَجے گڑھ پہنچے اور وہاں ملازمت اختیار کر لی۔ پھر نواب شمشیر بہادر اخگر سے اصلاح لینے لگے۔ مثنوی عطرِ فتنہ اور قرابادین شفائی ان کی تصنیفات سے ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

وحشت نہ دل کا اپنے نہ کچھ حال پوچھئے
آنسو بھی پوچھنے کو تو اَب آستیں نہیں

چپلو بگڑو نہ اِتنا دِل لگی ہیں
کہیں گے کچھ نہ اَب تم سے ہنسی میں

پارسا جانتے تھے ہم تو شفاؔ کو از حد
آج دیکھا تو چلے آتے تھے میخانے سے

شفا **شفاؔ:-** لالہ سوہن لال صاحب بریلوی شاگرد حضرت ہوش۔ اچھے فکر کے شاعر ہیں۔ کلام یہ ہے:-

دِل کو پروا نہیں سختی وہ اگر کرتے ہیں
اپنے نالے بھی تو پتھر میں اثر کرتے ہیں

گیسوؤں کا تیرے رہتا نہیں کب دِل میں خیال
یہ وہ کافر ہیں کہ کعبہ میں بھی گھر کرتے ہیں

بلا ہو۔ قہر ہو۔ کیا جانئے کہ کیا ہو جائے
تمہاری زُلف جو برہم کبھی ذرا ہو جائے

نصیب شربت دیدار ہو اگر ان کا — تو پھر شفا کو نہ کیونکر بھلا شفا ہو جائے

شفا

شفا:- پادری لے۔ آر بیلی بریلوی مذہباً گو عیسائی ہیں۔ مگر ہندستانی زبان اور مشرقی لٹریچر کے سرگرم حامی ہیں عطا بدایونی اور جناب وسیم خیرآبادی سے تلمذ ہے۔ کلام مرسلہ کا انتخاب یہ ہے

ہو گیا ہے مری نظروں سے جو پنہاں کوئی — زندگی کا نظر آتا نہیں سامان کوئی
اب تو پردہ نہ کرو آکے دکھا دو دیدار — آنکھ میں دم ہے کوئی دم کا ہے مہمان کوئی
اے جنوں وادیٔ وحشت میں ترے ہاتھوں سے — چاک دامن ہے کوئی چاک گریبان کوئی
کیوں شفا کے لئے کرتے ہیں دوا میری طبیب — دردِ فرقت کا جہاں میں نہیں درماں کوئی

شفاعت:- مولوی شفاعت اللہ ولد شیخ سخاوت اللہ حمیدی۔ محلہ قاضی ٹولہ شہر بدایوں میں سکونت تھی۔ جناب نوا سے تلمذ تھا۔ افسوس ہے کہ زیادہ حالات اور کلام نہ ملے۔ کلام شائع نہیں ہوا۔ ۱۲۸۹ھ میں بعمر ۵۰ سال انتقال کیا۔ یہ دو شعر ان کے ہیں:

عکس لب سے نتھ کا موتی لعل احمر ہو گیا — ہنس دیا وہ گل تو پھر گوہر کا گوہر ہو گیا
میں ترے لئے یار جو رسوا نہیں ہوتا — عالم میں ترے حسن کا شہرا نہیں ہوتا

شفق

شفق:- انوار الدولہ سعید الملک نواب محمد سعد الدین خاں صولت جنگ مرحوم رئیس کالپی نواب عماد الملک غازی الدین خاں خلف نظام الملک آصف جاہ کی اولاد میں سے تھے۔ سید امجد علی قلق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ شاعر گرامی قدر مصنف **چشمۂ فیض** اور صاحب دیوان تھے۔ مرزا غالب سے خط و کتابت رہتی تھی۔ اور کسب کمال کا شوق تھا۔ ذہن رسا اور طبیعت خداداد رکھتے تھے طرز بیان مرغوب اور خوش اسلوب ہے۔ کلام ملاحظہ ہو:-

آرزوؤں کی نہ لے شوقِ شہادت نکلی — سخت جانی سے مری خنجرِ قاتل ٹوٹا
مقامِ عشق میں غفلت ہو عین ہشیاری — کہ رخنۂ نگہِ یار خواب ہوا
یاد سے چشمۂ خنجر کی روانی مجھکو — کر دیا نزع میں کس لطف سے پانی مجھکو

حوصلے دل میں تڑپنے کے ہیں کیا کیا دیکھئے
ذبح کر کے رقصِ بسمل کا تماشا دیکھئے

گھر سے وحشت میں نکلتے ہی وطن بھول گئے
یہ فضا دشت کی دیکھی کہ چمن بھول گئے

یہ ضعف ہے کہ سانس کا لینا محال ہے
بارِ گراں ہے رُوح تنِ زار کے لئے

شفق :- مرزا علی جان لکھنوی ابن مرزا جہاں۔ شاگرد میر امداد علی بحر شاعر دربار واجد علی شاہ اور صاحبِ دیوان تھے۔ مٹیا برج میں رہتے تھے۔ اور اچھا شعر کہتے تھے۔ چند شعر نتائج افکار سے درج کئے جاتے ہیں :-

سرِ شوریدہ اپنا وقفِ تیغِ جورِ خوباں ہے
نکالیں حوصلہ جی بھر کے اب اہلِ ستم اپنا

طمع دو آنسوؤں کی بھی نہ رکھو اہلِ دُنیا سے
شفق جی بھر کے رو لو جیتے جی کر جاؤ غم اپنا

ملو تو صورتِ آئینہ صاف ہو کے ملو
مزا نہیں ہے دلوں میں اگر غبار رہا

کیوں ٹھنڈی سانس بھرتے ہو غیروں کیواسطے
محفل میں شمع ساں نہ جلاؤ پرائے دل

اُدھر خدا بندگی کا طالب اُدھر ہے نفسِ حریص غالب
یہ رُوح آ کر میانِ قالب عجب مصیبت کے درمیاں ہے

جو بات کی انہوں نے خبر ہو گئی ہمیں
حاصل ہوئی ہے عشق سے ہم کو صفائے دل

شفق

شفق :- دولت رام گلفروش باشندہ دہلی۔ ساکن قدم شریف۔ اُستاد ذوق کے شاگرد تھے۔ ٹپہ۔ ٹھمری اور غزل کہتے تھے۔ اُمّی محض تھے۔ مگر تعلیم یافتہ لوگوں کے فیضِ صحبت سے صحیح الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔ غدر کے بیس۲۰ برس بعد تک زندہ رہے۔ پیرانہ سالی میں انتقال کیا۔ کلام یہ ہے :-

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اُسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

دمِ غسل سے مرے پیشتر یہی ہمدموں نے بھی سوچ کر
کہیں جائے وہ اس کا نہ جی دہل مری لاش پر سے ہٹا دیا

مجھے دفن کر چکو جس گھڑی تو یہ کہنا اس سے کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشقِ زار تھا تہ خاک اُس کو دبا دیا

میری آنکھ جھپکی تھی ایک پل ہی دل نے چاہا کہ اٹھ کے چل
دلِ بیقرار نے آخرش مجھے چٹکی لیکے جگا دیا

اگر اس سے کہتا نہ اتنا تو تو نہ رُکتا تجھ سے وہ تُند خو
شفق آہ تو نے یہ کیا کیا اُسے عشق اپنا جتا دیا

پسِ مُردن بھی گردش ہے زبس میرے مقدر میں
الٰہی کیا کرے دیوانۂ اُلفت کہاں جائے

نگوڑے کسطرح رہتی ہے میری خاک چکر میں
قرار آتا ہے صحرا میں نہ جی لگتا ہے اب گھر میں

خدا کے سامنے آنے تو دو مغرور قاتل کو
قیامت ہم بھی اک برپا کرینگے آج محشر میں

فراقِ یار میں کیا لطف ساقی بادہ نوشی کا
بجائے مے ذرا سا زہر بھر دے میرے ساغر میں

دلِ محروم کا مدفن زیارت گاہ بن جائے
شفق چھوٹی سی اک تُربت بنا دو کوئے دلبر میں

شفق :- جناب مولوی حسن مرتضٰے صاحب شفق ساکن عماد پور ربیع گنج ضلع گیا خلف مولوی سید حسن رضا مغفور سابق صدر الصُّدور جونپور و بنارس۔ آپ اُردو کے کہنہ مشق اور پُختہ مغز مشاہیر شعرا میں ہیں۔ شعر و سخن کا مشغلہ ابتدائے سنِ شعور سے ہے ابتدا میں آپ نے جناب حکیم عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی سے اصلاح لی تھی۔ پھر حضرت امیر احمد مینائی لکھنوی سے تلمذ حاصل کیا۔ آپ نے کتب درسیہ عربی فارسی و طب الہ آباد اور عظیم آباد وغیرہ میں پڑھیں۔ ادب اور زباندانی کا شوق فطری تھا۔ ہندوستان کے اکثر گلدستوں اور رسالوں میں آپ کی نظمیں چھپتی ہیں۔ آپ کے کلام کو شرف شہرت و قبولیت حاصل ہو چکا ہے۔ بیاضِ نعت۔ حدیقۂ آخرت وغیرہ آپ کے نعتیہ رسالے چھپ چکے ہیں۔ فنِ عروض میں ایک جامع و مختصر رسالہ مسمّٰی باسم تاریخی مہرِ عروض چھپ گیا ہے۔ رُکنِ عروض اور تحقیقِ سخن وغیرہ رسالے بھی آپ کی تصنیف سے ہیں۔ ریاضِ شفق جس میں آپ کے مختصر حالات اور ہر قسم کے کلام کا انتخاب درج ہے۔ آپ کے شاگرد ذبیح نے شائع کیا دلِ صد پارہ مختلف عنوان کی تنسو رباعیوں کا مجموعہ طبع ہو چکا ہے۔ آپ کے تلامذہ میں یہ ہیں۔ سرپر کابری شمس شہر گھاٹوی۔ قوس۔ ذبیح۔ آپ کا کلام بہت صاف اور فصیح ہوتا ہے۔ فنِ شعر میں پورا دخل رکھتے ہیں۔ شوکت الفاظ۔ حسنِ بندش۔ دلنشیں تخیل۔ آپ کے کلام

شفق

کے امتیازی اوصاف ہیں۔ فرسودہ مضمون جب لکھتے ہیں اپنی جدّت طرازی سے اس میں بھی نئی رُوح پھونک دیتے ہیں۔ طور و موسیٰ کا معاملہ ہمیشہ سے شعراء کا تختۂ مشق رہا ہے۔ مگر آپ نے کیا دل آویز بات لکھ دی ہے۔ یہ شعر سنئے۔

چمکیگی برقِ طور جمالِ حبیب سے کہدو کلیم ہٹ کے کھڑے ہوں قریب سے

اِس مضمون کو شائد کسی شاعر نے اس پہلو سے نہیں ادا کیا۔ یہ خاص جناب شفق کا حصّہ ہے۔ بعض اشعار ایسے ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر دل بے چین ہو جاتا ہے۔

شفق بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہو گیا
کہ دِل تھام کر تم ٹہلنے لگے

کس قدر اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسی طرح ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ آپ نہایت خلیق اور منکسر المزاج ہیں۔ مظہر سعید آپ کا تاریخی نام ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو: ۔

۱۲۸۹ھ

ہے الگ رشتۂ دُوئی سے بندۂ درگاہ کا
سات پردے میں بھی آنکھو نکے ہے جلوہ اس کا
جسکے سو داغ جگر میں ہوں ہزاروں ڈلمیں
اس تمنّا میں کہ دل کی کوئی حسرت نکلے
فنا ہو کر ہم آغوشِ بقا ہوتا تو کیا ہوتا
خودی پر آپکو کیا کیا سمجھتا ہے خدا سمجھے
قیامت سی نہیں کچھ انتظارِ وصل کی مُدّت
شفق ہے نیستی پر بھی بشر کو دعوئ ہستی
مست ہو کر یُوں اُبل پڑتا نہ تھا زاہد تجھے
نہیں ہم ایسے دیوانے کریں منّت رفوگر کی

ایک ہے کعبہ کلیسا پھیر ہے کچھ راہ کا
دیکھ ہر پردے میں در پردہ تماشا اس کا
اللہ اللہ دل اس کا ہے کلیجا اس کا
آج مُنہ دیکھتی ہے میری تمنّا اس کا
جو قطرہ تھا وہ دریا آشنا ہوتا تو کیا ہوتا
یہ بندہ بیخودی سے باخدا ہوتا تو کیا ہوتا
خدا جانے کہیں وعدہ وفا ہوتا تو کیا ہوتا
نہ ہونے پر یہ عالم ہے بھلا ہوتا تو کیا ہوتا
اتنی ہی پھر کیوں نہ پی جتنا تیرا پیمانہ تھا
کہ اُلٹا اور پردہ فاش ہو چاک گریباں کا

کچھ زمانہ۔ کچھ مقدر۔ کچھ فلک بدنام ہے
ڈر کے مارے نام لے کون اس ستم ایجاد کا

بخش دینے کی ذرا ہمت تو دل میں کیجیے
حوصلہ پھر دیکھئے شرمندۂ تقصیر کا

جگر پر ہاتھ۔ آنکھوں پر ہے دامن، درد پہلو میں
شفقؔ معلوم ہوتا ہے تمہارا دل کہیں آیا

فرشتے ملتے ہیں انسان ہی نہیں ملتا
خدا ملے تو ملے آدمی نہیں ملتا

شفقؔ جو دل میں ہے آنکھوں میں ہی نگاہ میں ہے
اسی کو ڈھونڈتے ہیں وہی نہیں ملتا

بیخودی دیکھ کہ موسیٰ کی کھلیں یہ آنکھیں
طور نے کام کیا سرمۂ بینائی کا

مے گلرنگ سخن سے یہ ٹپکتا ہے شفقؔ
مست ہوں جام امیر احمد مینائی کا

میں لحد میں بھی نہ تنہا آیا
لیکے ساتھ اس کی تمنا آیا

جب کہا میں نے دل آیا تو کہا
کہنے والے کا کلیجا آیا

جی اٹھے مرتے ہی مرنے والے
موت کیا آئی مسیحا آیا

چھالوں کو جہاں چھیڑتے ہیں دشت میں کانٹے
سب پھوٹ کر روتے ہیں غربت بھی ہے کیا چیز

چھپ چھپ کے شفقؔ تھوڑی سی پی لیتا ہے واعظ
کمبخت نہیں چھوٹتی عادت بھی ہے کیا چیز

ایک نیا خطاب دیں حسن کی ہر ادا کو ہم
پیار کہیں ستم کو ہم لطف کہیں جفا کو ہم

یہ کہہ کہہ کر فرشتے قبر میں شانہ ہلاتے ہیں
کہ غافل عمر بھر سویا تھا اب تجھکو جگاتے ہیں

اشک غمخواریاں جتاتے ہیں
رونے والوں کا منہ دھلاتے ہیں

شفقؔ ہم میکدے والوں سے پوچھے کوئی حال انکا
جناب شیخ کا کیا پوچھنا اللہ والے ہیں

اتنی ساقی نے دی کہ دی ہی نہیں
اتنی کم ہم نے پی کہ پی ہی نہیں

مر کے جینے کا کیا مزا جانے
جس نے کمبخت جان دی ہی نہیں

دختِ رز یا پری تھی شیشے میں
اڑ گئی یوں کہ جیسے تھی ہی نہیں

ہو فرشتہ شفقؔ یہ بات ہے اور
جو نہ انسان ہو آدمی ہی نہیں

کوستے جاتے ہیں وہ نام شفقؔ کا لے کر
اور کہتے ہیں کہ گمنام ہے مشہور نہیں

ڈھاؤ آغازِ عشق میں نہ ستم
ابتدا ہی میں انتہا کیوں ہو

جس دوا میں ہو درد کا نہ اثر
وہ مرے درد کی دوا کیوں ہو

شفقؔ اس کی عطا کو بھول گئے
اتنے شرمندۂ خطا کیوں ہو

آنسو ہوئے کیوں جاری کیوں دل ہوا گرویدہ
کیا دیکھ لیا تو نے اے دیدۂ غمدیدہ

اثر کو ساتھ لئے کامیاب ہو کے پھری
فلک سے میری دعا مستجاب ہو کے پھری

دعائیں دیتی ہے تاثیر کو فغاں میری
کہ نا امید گئی کامیاب ہو کے پھری

قبول ہو گئی اس در پہ التجا میری
سوال بنکے گئی تھی جواب ہو کے پھری

فصلِ گل کچھ دن رہی کچھ دن رہا دورِ خزاں
آشیاں اپنا ہوا آباد بھی برباد بھی

اس نے سیکھا آپ سے اور اس سے سیکھا آپ نے
آسماں ہے آپ کا شاگرد بھی استاد بھی

ساری دنیا اک طرف گورِ غریباں اک طرف
کسقدر آباد ہے ملکِ عدم آباد بھی

الگ جُن رکھے دونوں ایک ہو جائیں نہ گھل مل کے
کہ دلمیں تیر کے ٹکڑے ہیں ٹکڑے تیر میں دل کے

بہار آئی تو نغمے ہیں خزاں آئی تو نالے ہیں
یہ ہیں دو نام گویا ایک ہی شورِ عنادل کے

شفقؔ یہ انتہائے بیکسی ہے دشتِ غربت میں
کہ کوئی رونیوالا تک نہیں ملتا گلے مل کے

کرامت بھرے جام تخفے سا قیا
کہ محفل میں بے پاؤں چلنے لگے

شفقؔ تم اگلے فسانے لوگونکی جیسے سنتے ہو دوستوں سے
یونہی زبانوں پہ سب کی آخر تمہاری بھی داستاں ہیگی

چڑھ جاؤگے نظروں پہ اُتر جاوگے دل سے
ہر شخص کی آنکھوں میں سمانا نہیں اچھا

بکھیڑے حسر تونکی ہیں نہ جھگڑے آرزوؤں کے
تعلق سے بری ہیں ہم دل بے مدعا ہو کر

دریا میں ٹوٹ ٹوٹ کے کہتا ہے ہر حباب
جبتک فنا نہ ہو کبھی حاصل بقا نہ ہو

رباعی

سائینس کو مذہب کا پتا ہی نہ ملا
اُلجھے ہوئے ڈورے کا سرا ہی نہ ملا

سب راز کھلے راز خدا ہی نہ ملا
عقدہ تو ملا عقدہ کشا ہی نہ ملا

شفق

شفق :- آغا مہدی حسین طبّاع اور ذہین ہیں۔ غزل کے علاوہ مرثیئے سلام اور نوحے وغیرہ بھی کہے ہیں۔ ڈسٹرکٹ جیل آگرہ میں ملازم تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

دیکھوں کسطرح وہ اغیار کے گھر جاتے ہیں
میں بھی بیٹھا ہوں سرِ راہ گذر آج کی رات

ہر اک موسم میں ضد سے حضرتِ واعظ کی پیتا ہوں
نہیں تو لطف مے نوشی فقط آتا ہے ساون میں

دوئی ہو دور گر دل سے تو سارا راز کھل جائے
یہ جنگ مذہبی بے سود ہے شیخ و برہمن میں

شفق

شفق :- مولوی عبدالقیوم صاحب امروہوی مخاطب بہ رئیس الکلام خلف مولوی حافظ عبدالرحمٰن صدر مدرّس عربیہ امروہہ۔ اگرچہ مرحوم علوم عربیہ میں مہارت وافر رکھتے تھے۔ مگر اردو شاعری میں انہوں نے بہت قلیل عرصہ میں جو ترقی کی تھی حیرت انگیز ہے۔ مرحوم کی شاعری کا آغاز ۱۹۱۵ء سے ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کثرت مشق سے ایک خوشگوار اور سنجیدہ شاعر بن گئے :-

ہندوستان کے مشہور گلدستوں اور رسالوں میں ان کا کلام چھپ کر مقبول ہوتا رہا۔ مرحوم کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ اساتذہ کے ہزاروں شعر یاد تھے۔ چند غزلوں میں حافظ جلیل حسن صاحب جلیلؔ مانکپوری سے اصلاح لی تھی۔ کہا کرتے تھے کہ میرا استاد "صنم خانۂ عشق" (دیوان حضرت امیر احمد مینائی) ہے۔ کلام مضامین کی چاشنی کے ساتھ ساتھ اردو کے روزمرّہ کا اچھا نمونہ ہے۔ تاریخ گوئی میں خاصہ ملکہ تھا۔ اور اکثر برجستہ تاریخیں کہی ہیں۔ افسوس ہے کہ عین عالم شباب میں یعنی بعمر ۲۵ رسال، پانچ مہینہ کھانسی بخار میں مبتلا رہ کر ۱۹ر جمادی الاوّل ۱۳۴۲ھ کی شب میں انتقال کیا۔ مولوی حبیب اللہ خاں غضنفر اللہ خاں غضنفر امروہوی ان کے شاگردِ رشید اور صحیح یادگار ہیں۔ کلام یہ ہے :-

عزّت ترے قدموں سے ملی کون و مکاں کو
روشن ترے جلوے نے کیا بزمِ جہاں کو

وہ جان گئے نالۂ جانکاہ کی تاثیر
وہ مان گئے درد بھرے دل کی فغاں کو

زخمی کئے دیتے ہیں ستمگر ترے طعنے
ہم تیغ سے کچھ بڑھ کے سمجھتے ہیں زباں کو

ہم خانہ کعبہ کی زیارت کو چلے ہیں
سینے سے لگائے ہوئے تصویرِ بتاں کو

اغیار کٹے جاتے ہیں اندازِ بیاں سے
جوہر وہ ملے ہیں مری شمشیرِ زباں کو

زبانِ حال سے رنگِ شفق کہتا ہے گردوں پہ
اُڑے ہیں خون کے چھینٹے زمینِ کوئے قاتل سے

یہی بیتابیِ دل ہے تو کیسا لطفِ نظارہ
کلیجہ تھام کر اُٹھنا پڑے گا بزمِ قاتل سے

دلِ بسمل سے اب اس کا نکلنا غیر ممکن ہے
ہزاروں حسرتیں لپٹی ہوئی ہیں تیرِ قاتل سے

کس کشمکش میں جان ترے ناتواں کی ہے
یارائے ضبطِ غم ہے نہ طاقت فغاں کی ہے

خلقت میں دھوم جلوۂ حسنِ بتاں کی ہے
زینت اسی چراغ سے بزمِ جہاں کی ہے

شائد نہیں خبر مرے دردِ نہاں کی ہے
تاکید بار بار جو ضبطِ فغاں کی ہے

او چارہ سازِ خاطرِ مایوس جلد آ
حالت بہت خراب ترے نیم جاں کی ہے

کیونکر نہ آفتابِ قیامت کی دھوم ہو
تصویر ہو بہو مرے داغِ نہاں کی ہے

جو مر گئے فراق میں گویا وہ جی گئے
لذت اجل میں زندگیِ جاوداں کی ہے

عالم سرِ نیاز جھکاتا ہے اس جگہ
کعبہ ہے یا زمین ترے آستاں کی ہے

دل سے نکل کے جانبِ عرشِ بریں چلی
ہمت بہت بلند ہماری فغاں کی ہے

شفق:۔ منشی کرتار ناتھ صاحب ولد لالہ نند لال صاحب ۱۹۰۴ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ کئی زبانیں جانتے ہیں۔ ایف۔ اے پاس ہیں۔ فی الحال ڈُائینا اینڈ کمپنی میں اکونٹنٹ ہیں۔ جناب سیماب اکبرآبادی اور جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔ بمقابلہ غزل کے طرزِ جدید کی نظموں کیطرف توجہ زیادہ ہے۔ کلام میں جدت زیادہ ہے۔ اگر مشقِ سخن اور اصلاح جاری رہی تو آئندہ مزید ترقی کی امید ہے۔ جو مختصر کلام موصول ہوا۔ اس کا انتخاب نذرِ ناظرین ہے ؎

نتیجہ یہ ملا اے بے وفا تیری محبت کا
نشاں ملتا نہیں ڈھونڈے سے بھی دل میں مسرت کا

وہ دل ہی کیا جو بلبل کیطرح ہر گل پہ شیدا ہو
شفق تو واقعی انساں نہیں ایسی طبیعت کا

قتل کر دیتے مجھے تیغِ ادا سے غم نہ تھا
کیوں گرفتارِ غمِ اقرارِ فردا کر دیا

پھر بہار آئی ہوا مرغِ قفس پھر نالہ زن
پھر دلِ شوریدہ نے طوفان برپا کر دیا

کس بھروسے پہ زندگی کاٹیں
تیرا وعدہ کوئی وفا نہ ہوا

دو گھڑی ہم بھی چین سے بیٹھتے
یہ بھی اے چرخِ بے وفا نہ ہوا

فدا ہوں تیری آنکھوں پہ مجھے بھی جام اے ساقی
بہت مدت سے میں بھی ہوں تیرے امیدواروں میں

تکلف برطرف ساقی ایاغِ بیخودی بھر دے
تمنا ہے مقدر کو نئے سر سے جواں کرلوں

حسینوں کی طبیعت بدگماں معلوم ہوتی ہے
ہماری خامشی ان کو فغاں معلوم ہوتی ہے

شگوفے کیا کھلائے ہیں تیرے نیرنگِ فرقت نے
بہارِ دل حریفِ گلستاں معلوم ہوتی ہے

اٹھائے اس قدر صدمے نہیں احساس عشرت بھی
خوشی کی آرزو دل پر گراں معلوم ہوتی ہے

شفق انکی حسیں آنکھیں بھی لبریزِ ناز ہیں
بہت پُر درد تیری داستاں معلوم ہوتی ہے

الٰہی ترکِ اُلفت کا گماں اسکو نہ ہو جائے
نہیں لب آشنا پھر ایک مدت سے فغاں میری

حشر ہی برپا کریگی شوخ جب ہو جائیگی
کر رہی ہے خونِ ناحق آنکھ شرمائی ہوئی

تم جو آ بیٹھو سرِ بالیں تو مرنا سہل ہو
رُوح پھرتی ہے تنِ بسمل میں گھبرائی ہوئی

گوکل کی چاندنی

سرسبز گلشنوں میں
موروں کی یہ قطاریں

رنگین مسکنوں میں
پی پی کی یہ پکاریں

یہ پریت کی بہاریں

اس جانفزا سماں میں
عشرت کی یہ بہاریں

رنگین گلستاں میں
یہ نور کی پھواریں

یہ پریم کی ہیں دھاریں

ساقیِ وحدت سے خطاب

گھیرے ہوئے نظروں کو ہے جلوہ جانانہ
ہر شاخ پری ہے اور ہر پھول ہے پیمانہ
پھر طور بنا ہر دل پھر شوق ہے دیوانہ
اندر کا اکھاڑہ ہے عشرت کا یہ گُل خانہ

پھر فصلِ بہار آئی
لا پھول پلا ساقی

اے جانِ شفق آ کر مسرور ذرا کر دے
اُلفت کے ترانوں سے مسحور ذرا کر دے
پُر کیف نگاہوں سے مخمور ذرا کر دے
ظلمت کدہ ہستی کو پُر نور ذرا کر دے

خونِ شُدِ دلِ سودائی
وقتست کہ باز آئی

شفق

شفق:- منشی لالتا پرشاد خلف منشی بیچے لال شاگرد منشی کنور جی مدہوش و شمس فرحت لکھنوی متوطن قدیم لکھنؤ مؤلف فرہنگِ شفق۔ فارسی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ انگریزی سے بھی واقف تھے۔ پیشہ کاپی نویسی قوم کایست خوش فکر اور تیز طبع شاعر تھے۔ کچھ زمانہ ہوا کہ تخمیناً ۵۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ چند اشعار بطور نمونہ نذرِ ناظرین ہیں:-

چار عنصر یوں سنبھالے ہیں دلِ مُردہ مرا
اِس لئے خاک پہ بیٹھا ہوں میں
کبر کیوں کرتے ہیں یہ دُنیا میں
یہ کس[1] مست کے آنے کی آرزو ہے
سمایا ہے جب سے تو نظروں میں میری
گلستاں میں جا کر ہر ایک گُل کو دیکھا

جس طرح بوجھ ایک کا بعد فنا ہو چار پر
کہ اُٹھا کر وہ نظر دیکھیں تو
پہلے اصل اپنی بشر دیکھیں تو
کہ ساقی لئے ساغر مشک بو ہے
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بُو ہے

[1] مندرجہ غزل کو بعض لوگ نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ کے نام سے موسوم کرتے ہیں:- ⁂

گریباں کیا چاک وحشت میں ایسا
نہ سینے کے قابل نہ جانے رفو ہے

بندہ ناچیز و بے حقیقت ہے
فیض مدہوش ۔ شمس و فرحت ہے

شفقت

شفقت:۔ سیّد نجف علی۔ شاعر خوش فکر اور عالی خیال ہیں۔ بندش اور مصرع کی ترکیب اچھی ہوتی ہے۔ زیادہ حال معلوم نہ ہُوا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

ازل کے روز سے تیرے ہی نظّارہ کا عاشق ہوں
دلِ حیراں کو آئینہ بنا دے اپنی صورت کا

بہار افزا ہے کیا ہی خال مشکیں چشم گُلرو پر
تماشا ہے رکھا ہے سنگِ اسود پشت آہو پر

نہ آئے گی مری تدبیر مجکو راس کبھی
مثل ہے اُوس سے بُجھتی نہیں ہے پیاس کبھی

شفقت

شفقت:۔ میر محمد حسین متوطن قصبہ گلاوٹھی تلمیذ صہبائی۔ انہوں نے شاہجہان آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ کلام میں مضمون آفرینی زیادہ ہے۔ بہت خوب کہتے تھے۔ یہ ان کا کلام ہے جو نذر ناظرین ہے:۔

اگر ملے تو میں جان تک بھی دیکے لوں صبر
کہ رنج و درد میں سامان ہو توکل کا

چل اب کہ آئے گی کس کام پھر مسیحائی
لبوں پہ دم ہے ترے کشتۂ تغافل کا

شوخی سے جسکو ایک جگہ پہ نہو قرار
نقشہ جو کوئی کھینچے تو کیا اس نگار کا

داغ فراق جاتے ہیں سینہ پہ ہم لئے
اب کام کیا رہا ہمیں شمع مزار سے

شفیق:۔ رائے لچھمی نرائن کھتری تھے۔ ۱۱۸۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام منشی منسارام تھا۔ جو نواب نظام الملک آصفجاہ مرحوم کے عہد میں پیشکار صدارت صوبہ دکن تھے۔ رائے منسارام بھی صاحب تالیف و تصنیفات تھے۔ الغرض شفیق نے ایسے گھرانے میں تربیت پائی۔ جہاں علمی چرچا بکثرت تھا۔ شفیق نے رواج زمانہ کے مطابق فارسی۔ عربی۔ صرف نحو۔ انشا وغیرہ کی تعلیم پائی۔ ابتدائے سن شعور سے شفیق کو شعر و سخن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی اس وقت دکن ہی میں تھے۔ شفیق نے انہیں کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اپنے اُستاد

سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ انکی شان میں ایک قصیدہ بہت ہی پُر زور نظم کیا۔ اور بھی اکثر مقامات پر اُستاد کی مدح خوانی کی ہے۔ فارسی اور اُردو کے نامور شاعر تھے۔ بہت کچھ کہا۔ مگر کلام اب کمیاب ہے۔ غضب ہے اپنے تذکرہ چمنستانِ شعرا میں اپنا ایک شعر نہیں دیا۔ شفیق کی چند تصنیفات مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) حقیقت ہائے ہندوستان۔ ہندوستان کی ایک تاریخ ہے۔

(۲) تنمیقِ شنگرف۔ دکن کی تاریخ ہے۔

(۳) مآثرِ آصفی۔ خاندانِ آصف جاہ کی تاریخ۔

(۴) بساط الغنائم۔ مرہٹوں کی تاریخ ہے۔

(۵) حالاتِ حیدرآباد۔ یہ شہر حیدرآباد کی مختصر تاریخ ہے۔

(۶) تذکرہ شامِ غریباں۔ اُن ایرانی شعرا کا تذکرہ ہے جو ہندوستان میں وارد ہوئے۔

(۷) گُلِ رعنا۔ فارسی گو شعراء کا تذکرہ ہے۔

(۸) چمنستانِ شعراء۔ ریختہ گو (اردو) شعراء کا تذکرہ ہے۔

(۹) کلامِ شفیق۔ کلیات کلام اُردو۔

شفیق ایک پُرگو شاعر اور کثیر التصانیف نثّار تھے۔ قریب قریب ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کی ہے جس سے قادر الکلامی اور مہارتِ فن کا پتہ چلتا ہے۔ پہلے صاحبؔ تخلّص کرتے تھے۔ بعد میں شفیقؔ ہوئے۔ بڑی تلاش سے یہ چند اشعار ان کے ہاتھ آئے۔ جو نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ غالبًا یہ ان کا ابتدائی زمانے کا کلام ہے۔ کیونکہ اس میں صاحبؔ تخلّص آیا ہے۔

تیرے بس میں ہیں ہمیں تو چھوڑ دے یا قید رکھ
آپ سے اب دام میں تدبیر کرنا کیا ضرور

بس ڈھپنی رہنے دو یہ بات میاں مت بولو
ہم تمہیں دیکھ لیا اور تمہارا اخلاص

بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ
نسیمِ صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

جیوں جلا آگ کا آتش سینی ہوتا ہے بھلا
شیخ جی آتے ہیں کس ڈھج سے پکڑ تسبی کو ہاتھ

عشق کے درد کو تحقیق دوا ہیگا عشق
مارے گر دن میں ایسا جائے جو منکا ڈھلک

کیا کریں عرض حال تیرے پاس
کوئی بچارا تجھے کہاں ڈھونڈے

ہم کو دل نیں تجھے دماغ نہیں
ایک جا کا تری سراغ نہیں

لائے جواب وہ کوئی صاحب کے شعر کا
ہمیں کنج قفس میں چھوڑ کر صیاد جاتا ہے

جس کو کہ ذہن تا قب وفکر دقیق ہو
خدا جانے کہ ہم سے خوش ہے یا ناشاد جاتا ہے

شفیق:- جونپور کے رہنے والے۔ نام محمد ولی الدین۔ حافظ قرآن فارسی میں بوستان تک واقفیت ہے۔ عربی فی الحال شروع کی ہے۔ مصنف بلبل چمن ہر سہ حصہ وکلام شفیق وغیرہ۔ شفیق حضرت حفیظ جونپوری کے شاگرد اور جناب حافظ حاجی مولوی محمد یعقوب صاحب انیق جونپوری تلمیذ حضرت داغ دہلوی کے خلف اکبر ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

شوق میں پہلے بنا بیٹھے نشانہ تیر کا
سرنگوں ہیں دیکھ کر اب زخم دل نخچیر کا

یہ اثر گلشن میں ہے سودائے عالمگیر کا
غنچہ غنچہ ہو گیا دانہ مری زنجیر کا

ظلم کرنیوالا اس پردے میں کوئی اور ہے
مفت میں ہے نام بدنام آسمان پیر کا

مر گئے زنداں میں کیا سر پھوڑ کر تیرے اسیر
آجکل راتوں کو غل ہوتا نہیں زنجیر کا

اے شفیق آتا ہے بس انکی نزاکت کا خیال
ورنہ میں تو کام لوں نالوں سے اپنے تیر کا

دور شباب چشم زدن میں گذر گیا
جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا

تعریف حسن سُن کے ہُوا تھا فریفتہ
انداز اس کے دیکھ کے میں اور مر گیا

کیا جانئے ہے کیا عدم آباد میں مزا
پھر کر کبھی نہ آیا وہاں جو بشر گیا

جینا وہ کیا کہ موت سے بدتر ہو زندگی
اچھا ہُوا کہ آپ کا بیمار مر گیا

کہتے ہیں وہ شفیق کی کچھ خیریت کہو
وہ خانماں خراب کہاں ہے کدھر گیا

جب کبھی پردے سے باہر روئے جاناں ہوگیا ... شرم سے بدلی میں پنہاں مہر تاباں ہوگیا
جو کوئی آیا عیادت کو ترے بیمار کی ... دیکھ کر اس کی پریشانی پریشان ہوگیا
پھوٹ کر روئے لہو اسطرح میرے آبلے ... ایک اک ٹکڑا بیاباں کا گلستاں ہوگیا
جسطرف دیکھو امید و شوق و ارماں دفن ہیں ... خانۂ دل کیا ہوا گنج شہیداں ہوگیا
روئے جاناں دیکھکر گیسوئے جاناں دیکھکر ... کوئی حیراں ہوگیا کوئی پریشان ہوگیا
زمانہ دے رہا ہے جان اس خلوت نشینی پر ... ہر اک آپے سے باہر ہو جو تم پردے سے باہر ہو
محبت کا مزا جب ہے کشش ہو دونوں جانب سے ... مرے دل میں ترا گھر ہو ترے دلمیں مرا گھر ہو
یہی اب چاہتا ہوں میں یہی میری تمنا ہے ... ترا در ہو مرا سر ہو مرا سر ہو ترا در ہو
واعظ ہر ایک شے میں اسی کا ظہور ہے ... ایمن کی قید اور نہ تخصیص طور ہے
قندیل عرش میں بھی مدینے کا نور ہے ... ذرّوں میں اس زمیں کے تجلّی طور ہے
کیا پوچھتا ہے بادۂ توحید کا مزا ... واعظ اسی شراب کی تلچھٹ طہور ہے
اپنے کو جب مٹاؤ تو اس کا نشاں ملے ... جتنا ہی وہ قریب اتنا ہی دور ہے

شفیق

شفیق: سیّد احمد حسین عرف ننھّو صاحب لکھنوی ۱۲۸۵ھ میں دریوالی گلی محلّہ مفتی گنج لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت امام موسٰی رضا کی اولاد میں ہیں آپ کے والد جناب حاجی سیّد علی حسین صاحب مرحوم اور دادا سیّد صادق علی صاحب زبردست عامل سمجھے جاتے تھے مگر پڑھے لکھے نہ تھے۔ باوجود اُمّی محض ہونے کے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ میانہ قد سیاہ رنگ بدن مائل بہ فربہی تقریر میں شوخی اور ظرافت کا انداز ہے۔ اہل لکھنؤ کو ان کی فطری اور وہبی شاعری پر ناز ہے۔ مرزا محمد جعفر اوج خلف حضرت دبیر لکھنوی ان کی سخن سرائی پر یہ رائے دیتے ہیں۔ "زبان کی خوبی اور بیان کی خوش اسلوبی دونوں دلکش پیرائے میں ہیں"۔ مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی تحریر فرماتے ہیں۔ کہ نظم کا ذوق

فطری ہوتا ہے۔ شفیق کے کلام میں آمد زیادہ ہے۔ اور آورد کم۔ معاملہ بندی اور جذبات سے کلام خالی نہیں ہوتا۔ مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر مرحوم "تعجب اور حیرت سے لکھتے ہیں۔ کہ ایک جاہل مطلق ان پڑھ اور ایسا شاعر" اردو زبان کی اصطلاحات کے موز سے واقف ہیں۔ دقیق سے دقیق خیالات کو سلجھے ہوئے الفاظ میں ادا کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ تخیل اور جذبات میں جدت کا ظہور ہے۔ باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے علم مجلسی سے خوب واقف ہیں۔ شاعری کیساتھ ہی علم موسیقی میں بھی کافی مہارت رکھتے ہیں۔ اور ایسی خوش الحانی سے غزل پڑھتے ہیں کہ سامعین کی زبان سے بے ساختہ آفرین نکل جاتی ہے۔ آپ کا پہلا شعر یہ بتلایا جاتا ہے۔

پکڑ کر لیچلا صیاد یوں بلبل کو گلشن سے
دبائے بال و پر منھ میں ہیں اور منقار چشکی میں

اُس زمانہ میں آپ کی عمر نو دس برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ چونکہ بچپن کلکتہ میں گذرا تھا۔ آپ نے آغا حجو شرف لکھنوی۔ گلشن الدولہ بہادر۔ حضرت منیر میر منشی شاہ اودھ کو دیکھا اور ان کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ شاہ اودھ کے انتقال کے بعد لکھنؤ آئے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ الو صاحب جلیس نبیرہ میر انیس نے آپ کو نکات شاعری سمجھائے اور بڑی شفقت و دلسوزی سے اصلاح دیتے تھے۔ کچھ زمانے تک جناب پیارے صاحب رشید سے اصلاح لیتے رہے۔ مگر زیادہ تر کلام بغیر اُستاد کے ہے۔ خود لکھ نہیں سکتے۔ بلکہ دوسروں سے اپنے اشعار لکھا لیتے ہیں سنہ ۱۳۳۵ھ میں دیوان شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

موسیٰ چلے ہیں طور کی جانب اُٹھا کے سر
کچھ بھی نہیں خیال نشیب و فراز کا

عشاق جسکو کہتے ہیں طول شب فراق
وہ بھی نمونہ ہے تری زلف دراز کا

محفل میں جل کے شمع بڑا کام کر گئی
عالم میں نام رہ گیا سوز و گداز کا

جس طرح چاہئے زینت کو ترقی دیجئے
آئینہ اپنا ہے رات اپنی ہے گیسو اپنا

یہ شفیق جگر افگار ہوا ہجر میں کیا
اب تو رو کے سے بھی رکتا نہیں آنسو اپنا

نرگس نے مری چشم گہر بار کو دیکھا
کس یاس سے بیمار نے بیمار کو دیکھا

نکالا چارہ گردوں نے عجب قیامت کی
کہ ان کے تیر سے رہتا تھا مشغلہ دل کا

ہم وہ عاشق ہیں کہ قبضہ میں ہے ہستی و عدم
روز جینا ہمیں اور روز فنا ہو جانا

میں نے یہ چاہا کہ بحر غم سے میں ہو جاؤں پار
دور مجھ سے منزلوں دامانِ ساحل ہو گیا

عشق عارض مٹ گیا ہوتے ہی عشق زلف یار
شام سے ٹھنڈا چراغ شمع محفل ہو گیا

اے شفیق زار بعد مرگ بس اتنا تو ہو
سب کہیں احباب ایک ایسا بھی جاہل ہو گیا

میں کہاں نظم کہاں جاہل مطلق ہوں میں
اسکی قدرت ہے مرا صاحب دیوان ہونا

قیس نے دشت نوردی میں بسر کی اپنی
میری تقدیر میں تھا داخلِ زندان ہونا

وہ یہ کہتے ہیں کہ ہر دل پہ ہے قابو اپنا
لڑتے ہی آنکھ اثر کرتا ہے جادو اپنا

کہہ لاکھ مگر کوچے سے بستر نہ اٹھے گا
یہ تیرا ستم ہم سے ستمگر نہ اٹھے گا

اے چارہ گرو آبلۂ دل کو نہ چھیڑو
مر جاؤں گا میں صدمۂ نشتر نہ اٹھے گا

یہ سوچ چکے ہم کوچہ میں بیٹھے ہیں تمہارے
آجائے قیامت بھی تو بستر نہ اٹھے گا

تم چھپ کے کہیں جاؤ مگر چھپ نہیں سکتے
رفتار سے کیا فتنۂ محشر نہ اٹھے گا

بیمار غم کے مرنے سے کیسا اداس ہے
اب سب مزاج پوچھتے ہیں چارہ ساز کا

بعد مرنے کے مجھے آپ سے خفت یہ ہے
جان تو موت نے لی آپ پہ الزام آیا

ساقی مرے ہر روز کے آنے سے ہے یہ تنگ
اب مجکو اس انداز سے ساغر نہیں ملتا

سمجھ میں کچھ نہیں آتا معاملہ دل کا
حضور آئیں تو ہو جائے فیصلہ دل کا

ادنےٰ یہ شان ہے ترے حسن و جمال کی
ناخن کٹے تو بن گئی صورت ہلال کی

مردہ دلی نے کر دیا رسوا جہان میں
چھپتی نہیں چھپائے سے صورت ہلال کی

مرا برباد ہونا عشق میں یوں کام آتا ہے
کسی کے نام کے ہمراہ میرا نام آتا ہے

بنکے سائل اُنکے کوچے میں صدا دینے لگے
جس نے کچھ احساں کیا اُسکو دُعا دینے لگے

مار ڈالا ہے زمیں کی گردشوں نے اے شفیق
ایک دن راحت نہ پائی چرخِ کج رفتار سے

اسوقت میں شفیق سے ہے حکم کچھ پڑھو
جب موت اسکی حضرت محشر[1] قریب ہے

شفیق:- چودھری شفیق الزمان صاحب تعلقہ دار گڑھی بہلول پور ضلع بارہ بنکی زیادہ تر قیام لکھنؤ میں رہتا ہے۔ رئیسانہ طبیعت پائی ہے کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں۔ باوجود کوشش کے زیادہ کلام نہ مل سکا۔ نمونہ یہ ہے:-

شہیدِ ناز کا ماتم کریں کیا
وہ آئے ہاتھ میں مہندی لگا کے

مجھے ہے رشک اے بُت وقتِ رخصت
حوالے کیا کروں تجھ کو خدا کے

چراغِ قبرِ عاشق ہو گیا گُل
قیامت کر گئے جھونکے ہوا کے

گرے کیا آنکھوں سے اشکِ ندامت
کہ دریا بہہ گئے لطفِ خدا کے

شکیب:- منشی عبدالرب صاحب امروہوی علمی استعداد کامل ہے۔ فارسی کے اچھے عالم ہیں۔ اکثر طلبا امتحاناتِ فارسی میں شامل ہونے کے لئے آپ سے رجوع کرتے ہیں۔ سید ابوالحسن ساکت امروہوی کے شاگردوں میں ممتاز ہیں کلام میں بھی اُستاد کے رنگ کا تتبع کرتے ہیں سنہ ۱۹ء سے قبل کے امروہہ کے مشاعروں میں شریک رہا کرتے تھے۔ اسکے بعد راجپوتانہ کی کسی ریاست میں ملازم ہو گئے اب عرصہ سے امروہہ میں ہیں۔ تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل ہے۔ ایک غزل جناب منظور احمد صاحب صدیقی امروہوی نے معہ حالات روانہ فرمائی تھی۔ اُس کا انتخاب نذر ناظرین ہے:-

ہم نے کب شکوہ کیا گھر غیر کے جانے لگے
کیوں نظر نیچی ہوئی کیوں آپ شرمانے لگے

آئے تھے جس بزم سے کل ہو کے رسوا و ذلیل
آج اسی محفل میں پھر ہم خود بخود جانے لگے

[1] سید کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی۔

ہے غنیمت کون کہتا تھا یہ دن ہونگے نصیب	ہم وہاں جانے لگے اور وہ یہاں آنے لگے
خوب کی مہماں نوازی گھر بلا کر آپ نے	مجکو باتیں ہر کس و ناکس کی سنوانے لگے
کہنے تو دیجے مجھے کچھ سُن تو لیجے میرا حال	کیا ضرورت ہے کہ سنکر رحم ہی آنے لگے

شکیب

شکیب:۔ نواب مرزا شکیب دہلی کے رہنے والے حیدر آباد دکن میں وکالت کرتے تھے۔ وہیں انتقال ہوا۔ یہ شعر ان کے ہیں:۔

مزا تو چکھ لے مے لالہ رنگ کا زاہد	ذرا سی پینے میں ظالم عذاب کیا ہوگا
جان لینی ہے تو لے چاک میں بلا سے چھوٹوں	راستہ دیکھ رہی ہے شب ہجراں کس کا
اے ترک یوں شکیب کو بسمل نہ چھوڑ جا	کر خاتمہ بخیر تو اور اک لگا کے ہاتھ
یہ دل زلف میں پھر پھنسا چاہتا ہے	بلا اپنے سر پر لیا چاہتا ہے
متاع دل و جاں جو لینی ہے لے لو	کوئی دم میں یہ سب لٹا چاہتا ہے

شکیبا

شکیبا:۔ میر غلام حسین شاگرد میر تقی میرؔ۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں شاعر خوش اسلوب تھے۔ شعرائے پایہ تخت میں ان کا شمار تھا۔ اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے انکی زبان بہت پاکیزہ معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ انصاف تو یہ ہے کہ دور موجودہ کے شعراء کے ہاں بھی ایسے صاف ستھرے شعر کم نکلتے ہیں۔ ذیل کے مطلع میں سات مرتبہ کیا کو لائے ہیں مگر کہیں بھی شعر میں حشو نہیں پایا جاتا۔ اسکو زباندانی اور قادر الکلامی کہہ سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ زیادہ کلام دستیاب نہ ہوسکا۔ چند اشعار زیب تذکرہ کئے جاتے ہیں:۔

ہمیں قتل تم نے کیا کیا نہیں کہتے ہم کہ برا کیا	یہ بھلا کیا یہ کہو کیا جو کوئی کہے کہ یہ کیا کیا
نیم بسمل اس نے گر چھوڑا شکیبا غم نہیں	پر یہ غم ہے اعتبار دست قاتل اٹھ گیا
اس چشم سرمہ سا کی نظر کیوں نہ تیز ہو	انزی ابھی ہے سان پہ تلوار تیز ہے
نہ پوچھو ماجرا ہجراں کی شب کا سخت آفت ہے	مہ تاباں بھی میرے سر پہ خورشید قیامت ہے
دن نہ گھر میں چین مجکو شب نہ مجکو خواب ہے	تابش مہر قیامت جلوہ مہتاب ہے

شکیل

شکیل ۔ منشی سید محمد صاحب شکیل لکھنوی اپنے بھائی جناب قمر کے شاگرد جوہر قابل موزوں طبع ہیں بہت سمجھکر شعر کہتے ہیں۔ زبان میں شیرینی اور انداز بیان میں دلکشی ہے۔ کلام یہ ہے:-

سب حسین ہیں جمع واعظ روز حشر
اور زاہد توبہ کر یہ ابر دیکھ
رندوں سے قسم لیجئے اے حضرت زاہد
نکریں تھے جو مرے دل کے بہلنے کیلئے
میری آنکھوں میں وہ ہر وقت پھرا کرتے ہیں
جگر میں داغ لب پر آہ پہ سوز

تو ڑاتا تھا اسی دن کے لئے
تجھ کو سمجھاتے تھے اس دن کیلئے
بے آپ کے پینے کی جو نیت ہو کسی کی
اب دعا کرتے ہیں وہ جان نکلنے کیلئے
راستہ ڈھونڈتے ہیں دل سے نکلنے کیلئے
یہ تحفہ لائے ہم بزم بتاں سے

شکر

شکر ۔ دانیال سقراط تھیفیل گارڈنر نام۔ ان کے والد مرحوم مسٹر سلیمان شکوہ گارڈنر عرف منا جان تھا کرنل گارڈنر مغفور رئیس کاسگنج کے پوتے تھے کرنل صاحب کی وفات کے بعد پہلا سا نمول وعروج ان کے خاندان کا نہ رہا۔ مگر پھر بھی خوشحالی سے بسر ہوئی۔ یہ انگریزی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں مہارت رکھتے اور فن سخن میں منشی عباس حسین ہوش لکھنوی سے مشورہ کرتے تھے۔ ان کا خاندان بسبب اس تعلق کے جو انہیں اکبر شاہ ثانی کے زمانے سے خاندان شاہی دہلی و اودھ سے رہا ہے۔ تاریخ ہند میں قابل ذکر ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

دعائیں جو ہوئیں کارگر رفتہ رفتہ
تڑپتے تڑپتے شب غم کٹی ہے
زمیں ہے اسی گئے آسماں ہے
ہوا گردش سے ثابت بعد تحقیق
لحد میں کیوں نہ ٹکے اے جانیوالو

نہ جانے کیوں ہیں اثر رفتہ رفتہ
ہوئی ہے خوشی کی سحر رفتہ رفتہ
تعالی اللہ کہاں اپنا مکاں ہے
زمیں کہتے ہیں جسکو آسماں ہے
عدم کی راہ میں منزل کہاں ہے

شکوہ

شکوہ ۔ محمد رضا مرزا فضیل مرحوم کے شاگردوں میں تھے۔ اگرچہ شعر کا شوق

کم تھا۔ مگر جو کچھ کہتے تھے اچھا ہوتا تھا۔ مندرجہ ذیل اشعار سے ان کی سلیم المذاقی آشکار ہے ان میں سے دو شعر اَب تک زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں ؛۔

تجھ کو دلدار مَیں سمجھتا ہوں
نہ اس کا وصل ہے ممکن نہ تاب ہے دل کو
مت مل تجھے کہتا تھا مَیں دل اس سے زیادہ
ملے ہے شب و روز وہ شوخ سب سے

کیا غلط یار میں سمجھتا ہوں
عجب طرح کا الٰہی عذاب ہے دل کو
پائی نہ سزا اور بھی مل اس سے زیادہ
مگر ایک سے ہے عار مجھ جاں بلب سے

شگفتہ :۔ صاحب عالم میرزا شگفتہ بخت عرف مرزا حاجی خلف الرشید شاہزادہ میرزا جواں بخت جہاندار شاہ ولی عہد شاہ عالم ثانی۔ صاحب عالم موصوف ناظم خوش تقریر تھے۔ اور بنارس میں سکونت پذیر۔ یہ دو شعر انکے دستیاب ہوئے جو درج ذیل ہیں ؛ شگفتہ

ساقی ہے مے ہے۔ باغ ہے۔ ابر بہار ہے
مشکل ہے میری اسکی ہو صحبت برار آہ

تیرا ہی رشک گل فقط اک انتظار ہے
میں جلد باز ہوں وہ تغافل شعار ہے

شگفتہ :۔ پنڈت برج بھوکن لال ولد پنڈت درگا پرشاد برہمن ساکن مصرکھ ضلع سیتا پور۔ پیشہ زمینداری۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ حضرت جگر صدیقی بسوانی سے تلمذ ہے۔ طبیعت میں عاشقانہ رنگ ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :۔ شگفتہ

جو بھڑکائیگی اے صبا یادِ گلستاں مجھ کو
اٹھا گلشن سے میرا آب و دانہ میں سمجھتا ہوں
دمِ آخر مری بالیں پہ آنے کو تو کہتے ہو
ملا دیں سونا کر مٹی میں ٹکڑے مرے دل کے
اٹھے جاتے ہیں کوچہ سے اگر تم حکم دیتے ہو

بہت مشکل ہے گنگی قفس کی تیلیاں مجھکو
نظر کچھ اور آتی ہے نگاہِ باغباں مجھ کو
مگر اتنا بتاتے جاؤ سچ اچھیں کہاں تک ہے
قدمبوسی مجھے ہو جائے حاصل خاک میں مل کے
اجازت ہو تو ٹکڑے ڈھونڈلیں ٹوٹے ہوئے دل کے

شگفتہ :۔ میرزا جہاں اختر عرف میرزا شگفتہ سلطان۔ خلف اصغر قہرمان اقلیم سخن رانی میرزا قادر بخش صابر گورگانی۔ نمونہ کلام یہ ہے :۔ شگفتہ

بگڑ جائے تری غیروں سے جبدم ہماری بات اس دم یاد کرنا

اس دل کے لگانے کا اثر دیکھئے کیا ہو کچھ طور نئے آئے نظر دیکھئے کیا ہو

نزع میں آئے وہ عیادت کو دو گھڑی اور بھی جئے ہی بنی

شگفتہ

شگفتہ:- منشی خیراتی لال کایستھ خلف بڑے طوطا رام تیز فہم، نکتہ رس، جدت پسند تھے مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی کے تلمیذ و ارادت مند تھے صاحب دیوان گذرے ہیں کلام بہت پُر اثر ہے محاورہ بندی نہایت مناسب اور زبان شستہ ہے مضمون آفرینی بھی پسندیدہ ہے کہیں عشق و محبت کا اظہار کہیں شوق و انتظار کی تصویر کہیں اشک حسرت کی تراوش ہے اور کہیں خون آرزو غرض جس موضوع پر قلم اٹھایا اُس کا نقشہ کھینچ دیا وطن لکھنؤ تھا مگر فیضِ استاد سے کہیں کہیں کلام میں دہلی کا رنگ و بو پایا جاتا ہے ۱۸۹۸ء میں وفات پائی کتابت کے ذریعہ سے بسراوقات کرتے تھے لکھنؤ چھوڑ کر کانپور کو اپنا وطن بنا رکھا تھا۔ آپ کا دیوان منشی چاند بلی متخلص بہ تکلم نے آپکی وفات کے بعد شائع کیا مگر افسوس ہے کہ ایک خوش رقم اور مشہور خطاط و خوش نویس کا کلام عمدہ حالت میں اشاعت پذیر نہ ہوا۔ دیوان میں اعلیٰ درجہ کا کاغذ لگایا گیا ہے مگر خط نہایت خراب چھپائی بالکل معمولی پھر طرّہ یہ کہ شاگردوں نے کلام کی صحت کا بھی لحاظ نہ کیا۔ خیر یہی کیا کم ہے۔ کہ مرحوم کا کلام تباہی اور گمنامی سے نکل کر روشنی میں آگیا۔ انتخاب کلام یہ ہے:-

حشر میں رونق ہوئی مل مل کر گلے ہنگامۂ قتل زخم شستہ ہیں کہ منہ چوم کر شمشیر کا

نظر آتے ہی سب جاتے رہے ہوش و حواس اپنے لب بام آ کے کسی پردہ نشیں نے اس طرف جھانکا

ہم نے تمہاری بات پہ دکھلا کے آئینہ معشوق خوبرو تمہیں ہم سا دکھا دیا

جوشش الفت نے دکھایا یہ اثر ہنگامۂ قتل خنجر قاتل لپٹ کر طوق گردن ہو گیا

ایک سا بھی پایا نہ آغوش زمانے نے کیا کہوں اشک جو آنکھوں سے ٹپکا صرف دامن ہو گیا

ہنگامۂ آرائش کا سبب وہ گل پہ نہ چھوٹ بیٹھے اس عمر مستعار کا ہے اعتبار کیا

ہے تصور جو ترے چہرہ نورانی کا
صورت آئینہ پابند ہوں حیرانی کا

اب کہاں دام مصیبت سے رہائی کی امید
تم کو مشکل ہوا عقدہ مری آسانی کا

گردشِ پائے تصور نے دکھائے یہ مزے
میرے اس کے منزلوں کا فاصلہ جاتا رہا

روز گھٹ جاتا ہے کچھ ہمت ممسک کی طرح
تنگ کرتا ہے مجھے گوشۂ زنداں کیا کیا

روزہ داران محبت سے حیا کرتی ہے
شام گیسو صفتِ صبحِ غریباں کیا کیا

دشنتِ مشاطہ سے اے یار دم آرائش
بنکے بگڑی ہے تری زلف پریشاں کیا کیا

اسقدر جوشِ تپ ہجر سے لاغر تن تھا
ذرۂ ریگ پس مرگ مرا مدفن تھا

کیا ندامت تھی دم قتل مجھے قاتل سے
دیدۂ تر صفت اشک نہ دامن تھا

یہی جو آتشِ فرقت کی سرفرازی ہے
تو دودِ آہ گلوگیر آسماں ہوگا۔

گستاخ ہوئے ہاتھ جنوں جوش پہ آیا
پابوسیِ دامن کو گریباں اتر آیا

دریائے اشک آنکھ میں آکر سمٹ گیا
کیا ربط یار تھا کہ بڑھا اور گھٹ گیا

اٹھا نہ گریہ کے کبھی فرش خاک سے ہرگز
مری طرح مرا آنسو بھی ناتواں ٹھہرا

فرطِ کاہش کا جو مجھ تک دسترس ہو جائیگا
جسم میرا صورت تارِ نفس ہو جائیگا

حجابِ یار کی کیفیتیں ہم کو دکھاتا ہے
رگوں میں منہ چھپا لینا حیا سے نوکِ نشتر کا

تیرے رخ کے سامنے شرما کے اے شعلہ مزاج
رکھ لیا ہے منہ پہ دامن شمع نے گلگیر کا

پاؤں باہر خانۂ زنداں سے رکھ سکتے نہیں
دیدۂ زنجیر رہتا ہے نگہبان آجکل

فصل گل ہے ہر طرف شیشے ہیں لبریز شراب
زاہد ہے رخصت توبہ کا ساماں آجکل

ڈرتے ڈرتے غضب تمہارے سامنے آتے ہیں ہم
ہوش کہتے ہیں "خدا حافظ" ہے لو جاتے ہیں ہم

جو آئے جی میں وہ ہم پر کرو ظلم
ہم اپنا دل تمہارا کر چکے ہیں

زمین کوئے جاناں سی بڑھا کر صحبتیں اپنی
شگفتہ دیدہ و دانستہ ہم برباد ہوتے ہیں

رائگاں کی مفت ہم نے عمر اپنی کیا کہیں۔
نالہ بے سود ہیں فریاد بے تاثیر ہیں

آتشِ غم سے اگر دو دِ جگر پیدا کریں
آسماں ایک اور ہم بالائے سر پیدا کریں

بیجا مصیبتوں کی شکایت بجا نہیں
کیا دخل ہے مشیّتِ پروردگار میں

رنجِ تنہائی نہ ہوگا شامِ غربت میں مجھے
ساتھ میرے جائیگی مجھ بے وطن کی آرزو

یہ کس گل پیرہن کا اشتیاق آمد آمد ہے
کہ رشک افزائے گلشن ہوگیا ہے اپنا کاشانہ

بگاڑا دورِ گردوں نے مرے سامان راحت کو
صراحی ہے نہ ساغر ہے نہ شیشہ ہے نہ پیمانہ

نہ شرماؤ آنکھیں اٹھا کر تو دیکھو
ملاقات ہے ہم سے تم سے کبھی کی

یہ سمجھا ہوں زندگی دودِ چراغِ کشتہ ہے
میری ہستی صورتِ بودِ چراغِ کشتہ ہے

نور ہو چشمِ حقیقت میں تو دیکھے شوق سے
جلوۂ ذاتِ مقدس اختراعِ جلوہ ہے

وہ صبر حق نے دیا ہے کہ ظلم اٹھانے پر
بجائے شکوہ لبوں سے مرے دعا نکلے

شگفتہ **شگفتہ** :- مرزا سیف علی بہادر خلف الرشید نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ مرحوم صوبہ دار اودھ۔ یہ چند اشعار آپ کے درج کئے جاتے ہیں ؎

بوسہ لینے ہوئے ہم دیکھو ادب کرتے ہیں
گالیاں دیتے ہیں یہ آپ غضب کرتے ہیں

خرامِ ناز ترا بس مری نظر میں رہا
تمام عمر ہی بیٹھا میں رہگذر میں رہا

آنکھیں چراکے شب وہ بہانے سے اٹھ گیا
حرفِ مروّت آہ زمانے سے اٹھ گیا

شگفتہ **شگفتہ** :- منشی سیّد محمد رضی شاگرد جناب فاخر لکھنوی۔ زبان صاف معاملہ بندی میں مہارت ہے۔ یہ کلام کا نمونہ ہے ؎

مزارِ یکساں کہتے ہیں سکن ہیں بلاؤں کے
پریشاں کرکے بالوں کو نہ تم ہرگز ادھر جانا

کریں کس کس کے پرانے کی کوشش وہ ہیں انساں
غضب ہے ایک دل میں لاکھوں ارمانوں کا بھر جانا

مرے آنے سے تم محفل میں کیوں اتنا ڈرے برہم
جہاں پر شمع ہوتی ہے وہیں پروانہ ہوتا ہے

مبارک ہو کہ مشہد میں بھی باقی ہے وہی وحشت
کفن کی دھجیاں لیکر ترا دیوانہ آتا ہے

شگفتہ **شگفتہ** :- بدھ سنگھ قوم کھتری دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاہ عالم ثانی کا

زمانہ پایا۔ بھورے خاں آشفتہ کے شاگرد تھے۔ ایک شعر دستیاب ہوا۔ جو درج کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سخن گوئی میں مذاق سلیم تھا ؎

ٹوٹے پڑے ہیں ساغر ٹکڑے گلابیاں ہیں	ساقی کے میکدے میں یہ بد شرابیاں ہیں

شمس

شمس:۔ سید صغیر حسن زیدی الواسطی ساکن دہلی مالک یوسفی پریس طرز قدیم کی پابندی میں اچھا کلام ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

رات بھر اک اثر بادۂ سرجوش رہا	سونگھتے ہی ترے بالوں کی کسے ہوش رہا
میرے اعمال اُٹھائے لئے پھرتے ہیں ملک	میں گنہ کرکے بھی دنیا میں سبکدوش رہا
جھینپتے کیوں ہو ذرا آنکھ ملاؤ تو سہی	میں ہی تو رات کو دشمن سے ہم آغوش رہا
ٹکنے کہیں نہ دے گا تلوّن مزاج کا	سوزن کی طرح سینکڑوں ہی گھر بنائینگے
شمس یہ جان لو اُردو کا ستارا چمکا	چند دن اور جو دِلّی میں یہی جوش رہا

شمس

شمس:۔ نواب زادہ سید شمس الحسن خان بی اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ) فرزند نواب صفی الدّولہ حسام الملک شمس العلما سید علی حسن خاں بہادر آپکی ولادت بروز جمعہ نوزدہم [19] صفر ۱۳۲۲ھ ہجری مطابق ششم مئی ۱۹۰۴ء بمقام لکھنؤ ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں بمقام علیگڑھ یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۰ء میں بمقام لکھنؤ ایل ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ نواب زادہ موصوف نہایت ذہین ہوشمند خوش مزاج اور علم دوست ہیں فضائلِ اخلاق سے مزیّن ہیں۔ آپ کے احباب کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ آپ کو ذوق شعر و سخن اور فنِ لطیف ادب سے ایک خاص طبعی اور فطری مناسبت ہے اور آپ کو جناب علی سکندر جگر صاحب مراد آبادی سے شرف تلمذ حاصل ہے حضرت شمس کی طبع وقاد اور جناب جگر سے مشورۂ سخن سونے پر سہاگہ۔ تخیل کی بلندی اور زبان کی فصاحت قابلِ تحسین ہے۔ آپ کا کلام نئے طرز کی عاشقانہ غزل کا ایک بہترین نمونہ۔ قوّتِ تالیف اور ندرتِ بیان آپ کا

حصہ ہے۔ اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

حد سے بڑھا جو اضطرابِ جوششِ انتظار میں / عشق نے جان ڈال دی بڑھ کے خیالِ یار میں
آج کچھ اس طرح سے ہے عشق کی روح موجزن / جیسے ہو ساری کائنات میری ہی اختیار میں
اب یہ حجابِ ناز کیوں اب تو اٹھا حجابِ ناز / روح سمٹ کے آگئی دیدۂ انتظار میں
حسن حیا سرشت ہے لب پہ ہو ذکرِ یار کیوں / عشق ادا شناس ہے پھر وہ ہو آشکار کیوں
عشق حریفِ حسن ہے حسن حریفِ عشق ہے / کوششِ اعتماد کیا کاوشِ اعتبار کیوں
غم ہے انیسِ زندگی غم ہے رفیقِ زندگی / غم ہے شریکِ زندگی کوئی ہو غمگسار کیوں
کاوشِ عشق ہی میں ہے شورشِ زندگی کا لطف / عشق ستم شناس ہے عشق ہو کامگار کیوں
میری نگاہِ شوق سے نیم نگاہیاں یہ کیا / میں ہوں گناہگارِ عشق حسن ہو شرمسار کیوں
آ اے خیالِ جاناں تجھ سے ہی لو لگائیں / کچھ تو ہمیں سنائے کچھ ہم تجھے سنائیں
یاد آ رہی ہیں اُن کی بھولی ہوئی جفائیں / شرمندہ کر رہی ہیں مجھ کو میری وفائیں
ہشیار جان و دل کے بیتاب کرنے والے / تجھ سی بھی کر رہی ہیں چشمک تری ادائیں
اب ہر نظر سے تیری مجبور بیقراری / اس دل سے مل چلی ہیں کچھ کچھ تری ادائیں
یہ حسن منفعل ہے سر تا پا عرق عرق / اے سوزِ عشق کچھ تجھے غیرت ہے یا نہیں
ہیں پیکرِ گناہ ہمی بابِ معصیت / تیرا کرم بھی عین حقیقت ہے یا نہیں
رنگینیٔ جمال نے کھویا ہے شمس کو / اس بیخودی میں شانِ عبادت ہے یا نہیں
خود حسن ہر اک شے میں دیکھتا ہوں میں / تجلیوں کی کشاکش میں کھو گیا ہوں میں
مرا وجود عدم ہے مرا عدم ہے وجود / نہیں ہوں اور ہر اک شے سے رونما ہوں میں
خبر نہیں نغمۂ درد تیری ہستی میں / جو ساز غم سے نکلتی ہے وہ صدا ہوں میں
مرا وجود انا ہے سبب انقلاب و شش / تغیرات جہاں کا اک آئینہ ہوں میں
نہ جانے کہ ساحلِ غم سے نجات مطلق ہے / خوشا کہ ذوقِ غربت میں ڈوبتا ہوں میں

نہ پوچھ جوششِ تحیّر کی جلوہ سامانی — جو حسن نے نہیں دیکھا وہ دیکھتا ہوں میں
سمجھ سکیگا کوئی کیا مری حقیقت کو — خود اپنے وہم و تصوّر سے ماورا ہوں میں

آنکھوں سے راہ رو منزل نہاں ہے اب — ہر ہر قدم پہ دل کا مرے امتحاں ہے اب
یوں شعلہ بار گرمی سوزِ نہاں ہے اب — جو سانس آرہی ہے وہ برق تپاں ہے اب

ہائے وہ پہلی ملاقات کی بیگانہ روش — کاش ہوتی یہ ہے ایسی ہی ملاقات نئی
ہر طرف رحمتیں بیتاب نظر آتی ہیں — مل رہی ہے یہ گناہوں کی مکافات نئی
اسکے سو جلووں میں ہر جلوہ ہے محشر بکنار — خوش ہوائے عشق کہ ہر دن ہے نیا رات نئی
شمسؔ کچھ خیر تو ہے رات گزاری کیونکر — آج آنکھوں میں ترے پاتا ہوں اِک بات نئی

مرا حال مجھ سے بیاں ہو رہا ہے — عجب طرح سے امتحاں ہو رہا ہے
انہوں نے اٹھا بھی دئے کب کے پردے — میرا عشق ہی درمیاں ہو رہا ہے
جو چبھتا تھا رگ رگ میں نشتر کی صورت — وہی درد آرام جاں ہو رہا ہے

ترا جلوہ زمیں سے آسماں تک — تو ہی تو ہے نظر جائے جہاں تک
بڑھی ہے بدحواسی اب یہاں تک — پلٹ آتا ہوں میں جاکر وہاں تک
اُٹھا دے پردۂ ہستی اٹھا دے — یہ سب جھگڑے فقط ہیں جسم و جاں تک
ہمیں بھی دیکھنا ہے اے شبِ غم — ستم ڈھاتی ہے تو بڑھکر کہاں تک

شمس

شمس ۔ ابو القاسم محمد شمسؔ ۔ آپ خان بہادر مولوی عبد الغفور خاں نسّاخ مرحوم صدر الصدور بنگالہ مصنّف تذکرہ سخن شعرا کے خلف الرّشید ہیں ۔ آپ کی ولادت ۱۲۸۴ھ میں ہوئی ۔ مظہر الحق اسم تاریخی ہے ۔ آپ کے خاندان کے بہت سے افراد اعلےٰ اور معزز سرکاری عہدوں پہ مامور رہتے آئے ہیں ۔ آپ کے چچا آنریبل مولوی عبد اللطیف خاں بنگالہ میں اہل اسلام کے موقر لیڈر سمجھے جاتے تھے ۔

حضرت شمسؔ کو صغیر سنی ہی سے شاعری کا شوق تھا ۔ انفراغِ تعلیم کے بعد

کسی سے اصلاح سخن لئے بغیر صرف اپنی ذاتی کوشش سے اس فنِ شریف میں کافی استعداد پیدا کر لی تھی۔ پھر کچھ دنوں اپنے قابل باپ کے شاگردِ رشید حضرت انسخ مرحوم سے مشورہ کرتے رہے۔ اس کے بعد اپنے والد کی تحریک سے فصیح الملک مرزا داغ سے تلمذ اختیار کیا جنہوں نے فنِ سخن کے رموز و نکات سے انہیں واقف کر دیا۔ ان کے ممتاز تلامذہ میں خان بہادر مولوی رضا علی صاحب وحشت کا نام مشہور ہے۔ اُستاد کے لیے ان کا تلمذ باعث فخر کہا جا سکتا ہے۔ شمس انگریزی وضع کے دلدادہ آزاد منش اور رند مشرب تھے۔ مگر فقرا اور اہل اللہ کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ان کا مشرب صلح کل تھا۔ انکی طبیعت فطری طور پر شاعری کے مناسب واقع ہوئی تھی۔ زبان پر اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ مضمون میں شوخی اور متانت کی گھلاوٹ ہے۔ جرأت کا مذاق شاعری انہیں بہت پسند تھا۔ پُرگو اور زُود گو بھی تھے۔ اپنے شباب کے زمانہ میں دہلی بھی آئے اور عرصہ تک مقیم رہے تھے۔ داغ۔ مجروح اور رشکی کے مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں بھی پڑھیں۔ غزل پڑھنے کا انداز بہت دلکش تھا مؤلف سے دو تین بار کلکتہ میں ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں بے مہری زمانہ سے بہت بیدل تھے۔

۱۹۰۵ء میں بنگالہ کا یہ آفتاب سخن غروب ہوا۔ عبد الحکیم صاحب نشتر نے یہ تاریخ لکھی۔ شمس نامی تھے فخر بنگالہ۔ (۱۹۰۵ء)

ان کے کلام کا مختصر مجموعہ مولوی بدر الزمان صاحب بدر ایڈیٹر رسالہ شمس کلکتہ نے اپنے پرچہ میں شائع کیا تھا۔ اسی سے انتخاب کر کے نذر ناظرین ہوتا ہے

کہے کوئی جی لگائے کوئی کسی کو دکھ بڑھائے کوئی
سنے کوئی اور سنائے کوئی یہی تو ہے لطف داستاں کا

تو مدتوں تک اسی بار رفا صد نہ ایسی باتیں بگھار قاصد
کہیں گے ہم لا کے یار قاصد یہ مہرباں ہیں وہ بدگماں کا

نہیں ہے مطلق ثبات ہستی حباب آسا ہے زیست اپنی
دلیل ہے منزل عدم کی ہر اک نشاں پائے رفتگاں کا

ہُوا جو تعلیم کا اثر کچھ کیا نہ جز عشق عمر بھر کچھ — پڑھا لڑکپن میں شمس اگر کچھ تو پانچواں باب گلستاں کا

ہم اور شکوۂ غم ہجراں غلط غلط — افسوس ہے کہ آپکا ایسا خیال ہے

قفس کے لطف گھر میں آ رہے ہیں — گھٹا جاتا ہے دم گھبرا رہے ہیں

مرے ارماں نکلنا چاہتے ہیں — ہجوم یاس سے گھبرا رہے ہیں

نہ ہو کیوں اعتبار عہد و پیماں — عدو کے سر کی قسمیں کھا رہے ہیں

گنہ ہیں نے کیا مے پی جو واعظ — کھڑے پھر آپ کیوں للچا رہے ہیں۔

سُنا ہے وزن در اُنکو ناپسند ہُوا — کبھی کبھی کا مرا دیکھنا بھی بند ہُوا

جبیں پر بل ہے غصہ آنکھ میں ہے تن کی بیٹھے ہیں — مری بگڑی ہوئی تقدیر گویا بن کے بیٹھے ہیں

مزے کی چھیڑ ہے کہتے ہیں وہ پہلو سے اُٹھ جاؤ — اٹھوں کیونکر کہ وہ اوپر مرے دامن کی بیٹھے ہیں

اٹھا سکتا نہیں کوئی بھی صدقے ناتوانی کے — کسی کی بزم میں ہم آج لاکھوں من کی بیٹھے ہیں

نہ چھیڑو تذکرہ وصل عدو کا پھر وہ بگڑ بیٹھیں گے — ابھی وہ شمس کن کن منتوں سے من کے بیٹھے ہیں

واعظ کو آج ہم سر منبر پلائیں گے — اچھی شراب چاہئے اُونچی دُکان کی

کوچۂ جاناں میں جانا روز کا اچھا نہیں — شمس سر پیٹو گے جب وہ بدگماں ہو جائیگا

اسکی گلی میں مجکو شمس حزیں ملا تھا — تھی جمع اک خدائی بیچارہ رو رہا تھا

ہجر بتاں میں زندگی و موت ایک ہے — جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں ہم ایسے شخص ہیں

ہمدم و مونس و غمخوار نہیں کوئی مرا — (بند) — غمگسار اور مددگار نہیں کوئی مرا

میں ہوں وہ جنس خریدار نہیں کوئی مرا — مر بھی جاؤں تو عزادار نہیں کوئی مرا

غوث اعظم بمن بے سر و ساماں مددے
قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے

سفر کشور بغداد کی اب ہے تقریب — لطف فرمائیں اگر آپ تو ہو جائے قریب

آپ کا روضہ ہے امید گہ شاہ و غریب — ایسی درگاہ کی اے کاش نہ یارت ہو نصیب

غوث اعظم بمن بے سر و ساماں مددے
قبلہ دیں مددے کعبہ ایماں مددے

شمس

شمس :- مشیر علی خاں۔ والد کا نام باقر علی خاں اور دادا کا نام حبیب شاہ خاں ہے۔ آپ ۱۹۰۴ء میں رامپور میں پیدا ہوئے۔ اردو۔ فارسی کی ضروری تعلیم پائی ہے۔ کتب بینی کا بہت شوق ہے۔ آپ کے اعزا ریاست میں معزز عہدوں پر سرفراز رہے ہیں۔ آپ خود بھی روہیلکھنڈ میں ایک ممتاز زمیندار ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

ناخن وحشت سلامت چاہیئے اے چارہ گر
دیکھنا کیا ہے جو زخم عشق اچھا ہو گیا

کچھ نہ دیکھا جلوہ گاہ ناز میں رنگ جمال
پردہ دار حسن خود آنکھوں کا پردہ ہو گیا

پوچھو نہ مجھ سے دل کی تباہی کا ماجرا
برباد ہو کسی کا نہ یوں گھر بھرا ہوا

کیا پوچھتے ہو شمس دل زار کا پتہ
مدت ہوئی فدائے فریب وفا ہوا

کھنچ گیا آنکھ میں نقشہ تری رعنائی کا
آج کچھ اور ہی عالم ہے تماشائی کا

اور کچھ دیر کا مہماں ہے بیمار فراق
اور باقی ہے فسانہ شب تنہائی کا

ہم جانتے ہیں کعبۂ حسن ازل جسے
وہ دل حریم جلوۂ ناز بتاں ہے اب

وہ دل کہ جو فریب ترحم سے تھا غنی
ممنون بے نیازی چشم بتاں ہے اب

صحت ہے مجھے کثرت آزار محبت
جائے نہ الٰہی خلش خار محبت

اچھا ہی کیا تکلیف عیادت نہ اٹھائیں
اب لائق پرسش نہیں بیمار محبت

اسی انداز سے پھر دیکھ لے او دشمن راحت
ابھی احساس کچھ کچھ ہے دل آشفتہ ساماں کو

دبا سکتا ہوں میں جذبات بیتابی بہرصورت
چھپا سکتا نہیں بے ربطی چاک گریباں کو

تصور اور ان کافر نگاہوں کا ارے توبہ
کوئی دل ڈھونڈتا ہے ورنہ ہے کوئی ایماں کو

ترقی کر رہی ہیں دمبدم بیتابیاں دل کی
دعائیں دے رہا ہوں چارہ ساز درد پنہاں کا

مبارک شوق قتل عاشقاں لیکن یہ سن لیجے
ابھی دیکھا نہیں ہے آپ نے خون شہیداں کو

کبھی ہمراز تھی خوشی دل کی
اب ہے غمخوار بیکسی دل کی
بندہ پرور خطا معاف مری
آپ نے خوب قدر کی دل کی

یہ زخم وہ نہیں ہے کہ مرہم ہو کارگر
یہ درد وہ نہیں کہ مداوا کرے کوئی

قاتل کو وقت ذبح تردّد ہے کس لئے
کیا حوصلہ کہ خون کا دعویٰ کرے کوئی

چاہتے ہیں کہ بڑھے شہرت خودداری حُسن
اہتمام نگہ شوق ہے پروا کیا ہے

بڑھ رہی ہے خلش دردِ محبت اے شمس
بیٹھا جاتا ہے دل زار یہ نقشہ کیا ہے

ضبط غم کیجیے تو فرماتے ہیں ہم کو کیا خبر
کچھ اگر کہئے تو آئینِ وفا سے دُور ہے

نالہ و فریاد گو عنوان بدنامی سہی
کاش اِتنا تو سمجھ لیتے کوئی معذور ہے

لُٹ گئے وہ دِل جو کبھی تھا مایۂ صبر و سکوں
گوشہ گوشہ اب اُسی کا درد سے معمور ہے

دیکھنا ہو جسے نخوت کی مکمل تصویر
آئینہ خانہ میں انداز تمہارا دیکھے

پردہ داری کی یہ صورت کہ نظر بھی نہ اُٹھے
خود نمائی کا وہ عالم کہ زمانہ دیکھے

شمس حکیم

شمس :- حکیم خورشید حسن باشندہ سہارنپور۔ کئی رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ تلمذ کا حال معلوم نہیں۔ آپ کے ایک شاگرد محمد یعقوب نے انتخاب کلام بھیجا تھا۔ اشعارِ ذیل ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں :-

سورج ڈوبا شام ہوئی ہے دُنیا نے آرام کیا
شمع جلی پروانے آئے سوز جگر نے کام کیا

زُلفِ پیچاں کی اسیروں کا نہ ذوق دید پوچھ
آنکھ پیدا کر کے چھوڑی حلقۂ زنجیر نے

شمس سے کچھ پوچھئے مت حضرتِ انساں کا حال
خاک کو رسوا کیا ہے جسم کی تعمیر نے

شہیدِ ناز کی تربت پہ بھی کچھ رنگ جم جائے
چراغ قبر روشن کرتے جانا شمع محفل سے

شمس

شمس :- مرزا اکبر علی۔ باشندہ لکھنؤ شاگرد حضرت دانش لکھنوی اوسط درجہ کا کلام ہے۔ دو شعر درج کئے جاتے ہیں :-

حرص بھی حد سے سوا سم ہے بشر کے حق میں
زہر ہوتا ہے اگر رزق بھی کھا جائے بہت

کشتۂ تیغ نگہ ہوں تو ہو راحت دل کو ۔ نیمجاں کر کے نہ قاتل ہمیں تڑپائے بہت

شمس

شمس: میر آغا علی شمس لکھنوی خلف میر محمد مہدی ثاقب قاضی محمد صادق خاں اختر ارشد تلامذہ میرزا قتیل مرحوم کے سلسلۂ تلمذ میں داخل تھے۔ دیانت الدولہ بہادر مصاحب حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کے رفقا میں ممتاز تھے پری رخان معانی کی تسخیر کے سوا شاہدان خوش جمال کو اپنے بس میں کر لیتے۔ معاملہ بندی سے ایسا لگاؤ تھا کہ مرتے دم تک حسن و عشق کی دنیا میں رہے۔ جن مہوشان عشوہ طراز نے خدائی بھر کو اپنا ناز بردار بنایا ان سے اپنی نعش اٹھوا کر چھوڑی۔ آغاز شباب ہی سے بازاری سودا سر میں تھا۔ شعر و سخن کے شوق نے اس جذبہ کو اور بھی مشتعل کر دیا لکھنو کی طوائفوں مشتری و زہرہ کا نام چمکانیوالی اور عالمگیر شہرت کا باعث آپکی اُستادی ہے آغا صاحب کی شاعرانہ اور ادبی کوششوں کا سرمایہ یہ دونوں بہنیں تھیں۔ جنکو آپ نے بڑی محنت سے شاعرہ بنایا تھا۔ اور ان کو ایسا عزیز رکھتے تھے کہ دوسروں کا کلام بھی انکی طرف منسوب کر دیتے تھے چنانچہ بی مشتری کیطرف سے جو فارسی دیوان شائع ہوا ہے۔ اس میں بیش تر حصہ میر غلام علی عشرت بریلوی کے کلام کا ہے۔ دیوان شائع ہونے پر عشرت کے اعزا نے دعویٰ دائر کرنے کا قصد کیا۔ مگر عدالت تک نوبت نہ پہنچی اور فریقین کے باہم فیصلہ ہو گیا۔

جس زمانہ میں برہان قاطع اور قاطع برہان کی بحث کا سلسلہ جاری تھا مرزا غالب کے مخالف لمبے چوڑے رسالے نکال کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے انہیں دنوں میں آپ نے بھی مرزا کے خلاف اخباروں میں زہرہ۔ مشتری کے نام سے مضامین شائع کئے تھے۔ اور مرزا صاحب کی شاعری پر بھی کچھ اعتراضات کئے تھے مگر چاند پر خاک ڈالنے سے کیا ہوتا ہے۔ زہرہ مشتری کیساتھ بسر اوقات کرنے پر معاصرین ان پر چوٹیں کرتے تھے۔ اور یہ انہیں سنکر خاموش ہو جاتے۔ پنڈت کشن لال طالب دہلوی نے کئی قطعے ان کے متعلق کہے ہیں۔ جن میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

بڑی توخیر ہے چھوٹی کھری ہے	شعاعِ شمس زہرہ مشتری ہے

مشتری اور زہرہ کی بہار زندگی ختم ہوجانے کے بعد آپ کانپور چلے گئے تھے ۱۸۹۶ء کے قریب انتقال کیا۔

حضرت شمس عربی فارسی میں صاحب استعداد تھے۔ اور فارسی اور اردو دونو زبانوں میں فکر کرتے تھے۔ چلتی ہوئی طبیعت پائی تھی۔ اگر یہ بازاری کوٹھے چھوڑ کر میدانِ سخن میں اپنا رنگ جماتے تو آج انکے شاگردوں کی تعداد کافی ہوتی۔ اور یہ استاد مانے جاتے۔ مگر افسوس ہے کہ چوک کی اُستادی نے شاعری کے کمالات کو ڈبو دیا۔ اور بزم آرایانِ سخن میں اچھی نگاہ سے نہ دیکھے گئے۔ خدا جانے اپنا مجموعہ کلام کہاں چھوڑا جس قدر اشعار دستیاب ہوئے ہیں درج کئے جاتے ہیں: ؎

کٹی شب یار کی آرائشوں میں
متاعِ عشق ہاتھوں ہاتھ لوٹی

دستِ جاناں میں بڑھی توقیر پشتِ آئینہ
ہنسکے وہ بولے جو بکھرے پیٹھ پر چوٹی کے بال
کیا عجب ہے گر تمہارے دیکھنے کے شوق میں
مُنہ پہ کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ صفائی دیکھ لی
صاف کھل جاتی ہے طینت یوں دلِ صافی کی شمسؔ

نہ کرو بات ادھر دیکھ تو لو
یہ تو فرمائیے کب آئے گا

بشر کا حُسن وہ شے ہے طبیعت آہی جاتی ہے

چھپکے ملنے میں حجاب آتا ہے
میں تو کہتا ہوں جنوں مجھکو ہوا
نہیں قسمت میں نہ ہو ساغر مے

سحر تک زلف بگڑا کی بنا کی
بندھی مٹھی کھلی قسمت حنا کی

مثلِ روئے شمس ہے تنویر پشتِ آئینہ
دیکھ کر دیکھی نہ ہو زنجیر پشتِ آئینہ
پھوٹ نکلے اس طرف تصویر پشتِ آئینہ
رُخ کے آگے گرد ہے تنویر پشتِ آئینہ
مُنہ پہ آئے جس طرح تقریر پشتِ آئینہ

نہیں اُلفت تو مروّت ہی سہی
تو خوشی آپ کی رخصت ہی سہی

دُعاؤں سے نہیں رُکتی یہ آفت آہی جاتی ہے

نہیں خلوت ہے تو جلوت ہی سہی
تیرے کہنے سے محبت ہی سہی
پیرِ میخانہ کی خدمت ہی سہی

شمس

شمس منشی ابوالفضل محمد تصدق حسین صاحب خلف منشی امیر خاں صاحب سب انسپکٹر پولیس ساکن بیگم گنج لکھنؤ۔ ۱۸۸۶ء سال پیدائش ہے حضرت رعب شاہ آبادی سے فنِ عروض پڑھا۔ اور نامور شعراء مثل جلال۔ تسلیم۔ انجم اور رجا وید سے فیضِ صحبت حاصل کیا۔ پھر حضرت رضا مرحوم شاگرد جناب امیر احمد مینائی سے تلمذ اختیار کیا۔ بقدر ضرورت علم موسیقی سے بھی واقفیت ہے زبان میں لوچ بیان میں لطف ہے طبیعت مزید ارپائی ہے۔ پڑھنے کا انداز بھی دلکش ہے کچھ عرصہ راجہ اشفاق علی خاں تعلقہ دار کھیری کے پاس رہے پھر رسالہ میزان اور لطیف کے ایڈیٹر رہے انجام کار دلگداز کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ یہ کلام ان کا ہے:۔

ہائے تنہائیِ لیلیٰ کی خبر دے کوئی
ساتھ مجنوں کے تو اک غول بیابانی ہے

توڑ پھولوں کو نہ آغازِ نمو میں گلچیں۔
رنگ بڑھتی ہوئی کلیوں کا ابھی دھانی ہے

کہوں کیوں کر سوا اے شمس حالِ دردِ دل لکھوں
نہ اس لائق زباں میری نہ اس قابل قلم میرا

ابھی کم سن ہیں کیا جانیں وہ کیا شئے ہے دغا دینا
جوانی آ کے سکھلائیگی ان کو دل دکھا دینا

اگر پوچھے وہ قاصد تجھ سے میری خانہ بربادی
ہتھیلی پر اُٹھا کر خاک رکھنا اور اڑا دینا

یہاں بجلی گری مجھ پر وہاں موسیٰ کو غش آیا
بہت کچھ رنگ لایا شمس ان کا مسکرا دینا

کبھی ناز و نکی چھریاں ہیں کبھی غمزوں کے بھالے ہیں
کسی دل نے دکھانے کیلئے پہلو نکالے ہیں

بتائیں کیا کہ کیوں ہم سینۂ پر غم سنبھالے ہیں
کچھ ابھی آپکے ارمان ہیں کچھ دل کے چھالے ہیں

یہ کہکر ہجر میں دن بھر دلِ مضطر کو سمجھایا
نہ گھبرا دیکھ وہ شام آئی۔ اب وہ آنیوالے ہیں

کہاں وہ ولولے دل کے کہاں یہ جوشِ ناکامی
محبت کا یہ پھل پایا کہ اب جینے کے لالے ہیں

مزے ناکامیِ تقدیر کے پوچھو مرے دل سے
کہ منزل پر پہنچکر بھی رہا میں دور منزل سے

ستارے جھلملائے بجھ گئیں شمعیں سحر آئی
اُٹھے سب عیش کے ساماں تم اٹھے جو محفل سے

سفر کی کلفتیں بھی حسرت افزائے تماشا ہیں
ہمیں یاد آ گیا مٹنا جو اٹھی گرد منزل سے

نہیں معلوم کیا لے قیدیِ غم ہونیوالا ہے
کہ دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے آوازِ سلاسل سے

پرساں ہے کون کشتۂ گیسوئے یار کا
روتا ہے بیکسی پہ اندھیرا مزار کا

آتا ہے گر تو آؤ کہ ہوتی ہے آنکھ بند
بجھتا ہے اب چراغ شبِ انتظار کا

جہاں کا درد ہر دل میں زمانے سے تعلق ہے
چلے خنجر کسی پر خون دیتا ہے گلا میرا

کہا ہے جب سے قاتل روز خنجر لیکے آتے ہیں
ذرا سی بات کہکر مول لے لی دشمنی میں نے

جی میں آتا ہے کہ ہاتھوں کی بلائیں لیلوں
اس ادا سے مرے مرنے کی دعا کرتے ہیں

نہ کام آتی ہیں آہیں نہ اب دعا میری
بتوں کے سامنے سنتا نہیں خدا میری

شمس

شمس:۔ بابو کنھیا لال۔ متوطن فرخ آباد۔ شاگرد جناب شیدا فرخ آبادی کلام اور حالات زیادہ نہ ملے۔ مندرجہ ذیل شعر بطور نمونہ درج ہیں:۔

تصویر یار آتی ہے ہر دم ہمیں نظر
نقشہ یہ دل کے چوکھٹے میں کون جڑ گیا

مجذوب بھی حیران ہیں سالک بھی پریشان
کیا راز خدا آئے بھلا عقل بشر میں

اس طرح سے کوئی پے تفریح چلا ہے
ہے تیر و کماں ہاتھ میں خنجر ہے کمر میں

شمس

شمس:۔ منشی شمس الدین صاحب۔ باشندہ فرخ آباد شاگرد حضرت طاہر فرخ آبادی آپ عرصہ تک مطبع رحیمی قنوج میں کاتب رہے۔ گلدستۂ پیامِ عاشق بھی آپ ہی لکھا کرتے تھے۔ زبان صاف بندشیں چست ہوتی ہیں۔ تلاش اچھی ہے۔ کلام یہ ہے:۔

تصور نوکِ مژگاں کا رہا اے جانِ جاں برسوں
چبھا کیں سینۂ و دل پر ہمارے برچھیاں برسوں

جفاؤں کی شکایت پر بگڑ کر مجھ سے فرمایا
جو چاہیگا وہ جھیلیگا ہماری سختیاں برسوں

رخ گلرنگ پر اس کے نہیں سبزے کی نمود
خضر آئے ہیں ہوا کھانے کو گلزاروں میں

روزِ فرقت جو چمکتا ہے مرا داغ جگر
دھوپ سایہ کیطرح چھپتی ہے دیواروں میں

خیرہ ہوتی ہے نظر دیکھ کے جلوہ اے شمس
روشنی برق کی ہے یار کے رخساروں میں

شمس

شمس:۔ منشی سید ظہیر الدین صاحب ساکن شیر گھاٹی محلہ شمالی ضلع گیا (صوبۂ بہار) ۱۲۸۱ھ سال ولادت ہے۔ فارسی اردو کے درسیات اپنے مکان پر پڑھنے کے بعد سیاحت

کا شوق دامنگیر ہوا۔ کلکتہ رنگون وغیرہ مختلف مقامات میں رہے ہے۔ شعر و سخن کے علاوہ فنِ سپاہگری میں خاص مہارت رکھتے ہیں جوان رعنا ذہین و خوش فکر ہیں۔ اردو نثر کی تحریروں میں آپکی ڈراما نویسی بھی قابل قدر ہے۔ کئی ڈرامے لکھے ہیں۔ فنِ نقاشی اور مختلف قسم کے خطوط صنعتی لکھنے میں خاص مہارت ہے۔ اوائل عمری سے شاعری کا مذاق ہے۔ مولانا شفق عماد پوری کو اپنا کلام دکھاتے ہیں اور انکے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:؎

یہ پوچھا جب شبِ وعدہ کہ دل بھی دل سے ملتا ہے ۔۔۔ وہ بول اٹھے کہ ملتا ہے مگر مشکل سے ملتا ہے
بڑا ہمدرد نکلا ناوکِ پیکاں ترا قاتل ۔۔۔ کہ جب آتا ہے پہلو میں تو آکر دل سے ملتا ہے
شبِ فرقت قضا مہمان ہو جاتی تو اچھا تھا ۔۔۔ یہ مشکل مر کے بھی آسان ہو جاتی تو اچھا تھا
مٹانا تھا مٹا کر پھر مجھے برباد کرنا تھا ۔۔۔ ستم ایسی طرح اے چرخ بے بنیاد کرنا تھا
کدھر تم چل دیئے اے رہروانِ منزلِ ہستی ۔۔۔ مسافر ہوں مجھے بھی اس سفر میں یاد کرنا تھا
نہ آئی نیند مجھ کو دیدۂ بیدار کی صورت ۔۔۔ پھری آنکھوں میں پتلی بنکے شب بھر یار کی صورت
دیکھ لوں خواب میں اس یوسفِ ثانی کو اگر ۔۔۔ نیند سے جاگ اٹھوں بخت زلیخا ہو کر
جب کلیسا کو گئے خانۂ کعبہ سے گئے ۔۔۔ شمس جب کعبہ میں آئے تو کلیسا ہو کر
ہزاروں قافلے بھٹکے ہیں میدانِ محبت میں ۔۔۔ جنابِ خضر بھی داخل ہیں یارانِ طریقت میں
فلک پہ جا کے پھر آتی ہے کیوں آہِ رسا میری ۔۔۔ لگے ہیں قفل شاید ان دنوں بابِ اجابت میں
عدم کی فکر میں آئے ہیں جانبِ ہستی ۔۔۔ سفر کی راہ نکالی ہے ہم نے گھر کیلئے

شمس ۔ چودھری شمس الدین خلف چودھری بشیر الدین رئیس سندیلہ ضلع ہردوئی بلازمت پیشہ ہیں۔ انکے نانا مولوی حکیم الدین صاحب مرحوم مشقِ سخن میں مہم اور سخن سنج تھے۔ رسمی تعلیم سے انفراغ کر کے شعر گوئی کیطرف توجہ کی اپنے برادر نسبتی مولوی سید نذیر حسن صاحب فتنہ سندیلوی سے اس فن کی تعلیم حاصل کی اور روز بروز طبیعت دکھلانے لگے۔ کلام سے مشاقی ظاہر ہوتی ہے زبان صاف اور محاورات پاکیزہ لکھتے ہیں مضمون آفرینی کیطرف توجہ کم ہے کلام کا انتخاب یہ ہے:

بُت سمجھ کر ہیں جنہیں ہوگیا کافر یارب
اَب وُہی ضد سے مُسلمان ہوئے جاتے ہیں

وصل میں پوچھ رہے ہیں مرے دلکی حسرت
جانتے ہیں مگر انجان ہوئے جاتے ہیں

مُردے اٹھتے ہیں مزاروں سے جو چلّاتا ہوں میں
ہے اثر صورِ قیامت کا مری فریاد میں

ہوگیا باہم یہ پیدا اتحادِ حسن و عشق
ہم ہیں انکی یاد میں وہ ہیں ہماری یاد میں

روٹھ کر مجھ سے مری جان کہاں جاتا ہے
جانے والے ترے قربان کہاں جاتا ہے

دیکھ او تیر نگاہ غلط انداز اِدھر
مُنہ اٹھائے ہوئے نادان کہاں جاتا ہے

شمس

شمس:۔ حاجی خواجہ احمد بریلوی شاگرد حضرت ہوش عرصہ ہوا کہ انتقال ہوگیا۔ بریلی کے نامی کتب فروشوں میں تھے۔ شاعری سے ذوق تھا۔ کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے۔ یہ کلام کا نمونہ ہے:ے

نالۂ قیس حزیں میں کچھ اگر تاثیر ہو
زلف لیلیٰ بڑھ کے اسکے پاؤں کی زنجیر ہو

کیا کہیں جو اس اذیت میں ہیں پنہاں لذتیں
سو گنہ کیجے جو اس کے ہاتھ سے تعزیر ہو

شمس

شمس:۔ منشی محمد علی خاں عرف ننھے صاحب شاگرد دوست علی خلیل کلام پختہ ہوتا تھا۔ زبان صاف تھی۔ یہ انتخاب ہے:ے

ترا جمال جو پیشِ نظر نہیں رکھتے
وہ مثل دیدۂ تر کے بصر نہیں رکھتے

صبا پیام یہ کہنا مری طرف سے اُسے
تم اپنے بیخبروں کی خبر نہیں رکھتے

کیا ہے حسن جوانی نے یہ انھیں بدمست
ہماری کیا کہ وہ اپنی خبر نہیں رکھتے

نظیر تا نظر آئے نہ اپنی صورت کا
وہ آئینہ کو بھی پیش نظر نہیں رکھتے

شمس

شمس:۔ منشی محمد شمس الدّین صاحب خوشنویس لکھنوی شاگرد خواجہ محمد مرتضیٰ خاں بہادر بقا لکھنوی۔ مطبع سرکاری بک ڈپو لاہور میں مدتوں مؤلف تذکرہ ہذا کے غمخوار رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب کے ماتحت کام کرتے رہے۔ متعدد قطعے ان کے ہاتھ کے موجود ہیں۔ بعد کو لکھنؤ جاکر مطبع نولکشور میں ہیڈ خوشنویس

رہے۔ تمام شمالی ہندوستان میں ان کی فنِ خطاطی کی مہارت اور نستعلیق کتابت کی شہرت تھی۔ فنِ سخن میں بھی مشق تھی۔ ذہن کی رسائی مضامین سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اسّی برس سے زائد عمر پاکر انتقال کیا۔ یہ ان کا کلام ہے۔ ؎

عینِ ایماں نام ہے اے جاں اگر اقرار کا　　کفرِ مطلق پھر لقب بے شبہ ہے انکار کا
دانہ ہائے سبحہ سے لیکر امامِ سبحہ تک　　سلسلہ دوڑا ہوا ہے رشتۂ زنّار کا
حضرتِ استاد تو ہیں آسمانِ شاعری　　شمسؔ میں ہوں کیوں نہ ہو شہرہ مرے استاد کا

شمسی (حاشیہ)

شمسی:۔ سید شمس الحق صاحب وکیل عدالتہائے رامپور شاگرد جناب رازؔ و رساؔ۔ بندشیں سلجھی ہوئی۔ زبان میں لذت۔ بیان میں درد ہے۔ کلام یہ ہے

خاک میں مجھکو ملا کر یہ عنایت بھی ہوئی　　کہ مری قبر پہ وہ غیر کو لیکر آیا
فصلِ گل آتے ہی آمد ہوئی ان دونوں کی　　جوشِ دل میں تو مرے پاؤں میں چکر آیا
نہ وہ صورت نہ وہ رنگت نہ وہ حالت نہ وہ ہم　　قہر آیا کہ الٰہی دل مضطر آیا
آتشِ تشنگیٔ حشر جو بھڑکی شمسیؔ　　چھینٹے دینے کے لئے چشمۂ کوثر آیا

شمسی (حاشیہ)

شمسی:۔ محمد متین نام۔ موضع کوٹھیا۔ ضلع اعظم گڑھ میں سنہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی سے ماہر ہیں۔ ملّا اور فاضل کی اسناد حاصل کی ہیں۔ انگریزی سے بھی واقف ہیں۔ فی الحال دیانند اینگلو ویدک ہائی سکول الہ آباد میں ہیڈ مولوی ہیں۔ شعر و شاعری سے طبعی مناسبت ہے۔ کچھ عرصہ سے حضرت نوح ناروی تلمیذ مرزا داغ سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ کلام یہ ہے۔ ؎

ہم صفیرو گلشنِ بیداد سے بچتے ہوئے　　میں تو خوگر ہو گیا بیرحمی صیاد کا
پوچھتے تھے کس عنایت سے وہ غم کی سرگذشت　　ہم نہ کچھ بھی کہہ سکے ان سے برا ہو یاد کا

بلا کا سوز ہے بلبل ترے ترانے میں　　خموش آگ نہ لگ جائے آشیانے میں
کسی کو چین ملا ہوگا اس زمانے میں　　یہاں بہار بھی آئی تو قید خانے میں

کسی کا قصر دل آویز ہے تو ہو شمسی
فقیر مست ہیں اپنے غریب خانے میں

کامل ہے کوئی شعبدہ گر اپنے ہنر میں
ہر ظلم کی تردید ہے معصوم نظر میں

جو قطرہ گرا آنکھ سے دامن میں لہو تھا
کیا جانئے کم بخت یہ کیا گذری سفر میں

کھینچ کھینچ کے جان آنکھوں میں آئی شب فراق
پوچھو نہ مجھ سے کشمکش انتظار کو

ہیں جان سے عزیز یہ وعدہ خلافیاں
ہم نے الٹ دیا ورق اعتبار کو

نہیں اٹھانا میری لاش اٹھیگی کوئے قاتل سے
مقدر میں یہیں کی سرزمیں معلوم ہوتی ہے

سخت جاں ہوں اور دل نازک بہت قاتل کا ہے
المدد شوق شہادت سامنا مشکل کا ہے

کشتۂ بیکس کے پہلو میں پڑی ہے ایک لاش
ہو نہ ہو اے غم یہ چھوٹا سا جنازہ دل کا ہے

مجھ سے ساقی داستان شوق مے نوشی نہ پوچھ
زندگی کا لطف قصہ مختصر شیشہ میں ہے

حادثے عشق میں کچھ ایسے نمایاں ہونگے
نہ تو ہم ہونگے نہ دل ہوگا نہ ارمان ہونگے

آگاہ تو ہونے دو ہمیں چاہ جبیں سے
اقرار سمجھ لیں گے کسی روز نہیں سے

میخانے سے ہے شمسی کو ایک خاص تعلق
بیعت ہے اسے پیر خرابات نشیں سے

شمشاد:- جناب مولانا محمد عبدالاحد صاحب شمشاد لکھنوی۔ آپ مولانا قطب الدین سہالوی کے خاندان سے تھے جن کی اولاد سے لکھنؤ میں فرنگی محل آباد ہے۔ اور مدت سے علوم کا مرکز بنا ہوا ہے۔ آپ کے والد ماجد مولوی عبدالرحیم صاحب اپنے وقت کے نامور علماء میں شمار ہوتے تھے۔ جو غدر کے دنوں میں بحالت نماز مسجد میں شہید ہوئے۔

حضرت شمشاد ۳ صفر ۱۲۶۶ھ کو پیدا ہوئے۔ ۱۴-۱۵ برس کی عمر سے شاعری کا شوق ہوا۔ آفتاب الدولہ خواجہ قلق مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کی شاعری۔ تلمیحات۔ مراعات اور استعارات کا مخزن بنی ہوئی تھی برسوں کے فرسودہ مضامین کو نیا کر کے دکھانا کمالات شاعری میں داخل تھا۔ راقم کی رائے

ہیں آپ کے کلام سے تو یہ باتیں نہیں پائی جاتیں۔ تخیل کی شگفتگی، مضامین کی تازگی اور اسلوب کی چستی سے آپ کا کلام مالا مال ہے۔ مشاعروں میں خوب داد پائی۔ قلق کے بعد مولانا عبدالعلیم عاصی کو اپنا کلام دکھلانے لگے۔ چند ہی روز میں مشق سخن سے کامل الفن ہوگئے۔ آپ کی علمی استعداد عالمانہ درجہ کی تھی۔ تمام عمر درس تدریس میں بسر ہوئی۔ آخری عمر تک مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں معلم رہے۔ شاعری کے اعتبار سے آپکی معلومات نہایت قابل قدر تھیں۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔ آپ کے تین دیوان طبع ہو چکے ہیں۔ جن میں لکھنؤ کی روزمرہ زبان کے نمونے۔ فصیح محاورات۔ ضرب الامثال کا دریا موج زن ہے۔ عربی الفاظ کے بجائے اردو۔ ہندی الفاظ اسقدر ملتے ہیں۔ جو دوسرے زبان دان کے ہاں مشکل سے ملینگے نازک سے نازک مضامین کو نہایت سادہ اور صاف الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ عمر بھر صرف غزل کہی۔ آپ کی غزل میں اخلاقی اور علمی نکات بھی دستیاب ہوتے ہیں صداقت۔ صبر۔ رضا۔ توکل کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ حسن و عشق کے بیان کرنے میں بانکپن کی شان کی بجائے متانت سے کام لیا ہے۔ الفاظ کی تراش خراش اور نازک خیالی اور دماغی کاوشوں میں مبتلا رہتے تھے۔ دور حاضر میں پرانی وضع کے پابند رہے۔ افسوس ہے کہ آپ نے قدیم دائرے سے قدم باہر نہ نکالا۔ ورنہ اردو شاعری میں خوب اضافہ کرتے۔ کلام کا انتخاب نذر ناظرین کیا جاتا ہے :-

زمانہ کی طرح وہ شوخ پرفن　　　کسی کا دوست ہے دشمن کسی کا

آنکھیں لڑتے ہی صلح ہوتی ہے　　　فائدہ کیا ہے اس لڑائی کا

دختر رز کی لالہ گوں صورت　　　خون کرتی ہے پارسائی کا

غم کلیجہ تک ہمارا کھا گیا　　　ہم نے غم کھایا تو کیا عیب کیا

محویت نے رنگ یہ دکھلا دیا تاثیر کا　　　میری صورت بن گیا خانہ تری تصویر کا

کونین ایک عکس ہے جس کے جمال کا
بے مثل تو ہے تیرے کرشمے ہیں بے نظیر

کب نہ یاد آئی تلخیِ انجام
سات پردوں میں بھی دیکھیگا تمہیں
شام کے وعدہ پر جو تم آتے

اِتنا کیا ہے تم نے وہاں حسرتوں کا خون

اے مرے دردِ دل کی بیتابی
میں رازِ حسن و عشق سمجھتا رہا جسے
تم تو دلبر ہو کیا گِلہ تم سے
میری شہرت کا دَور بھی افسوس
دل نہ کعبہ تھا نہ کوہِ طور تھا

وہی ہم ہیں وہی جلسے وہی سامانِ عشرت ہیں
جن آنکھوں نے دیکھے ہیں تیری حسن کے نیرنگ
ان سے الگ تھی جب تک برگشتہ تھی ہر اک شے
جیسے عدم میں تھے ہم ویسے وجود میں ہیں
میں چپ تکتا ہوں سب کا منہ کھلا جاتا ہے رازِ دل
اٹھلا کے چل کہ ناز سے چل یا سنبھل کے چل
ازل کی وہ مستی ابد تک نہ اتری
غیر ممکن ہے کہ ہو اچھے بُرے کا امتیاز
جب کہا بانہیں گلے میں ڈالکر جانے بھی دو
ساتھ اپنے کیا انہیں لیتا گیا میرا شباب

میں بھی ہوں ایک نقش اسی کے خیال کا
تیری ثنا میں تنگ ہے عالم مثال کا

کب مرا عیش بدمزا نہ ہوا
پڑ گیا لپکا جسے دیدار کا
میں نہ رو رو کے یوں سحر کرتا

عاشق کے دل کو گنجِ شہیداں بنا دیا

رحم بنکر مزاج یار میں آ
تم نے اسی کو رنجشِ پنہاں بنا دیا
جب مرا دل ہی بے وفا نکلا
صورت عمر بے بقا نکلا
تیرے جلووں سے مگر معمور تھا

فقط اک دل کی مجھنے سی نہیں وہ رنگ صحبت کا
ان سے تو کبھی ذوقِ تماشا نہیں جاتا
ان کے ہوئے تو اب ہے کون و مکاں ہمارا
کیا تھا وہاں ہمارا کیا ہے یہاں ہمارا
خموشی حال کہتی ہے مرا طرزِ بیاں ہو کر
لیکن کسی کا دل نہ کفِ پا سے مل کے چل
پلائی جو تو نے شرابِ اوّل اوّل
دل جہاں آیا کسی پر سو جھتا کچھ بھی نہیں
سب گیا گذرا ہوا غصّہ گِلہ کچھ بھی نہیں
یا تو لاکھوں حوصلے تھے دل میں یا کچھ بھی نہیں

ہے نفس کی آمد و شد بر بقائے قصرِ تن
ہم صحبتوں کو یاد کرو مجھکو دیکھ کر
تمہاری آنکھ کی گردش سے کون مست نہیں
کروں جو یادِ جوانی تو کہنی ہے پیری

بڑھتی جاتی ہے عداوت آپ کی
ہم بھی عاشق ہیں کچھ غلام نہیں

عجب تاثیر دیکھی ہیں نے یہ عشق مجازی ہیں
کیا ستم ہے کہ نصیحت کرے آکر ناصح
وہ کوسنے کی ادائیں وہ غصہ کی چتوں
خلوتِ دل میں چلے آؤ تکلف نہ کرو
دستِ نگاہ دونوں نہ کیوں بیدردی کرتے بڑھیں

مصیبت یا کہ راحت جو خدا دے
تم جو آمادہ ہو جفا کے لئے
یاس نے آس اسطرح توڑی

ملنے جلنے کا ذرا اس میں نہیں ہوتا دخل
سبز رنگوں کی محبت نے یہ باندھا ہے طلسم
کافر کا کفر بھی نہ کرے گا اسے قبول
حیا خاص ان کی ادا ہو گئی
یہ تو عنوان محبت ہی کہ دنیا سے
من و تو کے مٹانے سے ہوا حاصل تو یہ حاصل
کہاں کا وصل کیسا ہجر غم کس کا خوشی کیسی

جسکی ہستی ہو ہوا پر وہ بنا کچھ بھی نہیں
وارفتگانِ قافلہ کا ہیں غبار ہوں
تم اپنی بزم میں دورِ شراب رہنے دو
کھلی ہے آنکھ تو اب ذکرِ خواب رہنے دو

یہ بھی کیا میری محبت ہو گئی
رشکِ یوسف ہوا کرے کوئی

محبت بڑھتی ہی جتنی جدائی ہوتی جاتی ہے
اس کے ملنے کی نہ تدبیر بتائے کوئی
جو دیکھتا ہوں تو منہ سے دعا نکلتی ہے
ہیں نے ارمانوں کو پہلے ہی ہشار کھا ہے
آنچل ڈھلک گیا ہے وہ سرمست خواب ہے

وہی دے جو مرے دلکو مزا دے
دل مرا پھیر دو خدا کے لئے
ہاتھ اٹھتے نہیں دعا کے لئے

دل کے آجانے کا انداز جدا ہوتا ہے
زخم بھرنے نہیں پاتا کہ ہرا ہوتا ہے
زاہد کو جو ملا ہے ریائی نماز سے
بس اب شرم کی انتہا ہو گئی
دل جو اس شوخ پہ آیا تو قضا بھی آئی
تمہارا وصف کرکے آپ ہی ہم خود تماشہ ہیں
نہ خلوت تھی نہ جلوت تھی جہاں تم تھے وہاں ہم

رباعی

کھلتا ہی نہیں بھید ذرا کیا ہے یہ	کچھ بھی نہیں پھر بھی اک تماشا ہے یہ
مکھی کی طرح اسمیں الجھتے ہیں حریص	جالا مکڑی کا ہے کہ دنیا ہے یہ

شمشاد:- منشی شیخ محمد حسین خلف شیخ محمد قاسم نوشاد مرحوم رئیس قدیم بنگلور ملک میسور۔ آپ ۶ ماہ رجب ۱۳۰۰ھ ہجری کو پیدا ہوئے۔ سلسلۂ خاندان شاہ میراں عرف لالجی سے ملتا ہے۔ کتاب معلومات غیب آپکی بہترین تصنیف ہے۔ خواجہ عشرت لکھنوی سے تلمذ ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

موسمِ گل ہیں تو گلشن کی ہوا کھانے دے	آج کل بند قفس میں مجھے صیاد نہ کر
ہائے کن کن کے کروٹیں بدلیں	شبِ وہ فرقت کی تھی سحر نہ ہوئی
کبھی دورِ فلک میں اے شمشاد	عیش سے زندگی بسر نہ ہوئی
تری صورت تو پیاری اور بھلی معلوم ہوتی ہے	مگر کچھ شوخ چنچل منچلی معلوم ہوتی ہے
لبوں سے چاٹ کر بنت العنب کو شیخ جی بولے	زباں پر میری مصری کی ڈلی معلوم ہوتی ہے

شمشاد

شمشاد:- نواب سلطان علی خاں عرف ننھن صاحب لکھنوی۔ شاگرد حضرت جلال۔ زبان خوب اور اندازِ بیان دلپذیر ہے۔ دو شعر نذرِ ناظرین ہیں:-

تمہاری چاہ میں یہ آج کون ڈوب مرا	یہ کیوں ہو تم عرقِ شرم میں نہائے ہوئے
بتو خدا تمہیں آباد رکھے دنیا میں	ہزاروں گھر کئے ویران بسے بسائے ہوئے

شمشیر جنگ

شمشیر جنگ:- جناب خاص الامرا اعتماد الملک صاحبزادہ محمد خاں صاحب بہادر شمشیر جنگ خلف نواب فیض محمد خاں خلف اکبر وزیر الدولہ مرحوم جاگیردار ٹونک۔ خاصی طبیعت پائی تھی۔ مضمون آفرینی کے ساتھ لطف زبان پر بھی نظر رکھتے تھے۔ ۶۰ یا ۶۲ برس کی عمر میں ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

ترے عشاق ہیں صورت میں سیرت دیکھنے والے	وہی کچھ ہیں حقیقت میں حقیقت دیکھنے والے
الٰہی اجنبی کیسا بنا ہوں بزمِ جاناں میں	تعجب میں کھڑے ہیں میری صورت دیکھنے والے

شمع

شمع ۔ مولوی محمود خاں صاحب بدایونی تلمیذ جناب ضیاء ۔ خوش فکر شاعر ہیں ۔ دو شعر جو دستیاب ہوئے ہیں نذر ناظرین ہیں : ؎

غضب کا سیل مری چشم اشکبار میں ہے
بلا کا شور نفس ہائے پر شرار میں ہے

مری طرف سے کدورت مزاج یار میں ہے
مرے نصیب کا لکھا خط غبار میں ہے

شمیم

شمیم :۔ منشی محمد علی صاحب ۔ سررشتہ دار ریاست نرسنگھ گڈھ ملک مالوہ شوخ طبع شاعر ہیں ۔ مولوی سید نذیر حسن صاحب فتنہ سندیلوی کے زمرۂ تلامذہ میں ہیں ۔ کلام یہ ہے : ؎

رہتا ہے یار چشم تمنا کے روبرو
آنکھوں پھرا دی عاشق شیدا کے روبرو

اس پیار کی نگاہ سے دیکھا کہ مر گیا
مجنوں جو آگیا کبھی لیلےٰ کے روبرو

وہ ہمیں بھولے ہوئے ہیں ہم انہیں کرتے ہیں یاد
صدقے انکے ہو کے قربان اپنی یاد کے

وہ ستم ایجاد کہتا ہے یہی عشاق سے
قمریوں کی گردنوں میں طوق ہوں فولاد کے

شمیم

شمیم :۔ سید خلیل احمد ترمذی خلف و شاگرد حضرت وسیم خیرآبادی ۔ عربی و فارسی کی تعلیم عالمانہ ہے ۔ انداز بیان دلکش ہے ۔ اور کلام میں درد ہے ۔ نمونۂ کلام نذر ناظرین ہے

آجائے مجکو لطف خزاں میں بہار کا
تم قبر پر چڑھاؤ کوئی پھول ہار کا

لو شمع آرزو ہوئی گل صبح ہو گئی
لو چل بسا مریض شب انتظار کا

نکلے تھے پر ابھی کہ اسیر قفس ہوا
آیا نہ مجھ کو راس زمانہ بہار کا

اے رہنے والو باغ کے اب ہم تو چل بسے
اب آئے یا نہ آئے زمانہ بہار کا

لائی اڑا کے گیسوئے مشکیں کی بو شمیم
ممنون کیوں نہ ہوں میں نسیم بہار کا

شمیم

شمیم :۔ منشی سید ولایت احمد صاحب سب انسپکٹر پولیس خلف منشی اکبر علی ساکن خیرآباد شاگرد حضرت امیر مینائی ۔ آپ ۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے ۔ جناب وسیم و حضرت ریاض سے قرابت قریبہ رکھتے تھے ۔ طبیعت شوخ اور غزل کے مناسب

تھی۔ زبان میں شیرینی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ زندہ دل۔ خوش مزاج اور خلیق انسان تھے۔ محکمہ پولیس میں خوب خدمات انجام دیں۔ قریب ۶۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔ ؎

پہ ہے خونِ ناحق نہ گھبرا تو اے دل
پکڑ لوں گا محشر میں دامن کسی کا

یہ ڈھٹائی دیکھیے دل لیگئے پہلو سے آپ
اُلٹے مجھ سے پوچھتے ہیں کیا ترا جاتا رہا

کچھ جو تسکین دیکھنے سے انکے دل کو ہو گئی
وُہ یہ سمجھے دردِ دل سب مٹ گیا جاتا رہا

نوٹ مندرجہ بالا آخری شعر کو پڑھ کر مرزا غالب کا یہ شعر فوراً ذہن میں آموجود ہوتا ہے:۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

میری آنکھوں میں سمائی ہے تمہاری صورت
جلوہ طور ہے کیا شعلۂ ایمن کیسا

وہ میری قبر کو ٹھکرا کے بولے
رہو گے خواب غفلت میں کہاں تک

نہالِ آرزو کیوں ہو نہ سرسبز
کہ سینچا ہے اسے خونِ جگر سے

اثر ہے میری چشمِ تر کا اے دل
کہ وہ دشمن پہ ایسے آج برسے

اے خوش نگاہ گردشِ چشمِ سیاہ سے
یُوں میرے دل کو پیس کہ سرمہ کہیں جسے

ایسے ہی بھولے تو میں حضرت دل لے ناصح
تُو نے سمجھایا انھیں اور یہ تری مان گئے

جان پاتے ہیں نئی جی سے گذرنیوالے
عشق میں مر کے بھی مرتے نہیں مرنیوالے

کاکلِ مشکیں گلِ عارض پہ ہے آئی ہوئی
یا کہ پھولوں پر چمن میں ہے گھٹا چھائی ہوئی

غم وہ شے ہے سامنے دشمن کے بھی میں رو دیا
یا خدا دل کا بُرا ہو کیسی رسوائی ہوئی

کیوں نہ صدقے ہوں تیغِ قاتل کے
اس نے ارمان نکالے ہیں دل کے

کیا چمن سے بہار جاتی ہے
نالے پر درد ہیں عنادل کے

شمیم۔ بابو چھیتر مل بھرتپوری شاگرد شیدا دہلوی۔ ۱۹۱۱ء میں دہلی میں تھے بعد کو وطن چلے گئے۔ شاعر خوش فکر ہیں۔ اور زبان شستہ اور سلیس ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے

اٹھتی ہے کس مزے کی خلش ہر نفس کے ساتھ
کانٹا تری نظر کا کہیں دل میں رہ گیا

عشق پردہ نشیں کا پاس رہا
راز دل لب سے آشنا نہ ہوا

قالب خاکی میں دل تھا دل میں تھا وہ جلوہ گر
بت مرا کعبہ میں کعبہ میرا بت خانے میں تھا

پردہ دار راز الفت بن گئی تھی بیخودی
ورنہ یارا ضبط کا کب تیرے دیوانے میں تھا

غنیمت ہے وہی دم زندگی میں
گذر جائے جو حق کی بندگی میں

رخ روشن پہ لہراتی ہے کاکل
یہ ناگن کھیلتی ہے چاندنی میں

مثال آئینہ حیراں ہوئے کیوں
نظر آیا تمھیں کیا آرسی میں

داغ جگر سے مٹ گئی تاریکی فراق
روشن چراغ آٹھ پہر اپنے گھر میں ہے

چھپائے جو کچھ پڑے تھے مرے سوز آہ سے
گردوں پہ آرہے ہیں نظر مہر و ماہ سے

ناکام تیرے در سے پھرا ہے یہ کون آج
حسرت ٹپک رہی ہے یہ کس کی نگاہ سے

شمیم :- جناب صاحب زادہ معظم علی خاں صاحب بہادر نجیب آبادی خلف نواب محمود خاں صاحب تلمیذ حضرت سید احمد علی صاحب رسا۔ طباع اور خوش فکر ہیں۔ زبان بہت صاف اور ستھری ہے۔ اور کلام جاندار ہے۔ یہ کلام ہے۔ ؎ — شمیم

ہاں جو تکرار ہی منظور ہے تو بات ہو اور
ورنہ کب آپ کا شکوہ مرے لب تک آیا

کوئی بگڑی کا نہ مونس ہے نہ غمخوار نہ دوست
سچ تو یہ ہے کہ ہر اک یار ہے بن آئی کا

حاجت نہیں کہ منت خنجر اٹھاؤں میں
بہنا ہے اب لہو مرے زخم جگر سے آپ

اللہ اللہ نظر آئی خدا کی قدرت
دیکھ کر ایک بت ہوشربا کی صورت

اللہ اللہ ری تاریکی شبہائے فراق
موت بھی پھر گئی بالیں سے پریشاں ہو کر

خوف ان کی برہمی کا بن گیا مہر دہن
حال دل وہ پوچھتے ہیں ہم بتا سکتے نہیں

وہ نہ آنے پائے اور موت آ گئی
رہ گئی دل ہی میں حسرت کیا کہوں

نمک بھی چھڑکتے ہیں دے دے کے چرکے
محبت میں کیا کیا مزے آ رہے ہیں

کب وفا ہوگا وعدۂ فردا / مُنہ دکھاؤگے کیا قیامت میں

کس روز تیرِ غم کا نشانہ نہیں ہوں میں / کس رات دردِ دل سے تڑپتا نہیں ہوں میں
کہتے ہیں کیا کروں وہ مرض میرا دیکھ کر / مردے کہیں جئے ہیں مسیحا نہیں ہوں میں
جانے دو بس نہ مُنہ مرا کھلواؤ۔ دردِ دل / کیا جانے کیا سبب ہے جو کہتا نہیں ہوں میں
بیٹھا ہوں بزمِ یار میں اللہ رے بیخودی / کچھ بھی خبر نہیں ہے کہ ہوں یا نہیں ہوں میں

ٹھہر تو آج وہ مخمور بھی ہیں اور خلوت بھی / دلِ بیتاب یہ موقع بڑی مشکل سے ملتا ہے
نہیں دشوار ملنا آدمی کا سہل ہے لیکن / جسے انسان کہتے ہیں بڑی مشکل سے ملتا ہے

اب بے اثری دل کو جلاتی ہے ہمارے / جلتے تھے عدو آہ شرربار سے پہلے

نہیں سرمایۂ طاعت تو کیا ہے / ہمیں فضل خدا کا آسرا ہے
نہیں ملتے ہو دشمن سے تو کیا ہے / تمہارا اور اُس کا دل ملا ہے
اٹھائے کوئی کب تک ظلم بیجا / ستم کی بھی کچھ آخر انتہا ہے

ٹھہرے نہ جگر میں بھی مرے دل میں گذر کے / کیا شوخ ہیں یہ تیر تری شوخ نظر کے

شمیم

شمیم: مولوی محمد عبد الرّؤف صاحب۔ ان کا دیوان شائع ہے۔ آدمی خوشگو اور خوش فکر ہیں۔ معاملہ بندی کیطرف توجّہ زیادہ ہے۔ روزمرّہ صاف اور زبان شستہ ہے لیکن جا بجا تعقیدیں کلام کو بدمزا کردیتی ہیں۔ نمونۂ فکر رسا نذرِ احباب ہے:۔

ہے مسیحائی کا دعوٰی بے دلیل / کہئے کس بیمار کو اچھا کیا

عجب سرا ہے سرائے فانی ثبات اس میں نہیں کسی کو / کسی کا اس جا مقام دیکھا کسی کو پا در رکاب دیکھا

قتلِ عاشق انھیں منظور رہا خوب ہوا / دردِ سر روز کا تھا دُور ہوا خوب ہوا

قفس مرا ابھی گلشن میں اور رہنے دے / چمن کی دیکھ لوں جی بھر کے میں فضا صیاد

جو اُس نے دیکھا نگاہ بھر کر چبھے ہیں دل میں ہزاروں نشتر / رولا دیا دو پہر برابر جو بات کی ایک مسکرا کر

کرامت اپنی دکھائینگے کیا مری جنازے پہ آئینگے کیا / بھلا وہ مجکو جلائینگے کیا جنھوں نے مارا جلا جلا کر

زلف کہتی ہے نقاب رُخِ روشن ہوکر
مشکل ہے رہروانِ عدم کا پتہ ملے
اے بُت یہ میرے حسنِ عقیدت کی بات ہے
اس کے رُخِ صبیح پہ سبزہ عیاں نہیں
نہیں معلوم گردوں کو ہے مجھ سے دشمنی کیسی
چلا تو ہے میخانہ کی سمت زاہد

مہر نکلا ہے چراغِ تہِ دامن ہوکر
وہ اس طرح گئی کہ قدم کا نشاں نہیں
اللہ بھی خفا ہے جو تو مہرباں نہیں
زنگ آ گیا ہے آئینۂ آفتاب میں
اگر دم بھر ہنساتا ہے تو برسوں ہی رلاتا ہے
یہ جُبّہ یہ دستار اللہ رکھے

شمیم:- شیخ مراد علی صاحب متوطن اترولی ضلع علی گڑھ۔ اچھا شعر کہتے ہیں مگر کہیں کہیں متروکات کا استعمال کر جاتے ہیں۔ زبان بُری نہیں ہوتی۔ مشاق معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کلام ہے:

دستِ دعا بلند کبھی اپنا گر ہوا
رہا ہم پر جنونِ فتنہ ساماں مہرباں برسوں
بجز میرے رہا ہے کون صرفِ امتحاں برسوں
چارۂ دردِ جگر جب نہ اجل سے بھی ہوا
آپ کے ساتھ ہی یہ جان بھی رخصت ہوگی

آئی ندا کہ بند اجابت کا در ہوا
اڑائیں دامنِ صحرا کی ہم نے دھجیاں برسوں
نگاہِ ناز کی کس پر چلی ہیں بجلیاں برسوں
درد ہی کو دلِ بیتاب کا درماں سمجھے
آپ اگر پہلو سے اٹھے تو قیامت ہوگی

شمیم:- جناب عباس مرزا صاحب عرف امراؤ مرزا صاحب لکھنوی تلمیذ میر وزیر علی صبا لکھنوی۔ ان کے والد کا نام امداد علی تنہا صاحب دیوان تھے۔ زبان صاف تھی اور شعر کا انداز دلپذیر۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

گور پر کیا چاہئے اُس کی پس مُردن چراغ
وصل کی پھر اُس کے کیوں کرتا ہے تو آس اے شمیم
ہر وقت ہجرِ یار میں ہے یہ صدائے دل
تعزیر چاہئے گنہ عشق کے لئے

حسرت و حرماں کے داغوں سے ہو جب کانون چراغ
جانتا تو ہے کہ پروانے کا ہے دشمن چراغ
چھوٹے سے بھی کسی سے نہ کوئی لگائے دل
تم شوق سے جلاؤ یہی ہے سزائے دل

شمیم

شمیم۔ جناب نواب سید محمد مرتضیٰ خاں صاحب نبیرہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم و خلف اکبر ممتاز الدولہ میر عبدالحیٔ خاں صولت جنگ مرحوم۔ ۱۲۹۹ھ میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تاریخی نام محمود اختر ہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد آپ لکھنؤ میں سکونت پذیر ہوئے۔ اوائل عمر سے شعر و سخن پر فریفتہ اور معانی کے شیفتہ ہیں۔ فارسی اور عربی میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت رکھتے ہیں۔ اُردو میں شمیم اور فارسی میں عشرتی تخلص کرتے ہیں۔ اُردو میں فصیح الملک حضرت داغ سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ فارسی نظم و نثر میں افتخار الشعراء حافظ خان محمد صاحب شہیر مرحوم تلمیذ حضرت غالب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ خوش وضع امیر زادے اور نازک خیال شاعر ہیں فی البدیہہ اور زود گوئی میں کمال حاصل ہے۔ فتح پور کے مضافات میں ان کی معقول جائداد ہے۔ اور کانپور میں چند پرانی عمارتیں ان کے اسلاف کی یادگار ہیں۔ نہایت سلیم الطبع اور با اخلاق شخص ہیں۔ زبان صاف کلام چست اور معنی خیز ہوتا ہے۔ اُردو دیوان کے ہزار صفحات ہیں۔ جن میں غزلیات کے علاوہ قصائد۔ مخمسات۔ رباعیات وغیرہ موجود ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو:

منور پرتو نور بتاں سے دل جو رہتا ہے
وفا اس واسطے کرتے ہیں سب اہل حرم میرا

نہ ہوتیں سامنے میرے عدو سے لطف کی باتیں
خیال اتنا تو لازم تھا ستمگر کم سے کم میرا

گر یونہی دورہ رہیگا گردشِ افلاک کا
خاک میں مل جائیگا پتلا ہماری خاک کا

دل کو چرا لیا یہ ستم تو نے کیا کیا
اے بت تجھے خدا کی قسم تو نے کیا کیا

وہ بیقرار ہو کے نکل آئے گھر سے آج
اے اضطراب دل یہ ستم تو نے کیا کیا

اک ہم کہ ہیں غفلت دل سے نہیں فرصت
اک وہ کہ نشاں جن کو ملا راز نہاں کا

باتوں باتوں میں نہ کاٹو شب خلوت دیکھو
بات رہ جائیگی اور وقت گذر جائے گا

ایک دل وہ بھی ہے تیرے بس میں
اور کیا ہے سرو سامان میرا

دل کو وہ چھیڑ کے فرماتے ہیں
عشق کا دل میں نشان باقی رہا
لا مجھے لا مرے پیکان میرا
جل گئی آگ اور دھواں باقی رہا

کھولا کسی نے بند جو اپنی نقاب کا
منہ پھر گیا اِدھر سے اُدھر آفتاب کا

دیکھ سکتا ہے بھلا کون کمر کی صورت
کس کو آتی ہے نظر تارِ نظر کی صورت

سنگِ درِ جاناں کا پتہ کچھ نہ ملے گا
یہ سر جو رہا ناصیہ فرسا کوئی دن اور

جلوہ نہیں ہے یار کا جامِ شراب میں
اک آفتاب غرق ہے اک آفتاب میں

وہ بگڑے، بات بگڑی، حال بگڑا، اک جہاں بگڑا
تری گردش کا میں اے خوبیِ تقدیر قائل ہوں

شمیم

شمیم: شیخ ابوالحسن صاحب زمیندار قصبہ بھانی ضلع بارہ بنکی رشتہ دار راجہ نوشاد علی خاں صاحب مرحوم۔ ذہن رسا اور طبیعت عالی ہے۔ یہ نمونہ کلام ہے:

کم نوش ہوں میں شوق ہے ہلکی شراب کا
ساغر بھی چاہئے مجھے ساقی حباب کا

اس شہسوارِ حسن پہ اٹھتی ہیں انگلیاں
شاید ہلالِ عید ہے حلقہ رکاب کا

چھڑکا دہانِ زخم پہ سفاک نے نمک
پایا ہے آج ہم نے مزا اضطراب کا

وہ دل میں چٹکیاں لیتے ہیں آ کے
نئے پہلو نکالے ہیں جفا کے

پسِ مردن زمیں میں گڑ گیا میں
خجل کس نے کیا میت اُٹھا کے

شمیمِ ناتواں کو سوئے یثرب
اُڑا لے جائیں گے جھونکے ہوا کے

شمیم

شمیم: حکیم محمد تقی صاحب ملازم ریاست بروندہ وارد بڑا گاؤں ضلع بجنور کلام سے مشاقی ظاہر ہوتی ہے۔ تلاشِ مضمون میں اکثر بہت دور نکل جاتے ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو:

جشنِ نوروز ہے مستانہ بہار آتی ہے
شیشہ بہک جاتا ہے طنابِ پیمانے سے

لاش پر قیس کی رو کر یہ کہا لیلیٰ نے
آج دنیا ہوئی خالی مرے دیوانے سے

بختِ خوابیدہ وہ رکھتا ہوں گلستاں میں شمیم
نیند نرگس کو بھی آتی مرے افسانے سے

شمیم

شمیم :- منشی شبیر سنگھ صاحب متوطن موضع گوری۔ ڈاکخانہ گور سہائے گنج ضلع فرّخ آباد۔ آپ بیس خاندان کے اعلیٰ ٹھاکر ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں آپ کی عمر ۴۸ برس سے متجاوز تھی۔ آپ کے آبا و اجداد کا قدیم پیشہ تیغ زنی و نبرد آزمائی تھا۔ اب عرصہ سے ذریعہ معاش زمینداری ہے۔ علاوہ شعرگوئی کے نثر نگاری کا بھی شوق ہے کچھ دنوں جناب عزیز لکھنوی کو کلام دکھلایا ہے۔ مگر اب عرصہ سے اصلاح کسی سے نہیں لیتے۔ تین غزلیں جناب شمیم کے ایک دوست نے بھیجیں۔ ان کا انتخاب نذر ناظرین ہے :ـ

دلوں کو کرب و اذیت کا میزباں دیکھا — کہیں بھی چین کو ہم نے نہ میہماں دیکھا
قدم جما نہ سکے پھر تو ہجر کے صدمے — خیالِ یار کو جب دل میں میہماں دیکھا
رفتہ رفتہ دل کی بیتابی نے چھیڑا سازِ دل — کھلتے کھلتے کھل گیا آخر ہمارا رازِ دل
چشمِ خونابہ فشاں جب کر رہی ہو انکشاف — ہمنشیں پھر چھپ سکے کیونکر ہمارا رازِ دل
سننے والوں پر نہ بیتابی کا عالم ہو گیا — عشق کی مضراب نے چھیڑا ہی میرا سازِ دل
مجنوں صفت شمیم جو دیوانے بن گئے — ہندوستاں میں نجد کے ویرانے بن گئے
ساقی کے لطفِ عام سے رندوں کے واسطے — دنیا کے گوشے گوشے میں میخانے بن گئے
ویران رکھئے یا انھیں معمور کیجئے — سب کے دلوں میں آپ کے کاشانے بن گئے
ہمدردیوں کو ان کی بنایا شریکِ حال — ہشیار اپنے کام میں دیوانے بن گئے

شمیم

شمیم :- مولوی سیّد جوّاد حسین خلف سیّد حیدر حسین یکتا رئیس امروہہ۔ سنہ ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ اردو اور فارسی کے عالم تھے اور خطوطِ نستعلیق و شکستہ کے ماہر۔ جناب سید ابوالحسن صاحب فرقتی امروہوی اور جناب ساکت امروہوی سے فن شعر کو درست کیا۔ کچھ دنوں بعد مولوی ساکت صاحب سے علیحدگی اختیار کرلی۔ حضرت ساکت کا مندرجہ ذیل شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے :ـ

سب جانتے ہیں اس مرے لطف عمیم کو	یہ بو کہاں تھی ہیں نے بسایا شمیم کو

اپنا اکثر کلام اپنے شاگردوں کو پڑھنے کے لئے دے دیا کرتے تھے۔ گھر کے رئیس تھے۔ مگر جب گھر کی جائداد بے پروائی اور شوقینی کی نذر ہو گئی۔ تو ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ بیس۲۰ برس حیدرآباد میں اور بیس برس ریاست رامپور میں رہے جناب شمیم کے بڑے صاحبزادے سید برجیس حسن برجیس تخلص کرتے تھے اور مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی میں اچھی ترقی کر گئے تھے۔ عین شباب میں راہی ملک بقا ہوئے۔ جوانا مرگ بیٹے کی وفات نے جناب شمیم کی صحت کو بہت سخت صدمہ پہنچایا۔ اور آخرکار دو برس کے بعد ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء میں خود بھی بعمر ۶۵ سال انتقال کر گئے۔ امروہہ اور اس کے قرب وجوار میں شاگردوں کی اچھی تعداد چھوڑی۔ آخر عمر میں غزل گوئی ترک کر دی تھی۔ مراثی، سلام وغیرہ بہت کہے مگر مزاج کی بے پروائی نے جمع کرنے کا موقعہ نہ دیا۔ جناب افسر صدیقی صاحب امروہوی نے یہ شعر روانہ کئے ہیں۔ جو نذر ناظرین ہیں:۔

خود شہادت دے رہی ہے سرخی رخسار صبح	ہے کسی کشتہ پہ گریاں دیدۂ خونبار صبح
تیرے شیدا کو نظر آئی خدائی بُت پرست	خط ابیض کو بھی سمجھا رشتۂ زنار صبح
وصل کی شب صور کی آواز تھی بانگ اذان	ہم کو آثار قیامت بن گئے آثار صبح
ان کی صورت دیکھ کر حیرت سے کہتے ہیں بشر	سورۂ الفجر ہے یا مصحف رخسار صبح
آب شمشیر صنم عاشق کے حق میں زہر ہے	جس طرح سے شب کو حق میں شربت دیدار صبح
آفتاب حشر چمکا اور خریدار آ گئے	یار نخشب میں بنا ہے یوسف بازار صبح
یاد روئے گل میں پھروں خون روتا ہوں شمیم	جب شفق دیکھو لٹا ہے چرخ پر گلزار صبح

شمیم:۔ رائے بہادر پنڈت شیو نرائن صاحب رینہ خلف پنڈت اندر نرائن صاحب رینہ ۱۸۵۹ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم جالندھر اور لاہور میں پائی۔

۱۸۸۱ء میں قانون کا امتحان پاس کیا۔ اور اس وقت سے ۱۹۰۵ء تک جالندھر ہی میں وکالت کرتے رہے۔ پیشۂ وکالت میں پنڈت صاحب موصوف نے ایسا قابلیت کا ثبوت دیا کہ ہائی کورٹ نے آپ کو وکیل سے ایڈووکیٹ کا رتبہ بخشا پنجاب میں سب سے پہلے وکیل ہیں جو ایڈووکیٹ بنائے گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد آپ کو رائے بہادری کا خطاب ملا۔ مندرجہ ذیل دو اشعار اس واقعہ کے متعلق فرمائے ہیں :ـ

گو ہم نمک حلالوں میں محسوب ہو گئے　　پر اپنے دوستوں میں تو معتوب ہو گئے
جاتی رہی وہ آن وہ ترکی تمام شد　　جب سے شمیم رائے سے مخاطب ہو گئے

شمیم صاحب علم ادب سے بھی خاص شوق رکھتے ہیں۔ حال میں آپ پنجاب ہسٹوریکل سوسائٹی کے صدر مقرر ہوئے ہیں۔ آپ بدھ مذہب کے بہت معتقد ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے دلدادہ ہونے کے علاوہ آپ علم موسیقی اور فنِ شاعری کے ماہرین میں سے ہیں۔ اردو علم ادب میں آپ کو مولانا محمد حسین آزاد کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ علوم و ادب مغربی میں آپ کا مطالعہ نہایت متنوع اور وسیع ہے۔ حال میں آپ نے اپنا قیمتی کتب خانہ سارناتھ (بنارس) بُدھ مست دُہارے کی نذر کر دیا ہے۔ آپ پنجاب کی مجلس قانونی کے رکن رہ چکے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں کُل سلطنت برطانیہ کی یونیورسٹی کانفرنس میں پنجاب یونیورسٹی کی نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور یورپ کے اکثر ملکوں کی سیر کی۔ مطالعہ کی مانند آپ کی سیاحت اور واقفیت عامہ کا میدان بھی نہایت وسیع ہے۔ آپ ایک کہنہ مشق ناثر اور شاعر ہیں۔ ایامِ شباب میں آپ نے کثرت سے عشقیہ غزلیں لکھیں۔ لیکن اب طبیعت اس طرف راغب نہیں ہے۔ آپ کے کئی ناول شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ آپ کتب ذیل کے مصنف ہیں۔ چاند۔ تاریخی ناول۔ ایم۔ اے ناول جس میں موجودہ طریقۂ تعلیم

پر بحث کی گئی ہے۔ کشمیری پنڈت۔ رسوم کشمیریاں پر بحث کی گئی ہے۔ مختصر قصہ جات۔ کشمیری سوسائٹی کے رفارم کے متعلق۔ شانتی بابا۔ دولت کے حاصل کرنے کے ذرائع اور صرف کرنے کے طریقے۔ حیاتِ گوتم بدھ۔ ترجمہ مسلک بدھ۔ موسیقی ہند۔ انگریزی۔ کلام نذر ناظرین ہے۔

مرنے کا مرے جا کے کسی نے جو کیا ذکر
کہنے لگے ہاں آئی ہے ہم کو بھی خبر آج

دل کھول کے بس آج تو پی لوں مئے گلگوں
ساقی نے دیا کھول ہے میخانے کا در آج

بجز اک موجِ خوں کچھ بھی کیا ہی لالہ زاروں میں
دھر آگیا ہے جیسے افغانِ مسلسل آبشاروں میں

یہ سب نیچر کی مایا ہے لبھاتی ہے طبیعت کو
عجب فطرت نما منظر ہیں بھر دی گلعذاروں میں

یہ ننھی سی زمیں اپنی اور اس پہ ناز ہوتا تھا
بھرے ہیں لاکھوں عالم اے فلک تیرے ستاروں میں

نہیں ویراگ بھاتا زندہ دل رندوں کے کانوں کو
کرو کچھ تذکرہ عیش و طرب کا بادہ خواروں میں

شمیم قومی عروج و پستی کے سارے ساماں ہیں اپنے بس کا
ابھی وہ قوم کیا ترقی جو خود نہ بدلیگی اپنی رسمیں

زمانے کی رفتار اک رہنما ہے
چلو اس طرف کو جدھر کی ہوا ہے

کتابیں ہوں نیچے کتابیں ہوں اوپر
یہی اندنوں زندگی کا مزا ہے

شمیم: نواب محمد حسین خاں خلف نواب یوسف علی خاں مرحوم۔ ساکن محلہ کشمیری کوٹھی عظیم آباد۔ لیاقت علمی اچھی تھی۔ جناب سید معین الدین احمد صاحب قیس اپنی تالیف گلشن حیات میں لکھتے ہیں۔ کہ با مذاق۔ وضعدار۔ مہذب اور خلیق تھے۔ صاحب زبان اور محاوروں کے محقق تھے۔ غزلیں خوب کہیں۔ جناب شاد عظیم آبادی سے تلمذ تھا۔ سفر حجاز سے واپس آنے کے بعد تکلیف روحانی و جسمانی میں مبتلا ہو کر ۱۳۲۹ھ میں راہی جنت ہوئے۔ تخمیناً ۵۰ برس کی عمر تھی۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔ شمیم

نہ ترک جفا کر جفا کرنے والے
کہیں مر نہ جائیں وفا کرنے والے

نہ جا نیم جاں چھوڑ کر بسملوں کو
خدا کے لئے او جفا کرنے والے

مری جان صدقے تری ہر ادا پر
منا پھر رہے ہیں اے خفا کرنے والے

در دوست پر ہم سے لاکھوں کھڑے ہیں
جھکائے سروں کو دعا کرنے والے

شمیم ابتداء عشق کی ہم نے کی ہے
ہمیں اس کی ہیں انتہا کرنے والے

شناور

شناور: منشی صاحب مرزا خلف شاہ میر خاں فیض آبادی۔ شاگرد خواجہ حیدر علی آتش۔ زباندانی میں اچھی مہارت حاصل کی تھی۔ محاورہ بندی میں خوش سلیقہ تھے۔ اور انداز بیان مرغوب تھا۔ مگر کلام شہرت کا محتاج رہا۔ امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے زمانہ میں لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اور مستند شعراء میں ان کا شمار تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو: ؎

دیر و کعبہ میں نہ جب پایا اسے
دل کو میں سمجھا ٹھکانا یار کا

کس سے شکوہ بے وفائی کا کروں
ہے طرف دار اک زمانہ یار کا

ماہِ تاباں کو لگاتا ہے گہن
منہ کو زلفوں میں چھپانا آپ کا

یاد ہیں مجکو بھی عیاری کے دستور بہت
آپ ہیں دُور تو بندہ بھی ہے پھر دُور بہت

پھر شب عیش و طرب ہے وہی چرچا پھر ہو
وہی ساقی وہی ساغر وہی مینا پھر ہو

پھر اسی چال سے چلتے ہو غضب کرتے ہو
خوف آتا ہے مجھے حشر نہ برپا پھر ہو

گر فنا کی ہو حقیقت سے زمانہ آگاہ
سخت ناداں ہے جو منت کش عیسیٰ پھر ہو

عشق کی کھا کے قسم پھر نہ شناور کر عشق
اعتبار اپنا نہ کھو دیکھ نہ رسوا پھر ہو

اے آئینہ رو ایک مجھی کو نہیں حیرت
بت بن گیا جس کو تری صورت نظر آئی

زلفوں سے صنم شان ہوئی کفر کی ظاہر
رخ سے ترے اللہ کی قدرت نظر آئی

شوخ

شوخ: محمد علی حسین خاں خلف محمد فخر الدین خاں صاحب آنریری مجسٹریٹ رئیس شاہجہانپور۔ آپ کے چار تخلص ہیں۔ شوخ۔ طرار۔ برق۔ بیقرار۔ جو تخلص بہ آسانی موزوں ہو جاتا ہے۔ وہی لکھ دیتے ہیں۔ مگر زیادہ تر برق

دل پسند ہے۔ ۱۲ سال کی عمر سے شاعری کا ذوق ہے۔ پہلے مولوی ستار بخش راقم شاہجہانپوری سے اصلاح لیتے رہے۔ پھر احسان علی خاں صاحب احسان شاہجہانپوری کے شاگرد ہوئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد رامپور جا کر منشی امیر احمد مینائی سے استفادہ کیا طبیعت اچھی۔ چلبلی اور شوخ پائی ہے۔ نثر بھی اچھی لکھتے ہیں۔ انتخاب کلام مرسلہ درج ذیل ہے:-

چشمِ جاناں سے تصور میں دلِ زار ملا
خوب دل کھول کے بیمار سے بیمار ملا

آپ فرماتے ہیں عشاق بہت سے دیکھے
یہ تو کہئے کوئی ہم سا بھی وفادار ملا

ہم فقیروں کو نہیں ظلِ ہما سے مطلب
پڑ رہے یار کا جب سایۂ دیوار ملا

عالم کو فراموش کیا یاد میں جس کی
بھولے سے بھی لیتا نہیں وہ نام ہمارا

پوچھتے کیا ہو ماجرائے فراق
ہو نہ دشمن بھی مبتلائے فراق

ہو گیا ہنگامۂ محشر بپا
چال یہ اے ماہرو اچھی نہیں

جل گیا طور ہوئے حضرتِ موسیٰ بیہوش
تو ہی لے برقِ تجلی یہ شرر کس کا ہے

ان منتوں پہ بھی وہی عادت جفا کی ہے
ظالم ترے مزاج میں ضد کس بلا کی ہے

غنچے چمن میں دیکھ کے بلبل کو ہنس پڑے
اس میں بھی دل لگی کوئی بادِ صبا کی ہے

شوخ

شوخ:- جناب بابو فتح چند صاحب رئیس و مہاجن لکھنؤ۔ طبیعت میں نفاست ذہن میں رسائی ہے۔ زبان شوخی سے آشنا ہے۔ لطف بیان رنگ کلام کو دوبالا کر دیتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

ذکر سے کچھ نہیں ہو جس سے توبہ ٹوٹ جائے
شیخ اگر لب تک ترے ذکرِ شراب آیا تو کیا

مغفرت ہوتی اگر رونے کو آجاتے تمہیں
تربتِ عاشق پہ رونے کو سحاب آیا تو کیا

آنکھ دکھلاتا ہے غصہ سے دلِ بیمار کو
تنے اک نظارہ پہ تجھکو عتاب آیا تو کیا

سرکی نقاب سے جو ترے جلوہ گاہ میں
اک خیرگی سی ہو گئی پیدا نگاہ میں

اللہ صبر دے مجھے یا اس کو دے وفا
لطف سے بڑھ کے ستم میں مجھے ملتا ہے مزا
تیر سے کم نہیں گو اصل میں یہ تیر نہیں
لوگ کہتے ہیں مسیحائے زمانہ جن کو
دل کو بھی میں رقیب سمجھتا ہوں عشق میں
موت آتی ہے تری فرقت میں نیند آتی نہیں
نہ رہتے آپ میں سنتے جو یہ تو آتا ہے
پیار سے رکھتے ہیں وہ سینے پہ ہاتھ
نکالوں کیا دیدہ کی ہوس میں ہے کوئی ظلم و ستم تو دیکھے
اٹھاؤ ساغر بھرو صراحی چلو گلستاں میں بادہ خوارو
غم محبت نے اے ستمگر کیا ہے اس گھر کو ایسا ویراں
میں بھی اور وہ بھی ہیں خوش دونوں کی جل جانے سے
ہیں تو ہیں دیکھ کے زاہد نے بھی دل تھام لیا
ترس آ ہی گیا آخر تڑپ دیکھی جو بسمل کی
ای ہے اب کسی کی شوخ آنکھیں اٹھ نہیں سکتیں

دو التجائیں ہیں یہ تری بارگاہ میں
پیار کرتا ہوں جنہیں میں وہ جفا کرتے ہیں
دل کو مجروح ترے ناز و ادا کرتے ہیں
لیجئے وہ مرے مرنے کی دعا کرتے ہیں
جو ان کا دوست ہے وہ مرا آشنا نہیں
جان جاتی ہے مگر دل کی تڑپ جاتی نہیں
ہم آپ سے ترے آنے سے پیشتر جاتے
اب ہمارے دل کی حالت اور ہے
کہ پھیر کر منہ میری گلے پر وہ شوخ خنجر چلا رہا ہے
کہ لطف اب ہوگا میکشی کا وہ ابر گردوں پہ چھا رہا ہے
نہ کوئی حسرت رہی ہے دل میں نہ کوئی اب تک رہا ہے
لاگ ہے شمع سے ان کو مجھے پروانے سے
ناز سے جھومتے نکلے جو وہ میخانے سے
گلے سے جھک کے پھر ملنے لگی تلوار قاتل کی
دلوں کا راز کہتی ہیں نگاہیں اہل محفل کی

شوخ

شوخ:- شیخ محمد جان عظیم آبادی سوداگر کتب۔ تلمیذ حضرت داغ۔ اخبار بے مثال پنچ دہلی پنچ وغیرہ میں چٹکیلے پھڑکتے ہوئے ظریفانہ مضامین لکھتے تھے۔ صاف اور سیدھا شعر کہتے۔ زبان صاف ہوتی۔ محاورات درست۔ "شوخ ظریف" کے نام سے جسقدر مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ وہ سب ان کے زور قلم کا نتیجہ تھے۔ شاعرانہ مباحث و مناظرات سے دلبستگی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں انتقال کیا۔ فسانۂ شوخ اور چند مختصر رسالے ان کی یادگار ہیں۔ کلام یہ ہے:-

رنگ لائے گا تڑپنا بلبلِ ناشاد کا　　جل اٹھے گا نالۂ سوزاں سے گھر صیاد کا

وعدہ تم جھوٹا ہی کر لو کچھ تسلی ہو تو جائے　　دل ذرا رکھ لو مری جاں عاشقِ ناشاد کا

ہم نے سہہ سہہ کر جفا کیوں انکی عادت کی خراب　　شوخ اب تو ان کو اپنا پڑ گیا بیداد کا

ہائے پہلو میں جو دن رات رہا کرتے تھے　　ان کو انکار ہے اب شکل بھی دکھلانے سے

داستاں اپنی مصیبت کی سناؤں کیا خاک　　تم کو فرصت بھی ملے غیر کے افسانے سے

سر اس کے قدم پہ ہے تہ شمشیر گلا ہے　　جینے سے زیادہ ہمیں مرنے میں مزا ہے

تھم تھم کے چھری پھیرے گا پر سے قاتل　　کچھ اور ہی رہ رہ کے تڑپنے میں مزا ہے

میں کہتا ہوں دل لیکے مرا تو نے دغا کی　　وہ کہتے ہیں رسوا مجھے دل دیکے کیا ہے

ہماری ظاہری باتیں نہ دیکھ او ناصح ناداں　　نظر رکھتے ہیں باطن پر حقیقت دیکھنے والے

شوخ: سید سخاوت علی جعفری اکبرآبادی۔ استعداد علمی معمولی ہے مگر مذاقِ سخن سے آشنا ہیں۔ ابتدا میں آغا شاعر دہلوی کے شاگرد ہوئے مگر طبعی افتاد نے تکلف اور تصنع کا خوگر بنا دیا تھا۔ سیدھے سادھے روزمرہ صاف ستھری زبان کے بجائے استعارات اور تشبیہات اور تلمیحات کو پسند کرنے لگے آخر آغا شاعر دہلوی سے گریز کر کے میرزا خادم حسین صاحب نامی اکبرآبادی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ ریلوے اسٹیشن دہلی کے عملہ میں کلرک تھے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:

یہ ناگ ہیں ستم گر دل میرا ڈسنے والے　　یہ بال الجھے الجھے یہ بال کالے کالے

[illegible]　　اے میرے [illegible]

اللہ [illegible] آگ کہتا وہ ان کا [illegible]　　اللہ تجھ کو بخشے اے میرے [illegible]

تیری طرح نظر میں کوئی نہیں سمایا　　[illegible] آنکھوں نظروں [illegible]

خلوت میں منہ چھپا کر کہتا وہ [illegible]　　[illegible] کوئی ہمیں منالے

[illegible]　　[illegible] اپنی قسمت [illegible]

شوخ

وصل اس کو ہے مجھے فرقت نصیب	غیر کی اور میری قسمت دیکھئے
اب بھی ہے انکار وصل غیر سے	آئینہ میں اپنی صورت دیکھئے
پوچھئے مجھ سے نہ حالِ سوزِ دل	آپ پروانہ کی حالت دیکھئے
وہ لٹے جاتی ہے دامن میں صبا	آپ کے گیسو کی نکہت دیکھئے
سی دئے ہیں ہونٹ رعبِ حسن نے	مُنہ تک آ تکتی ہے حسرت دیکھئے
مُنہ چھپا لیتے ہیں مجھ کو دیکھ کر	یہ سزائے جرمِ اُلفت دیکھئے
شوخ وہ کرتے ہیں وعدہ حشر کا	ہو نہ ہو کب ہو قیامت دیکھئے

رباعی

ہر شعر کا دعوےٰ ہے کہ یکتا ہوں میں	مضمون بھی کہتا ہے اچھوتا ہوں میں
قبضہ ہو نہ کیوں ملکِ سخن پر اے شوخ	شاگردِ رئیسِ سخن آرا ہوں میں

شوخ

شوخ:- منشی بنواری لال ولد منشی کشن نرائن شفیق۔ آپ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ خاندانی شاعر ہیں۔ محلہ نولبستہ شہر لکھنؤ میں قیام ہے۔ آپ کو منشی دوارکا پرشاد صاحب افق مرحوم سے تلمّذ تھا۔ ۱۱ر فروری ۱۹۳۲ء کو شاہ افغانستان نے ایک قصیدہ کے صلہ میں ایک طلائی گھڑی مرصع اور ایک عدد قلم پارکر مرحمت فرمایا۔ ۲۰ فروری ۱۹۳۲ء کو مہاراجہ صاحب بنارس کی تاج پوشی کے جلسہ میں آپ نے قصیدہ پڑھا جس کے صلہ میں مہاراجہ صاحب نے دست مبارک سے خلعت اور تین سو روپیہ نقد عطا فرمایا۔ آپ کی رباعیات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

مستِ الست ہوں یہ مرا ظرف دیکھئے	چلّو لگا لیا وہی پیمانہ ہو گیا
دلکو سکوں ہو کیسے اس ہاں پر اس نہیں پہ	کچھ کچھ ہے مسکراہٹ کچھ کچھ شکن جبیں پہ
جو تنگکدۂ دہر کو میخانہ بنا دے	ممکن ہے کہ ہر پھول کو پیمانہ بنا دے

مے کے پینے سے نہیں ہوتا ہے کوئی بھی گناہ	شرط اتنی ہے کہ بڑھ جائے نہ پیمانے سے

شوخ

شوخ:۔ حاجی سید سلطان احمد صاحب لکھنوی شاگرد جلال لکھنوی اچھی طبیعت پائی ہے۔ مضمون اور زبان دونوں باتیں کلام میں ہیں۔ باوجود تلاش کے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔ بہم رسیدہ کلام کا انتخاب حاضر ہے:۔

وہ میرے غم میں پسِ مرگ خاک اڑاتے ہیں	غرض یہ ہے کہ نشاں تک رہے نہ مدفن کا
تمہارا کیا ہوا نقصاں جو چوما مصحفِ رخ کو	کہ فرضِ عین تھا اک بوسہ دینا ہم کو قرآں کا
دل اس کا دوست تھا بھرتی تھی جان دم اس کا	شبِ فراق کوئی میرا غمگسار نہ تھا
کسی کے شکوہ بیجا سے فائدہ ہم کو	کہ اپنے دل ہی پہ جب اپنا اختیار نہ تھا
جز یادِ دوست کوئی نہیں دوستدارِ دل	بس ایک اس کا غم ہے فقط غمگسارِ دل
جلوہ یہ کس نے حسن کا اپنے دکھا دیا	یہ کون لے گیا مرا صبر و قرارِ دل
خالی ستم سے لطف تمہارا صنم نہیں	کب دیکھنے کو آئے ہو جب ہم میں دم نہیں
کالی گھٹائیں میکدے پر چھائی رہتی ہیں	مے نوشوں پر یہ کیا ہے جو اس کا کرم نہیں؟
اگر کچھ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے تو یہ کیا ہے	وہ ہم کو بھولے بیٹھے ہیں ہم ان کو یاد کرتے ہیں
جلانے کو ہیں وہ بجلی مٹانے کو ہیں وہ آندھی	لگا کر پہلے دل میں آگ پھر برباد کرتے ہیں

شوخ:۔ سید افسر علی صاحب قدیم وطن بلگرام ہے۔ مگر ان کے والد ماجد مولوی سید فرزند علی سانڈی ضلع ہردوئی میں جا رہے۔ اس وقت سے یہی ان کا وطن ہو گیا۔ حضرت شوخ نے طبیعت بہت چلبلی اور شوخ پائی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے استاد حضرت امیر احمد مینائی نے ان کا تخلص شوخ تجویز فرمایا۔ فارسی و عربی کی تکمیل کے بعد انہوں نے خوش نویسی، شناوری اور فن سپہ گری میں بھی کمال پیدا کیا۔ پھر انگریزی میں انٹرنس پاس کر لیا۔ شاعری کا مذاق فطری تھا۔ حضرت امیر مینائی کے فیض اصلاح سے طبیعت میں اور بھی روانی پیدا ہو گئی۔ مگر

زیادہ دنوں جناب امیرؔ سے استفادہ حاصل نہ کر سکے تھے کہ انہوں نے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد سیّد منصب علی صاحب ہنرؔ مرحوم شاگردِ رشید آفتاب الدولہ قلقؔ لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ اب طبیعت بہت منجھ گئی ہے اور اصلاح کی ضرورت باقی نہیں رہی ہردوئی میں ماسٹر ہیں۔ ہردوئی میں حکام کی طرف سے کوئی جلسہ ہوتا ہے تو یہ نظم پڑھنے کے لئے ضرور یاد کئے جاتے ہیں۔ ہندی شاعری سے بھی ذوق ہے۔ اپنے کلام کو دلکش لہجہ اور انداز سے پڑھتے ہیں۔ پرتاثیر شعر ہوتا ہے۔ زبان کی شستگی اور بیان کی سلاست شوخی اور متانت کا پہلو لئے ہوئے ہوتی ہے۔ روزمرّہ صاف ہے۔ اب انتخاب کلام نذر ناظرین ہوتا ہے: ؎

رقیب نے وہ سرِ بزم آج کھائی چوٹ
کہ یاد آ گئی ظالم کو بھی پرائی چوٹ

لطف آ جائے جو ارماں میرے باہم ہو کر
اسکے سینہ میں رہیں عشق کے محرم ہو کر

فتنہ برپا ہوا اک حشر کا عالم ہو کر
انکی پازیب کچھ اس طرح بجی چھم ہو کر

آتشِ ہجر سے جل جل کے ہٹے ہیں یوں سرد
درد و غم ہو کے اٹھے اور گرے شبنم ہو کر

کم سنی ہے وہ ابھی طرزِ جفا کیا جانیں
ناز کہتے ہیں کسے کس کو ادا کیا جانیں

لیجئے کس لئے احسانِ اطبّا سر پر
مرضِ عشق کی یہ لوگ دوا کیا جانیں

شوخ ہے آٹھ پہر دل میں حسینوں کا خیال
بندۂ عشق ہیں ہم یادِ خدا کیا جانیں

خدا کا تو ہے جو یا ہم بتوں کو رام کرتے ہیں
تو اپنا کام کر واعظ ہم اپنا کام کرتے ہیں

ہمیں گر خط لکھے کوئی خدایا ہاتھ ہی ٹوٹیں
جواب نامہ میں شوخی سے وہ ارقام کرتے ہیں

وہ ہو مئے کہ خواب میں بھی نہ مجھے خمار آئے
کوئی ایک جام ساقی کہ نئی بہار آئے

کبھی کچھ کہا جو میں نے تو بگڑ کے مجھ سے بولے
چلو چپ چلے ہیں دیکھے بڑے وضع دار آئے

ہوئی قدر سرفروشی دلِ زار واہ کیا خوب
سرِ بزم ہنس کے بولے ہم سے جاں نثار آئے

تری شوخیوں کا شکوہ کبھی شوخ منہ پہ لایا؟
تجھے اعتبار آئے کہ نہ اعتبار آئے

چونک اٹھے فتنۂ محشر کہ یہ آفت کیا ہے
شور خلخال ہے یا شور قیامت کیا ہے

ہے یہ الفت کا مزا میں تو کروں پیار نہیں
وہ کہیں مجھ سے کہ آئی تری شامت کیا ہے

اس طرح سے دل محو تصور ہے کہ ہر دم
آنکھوں میں پھرا کرتی ہے تصویر کسی کی

برق نگہ ناز کسی جا پہ نہ ٹھیری
ہاں ہاں یونہی چل جاتی ہے شمشیر کسی کی

شوخ

شوخ:- سید علی متقی خاں شوخ خلف سید علی مجتبےٰ خاں مجتبےٰ رئیس امروہہ استعداد عربی و فارسی معقول ہے۔ انگریزی بھی بقدر ضرورت جانتے ہیں۔ نہایت سلجھی ہوئی طبیعت ہے۔ اور بہت سنجیدہ مزاج ہیں۔ جس زمانہ میں مولانا محمد علی جوہر نے اول مرتبہ ہمدرد جاری کیا تھا آپ بھی عملہ ادارت میں شامل تھے۔ تقریر اور تحریر دونوں باتوں میں اچھا دخل ہے۔ میونسپل کمشنر اور سینیئر وائس چیرمین رہ چکے ہیں۔ خط بہت پاکیزہ ہے۔ فن شعر میں سید محسن حسین صاحب تخمی امروہوی سے تلمذ رہا ہے۔ ۴۰ سال کے قریب عمر ہوگی۔ عرصہ سے شغل شعر گوئی ترک ہے۔ ایک غزل جو رسالہ اعجاز امروہہ میں شائع ہوئی تھی جناب منظور حسین صاحب افسر صدیقی نے کراچی سے روانہ فرمائی ہے۔ اس کا انتخاب حاضر خدمت ناظرین ہے:-

الم کیا انتہا ہو جس الم کی
ستم کیا کوئی حد ہو جس ستم کی

زہے قسمت مرا قاتل بنا وہ
جہاں میں دھوم تھی جسکے کرم کی

پیام موت ہے حکم رہائی
ہوئی میعاد پوری قید غم کی

دکھائے صورت اس پردہ نشیں کی
تو سمجھوں کچھ حقیقت جام جم کی

اسی نے دل دکھایا خوب اے شوخ
توقع ہم نے کی جس سے کرم کی

شوخی

شوخی:- منشی نادر شاہ خاں رامپوری۔ آپ کے والد محمد ضامن خاں رامپور کے پٹھان تھے۔ شوخی دہلی میں پیدا ہوئے۔ اوائل شباب میں دہلی میں ملازمت اختیار کی مرزا غالب کا آخری زمانہ تھا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ دو چار غزلیں ان کو دکھائی تھیں۔ وسط عمر

ہیں بنارس چلے گئے جہاں نائب ناظر عدالت کلکٹری اور پیشکاری کی خدمات انجام دینے کے ساتھ مرزا صابر سے مشورہ سخن کرتے رہے کلام کو دیکھکر یہ کہنا پڑتا ہے کہ مرزا غالب کو دو چار غزلیں دکھانے اور مرزا صابر کے تلمّذ اور حضرت اسیر اور جناب منیر کے مقابل میں غزلیات پڑھنے کے باوجود آپ کا کلام مشاقی اور رسائی ذہن کا ثبوت پیش نہیں کرتا۔ انتخاب ملاحظہ ہو: ؎

ہوں کسی حالت میں پر غصہ ہی اس دلگیر پر
خود بخود بل آگیا پیشانیِ تصویر پر

آج پھر پی کر شراب آئے ہیں ان کی بزم میں
کل نکلوائے گئے تھے ہم اسی تقصیر پر

ناتوانی سے نہ پائی جب تری محفل میں راہ
پہنچے ہم چڑھ کر صدائے نالۂ دلگیر پر

حسن روز افزوں ملا اللہ کے گھر سے تجھے
اور کیا تیرے لگیں گے اوبت بے پیر پر

بجھائی تشنگی سوزِ غمِ فرقت کی کثرت نے
کہ پانی ہو گیا پھرتے ہی خنجر میری گردن پر

ہر سخن پہ جان نہ دینے کا ہے گلا
اک بات آگئی ہے بت خود نما کے ہاتھ

بنا کروں کوئی میخانہ جی میں ہے شوخی
کہ بعد مرگ زمانہ میں یادگار رہے

تلو جاسے ہے داغوں نے جلایا کفن اپنا
کہتے ہیں کہ مردے میں حرارت نہیں ہوتی

کچھ روز جوانی کے مزے لینے دے زاہد
دو چار برس میں تو قیامت نہیں ہوتی

شور شور: منشی سید استاد علی مختار عدالت متھرا ۱۸۵۹ء میں فتح پور سیکری میں پیدا ہوئے۔ سید عالم عالی ان کے والد آگرہ میں کلکٹری کے دفتر میں ملازم تھے۔ اسی وجہ سے ابتدائی مشقِ سخن میں وہاں کے نامی شعرا مثل مرزا حاتم علی بیگ مہر۔ انکے بھائی مرزا ماہ اور خلیفہ گلزار علی اسیر کی صحبت نصیب ہوئی۔ مرزا خادم حسین رئیس کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہے۔ اچھے شاعر اور قواعد فنِ عروض سے ماہر تھے اصلاح دینے میں بھی اچھا ملکہ تھا۔ منشی رادھا موہن عاجز اور منشی گوبند سہائے شیال ان کے نامی شاگردوں میں تھے۔ متھرا سے ایک رسالہ مذاقِ سخن جاری کیا تھا۔ دو دیوان عاشقانہ

ایک دیوان نعتیہ اور مثنوی افسانۂ عبرت ان سے یادگار ہے۔ انداز بیان دلکش اور طبیعت رسا پائی۔ یہ انتخاب کلام ہے:۔

محشر میں منع کرتے ہو فریاد کے لئے
یاں بھی نہ فیصلہ ہو کسی داد خواہ کا

ترچھی نگاہیں دل پہ چھری بن کے پھر گئیں
سیکھا ہے ابروؤں نے چلن ذوالفقار کا

عزم ہے تیغ آزمائی کا
اب خدا حافظ اس کلائی کا
نیکی کرتے برائی ملتی ہے
یہ زمانہ نہیں بھلائی کا

کبھی جو خواب میں حوروں سے میں دوچار رہا
خیال یار سے برسوں میں شرمسار رہا

شراب کیا وہ جسے پی کے ہوشیار رہا
وہ عشق کیا جو طبیعت پہ اختیار رہا

خطائیں داور محشر نے بخش دیں سب کی
گنہگار تمہارا گناہگار رہا

نہ دیر والوں میں عزت نہ کعبہ والوں میں
بتوں کے عشق میں کافر نہ دیندار رہا

نالۂ دل کا شب فرقت عجب انداز تھا
جس کے آگے شور محشر دور کی آواز تھا

خوف رسوائی سے آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئیں
سات پردوں میں چھپے آنسو نہیں راز تھا

کیا کر گئی جادو تری شمشیر نظر آج
آپس میں کٹے مرتے ہیں دل اور جگر آج

تنہائی میں اک تو ہی تو ہمدم ہے ہمارا
اٹھ اٹھ کے کہاں جاتا ہے اے درد جگر آج

تاثیر کی پیدا یہ مرے نالۂ دل نے
بوسے لب فریاد کے لیتا ہے اثر آج

مچلے ہوئے بیٹھے ہیں کہ دل لیکے اٹھیں گے
کیونکر انھیں سمجھائیے نادان بہت ہیں

ہنگام نزع مجکو جو آتی ہیں ہچکیاں
جھوٹے سے آج یاد کسی نے کیا نہ ہو

دل جس کو دیجئے وہی دشمن ہے جان کا
عاشق سا بدنصیب کوئی دوسرا نہ ہو

نکلا جو منہ سے میرے برا ہو رقیب کا
بولے وہ کس ادا سے کہ تیرا برا نہ ہو

شور

شور۔ محمد شفیع الدین خاں برادر خورد جناب سجادہ نشین صاحب لبکھاری کے شاگرد جلیس۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔ چند شعر جو دستیاب ہوئے نذر ناظرین ہیں:۔

اے شیخ تو شریک ہو بزم شراب میں | انکار بھی گناہ ہے کار ثواب میں
ہم اے ضبط دل کو سنبھالے ہوئے ہیں | مگر چرخ کے پار نالے ہوئے ہیں
دکھا ان کو تاثیر نالوں کی اے دل | جو کہتے ہیں دل کو سنبھالے ہوئے ہیں
مجھے دیکھ کر وہ رقیبوں سے بولے | مری بزم کے یہ نکالے ہوئے ہیں
مرید مغاں تھے ہم اے شور کل تک | مگر آج اللہ والے ہوئے ہیں

شور

شور:- مرزا محمود بیگ۔ دہلی کے قدیم باشندے تھے۔ مرزا منش اور بہت خوش مزاج شخص تھے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں قدرت اللہ شوق سے دہلی میں ملاقات کی تھی۔ بہت ہی پُرگو تھے۔ خیال کی رفعت شوخی اور متانت کے ساتھ دست و گریبان ہوتی ہے۔ یہ نمونۂ کلام ہے۔

پاس خاطر سے نہ چوسر کھیلنے میں کچھ کہا | جیت لی کل ہم سی بازی آپ نے ہاری ہوئی
آہ کھینچوں تو جلے عالم نہ کھینچوں میں جلوں | زندگی اس کشمکش میں اپنی اب بھاری ہوئی
لالہ حمرا زمیں پر آسماں پہ ہے شفق | یاں تلک اس چشم تر اپنی سے خونباری ہوئی
تیری خواہش جس نے کی تو اسکے سر پہ چڑھ گئی | کیوں رہی اے بنت العنب تو ایسی مستانی ہوئی

شور

شور: جناب رشید احمد صاحب قریشی شاگرد حکیم حنیف علی رعب شاگرد جلال لکھنوی۔ عربی ہائی سکول دہلی میں تعلیم پائی۔ شعر گوئی کی طرف قدرتی میلان ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

تم قابل خطاب تو سمجھے بھلا مجھے | اچھا بُرا ہوں میں کہے جاؤ بُرا مجھے
میں اور تشنہ کام رہوں تیرے دَور میں | آنکھوں کا صدقہ جام کوئی ساقیا مجھے
جلنے کو ناز برق اٹھائے مری بلا۔ | کیا کم ہے تیرا خندۂ دنداں نما مجھے
نہ کھلتا تھا کہ یہ دلبستگی کیوں ہے اذیت سی | جو دل چیرا تو نکلے اس میں تیرے تیر کے ٹکڑے
آوارگی نہ جائیگی جبتک ہے دم میں دم | وحشت میں ہر نفس ہے سمند ہوا مجھے

شور

شور۔ حاجی افتخار الدین مرحوم۔ آپ بدایوں کی عدالت میں وکیل تھے فن سخن میں مولوی احمد حسین وحشت بدایونی سے تلمذ تھا۔ ۱۹۲۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ۸۰ برس کی عمر پائی۔ ایک دیوان مطبوعہ ان کی یادگار ہے۔ شعر کا مذاق بہت عمدہ اور قواعد فن سے واقفیت اچھی پائی جاتی ہے۔ معاملہ کے شعر خوب کہتے ہیں۔ کلام بامزا ہوتا ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو، سہ

جلوہ افگن ہے فروغ رخ تاباں کس کا
رات دن تکتا ہے منہ مہر درخشاں کس کا

سجدۂ شوق کا ہر نقش مٹانے کے لئے
خاک پر لوٹ گیا گوشۂ داماں کس کا

چلتا ہوا فقرا ہے تری تیغ ادا کا
خود کام کرے نام ہو بدنام قضا کا

نظر بازوں میں ہے جلوہ کسی کے روئے روشن کا
فسانہ رہگیا ہے نام کو اب دشت ایمن کا

اڑا دینا وہ فقروں میں لگا لینا وہ باتوں میں
نکل جانا وہ شوخی سے چھڑا لینا وہ دامن کا

نگاہیں کام کر جاتی ہیں سب اپنا اشاروں میں
نیا چلتا ہوا جادو یہ دیکھا چشم پر فن کا

خود فروشی جو کرے یوسف دوران اپنا
نذر بیعانہ کرے دل مہ کنعاں اپنا

پھر نہیں جانتے دل لے کے ستمگر دینا
شور دل دیتے ہو ان کو تو سمجھ کر دینا

زور و شور آج دکھاتا ہے تو اے ابر بہار
ساتھ اب دیدۂ گریاں کا برابر دینا

خیال عیش تو اے چرخ کوئی خواب نہ تھا
شب وصال نہ تھی موسم شباب نہ تھا

فتنۂ حشر نیا حشر میں برپا ہوگا
ان کو بے پردہ جو دیکھیں گے تماشا ہوگا

وعدہ وصل کا اقرار نہ پورا ہوگا
آج بھی کل کی طرح وعدۂ فردا ہوگا

گیسوئے جاناں کا سودا ہوگیا
ہم کو بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہوگیا

آنکھیں چرا رہے ہیں ملاتے نہیں نظر
ملتا نہیں جواب ہمارے سوال کا

ہیں مرے دم سے جفائیں ساری
یاد کر کے مجھے پچھتائیے گا

جل بجھ کے رہگئی دل سوزاں کی کائنات
کچھ داغ سا ہے سینہ میں دل کا نشاں نہیں

مٹا رہا ہے جہاں مجکو مثلِ حرف غلط
زباں پر کبھی نہ آوں وہ داستاں ہوں میں

شریک درد ہوں ہر ایک غم رسیدہ کا
جو کوئی آہ کرے اس کا ہم زباں ہوں میں

وہ اور وعدہ وصل کا اپنی زبان سے
پیغامبر یہ بات بنائی ہوئی سی ہے

وہ آنکھیں دل جو چھینیں دلبری کی اک ادا ٹھہرے
قیامت ہو کہ شوخی بنکے آنکھوں میں حیا ٹھہرے

الٹ دو رخ سے برقع بنکے خود خورشید محشر تم
ابھی مٹتا ہے جھگڑا حشر پر کیوں فیصلہ ٹھہرے

وعدہ کبھی ملنے کا وہ پورا نہیں کرتے
جب کہئے تو کہدیتے ہیں اچھا نہیں کرتے

میری آنکھوں میں آیئے تو سہی
اپنا جلوہ دکھایئے تو سہی

سر یہ حاضر ہے میرا بسم اللہ
آپ خنجر اٹھایئے تو سہی

جاں قدموں کیساتھ جائے گی
غیر کے گھر میں جایئے تو سہی

شور ؛۔ مسٹر جارج پیش شور معروف بہ شور صاحب۔ غدر سے قریب ۴۰ سال قبل ان کے بزرگ نواح دہلی میں آئے تھے۔ اور اسلامی طرز معاشرت اختیار کر لیا تھا گو مذہبًا عیسائی رہے۔ شور صاحب اوائل مشقِ سخن میں مرزا رحیم بیگ ساکن میرٹھ سے مشورہ کرتے رہے پھر قطب الدین مشیر دہلوی اور ان کے بیٹے میاں غلام دستگیر سے اصلاح لیکر رتبہ استادی حاصل کیا۔ ہرچند پور ضلع میرٹھ اور علی گڑھ میں چند دیہات ان کی ملکیت تھی معاش کی طرف سے بیفکر اور بڑے زندہ دل یار باش خلیق متواضع منش تھے۔ شاعری کا شوق اس درجہ تھا کہ کسی وقت فکر سخن سے فارغ نہ رہتے تھے۔ ہندی زبان کی بھی مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی اکثر ٹھمریاں اور ہولیاں مشہور ہیں اردو میں صاحب تصانیف کثیر گذرے ہیں۔ چار پانچ اپنی زندگی ہی میں چھپوا کر شائع کر دئے تھے۔ ہر دیوان جناب داغ دہلوی کی ہمطرح غزلوں سے معمور ہے۔ سنہ ۱۸۸۴ میں ۷۰ سال کے قریب عمر پا کر انتقال کیا۔ کلام کا نمونہ نذر ناظرین ہے

اس کی مژگاں کا تصور دل میں ہائے
عمر بھر کانٹا سا اِک کھٹکا کیا

آزاد دو جہاں سے انسان تھا مگر
یہ سلسلہ وبال ہوا حرص و آز کا

چشموں نے اشک کو دُرِ یکتا بنا دیا
لختِ جگر کو لعل کا ٹکڑا بنا دیا

غیر کیساتھ عیادت کو وہ دلبر آیا
تو مسیحا ملک الموت کو لیکر آیا

بوسہ مانگا تو بگڑ کر بولے
مُنہ تو اپنا ذرا بنوائیے گا

یقیں ہے مجھکو کہ جیب و دامن مرا کبھو بھی نہیں رہیگا
مگر یہ دستِ جنوں سمجھ لے ہمیشہ تو بھی نہیں رہیگا

یہ باتیں کہنے کی سب ہیں زاہد جو دیکھ پائے تو اس صنم کو
تو پھر تیمم کی اصل کیا ہے ترا وضو بھی نہیں رہیگا

حُسن کی ساری خطا ہے اسمیں اس کا کیا قصور
اس کا عالم دیکھ کر دیوانہ اک عالم ہوا

لینے کی بات تو بھاتی ہے سبھی کو اکثر
تلخ ہوتا ہے مگر موت سے بڑھکر دینا

جاتی نہیں ہے اس کی کسک عمر بھر کبھی
ہر دم کھٹکتی رہتی ہے دلبر نظر کی چوٹ

ہم نے انگریزی تو پوشاک ہیں دیکھی نہ سُنی
کوٹ پتلون پہ ہیں سُرخ کلاہیں کیونکر

گلگیر نے دہان میں لی جب زبانِ شمع
پروانے جل کے ڈھیر ہوئے سب لگن کی پاس

نرگس کو تیری چشم سے چشمک ہے باغ میں
اے رشکِ گل ذرا تو اُدھر کو یہاں سے چل

جتنے بگڑتے ہم سے ہو اتنے ہی بنتے ہو
اب تم کو بنان کے چھیڑا کرینگے ہم

کفن پہ میرے نہ [illegible] کوئی ہرگز گلاب چھڑکو
مرا ہوں ساقی کی دیکھ آنکھیں شراب [illegible]

آپ ہی انصاف دشمن سے ہو کیا چشم وفا
قتل عاشق کو کرو تم اور خدا کا نام لو

سنبھل کے باغِ محبت میں پاؤں رکھنا فقیر
گلِ مراد سے یہاں پہلے خار راہ میں ہے

یہ بڑا دان ہے کھلا پھر نہ تجھ پہ اے شیخ
کہ دنیا دور مینا شیشہ و پیمانہ ہے

کہا جو میں نے وفا کر تو ہنس کے فرمایا
جفا کو چھوڑ دیں ہم آپ کی وفا کیلئے

زباں سے ترے جب نہیں ہو چکی
تو جینے کی صورت نہیں ہو چکی

غم ہمیں اور غم کو ہم کھاتے رہے
زندگی کا یہ مزا پاتے رہے

ہر بات مری وہ کا جھگڑا ہے
[illegible]

خاموش رہا تو سو سنائیں — بولا تو نہ مجھ سے گفتگو کی
نمک ایسا، حسن ایسا، زباں ایسی، نہ آنکھ ایسی — غنیمت اور اقلیموں سے ہے ہندوستاں پھر بھی
اگرچہ داغ بھی مشہور ہے شیریں کلامی میں — مگر تم شور ہو کر شور ہو شیریں زباں پھر بھی

شور:۔ سید عبدالرحیم صاحب بریلوی شاگرد جناب خواہاں۔ صفائی زباں اور سلاست سے ان کی طبیعت کو کم مناسبت ہے۔ نمونۂ کلام مندرج ہے:۔

طوق گردن میں پڑے یا پاؤں میں زنجیر ہو — زلف کے سودے میں کیا کیا دیکھئے تعزیر ہو
بوسۂ زلفِ معنبر نہیں مانگا ہے ابھی — مشکیں کسواتے ہو کیوں میری خطا سے پہلے

شور

شور:۔ پنڈت برج کشور زتشی۔ آپ بتاریخ ۶ر اکتوبر ۱۸۶۴ء بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ریاست گوالیار میں ملازم ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں اسسٹنٹ نائب دیوان مال ریاست کے عہدے سے پنشن پائی۔ اب فرائض منصبی سے سبکدوش ہو کر دہلی قیام ہے۔ اردو فارسی ہر دو زبان میں شعر خوب کہتے ہیں۔ اردو کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

میں کیا قاصد لکھوں خط میں فراقِ یار کا مضموں — عبارت طول ہو گی حرفِ مطلب مختصر ہو گا
پرستش روزِ جزا پر داد خواہی میں نے کی — کاتبِ تقدیر نے دفتر کا دفتر رکھ دیا
قدر انساں کی ہوا کرتی ہے مر جانے کے بعد — پھول سے پیدا ثمر ہوتے ہیں مرجھانے کے بعد
آپ کی نیچی نگاہیں کچھ تو کہتی ہیں ضرور — فرق آتا ہے نظر میں دل میں فرق آنے کے بعد
ہمارا دم اکھڑتا ہے وہ دم غیروں کا بھرتے ہیں — برا ہو ایسے جینے کا نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
لے چلی دل کی خلش جانبِ صحرا مجھکو — آنکھ دکھلائیگا کیا پاؤں کا چھالا مجھ کو
ساتھ آئے تھے رفاقت کو اسی دن کیلئے — چل دیے ہوش و خرد چھوڑ کے تنہا مجھ کو
بیقراری مجھے کیوں کرتی ہے رسوا دن کو — رات کیا رونے کو اے دیدۂ گریاں کم ہے

شورش

شورش:۔ میرزا منعم۔ برادر زادہ و تلمیذ میرزا محمد اکبر طبش۔ رائے لچھمی نرائن

اورنگ آبادی اپنے تذکرہ "چمنستان شعرا" میں لکھتے ہیں۔ کہ اگرچہ شورش اپنے چچا یعنی حضرت طپش کے شاگرد تھے۔ مگر ذہانت وطباعی میں اپنے استاد سے بڑھے ہوئے تھے۔ بلکہ آخر میں طپش خود اپنا کلام شورش کو دکھانے لگے تھے۔

حضرت شورش مجردانہ وقلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ علم موسیقی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ ہندی شاعری میں بھی دسترس تھا۔ فارسی واُردو میں بہت کچھ کہا۔ مگر مسودات ضایع ہو گئے۔ ۱۱۷۲ھ میں انتقال ہوا۔ لچھمی نراین شفیق نے تاریخ کہی۔ ع مرگیا آہ شورش ہمدم۔ ۱۱۷۲

دو شعر ملے جو نذر ناظرین ہیں۔

ہمارے پاس پی آیا نہ آیا	بھروسہ کیا ہے جی آیا نہ آیا
جب سنی پہا جامہ پیرہن و جیلاد سبز	تب سے پایا گلشنوں میں سرو نے ایجاد سبز

شورش: جناب غلام احمد صاحب ابن محمد اکبر۔ اصلی وطن کشمیر تھا۔ مگر آپ کا خاندان عرصۂ دراز سے دہلی میں آیا تھا۔ شورش صاحب سے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ وحسرتی کو دلی محبت تھی۔ نواب صاحب مرحوم تذکرہ گلشن بےخار میں تحریر فرماتے ہیں کہ "باداعی طریق آشنائی می سپرد" فن سخن میں آپ کو حضرت مومن سے تلمذ تھا۔ آپ مہاراجہ بختے سنگھ بہادر والی الور کے ملازم تھے۔ مرض استسقاء میں مبتلا ہو کر ۲۰ سال کی عمر میں اس خاکدان کو چھوڑ کر راہ گیر عالم بقا ہوئے ۱۹۱۲ء میں جناب فصیح نے الور سے کچھ کلام روانہ فرمایا تھا۔ اس کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

شورش

حکیم فصیح الوری

"از ترجیع بند۔ مرثیہ غدر"

عالم میں ایک شور قیامت بپا ہوا	لو آسمان ٹوٹ پڑا ہائے کیا ہوا
ہر گھر سے کیوں ہے نالۂ واحسرتا بلند	عشرت کدہ جہان کا کیوں غم سرا ہوا
تھمتی نہیں ہے اشک مسلسل کی کیوں جھڑی	کیوں چشم خوں فشاں ہے یہ کیا ماجرا ہوا

مرنے کے بعد رونے کی جن سے امید تھی	افسوس ہے انھیں کا ہمیں پیٹنا ہوا
کیوں قطرہائے اشک نہیں زیب آستیں	لخت جگر ہے آنکھ میں شاید رکا ہوا

از غزلیات

کیا جانے عدو خون جگر پینے کی لذت	شورش سے مزا پوچھئے تلخ آب الم کا
کیا قیامت ہے کہ روز حشر ہے سر روز ہجر	تھا قیامت کیلئے یارب مقرر ایک دن
ہمدم شب ہجراں میں اجل بھی تو نہیں ہے	حال اپنا کہیں کیا در و دیوار کے آگے
تا خواب میں بھی جلوہ فروز انکے نہو تو	ہم کوچۂ اغیار میں فریاد کریں گے

شورش

شورش:- میر زین العابدین خاں۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کے دوستوں میں تھے۔ ان کی شاعری کا زمانۂ شباب ۱۸۶۸ء سے ۱۸۷۲ء تک سمجھنا چاہیئے۔ مہر نے مندرجۂ ذیل غزل کو بہت پسند کیا تھا:-

ہے قرص قمر پر تو انوار کسی کا	کچھ برق میں ہے جلوۂ رخسار کسی کا
ہم محو رخ یار ہیں اوروں سے ہمیں کیا	یوسف کو خریدے نہ خریدار کسی کا
کرتے ہیں درستی شکن زلف کی یاں آپ	دم ٹوٹ رہا ہے پس دیوار کسی کا
بیفائدہ ہے چشم وفا یار سے شورش	ممکن ہی نہیں ہو وے جو وہ یار کسی کا

شوریدہ:- شیخ سلطان دین۔ برہان پور میں وطن تھا۔ ایک عرصہ تک اورنگ آباد میں بھی قیام رہا تھا۔ خط نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ پہلے سلطان تخلص کرتے تھے۔ اس کے بعد تشہیر بعد کو شوریدہ ہوگئے۔ یہ اشعار انکی طبع آزمائی کا نتیجہ ہیں

ایک رنگ میں کئی رنگ بناتا ہے رنگیلا	ہر طرح میں کئی طرح دکھاتا ہے رنگیلا
تجھ زلف کے دیکھے ستی سنبل کو گیا بھول	ہیں خود ستی بیخود ہوا بس دل کو گیا بھول
رنگین ادا سے حبیب تو گیا باغ میں سجن	ہر نقش پا میں پہ نہ تھے گل کے دستے تھے
چشم دریا سے کیوں نہ ہوں طوفاں	اشک باراں ہنوز جاری ہے

شوق

شوق:- زمانۂ قدیم کا سخن آفریں تھا۔ دنیاۓ شاعری میں اس کا نام پوشیدہ ہے۔ تذکروں کی ورق گردانی سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ باشندہ دہلی اور مرزا رفیع سودا کے شاگرد تھے۔ مشکل پسندی اور خیال بندی کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

سرشک گرم سے ہو دل کباب در تہ آب	ہوا ہے چشم کا خانہ خراب در تہ آب
غارت گروں کے ہاتھ سے مانند طفل اشک	جاتا ہوں نقد دل کو میں آگے دھرے ہوئے

بقیہ کلام جناب منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی متعلق صفحہ ۱۰۹

جادو کہ اثر کرے نظر پر	حسن	بجلی کہ گرے دل و جگر پر
تنگی ہے دہان تنگ میں تو		سرخی ہونٹوں کے رنگ میں تو
شوخی کی ادا میں شان تیری		دامان حیا میں آن تیری
تو سرمۂ چشم فتنہ پیکر		تو رنگ حنائے دست دلبر
سج دھج تو ہے نکھار تو ہے		زیور تو ہے سنگار تو ہے
سادہ رہے تو ہے لطف اسی میں		ہیں لاکھ بناؤ سادگی میں
بہار باغ بنکر چھپٹ پڑا ہے حسن پھولوں پہ	بہار	ہوا سے اٹھتی ہیں شاخیں کہ گل بیٹھے ہیں جھولوں پہ
بہار آخر یہ کیا شے ڈھونڈتی پھرتی ہے دنیا میں		کہ بقچی ہر کلی کی کھولتی ہے دشت و صحرا میں
شجر میں گل کو دیکھو کیا گلابی رنگ اس کا ہے		شباب اسکے بدن سے رنگ بنکر پھوٹ نکلا ہے
بہار ایسی ہے ریلیں گل ہے صحرا اور گلشن میں		کہ دنیا بھر کے پھولوں کو لے بیٹھی ہے دامن میں
ہوا کچھ ایسی وارفتہ ہے حسن سبزۂ تر پر		نچھاور کرتی ہے شبنم کے موتی سبزے کے سر پہ
پھولوں سے جھبے جھولاتی ہیں کہ پتے چھوٹے چھوٹے ہیں		کھڑے ہیں شوق ہنستے ہیں کہ گل پیڑ پہ پڑے ہیں
شادی میں مینڈک بجاتے ہیں سرود آواز سے	برسات	رقص کرتی ہیں بطیں تالاب میں کس ناز سے
وہ ہوا نے زور باندھا اور بادل ہٹ گیا		کھل گیا خورشید کا چہرہ کہ پردہ پھٹ گیا

بچھ گیا ہے دھوپ میں سونے کا پتّر ہر طرف
خوب ہے ساقی ہیں کرنیں ہُن زمیں پر ہر طرف

صحن سونے کا ہے چھت سونے کی گھر سونے کے ہیں
پھول پھل پتے ہیں سونے کے شجر سونے کے ہیں

کیمیا گر ہے مگر عالم میں خورشید فلک
جسکی صنعت سی پہاڑ و بن ہی سونے کی چمک

مختلف چڑیاں اُڑیں کوّے اُڑے چیلیں اڑیں
اپنے اپنے آشیانے سے ابابیلیں اُڑیں

شوق

شوق :- حافظ غلام رسول نام شاگرد حضرت شاہ نصیر دہلوی۔ طبع رسا اور فکر رنگین رکھتے تھے۔ استاد کی طرح سنگلاخ زمینوں میں کئی کئی غزلیں کہکر فصاحت کے پہاڑ کو چیر کر جواہر آبدار نکال لیتے ہیں۔ خداداد ذہن اور زور طبیعت سے پتھر کو پانی کر دکھاتے ہیں۔ مشّاق اور باکمال شاعر تھے۔ روزمرّہ زبان اور محاورات کی اصلیّت سے ماہر تھے۔ جب استاد کے طرز سے الگ ہوکر کہتے تو بیان سادگی اور سلاست سے مربوط ہوتا۔ نکتہ سنج۔ معنی طراز اپنے معاصرین میں ممتاز۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں کابلی دروازہ کی مسجد کے امام تھے۔ خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق نے ابتداء میں آپ ہی سے اصلاح لی ہے۔ اور یہی ایک شاگرد اُن کے لئے صدہا شاگردوں کے برابر اور فخر استاد تھا۔ حافظ صاحب نے ۱۲۷۲ھ میں وفات پائی۔ آپ کا ناتمام قلمی دیوان مؤلف کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ زمانۂ حاضر کے نقّاد عطف و اضافت کے بعد اعلان نون دیکھکر مسکرائیں۔ مگر زبان کا قابلِ قدر سرمایہ محاورات اور امثال کا خزانہ انہیں زمینوں میں مدفون پائیں گے۔ جس ایجاد کا سہرا ان کے سر ہے۔ آپ کے باندھے ہوئے محاورات میں نہ قیاسِ نحوی کو دخل ہوسکتا ہے۔ نہ ضمیر متکلم و غائب کی جستجو کام آسکتی ہے۔ کیونکہ عام نظر سے ان کی تصحیح مخلِ فصاحت ہوجائیگی۔ بعض الفاظ اصل میں جمع ہیں۔ مگر محاورہ میں مفرد ہیں مثلاً۔

لائے ہیں بجا ہم تو اسے اے شہِ خوباں | سرکار سے اب جو کہ ہے احکام نکلتا

اسی طرح بعض الفاظ مفرد ہیں۔ لیکن محاورہ میں جمع بولے جاتے ہیں حافظ صاحب

کے دیوان میں ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ اور کلام پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے ایک ماہرِ فن کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ آپ کو روزمرّہ اور محاورات انتخاب کرنیکا خداداد ملکہ تھا اور انہیں صرف کرنیکا عمدہ سلیقہ۔ آپ کے فیض صحبت سے حضرت ذوق کو یہی بات ہاتھ آگئی تھی۔

جناب شوق کے کلام میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہیں جو اس زمانے کے شاعر کا مایۂ ناز ہو سکتی ہیں۔ مگر انتہائے سادگی میں نہ میر کا درد ہے۔ نہ درد جیسا سوز و گداز۔ رعایت لفظی کا شوق کہیں کہیں کلام کو بدمزا بھی کر دیتا ہے۔ مشکل زمینوں میں توسن طبع کو دوڑاتے چلے جاتے ہیں۔ قدیم خیالات ذرّوں کی طرح چمک اٹھتے ہیں۔ دیکھو پری رخان کہن کا بانکپن دکھانے میں کیا غضب ڈھاتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ؎

گھر سے قشقہ کھینچ کر نکلے لالہ رخاں کیا صندل کا	جادو آنکھیں شوخ نگاہیں قہر ہے ڈورا کاجل کا

پرانے آدمی تھے۔ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ محاورات و امثال کے ردّ و بدل کئے جانے سے غرابت لفظی کا عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے انہیں بجنسہٖ نظم کر دیتے تھے۔ فرماتے ہیں: ؎

ٹھہرا ہے دل کا تجھ سے کیا زلف یار سودا	اپنی تو وہ مثل ہے اک سر ہزار سودا

زبان کے بہترین نمونے ان کے کلام فصاحت نظام میں موجود ہیں۔ غزلیات کا انتخاب یہ ہے: ؎

کیا ہے جمع جو تقدیر نے دفتر گناہوں کا	لکھا کیا ہوگا آخر دیکھئے ہم روسیاہوں کا
سیہ خیمہ نہیں استادہ ہے لیلیٰ کے مرقد پہ	گھٹا سا چھا رہا ہے یہ دھواں مجنوں کی آہوں کا
خال اسکے لب نہیں ہے رخِ آتش پہ شوق	آتش پہ دھر دیا ہے یہ دانہ سپند کا
کعبۂ دل کو مرے ظلمت سے ڈھایا تم نے	کچھ خدا کا بھی تو اپنے تمہیں ڈر نہ ہوا
زلفوں سے اگر دل کو سروکار نہ ہوتا	سچ ہے کہ بلاؤں میں گرفتار نہ ہوتا

نہیں بہنر سنانا اے فلک اتنا غریبوں کا
ستاتا ہر گھڑی تو کس لئے عاشق کو ہی اپنے

رُخ زرد ہے یہ تیرے بیمار ناتواں کا
عالم نہ توڑ لو کہیں گریہ کو ضبط کر

مزا ہے اسلئے گھر گھر کے تجھ کو جانے کا
بسانِ نقشِ پا کوچہ سے میں ہرگز نہ اٹھونگا

نہ شب کو خواب ہی یاں اور نہ دل کو ہی آرام
پیدا کریں گے ہم بھی کہیں اور دل لگی

سمجھی ہے تو سراسر اُس کو وبالِ گردن
موسم بھی پھرا اور زمانہ کی ہوا بھی

بدنام ہوا ہیں تو ترے عشق میں اے یار
جا پڑا اس زلف پر شب کیا ہوا پلٹے خیال

مہر سے صد چند رتبہ کیوں نہ ہو اس کا بلند
دل جسکو دیا ہم نے ہوا دشمنِ جاں وہ

استاد نصیر آپ یہ تفضّل سے تمہارے
اُلجھ رہے ہیں وہ زلفوں کے تارِ دل سی مرے

لکھا ہوا ہے یہ اس مہ جبیں کے پردہ پر
مرے مزار کے تم گرد کھینچ دو دیوار

نگاہ اس کو نہیں میری زندگانی پر
آتا نہیں جو وعدہ خلافی سے صنم باز

جھانکے ہی اس ذقن کو جو پہلو سے خوب دل
کہیں کیا تیری بیرحمی کو ہم لکھا نصیبوں کا

سمجھ دل اور کا بھی غیرت مہتاب اپنا سا
شرمندہ جس کے آگے تختہ ہے زعفراں کا

اے چشم اشک بار بس اب تار مت لگا
ہے بر میں شوخ ترے جامہ چار خانے کا

اگر تم یاں سے اب مجھ کو نکالو گے تو کیا ہوگا
ترے فراق میں اب چین اُڑ گیا دل کا

صاحب سے جب سلام و پیام اور کا ہوا
اے شمع تجھ کو سر پر رکھ تاجِ زر نہ آیا

لیکن وہ مرا سامنے گلفام نہ آیا
اور لب پہ ترے حیف مرا نام نہ آیا

سانپ تاریکی میں آجائے ہے اکثر زیر پا
جس کے آیا ہو دلا دوشِ پیمبر زیر پا

افسوس زمانے میں کوئی کام نہ آیا
ہوتا چلا عالم میں سخن عام ہمارا

گرو کو مانے ہیں یہ اپنے بالکے کیسا
نہیں ہے کوئی اب البساز میں کے پردہ پر

موا ہوں میں کسی پردہ نشیں کے پردہ پر
ہزار حیف ہے اب ایسی زندگانی پر

بتلاؤں میں کیا اسکو وہ ہے ایک ہی دم باز
ڈرتا ہوں میں کنوئیں نہ اب جائے ڈوب دل

ابرو و چین جبیں وتل۔ در و زنجیر و قفل
مصر تن کے بنینگے یہ اے دل در و زنجیر و قفل

ہیں کلید عقل ہوں ملک سخن ہیں آج شوق
ہیں مرے آگے نہ کچھ مشکل در و زنجیر و قفل

لٹ دھوئیں کی ہے سر شعلہ کہاں شمع لگن
سر کے کھوئے ہی کھڑی محفل دلداریں بال

سودائی خبطی۔ وحشی پکارے ہیں سب مجھے
کیا کیا رکھے ہیں اس نے مرے جنکے نام تین

بوسہ جب اسکے چشم و رخ ولب کا لوگے شوق
جھک کر کرونگا آپ کو تب میں سلام تین

چٹ پٹ ترا بیمار ہوا تین ہی دن میں
اس واسطے اے شوخ کہیں حرف اجل تین

غربت میں سنا کوہکن و وامق و مجنوں
بھائی مرے ای عشق یہ ہیں پگڑی بدل تین

فوج الم سے یاں ہیں مقابل جان پر اپنی کھیلے ہیں
ہجر میں تیری آفاتیں ہم کیا کیا سر پہ جھیلے ہیں

لاکھ طرح کا عالم اپنی نظروں سے یاں گذرے ہے
سیر تماشے کو ہم جاتے اب جو میلے ٹھیلے ہیں

تری عشق میں ہوں میں جاں بلب کی تجھ ہی سے بس طلب
ادھر آکے گاہ تو غنچہ لب ذرا لب سے لب تو ملا کہیں

موسم گل میں تیرے بدولت سیر چمن کر لیویں ذرا
کنج قفس سے اب تو رہا کر آہ ہمیں صیاد کہیں

کریں تحسیں سخنداں کیوں نہ ہر اک شعر پر اپنے
کہ طرز گفتگو ہم شوق استادانہ رکھتے ہیں

رنگترے کی تعریف

مزا انگور کا ہے رنگترے میں
عسل زنبور کا ہے رنگترے میں

ہیں اشعار ہلالی اس کی پھانکیں
یہ مضمون دور کا ہے رنگترے میں

نہیں ہے اسکی پھانکوں میں یہ ریزہ
یہ لشکر مور کا ہے رنگترے میں

ہے گلگون مجسم یا بھرا خون
کسی مہجور کا ہے رنگترے میں

ہر دم نہ گالیاں دے بت بے حجاب تو
بولوں گا میں تو ہوگا ابھی لاجواب تو

گذرے صبا اگر ادھر کہیو ہمارے یار کو
بھول گیا ہے دل سے کیا عاشق غمگسار کو

قطرۂ مے سے ہیں اگر چور نشے میں ہوں تو کیا
جام شراب ساقیا بھر کے پلا جو ہو سو ہو

چھوڑ کے عارض پہ اب زلفِ سیاہ فام تو
یار دکھا دے بہم تک سحر و شام تو

مارے خوشی کے جی میں نہ پھولا سمایا قیس
آئی اُسے جو ناقۂ لیلےٰ کی بن میں بو

اس ڈھب سے جا کے خط اسے قاصد تو دیجیو
چھوٹے کہیں نہ اس کی ذرا انجمن میں بو

کہئے نہ کیونکہ طوطیِ ہند آج تجھ کو شوقؔ
خسرو کی صاف نکلے ہے تیری سخن میں بو

رکھ دے بس اپنے ہاتھ سے اے یار آئینہ
حیران ہوگا دیکھ نہ ہر بار آئینہ

قہر کی ڈالی جب اس نے عاشقِ مضطر پہ آنکھ
گاہ تکتا تھا ادھر کو گاہ تیغ و خنجر پہ آنکھ

مت سمجھ ساقی سرِ گرداب تو اس کو حباب
جھک رہی ہے یہ کسی میخوار کی ساغر پہ آنکھ

کیا زلف سے گونج الجھی اس کان کی بالے کی
بانہی پہ لڑائی ہے بچھو سے یہ کالے کی

کشتِ دلِ عاشق کی دشمن ہے یہ آہِ سرد
کیا خاک جلی کھیتی سرسبز ہو پالے کی

ہم خار سے آنکھوں میں کھٹکتے نہ کسی کی
گر بار نہ اس یارِ گل اندام کے ہوتے

خاکستر اب تمام بدن پر لگائیے
اس عشق میں بس آپ کو جوگی بنائیے

سرسبز باغ ان کو اب ایسا دکھائیے
اِک دم میں بس ہتھیلی پہ سرسوں جمائیے

پڑھ پڑھ کے روز سورتِ اخلاص کیجے دم
قابو میں اپنے ان کو اسی دم میں لائیے

جی چاہتا ہے مجلسِ رندان میں جائیے
مئے پی کے آج خوب سی دھوم میں مچائیے

اے چشم لختِ دل کا کچھ اپنی نہیں بہا
یہ لعلِ بے بہا ہے اسے مت بہائیے

قدم رکھے ہے عجب ناز سے بتِ بدمست
نشے میں چور ہے اور ہاتھ میں گلابی ہے

درنگ آنے میں تیرے جو لمحہ بھر ہو جائے
نہ پائے تو مجھے بستر پہ یاں سحر ہو جائے

کرے جو دیدۂ پرنم سے اپنے ہم چشمی
تو پانی پانی خجالت سے ابرِ تر ہو جائے

مالا جپے ہے اشکِ مسلسل کی چشمِ نم
تسبیح بھی ہوئی ہے کہیں بن امام کی

بھر جا ند بات کی نہیں اس سے مجھ سے شوقؔ
کھا کر قسم میں کہتا ہوں تیسوں کلام کی

دل کہاں رشکِ پری زلفِ گرہ گیر میں ہے
قید دیوانہ ترا خانۂ زنجیر میں ہے

روبرو جس کے بھرے تیغ صفاہاں پانی	کاٹ ابرو کی میاں وہ تری شمشیر میں ہے

شوق

شوق:- محمد قدرت اللہ شوق ابن شیخ قبول محمد صدیقی قصبہ موی مضافات سنبھل کے رہنے والے اور شیخ کریم اللہ شہید کی اولاد سے تھے۔ علوم درسیہ کی تکمیل مولوی غلام طیب ساکن صوبہ بہار سے کی تھی اور فن شعر میں مولوی قیام الدین قائم چاندپوری سے تلمذ تھا۔ نیک طینت بزرگ تھے۔ صاحب تلامذہ کثیر ہوئے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ ان سے یادگار ہے جس کا نام طبقات الشعراء ہے جو مولف کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ افسوس ہے کہ یہ تذکرہ اب تک طبع نہیں ہوا۔ شاعروں کے متعلق آپ اپنے زمانہ کے بہترین محققوں میں تھے۔ تذکرہ طبقات الشعراء کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ معاصرین اور قدما کے حالات اور کلام کی تفتیش و تحقیق میں آپ نے بہت کاوش کی ہے۔

شوق طبیعت دار اور پرگو شاعر تھے۔ باعتبار زمانہ اپنے رنگ میں یکتا تھے آج کل کے متروکات اس وقت فصاحت کی جان سمجھے جاتے تھے کبھی قدرت بھی تخلص کرتے تھے۔ ان کا دیوان مرتب ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۲۳۲ھ میں انتقال کیا۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو

دین و دل صبر و قرار و خرد و تاب و تواں	گھر کا گھر لٹ گیا اور ہم سے بچایا نہ گیا
کیا کہیں کتنے تو کر بیٹھے ہیں اس بت سے نگاہ	ایسا روٹھا وہ کہ پھر ہم سے منایا نہ گیا
سوچتیں لاکھ فسوں ہم نے ہزاروں ہی کئے	اس پری زاد پہ پھر ہم سے بھی سایہ نہ گیا
کیا دل کافر مرا ہر دو دیر و کعبہ سے ہے	نہ بتوں سے ربط اس کو نہ خدا سے آشنا
دین تو کھویا ہے دنیا بھی نہ کی کچھ حاصل	شوق ناکارہ ادھر کا نہ ادھر کا نکلا
دربدر خاک بسر جب سے ہی دیکھا شب و روز	مثل خورشید جو تا لب کوئی زر کا نکلا
اس ضعف کو پہنچا ہے ترے ہجر میں قدرت	نے نالہ نہ آہ ہے نہ طاقت ہے فغاں کا
رکھتا تھے ترے ہجر میں جی ان سے نہ وبال	کیا دل سے جدا ... [illegible]

کیا عشق ہی ہوتا ہے الٰہی مرض الموت
جس رنج کو سنتے ہیں نہ دارو نہ دوا کا

گر اسی طور نت ستائے گا
کس توقع پہ دل لگائے گا

وسعت دل یہ چاہتی ہے مری
لامکاں پہ مکاں بنائے گا

ہے جلوہ حق شوق کی چہرہ سے نمودار
لیتا ہے کوئی جس طرح اوتار اُتارا

اٹھا ہے مجھے لیکے پھر آج دل
غضب کا یہ مارا کدھر جائیگا

ق
کہی اس سے قاصد نے کل جا یہ بات
جو تو ٹک تسلّی نہ کر جائے گا

کوئی دم کا مہمان ہے شوق آج
سفر پھر وہ دنیا سے کر جائیگا

لگا کہنے سنکر وہ بیگانہ خو
بلا سے مری گر وہ مر جائے گا

کٹی عمر جس طرح حسرت میں سب
تو یہ دن بھی دم میں گذر جائیگا

جو کل سیر چمن کو گھر سے وہ غنچہ دہاں نکلا
پھٹا گل کا جگر سینہ سے بلبل کے فغاں نکلا

کرے ہے آجکل مدت سے وہ وعدہ خلاف اتنک
کٹی عمر انتظاری میں نہ آج آیا نہ کل آیا

مغفرت ہاتھ باندھکر آئی
دیکھ میرے گناہ کی کثرت

ہنسی آتی ہے مجھکو بات پر اسکی کہ کہتا ہے
فلانا رونا ہی رہتا ہے پوچھو تو یہ کیا باعث

حافظ ہے خدا اس کا کہ ہوں جس پہ یہ آفات
غم جور و الم ظلم و ستم آہ و فغاں درد

ہوا ہوں بسمل تیغ ندامت کھول زلفوں کو
خدا کا واسطہ ٹک ڈالیو یہ دام دم لیکر

سنے تجھ گلی میں شور و فغاں جان ہم تلک
یہ دھوئیں دیکھتے ہو مرے دم قدم تلک

اے شوق تیرے شعر کی اب تو پڑی ہے دھوم
سودا و میر و قائم و درد و الم تلک

میرے ملنے سیتی اتنا پرہیز
بل بے غیرت اسے کیا کہتے ہیں

آہ ایک دم نہ رہی صحبت یاراں باقی
رہ گئے دل میں مرے داغ ہزاراں باقی

جیوں جیوں چاہیں اسے تیوں تیوں خودآرائی ہوئی
خود پرستی خودنمائی تس پہ خودرائی ہوئی

دلربا دلدار دلبر کیوں نہ سب اس کو کہیں
دلبری کے فن میں حاصل جسکو یکتائی ہوئی

سانپ کی سی لہر اک دل پہ مری پھر جائے شوق
یاد آتی ہے جب اسکی زلف بل کھائی ہوئی

کیا کہوں اپنے میں اس رشکِ چمن کی خوبی
غنچے گل کھاتے ہیں دیکھ اسکے دہن کی خوبی

موجزن جب سے دو آبہ مری چشموں کا ہوا
گر گئی نظروں سے سب گنگ و جمن کی خوبی

گل کترتا ہے ہر اک بات میں تو تو اے شوق
کیا بیاں کیجے ترے طرزِ سخن کی خوبی

ہزاروں صورتیں دیکھیں پہ یہ نقشہ نرالا ہے
یہ قدرت نے شاید آپکو سانچے میں ڈھالا ہے

ہر اک عضو اس کا جو دیکھو تو عالم سے نرالا ہے
غضب جوڑا عجب مکھڑا ستم کانوں کا بالا ہے

کہے ہے شوق کے اشعار سن جرأت یہ حسرت سے
عجب انداز ہے کچھ اسکی کیا ہی کہنے والا ہے

غافل تجھے کرتا ہے یہ گھڑیال منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

مثلِ گل لاکھ رکھئے پردے میں
بوئے الفت چھپی نہیں رہتی

اے خدا یوں بھی کبھی تیری خدائی ہوگی
کہ مجھے اسکی جدائی سے جدائی ہوگی

شوق

شوق :۔ رائے ٹھاکر پرشاد صاحب کھتری حیدرآبادی۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کے عزیزوں میں ہیں۔ رسالہ آصفی جو مہاراجہ صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کے مہتمم رہ چکے ہیں۔ طبیعت شوخ زبان شستہ ہے:۔

جب کہا میں نے کہ مرتا ہوں تو بولے ہنسکر
کہیں منہ سے بھی کہا کرتے ہیں مرنیوالے

حسن اور عشق کا جھگڑا نہ مٹے گا تا حشر
ہار کر بیٹھ رہے فیصلہ کرنیوالے

بے کسی رو کے جنازہ پہ مرے کہتی ہے
چھوڑ کر مجھ کو کہاں جاتا ہے مرنیوالے

شوق

شوق :۔ منشی غلام محمد عرب حیدرآبادی۔ صیغہ دار محکمہ معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ حیدرآباد۔ ان کے آبا و اجداد عرب سے آکر سرکار آصفی میں ملازم ہوئے۔ میرزا محمد سلطان غافل دہلوی سے تلمذ ہے۔ ۱۲[illegible]ھ سال ولادت ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

پائے نظارہ رخ کی صفائی سے پھسل گیا
دل گرتے گرتے چاہِ ذقن میں سنبھل گیا

[illegible] میں سر کے [illegible] درست [illegible] ہوا
[illegible] راست [illegible] کا جو نقطہ وہ خلل گیا

لاکھوں فتنے اُٹھے ہنگامہ ہُوا۔ صور پھنکا
آبِ خنجر سے ترے ہوگئے لاکھوں سیراب

عرصۂ حشر مگر کوچۂ جاناں نہ ہُوا
شوقؔ مقتل سے مگر تشنہ گلو آتا ہے

شوق: ۔مولوی منشی سید حسن عطا صاحب خلف الصدق مولوی قاضی احسان اللہ صاحب عباسی ساکن سندیلہ آپ کا خاندان باعتبار شرافت علمی و نسبی ممتاز رہا ہے۔ آپ کے جدِّ امجد حضرت ملک العلماء قاضی القضاۃ قاضی نظام الدین صاحب عالمگیر بادشاہ کے شاہزادوں کی تعلیم کی خدمت پر ممتاز ہوئے تھے۔ اس خدمت کے صِلہ میں گیارہ موضعے معافی میں مرحمت ہوئے۔ جن کو ایامِ غدر کے قبل ہی آپس کی خانہ جنگیوں کے باعث مولانا منشی حسن عطا صاحب کے پردادا جناب قاضی بشارت اللہ صاحب نے چھوڑ کر اپنے نانہال قصبہ سندیلہ میں آکر سکونت اختیار کی۔ جناب شوقؔ صاحب دیوان تھے۔ اور علاوہ دیوان کے فنون میں کئی رسالے تصنیف فرمائے تھے۔ مگر سب کلام غیر مطبوعہ رہا۔ آپ کا قلمی دیوان مولوی منشی محمد جعفر حسین صاحب زہری خیرآبادی کے پاس محفوظ ہے۔ آپ کا کلام معمولی ہے۔ تخئیل اور اسلوب کی چستی و دلاویزی ناپید ہے۔ ہاں رعایت لفظی سے کوئی شعر خالی نہیں نظر آتا۔ ستّر سال کی عمر پاکر ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔

ہے خطِ چینِ جبیں یا مد ہے بسم اللہ کا
مصحفِ رخسار ہے یا دل کلام اللہ کا

باتوں ہی باتوں میں دیکھا تم نے کوہِ طور پر
ہوگیا تھا حال کیا موسٰی کلیم اللہ کا

ذاتِ واحد خطاب ہے تیرا
ہر دو عالم حجاب ہے تیرا

سب جگہ اور پھر کہیں بھی نہیں
یہ عجب کچھ حساب ہے تیرا

مَیں کہتا ہوں کچھ اور وہ فرماتے ہیں کچھ اور
ڈرتا ہوں کہ پیدا نہ ہو تکرار کی صورت

آتا ہے عیادت کیلئے جب وہ مسیحا
اک دم میں بدل جاتی ہے بیمار کی صورت

اے جنوں ممنونِ عشقِ یار ہیں
اک گریباں کے ہزاروں تار ہیں

طور پر موسیٰ آئے تھے اک مشتاقِ دید | یاں ہزاروں طالبِ دیدار ہیں

لڑائی ہو رہی ہر وصل میں حسرت سے ارمان سے | یہ کہتی ہے کہ ہم نکلے وہ کہتا ہے کہ ہم نکلے

گرے مردے نہیں کے جی اٹھے فیضِ کفِ پا سے | اگر بت خانہ سے باہر وہ بت وا اک قدم نکلے

نہ آئینگے نہ آئینگے یہی کہتے ہیں وہ ہر دم | مرے چاہے جب کوئی کس کا چاہے دم نکلے

برق وش مانگ تری مدِ نظر ہوتی ہے | رات جب نصف ادھر نصف ادھر ہوتی ہے

وہ سیہ بخت ہوں پروانے بجھا دیتے ہیں | شمع روشن مری تربت پہ اگر ہوتی ہے

ہجر میں نیند کہاں بس یہی رہتا ہے خیال | رات کب کٹتی ہے کس وقت سحر ہوتی ہے

شوق **شوق**:۔ شیخ عبد الرحمن صاحب ساکن پیلی بھیت۔ قاضی ممتاز حسین ممتاز مرحوم کے تلامذہ سے ہیں۔ صنائع بدائع سے واقف ہیں۔ تشبیہات اور استعارات میں سیدھے سادے مطالب کو ادا کرتے ہیں۔ کلام یہ ہے:۔

آتشِ گل کا نہ اتنا وصف کر گلزار میں | آبلہ پڑ جانے کا بلبل تری منقار میں

زلف اس کی میں نے جب چھو لی تو جھنجھلا کر کہا | ہاتھ کیوں دیتا ہے او نادان دہانِ مار میں

شوق **شوق**:۔ محمد مراد علی صاحب لکھنوی۔ شاگرد حضرت اسیر مرحوم۔ مولوی سید فضل رسول صاحب بہادر واصلی تعلقہ دار سندیلہ خیال بند حضور سے تھے قدیم لکھنؤ کے نوبہ پر شعر کہتے تھے۔ رعایت لفظی کو حسنِ سخن جانتے تھے۔ زبان تاثیر سے خالی تھی مگر مبالغہ کی دھوم دھام سے تخیل کا پایہ بلند تھا۔ ۱۳۲۲ھ کے بعد انتقال کیا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

موسمِ گل میں فرشتہ رند کو | پاس [illegible] کا لہو حلال ہوا

[illegible] | [illegible] نثار ہیں

[illegible] | [illegible] جاتے ہیں

[illegible] | [illegible] جاتے ہیں

اللہ ری پردہ داریِ اُلفت کہ راہ سے
اب نقش پائے غیر بھی مٹوائے جاتے ہیں

ہوا ہے قطع تعلق تمام دنیا سے
بس ایک دل میں تمنائے وصل یار رہی

تڑپ تڑپ کے کٹی رات کس مصیبت سے
شبِ فراق میں کیا جان بیقرار رہی

اشک رو رو کے بہاتی ہیں قفس میں صیّاد
ہم اسیروں کو یہی دانہ یہی پانی ہے

شوق

شوق:۔ منشی عبدالعزیز صاحب ساکن دینانگر۔ شاگرد حضرت احسان مرحوم شاہجہانپوری۔ زبان کی صفائی کا لحاظ رکھتے ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے: ؎

وہ مری لاش پہ کس ناز سے آکر بولے
روٹھ جائے جو کوئی اس کو منائیں کیونکر

کیا لیگا یہاں آکے بھلا ناوکِ دلدوز
اب خونِ تمنا بھی مرے دل میں نہیں ہے

اے چرخ مری لاش کو مل جائے جو تربت
اتنی بھی زمیں کوچۂ قاتل میں نہیں ہے

شوق

شوق:۔ بابو آنندی پرشاد صاحب کھتری مرحوم دہلوی۔ خلف رائے شنکر رائے۔ انگریزی اور فارسی کے ماہر اور کسی قدر سنسکرت سے واقف تھے۔ نہایت متواضع خوش سلیقہ نیک کردار خوش گفتار شاعر تھے۔ فنِ سخن میں مرزا سالک مرحوم سے مستفید ہوئے۔ کچھ دنوں نہر کے دفتر میں ملازمت کرنے کے بعد ۱۲۹۸ھ میں ۲۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ موزوں طبع نوجوان تھے۔ خیالات میں جدّت زبان میں سلاست تھی۔ کلام میں مزا تھا۔ انتخاب یہ ہے: ؎

شوق دیوانہ ہے اے حضرت ناصح بیشک
ہرزہ گوئی میں مگر آپ سے کمتر ہوگا

زہر کھالوں کہ ہو سچ جھوٹ سب اسکا معلوم
شہر میں شہرہ ہے اس بت کی مسیحائی کا

رہبرِ راہ عدم کیونکہ نہ قاتل کو کہوں
دمِ شمشیر ہوا جادہ منزل میرا

اک وہ کہ ان کے ظلم کی عالم میں دھاک ہے
اک ہم کہ شہر شہر میں شہرے وفا کے ہیں

قانونِ عشق و رسمِ محبت کو دیکھئے
مجھ سے گلے انہیں مری مہر و وفا کے ہیں

آجائے موت بھی تو یہ جانوں کہ وہ بھی آئے
بگڑیں ہیں یہ کچھ ہوا اس مرے اضطراب میں

نازشں ہے اپنے حسن پہ جتنی کہ آپ کو	کچھ اس سے کم نہیں ہے غرورِ وفا مجھے
کچھ رشک لطف غیر سے کچھ رنج ہجر سے	آتا ہے یاد آپ کا عہد وفا مجھے

شوق

شوق:- مولوی محمد حسن صاحب ساکن بچھرایوں ضلع مراد آباد۔ ولد مولوی احمد حسن رئیس۔ مولوی نجم الدین برق مرحوم کے تلامذہ سے ہیں۔ سلسلۂ شاعری حکیم مومن خاں تک پہنچتا ہے۔ شعر گوئی کا شوق ہے مگر اپنے کلام کی طرف سے بالکل بے پروا ہیں۔ بندشیں اچھی۔ مضامین عمدہ۔ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات نکلتی ہے چند متفرق شعر جو انہیں یاد تھے۔ مؤلف کو لکھوا دئے انہیں کو ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے:-

میسر ہی نہیں ہوتی رسائی اسکے دامن تک	پچھڑا ہوں خاک ہو کر ہم نشیں ہیں کو بکو برسوں
بیدار ہوں میں یارب یا خواب دیکھتا ہوں	وہ آج جلوہ فرما میرے مکان پر ہیں۔
مرے ارمان و حسرت کا خلاصہ یہ ہے بتلا دوں	کہ میرے اس دل پُر آرزو کا مدعا تم ہو
کہا تھا غیر کا شکوہ کہ اب اس سے نہ ملئے گا۔	خفا ہو کر یہ فرمایا بڑے ہی کج ادا تم ہو
وہ بالیں پہ آئے قضا بھی کھڑی ہے	ہے وقت دعا اب یہ نازک گھڑی ہے
دامن کے ٹکڑے جیب کے پرزے کریں گے ہم	آرائش جنوں کا یہ زیور بنائیں گے
سُرمہ نے اور آنکھ کو خوں ریز کر دیا	کیا وہ نگاہ ناز کو خنجر بنائیں گے
ساقی یہ اپنا جام و سبو تو اٹھا الگ	ہم ماہ و آفتاب کو ساغر بنائیں گے
دونو شہید غمزۂ سفاک ہو گئے	تربت دل و جگر کی برابر بنائیں گے
مضطر ادھر جگر ہے اُدھر بیقرار دل	ناوک تری نظر کے کہاں گھر بنائیں گے

شوق

شوق:- منشی نصیر احمد خاں خلف شفاعت احمد خاں۔ باشندہ رام پور تلمیذ حضرت داغ ملازم ریاست بھوپال۔ استاد کا رنگ تو ہاتھ نہ آیا۔ مگر ضروریات غزل سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ زبان اچھی ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

اپنی تصویر بھی بھیجی نہ تسلّی کے لئے
کسی صورت سے میرے دل کو بہلنے نہ دیا

یہ عجب کام کیا برقِ تجلّی نے تری
طور پر طالبِ دیدار کو جلنے نہ دیا

قتل کرتا رہے وہ زندہ بھی کرتا جائے
حشر تک یونہی رہیں خنجر و سر دونوں ساتھ

تیر دل میں جو لگایا تو جگر میں پیکاں
ہائے گھائل ہوئے دل اور جگر دونوں ساتھ

پھر دل میں قیامت کی خلش ہونے لگی شوق
پھر چٹکیاں لینے لگی بیداد کسی کی

شوق

شوق: حسن علی خاں دہلوی۔ خاں آرزو کے شاگرد نواب عماد الملک غازی الدین کے رشتہ دار، خوش گو اور خوش فکر تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کا زمانہ پایا۔ درحقیقت اچھے استاد کو کلام دکھایا تھا۔ سپاہی پیشہ تھے۔ چنانچہ قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں کہ دہلی سے دل برداشتہ ہو کر روہیلکھنڈ میں راجہ بلاس کے ملازم ہو گئے۔ تعقید لفظی، علامت فاعلی کا حذف، بعض حرف کو تقطیع سے خارج کر دینا مثلاً "آج ہی" کو "آجی" باندھنا وغیرہ جو اب متروکات میں داخل ہیں۔ ان کے ہاں موجود ہیں۔ جیسے ان کے معاصرین کے کلام میں بہرحال اچھے کہنے والوں میں تھے۔ کلام یہ ہے

اگر قاصد ترے کوچے سے ٹک جلدی نہ آوے گا
تو پیارے دیکھیو پھر تو کہ میرا جیو ہی جاوے گا

آجی ملو تو بہتر وعدہ غلط ہے کل کا
جوں طفلِ اشک میں تو مہماں ہوں کوئی پل کا

کسی کو باغِ دنیا سے نہ دیکھا شاد ہم جاتے
برنگ شبنم اک عالم یہاں سے چشم تر گذرا

عبور بحرِ دنیا میں سبکساری سے کرتا ہوں
حباب آسا شمارِ دم سے بے کشتی گذرتا ہوں

ماتم میں میرے کوئی نہ رویا تو غم نہیں
تربت پہ میری شمع کا ہنسنا بھی کم نہیں

تلوار کس پہ کھینچتے ہو ہم تو مر چکے
پیاسے ہو کس کے خون کے ہم میں تو دم نہیں

مدّت سے یہ بحث درمیان ہے
پر علم نہیں کمر کہاں ہے

رباعی

اس دور میں بد قماش اکثر دیکھے
تھے وہ جو غلام تاج بر سر دیکھے
اے گنجفہ باز چرخ تیرے ہاتھوں
اوراقِ جہاں تمام ابتر دیکھے

شوق

شوق:- شاہزادہ مرزا افضل علی خاں لکھنوی شاگرد اصغر علی خاں نسیم دہلوی بلند فکر اور روشن خیال تھے۔ عامیانہ خیالات سے کلام کو پاک رکھتے۔ خوبیٔ مضامین کا لحاظ تھا۔ فنِ سخن میں ذوقِ سلیم پایا تھا۔ لکھنؤ میں رہ کر دہلی کی شاعری کے مقلد تھے۔ کلام یہ ہے:-

ساتھ ہی دل کو لئے تیر کا پیکاں نکلا
صاحبِ خانہ کے ہمراہ یہ مہماں نکلا

دل، جگر، جان کا دشمن یہ بنا عشقِ مژہ
خانۂ تن میں رہا تیر سہ پہلو ہو کر

باغباں بیٹھنے دیتا نہیں کیوں پاس لئے
گل میں بلبل نہ سما جائیگی کچھ بو ہو کر

کبھی ہم داغ بنکر دامنِ قاتل میں رہتے ہیں
کبھی ہم پاس ہو کر دیدۂ بسمل میں رہتے ہیں

دوست ہے بعد فنا ایک فقط شمعِ مزار
یہی رونے کے لئے ہے یہی جلنے کے لئے

خونِ عاشق انہیں منظور تھا پنہاں کرنا
مہندی ہاتھوں میں ملی رنگ بدلنے کیلئے

نامہ بر اب تجھے کیا غم ہے کہ میرا دلِ زار
ساتھ جاتا ہے ترے جی کے بہلنے کیلئے

درد رہ رہ کے دلِ زار میں جو اٹھتا ہے
اک سہارا ہے یہ کروٹ کے بدلنے کیلئے

شبِ فراق میں دونوں تھے مضطرب کیسے
اثر دعا کے لئے اور دعا اثر کے لئے

گر انکی طرف ہے سارا عالم
میری بھی شریک بے کسی ہے

شوق

شوق:- شیخ الٰہی بخش مرحوم۔ دہلی مولد تھا اور آگرہ مسکن۔ مرزا مظفر بخت جہاندار شاہ جواں بخت کی سرکار میں رسالہ نویس تھے۔ سنہ ۱۲۴۱ھ میں وفات پائی۔ کہتے ہیں کہ صاحبِ فن تھے۔ اور علاوہ دیوان کے نشاطِ قوانین سلطنت اور مثنوی نل دمن بطور یادگار چھوڑی۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

کعبہ صنم کا اور گلِ تر دونوں ایک ہیں
میری کی آہ و بادِ سحر دونوں ایک ہیں

مطلوب دو مکاں ہوں اگر تجھ کو ایک سر
آنکھوں میں میری آکے یہ گھر دونوں ایک ہیں

شوق

شوق:- سید اشتیاق حسین صاحب نبیرۂ حضرت ظہیر دہلوی۔ آپ کے والد

میر جیون علی صاحب شرفائے شاہجہان آباد سے تھے۔ آپ سنہ ۱۳۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ۸ برس کی عمر سے اپنے نانا کے ساتھ رہے اور اُنہیں کے ہاتھوں تعلیم و تربیت پائی۔ سفرِ دکن میں بھی حضرت ظہیر کے ہمراہ تھے۔ فن سخن میں جناب ظہیر و حضرت داغ کے شاگرد ہیں۔ تصنیف و تالیف کا شوق ہے۔ ایک کتاب سلک مروارید کے نام سے شائع ہو چکی ہے جس میں مختلف اساتذہ کے اشعارِ آبدار جو فراق۔ وصال۔ انتظار۔ یاس و ناکامی سے علاقہ رکھتے ہیں۔ جمع کئے ہیں۔ عرصہ سے دہلی میں قیام ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

رہی جگہ نہ رقیبوں کے گھر بنانے کی　　بھلا ہوا ترے دل میں مرا غبار رہا
اب اسکا شکوہ ہی کیا دل تو دے چکے اے شوق　　پرائی چیز پہ کیا اپنا اختیار رہا
کبھی عہد و پیماں نہ باندھے جنہوں نے　　وہ چلّا میری قبر پہ باندھتے ہیں
دیکھے ہیں زمانہ کے حسیں اور بھی ہم نے　　جچتا ہی نہیں تیرے سوا کوئی نظر میں
وہ آئیں عیادت کو تو کچھ اور مزہ ہو　　جو چاہیئے لذّت وہ نہیں دردِ جگر میں
مرا سر در پہ جھکا کر کہا یوں کج ادائی سے　　مقدّر کا لکھا مٹتا نہیں ہے جبہ سائی سے
تو نے مارا ہے خرامِ ناز سے　　آ مجھے آکر جلا اعجاز سے
کیا کہا ہے کان میں ہمراز سے　　ہم سے بھی کہیئے اسی انداز سے

شوق

شوق:۔ مرزا محمد منیر صاحب میرٹھی اکونٹنٹ محکمہ گوالیار۔ شاگردِ مولانا شوکت میرٹھی۔ عربی فارسی میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ کلام میں سنجیدگی اور متانت ہے۔ کہیں کہیں زبان کا لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔ نمونہ نذر ناظرین ہے:۔

دلِ مُضطر کو قرار آئے تو کیونکر اے شوق　　یہ تو قسمت ہی میں قسّام ازل نے نہ دیا
ہے قیامت پائمالِ ناز و اندازِ خرام　　تیرے ہر نقشِ قدم پر حشر نے سر رکھ دیا
وائے ارمانِ سبکدوشی کٹا تو سر۔ مگر　　بار احساں تیغ نے ایک اور مجھ پر رکھدیا

مشت خاک اپنی ٹھکانے سے لگا دی تو نے
ہم دعائیں تجھے اے بادِ صبا دیتے ہیں

آکارِ دل تمام کر اے خنجرِ نگاہ
بجز پردہ ہائے چشم کوئی درمیاں نہیں

وہ آئی جھومتی تیغِ تغافل فرقِ ارماں پر
جھکانا گردنِ تسلیم کا طاعت میں داخل ہے

راز دل مشتہر نہ ہو جائے
پردہ خود پردہ در نہ ہو جائے

آپ کے وعدہ ہائے فردا سے
حشر ہی پیشتر نہ ہو جائے

شوق

شوق :- مولوی حکیم عنایت اللہ فرید آبادی۔ شاہجہان آباد میں تکمیل علمی کے بعد مولانا صہبائی سے فن سخن میں تلمذ اختیار کیا۔ استادانِ باکمال مثل ذوق و مومن و غالب وغیرہم کے جلسوں میں شریک رہتے تھے۔ علم طب میں دخل کامل تھا عرصہ تک سرکارِ انگلشیہ میں ملازم بھی رہتے تھے۔ پیرانہ سالی میں پنشن لے کر خانہ نشین ہوئے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ خوش فکر سخن سنج تھے۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں بقیدِ حیات تھے۔ کلام یہ ہے :-

پسِ مرگ خاک کو بھی نہ رہا قرار اک جا
کوئی فاتحہ تو پڑھتا جو کہیں مزار ہوتا

اس آن سے دیکھا ہے مجھے آج کسی نے
قابو میں نہ دل ہے نہ سنبھلتا ہے جگر آج

گر جانتے رنگینی یہ سب دل میں حسرتیں
پہلے ہی کرتے ہم دلِ بے آرزو پسند

یاس ہے اور بیکسی کیوں نہ ہوں اشکبار ہم
درد ہے دل میں اس لئے روتے ہیں زار زار ہم

جان سے اپنی تنگ ہیں یہ بھی ہے کوئی زندگی
کرتے ہیں ایک عمر سے موت کا انتظار ہم

رحم آیا انہیں مجھ پر شاید
میرے مرنے کی دعا کرتے ہیں

آرزوئے وصال کرتے ہو
کیا خیال محال کرتے ہو

بولے وہ چاہتا ہے اک عالم
کیا تمہیں کچھ کمال کرتے ہو

اپنے عیار سے امید وفا
شوق تم بھی کمال کرتے ہو

کیوں نہ صہبائی کی شاگردی کا ہو فخر مجھے
لیتے استاد سے ہیں شوق تعلم مجھ کو

چشمِ آفت نہیں تو پھر کیا ہے
قد قیامت نہیں تو پھر کیا ہے

شوق یہ پوچھنا ہے قامتِ یار
گر قیامت نہیں تو پھر کیا ہے

اور کچھ مانگوں نہ اس بُت کے سوا اللہ سے
زاہدا مقبول گر میری دعا ہونے لگے

سب کچھ کیا علاج نہ ہرگز شفا ہوئی
عیسٰی سے بھی نہ میرے مرض کی دوا ہوئی

کیا سمجھ ہے کہ ہر اک بات کو الٹا سمجھے
ہم بُرا سمجھے جو اے بت تجھے اچھا سمجھے

یہاں کے آنے پہ راضی تو ہو گئے ہیں وہ
مگر کچھ اور ہے تھوڑی سی گفتگو باقی

نیند آئی جو مؤذن کو مری بن آئی
ورنہ یوں کب تھے سحر تک وہ ٹھہرنے والے

اہلِ ظاہر کا ذرا خوف ہے ہم کو ورنہ
صاف کہہ دیتے کہ اے بت تجھے ہم کیا سمجھے

شوق:۔ مولوی سید محمد حسین سہارنپوری خلف سید جمعیت علی شایاں کہنہ مشق مضمون نگار ہیں۔ ایک زمانہ میں سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق پر اخبار عام لاہور میں زبردست ریویو کیا تھا۔ میرٹھ میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ عمر اچھی پائی حضرت جلال سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو:۔

برباد ہو مٹ جائے کوئی ان کی بلا سے
انکو تو فقط یاد ہے اک لفظ نہیں کا

شاید خیالِ یار ہے مہماں کہ صبح تک
جھپکی نہیں ہے آنکھ شبِ انتظار میں

میری قسمت کی رسائی دیکھئے
ان کے در پر جبہ سائی دیکھئے

جان یہ دیتے ہیں ذکر حور پہ
زاہدوں کی پارسائی دیکھئے

بلبلوں کو ہے گمان شاخِ گل
یار کی نازک کلائی دیکھئے

حضرتِ زاہد بس اب چلنا ہے جام
وہ گھٹا قبلہ سے آئی دیکھئے

بچ گئی جان اک نگاہ دلفریب
موت کس حیلہ سے آئی دیکھئے

شام ہی سے رنگ فق ہے شوق کا
کیا ہو تا صبح جدائی دیکھئے

شوق:۔ مولوی محمد ظہیر احسن خلف شیخ سبحان علی۔ قصبہ نیمہ ضلع پٹنہ کے

رہنے والے تھے۔ علوم عربیہ کی تکمیل علمائے فرنگی محل سے کی تحقیق زبان اردو کا شوق تھا حضرت شمشاد سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ جناب تسلیم لکھنوی سے ارادت تھی۔ سخنور باکمال حضرت جلال لکھنوی سے مناظرہ اور تحریری مباحثہ کرنے کے بعد لکھنؤ میں ان کا شہرہ ہوگیا۔ اور پٹنہ بہار وغیرہ میں کامل الفن مشہور ہوگئے۔ مذہبی تصانیف کے علاوہ جو کتابیں علم ادب کے متعلق لکھی ہیں وہ نہایت کارآمد ہیں۔ رسالہ اصلاح میں متروکات اور اہم اصول معانی سے بحث کی ہے جو بہت مقبول ہوا ازاحتہ الاغلاط میں لغات کی صحت تلفظ وغیرہ کی بحث ہے۔ سرمۂ تحقیق میں الفاظ کی تحقیقات درج ہے۔ بہت موسم تک اخبارات میں اس رسالہ کی بابت مضامین نکلتے رہے ہیں۔ آپ ۱۸۹۶ء میں حیات تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

گراتا ہے دل پر قیامت کی بجلی ۔۔۔ وہ منہ پھیر کر مسکرانا کسی کا
وہ بھولی سی صورت لڑکپن کی باتیں ۔۔۔ ہمیں یاد ہے وہ زمانہ کسی کا
تمہیں عشق سے شوق سب روکتے تھے ۔۔۔ مگر تم نے کہنا نہ مانا کسی کا

سینے ہو جو دل میں تو جگر کو نہ جلاؤ ۔۔۔ ہمسائے کے گھر آگ لگانا نہیں اچھا
دیکھو نہ کہیں دل کی لگی اور بھڑک جائے ۔۔۔ بالین لحد شمع جلانا نہیں اچھا
دامن کبھی جھٹکتے ہیں کبھی تنتے ہیں وہ ہاتھ ۔۔۔ اے شوق ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا

دیا دل جس کو جی چاہا طبیعت اپنی دل اپنا ۔۔۔ عبث وہ روکتے ہم کو حضرت ناصح بگڑتے ہیں

حق سے کرتے تو ہیں گلہ اس کا ۔۔۔ ٹھہریں مجرم مگر نہیں نہ کہیں
اور ہے دل چرانے والا کون ۔۔۔ ہو گئیں چشم سے نگاہیں نہ کہیں

نالے بیتاب ہیں سینے سے نکلنے کیلئے ۔۔۔ اس ستمگر سے کوئی کہہ دے سنبھلنے کیلئے
اے مرے جذبۂ دل وقت مدد آ پہنچا ۔۔۔ گھر سے وہ آج نکلتے ہیں ٹہلنے کے لئے
محفل غیر میں کیوں شمع جلائی تم نے ۔۔۔ کیا وہاں کوئی نہ تھا رشک سے جلنے کیلئے

حسرتیں بھر گئیں اے شوق یہانتک دلمیں
آرزو ڈھونڈتی ہے راہ نکلنے کیلئے

او تغافل شعار کیا کہنا
مرگئے ہم تجھے خبر نہ ہوئی

دل کو تھا وصل سے انبساط ایسا
احتیاجِ پیامبر نہ ہوئی

کہتے ہیں فرط بیخودی اس کو
دل گیا پاس سے خبر نہ ہوئی

اے شوق وہی عشق و محبت میں ہے کامل
ہر شے میں جسے جلوہ جاناں نظر آئے

نظر پڑی جو سرراہ اس پری وش پر
تو شیخ جی کہیں جُبّہ کہیں چھڑی بھولے

بھڑکی ہے لگی جی کی بجھا کیوں نہیں دیتے
آب دم شمشیر پلا کیوں نہیں دیتے

مانا کہ ان آنکھوں نے کیا خون کسی کا
لب میں ہے جب اعجاز جلا کیوں نہیں دیتے

صبح وصال

ہائے فلک نے قہر یہ ڈھایا
بخت نے ایسا پلٹا کھایا
صبح الم کا مُنہ دکھلایا
وقت جدائی سر پہ آیا
دیکھ کے غمگین حالت دل کی
رونی ہے دل میں حسرت دل کی

کیجئے کیا اظہار الم کا
حال ہے روشن حسرت و غم کا
کیا ہو بیاں گردوں کے ستم کا
ہائے وہ تارا صبح کا چمکا
بجنے لگا افسوس گجر بھی
بول اُٹھے مرغان سحر بھی

عیش کسی عاشق کا نہ بھایا
کوّوں نے غل شور مچایا
کم بختوں کو چین نہ آیا
گھڑیالی نے گھنٹا بجایا
ظالم نے اور آفت ڈھائی

لو وہ اذاں کی آواز آئی

جھوم رہے ہیں سب متوالے — جاتے ہیں مسجد ہمت والے
باہر نکلے خلوت والے — پڑھتے ہیں سبحہ طاعت والے

شغل کہیں ہے ذکر خدا کا
ورد کہیں ہے صلِ علیٰ کا

برہمنوں نے شور مچایا — سارا شوالہ سر پہ اٹھایا
بت خانہ میں سنکھ بجایا — سارے جہاں کا دل دہلایا

گھر سے چلے اشنان کو ہندو
جے گنگا کا شور ہے ہر سو

بادِ سحر سے غنچے چٹکے — نکہت گل کے قافلے بھٹکے
ہیں جو طلوعِ مہر کے کھٹکے — روتی ہے شبنم گل سے لپٹ کے

کہتی ہے دن کی قسمت چمکی
ہوں مہماں اب کوئی دم کی

بادِ سحر کے جھونکے سے کھل کے — طرّے بکھرے ہیں سنبل کے
خندۂ رنگیں دیکھ کے گل کے — زخم ہرے ہیں ہر بلبل کے

صبح جو سر پر آئی ہوئی ہے
دل کی کلی مرجھائی ہوئی ہے

رہ گئی کچھ کچھ شب کی سیاہی — چلنے لگے منزل سے راہی
کیسی گھڑی یہ آئی الٰہی — ہوتی ہے کوئی دم میں تباہی

نقدِ دل و جاں کھو بیٹھے ہیں
اپنے لکھے کو رو بیٹھے ہیں

صبح ہوئی کیا آئی قیامت
سوئے جو ہیں یہ جانِ نزاکت
ساتھ لگا لائی اک آفت
ان کو ابھی ہے خواب کی غفلت

لیکن کوئی دم میں یہ پیارے
اٹھیں گے پہلو سے ہمارے

درد جگر کی صورت اٹھ کر
چھوڑ کے ہم کو بستر غم پر
بیٹھنے والے ہیں کب دم بھر
گھر کو سدھاریں گے یہ مقرر

لاکھ کریں گے منت و زاری
کب یہ سنیں گے بات ہماری

لو جاگے۔ لی بخت نے کروٹ
ہائے رے ان کی یہ گھبراہٹ
مُنہ سے ہٹایا اپنا گھونگھٹ
دیکھتے ہی صبح اُٹھے جھٹ پٹ

نیند کے جھونکے کچھ بیداری
ملتے اُٹھے آنکھ خماری

شوق

شوق:۔ محمد ریاض احمد ولد شیخ عزیز احمد مرحوم بدایونی۔ بدایوں میں بچوں کو انگریزی پڑھاتے رہے ہیں۔ سیدھے سادے صاف شعر کہتے ہیں۔ کلام یہ ہے

نکلی تو میری جان گیا تو مرا جگر
ناصح کے شر سے شوق بچائے خدا مجھے
تیری گرہ سے لے دل ناشاد کیا گیا
کم بخت پھر دماغ پھرانے کو آ گیا

وفور ناتوانی ہے یہاں تک
رسائی کس طرح ہو نامہ بر کی
دل ہی الفت میں ساتھ چھوڑ گیا
آہ بیکار نالہ بے تاثیر
کہ نالہ بھی نہیں آتا زباں تک
نہ پہونچے جس جگہ وہم و گماں تک
کس کا اب آسرا کرے کوئی
چپ نہ بیٹھے تو کیا کرے کوئی

شوق

شوق:۔ حکیم اسرار الحق خلف حکیم مولوی عبد القیوم صدیقی فرنگستنی امروہی

فنِ طب کچھ اپنے والد اور کچھ جناب حکیم عبدالسلام مرحوم اور کچھ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم سے حاصل کیا۔ صوفی منش آدمی تھے۔ شاہ سیّد علاؤالدین صاحب کی خدمت میں بلاناغہ روزانہ حاضر ہوا کرتے۔ اس سے ان کی مستقل مزاجی کا پتہ چلتا ہے۔ شوقؔ صاحب مقرر بھی اچھے تھے تصنیف و تالیف کا بھی بہت شوق تھا۔ افسوس ہے کہ ان کی تمام کتابیں غیر مطبوعہ رہ گئیں۔ شوقؔ مرحوم نے فنِ شعر کی ابتدا مولوی اصغر علی ثابتؔ رامپوری سے کی۔ اس کے بعد مولوی قطب الدین صاحب قطبؔ امروہوی سے بھی استفادہ کیا۔ آخر زمانے میں کسی کو کلام نہ دکھاتے تھے ۱۳۴۹ھ میں انتقال کیا۔ ایک غزل جناب افسر صدیقی صاحب امروہوی نے کراچی سے روانہ فرمائی ہے وہ حاضر ہے: ؎

سب میں ظاہر ہیں مگر سب میں نہاں رہتے ہیں — خود نشاں دیکھیے وہ بے نام و نشاں رہتے ہیں
ہیں وہی اوّل و آخر وہی ظاہر باطن — بھید کھلتا نہیں پھر بھی وہ کہاں رہتے ہیں
ہم تو مٹ کر بھی رہے مجرمِ جرمِ الفت — وہ مٹا کر بھی مسیحائے زماں رہتے ہیں
جاگتا رہتا ہے سوتے میں بھی جادو ان کا — تیر انداز وہ بے تیر و کماں رہتے ہیں
آنے دیتے ہی نہیں اُن کے سوا کوئی خیال — دل کے ارمان ہی دل کے نگراں رہتے ہیں
آہ اے عیسیِ دوراں ترے بیمار فراق — مرتے مرتے بھی سوئے در نگراں رہتے ہیں
ہم تو مشرک ہوں اگر غیر کی جانب دیکھیں — آپ ہر دل میں مکیں صورتِ جاں رہتے ہیں
مسجد و دیر و کلیسا و کنشت و کعبہ — سب یہ خالی ہیں تو پھر آپ کہاں رہتے ہیں
بے حجابی میں بھی پردہ نہیں اٹھتا رخ کر — دل میں آکر بھی وہ آنکھوں سے نہاں رہتے ہیں
دیر و کعبہ میں عبث شیخ و برہمن ہیں مقیم — وہ یہاں رہتے ہیں حاشا نہ وہاں رہتے ہیں
وہ دکھاتے ہیں ہر اک چیز میں جلوہ لیکن — ڈھونڈنے والوں کی نظروں سے نہاں رہتے ہیں
حضرتِ شوقؔ یہ جانبازی کی جرأت کب تک — رات دن آپ تو مصروف فغاں رہتے ہیں

شوق

شوق:۔ پنڈت جگ موہن ناتھ صاحب رینہ خلف پنڈت وشیشور ناتھ رینہ۔ یہ خاندان کشمیری پنڈتوں میں معزز شمار ہوتا ہے اور تین پشت سے دہلی سے جاورہ گیا ہوا ہے۔ جسونت راؤ ہلکر والیِ اندور کے ساتھ نواب میر خاں اور نواب غفور خاں نے پنجاب کی لڑائیوں میں دادِ شجاعت دی۔ جب امن قائم ہوا تو غفور خاں کو مالوہ میں سات آٹھ لاکھ کا علاقہ عطا ہوا اور انہوں نے جاورہ کو اپنا صدر حکومت قرار دیا۔ اس وقت شوق صاحب کے جدِّ امجد پنڈت شیو ناتھ دیوان مقرر ہوئے۔ حکام انگریزی میں بھی اچھا رسوخ تھا۔ اس وجہ سے شوق صاحب ۱۸۹۰ء میں صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ اب چند سال سے مدت ملازمت کے اختتام پر پنشن پا رہے ہیں۔ جناب شوق نے طبیعت رنگین اور ذہن رسا پایا ہے عنفوانِ شباب سے شعر شاعری کا شوق رہا۔ خوب کہنے لگے۔ چونکہ پہلے حضرت امیر مغفور اور ان کے بعد نوح مچھلی شہری مرحوم کے فیض تلمّذ سے بہرہ یاب رہے اس لئے کلام میں متغزلانہ رنگ اور اسلوب میں شیوا بیانی پیدا ہو گئی جو قابلِ داد ہے حال میں آپ نے اردو فارسی شاعری پر ایک بڑے احسان کا کام کیا ہے۔ یعنی ایک بسیط و مصوّر تذکرہ مدوّن و شائع فرمایا ہے۔ جس میں اُن کشمیری پنڈت شعراء کے حالات و کلام درج ہیں۔ جنہوں نے فارسی یا اُردو میں سخن سرائی کی ہے نمونہ کلام یہ ہے

میں تو اس سے اک دل مظلوم ہی مانگا کیا
کاتب سوز ازل کیا جانے کیا لکھا کیا

چشم گریاں تو ہماری اشک ہی پیتی رہی
رنگ رخ نے راز دل اُڑ اُڑ کے سب افشا کیا

طوفِ کعبہ ہو کہ ہو سیر صنم خانہ عشق
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا (غالب)

نہ ان کو توڑنا ساقی نہ ویرانے میں رکھ دینا
یہ شیشے جتنے خالی ہیں پریخانے میں رکھ دینا

بوقتِ امتحاں اے دل رہے کچھ پاس خودداری
کہیں سر پائے قاتل پہ نہ گھبرانے میں رکھ دینا

دل میں آج آئی ستمگار یہ کیا
مجھ سے ہمدردی کا اظہار یہ کیا

سچ کہو دل میں تمہارے کیا ہے — لغزشیں ہیں دم اقرار یہ کیا
سخت جاں بھی تو نہیں ہیں ایسا — دم چرانے لگی تلوار یہ کیا
شوق اٹھو بھی کہاں بیٹھ رہے — دو قدم ہے در دلدار یہ کیا

میکدہ چھوڑتے تو چھوڑ دیا — اب ٹھکانا نظر نہیں آتا
کسی حیلے اجل نہیں ٹلتی — کچھ بہانا نظر نہیں آتا
شوق کس رنگ میں ہو تم ڈوبے — کیا زمانہ نظر نہیں آتا

دل سے پوچھو کیا ہوا تھا اور کیوں خاموش تھا — آنکھ جو دیکھی تھی اتنا مجھے بس ہوش تھا
بیخودی سے لذت جام خودی اترا تو پھر — ایک ہی ساغر ملا ایسا کہ میں مدہوش تھا

یہ حالت ہو مرے دست جنوں کی جوش وحشت میں — کبھی پڑتا ہے دامن پر کبھی چاک گریباں پر
بتوں کے آگے سجدہ کرتے کس نے شوق کو دیکھا — ارے توبہ یہ تہمت اور اک مرد مسلماں پر

حسرتیں کہتی تھیں کیونکر پاؤں پھیلائینگے ہم — وسعت دل کو جو دیکھا وہ بھی حیران ہوگئیں
جن شکایت ہائے پنہاں سے لب واقف نہ تھے — چشم خوں آلود سے آخر نمایاں ہوگئیں

دکھڑے یہ آج سنیئے کس بے زباں کے ہیں — کچھ شکایت اسکی بھولی ہوئی داستاں کے ہیں
سب پوچھتے ہیں شہر خموشاں میں کون ہے — حیراں ہیں کیا بتائیں مسافر کہاں کے ہیں

کسی کا بخت خوابیدہ ہوں پامال جفا میں ہوں — کسی حسرت بھرے دل کی اک آہ نارسا میں ہوں
بیان نالۂ دل ہوں کہ بانگ بے درا ہوں میں — نہیں گو کچھ مگر ساز شکستہ کی صدا میں ہوں

ہونا تھا جو وہ ہوگیا اس کا گلہ نہیں ذرا — دل پہ جو کچھ گذر گئی اس کی تمہیں خبر نہیں
غم نہ کرینگے حال دل پڑھ کے [illegible] ساز ہیں — عشق کے راز کا بیاں اُن کو [illegible] نہیں
جلتی ہے شمع بزم میں گل [illegible] — دونوں جلے ہیں ہم وہ عشق کے سوز و ساز میں

[illegible] — [illegible] راہ چلنے والو
دل کا [illegible] ہو گیا [illegible] — پیکاں کو [illegible] سینہ سے نکالو

اے شوقؔ دیدۂ چشمِ بصیرت سے کام اگر
بے پردہ خود نقاب کرے حسنِ یار کو

چلنے لگے عدم سے تو کچھ آگیا خیال
لے آئے ساتھ ہستیٔ ناپائیدار کو

نہیں ہے ذکرِ حق سے خالی ہو حق بادہ نوشوں کی
صدائے نعرۂ مستانہ ہے تکبیرِ مے خانہ

پڑی ہیں پاؤں میں مستو تمھارے موجِ مے کی زنجیریں
اسیرِ بیخودی سب ہیں یہ ہے تعزیرِ میخانہ

شکستِ توبہ کی بنیاد تا برسوں رہے قائم
ہماری خاک ہو گی شاملِ تعمیرِ میخانہ

اٹھو اے شوقؔ اب تم کر چکے ہو خم کے خم خالی
تمہاری کوئی ملکیت نہیں جاگیرِ میخانہ

مجھ میں باقی ہی اب رہا کیا ہے
دیکھئے مرضیِ خدا کیا ہے

ہیں خطاوار ہی سہی لیکن
سن تو لو پہلے ماجرا کیا ہے

دیر و کعبہ میں کس کا چرچا تھا
تو نے آخر وہاں سنا کیا ہے

لبِ زخمِ جگر تو ہنستے ہیں
تو نے اے بخیہ گر سیا کیا ہے

نیند اے چارہ گر نہیں آتی
شام سے تا سحر نہیں آتی

ایک اک غش ہے ناتوانی سے
سانس دو دو پہر نہیں آتی

مے یہ کیسی پلائی ساقی نے
بیخودی کی خبر نہیں آتی

بہرِ تسکینِ دل کوئی تدبیر
تجھ کو اے چارہ گر نہیں آتی

جا کے بت خانہ میں بھی دیکھ لیا
کوئی صورت نظر نہیں آتی

سیرِ چمن کو آئے تو یہ تازہ گل کھلا
جاتے ہیں لوٹے گل کو پریشاں کئے ہوئے

کل تک مجھے تھا عزت و ناموس کا خیال
بیٹھا ہوں آج چاک گریباں کئے ہوئے

پھر میکدے کو لے ہی چلا شوقِ میکشی
توبہ کو آج اپنی پشیماں کئے ہوئے

ہجراں کسل و درد جگر خون رلاتا ہے مجھے
اب تو کچھ رنگ دگرگوں نظر آتا ہے مجھے

میری ہستی کی حقیقت یہ ہے اس سے آگے
ہوں میں اک حرف وہ لکھ لکھ کے مٹاتا ہے مجھے

تابِ رفتار نہیں منزلِ مقصود ہے دور
جذبۂ شوق ہی کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

قصے دونوں کے ادھورے ہی رہے جاتے ہیں
مستِ ازل سب جمع ہوئے ہیں لاؤ سبو کچھ کام چلے
دل کو ہم نے اپنا جانا ہم سے خطا یہ فاش ہوئی
بلبلو اب تو قیدِ قفس ہے دیکھیے کب تک چھٹنا ہو
تیری وحدت میں ہے کثرت کی بھی نیرنگی
پتے پتے کی زباں دیتی ہے درسِ وحدت
صبح ہوتے ہی ہوئی بزمِ شبینہ برہم
وفورِ درد میں ضبطِ فغاں رہے نہ رہے
دمِ اخیر تو سن لو جو دل پہ گذری ہے
بس آج قصۂ بسمل کا خاتمہ ہو جائے
ہم کو دل دیکے جفاؤں کا پتہ ملتا ہے
سوزِ پنہاں۔ غمِ ہجراں۔ تپشِ دل کے سوا
جستجو کرتے ہیں ہم دیر و حرم میں ناحق
دور سے منزل کو زار و ناتواں دیکھا کئے
یہ کسے معلوم منزل تک وہ پہنچے یا نہیں
میں ہوں سرمستِ ازل خمخانۂ جاوید کا
دل ہی خود سر ہے جنوں سودائی تو پھر کیونکر نبھے
جلوہ حسنِ بتاں سے ہے یہ ظاہر ہوتا
جاں بلب ہے کوئی تا صبح رہے یا نہ رہے
شوق تو بندۂ الفت ہے اسے کیا پروا
دیکھتے دیکھتے نیرنگ دو عالم کی فنا

دل کو میں اپنی تو وہ اپنی سناتا ہے مجھے
ساقی کو ہاں پاس بٹھا کر یار و دَورِ جام چلے
دھوکا جو دے قسمت پہ ہم کو ایسوں سے کیا کام چلے
تم کو مبارک سیرِ گلشن ہم تو اسیرِ دام چلے
اس تماشہ سے مگر آنکھ ابھی بیگانہ ہے
سبق آموز مرا سبزۂ بیگانہ ہے
نہ وہ ساقی نہ وہ ساغر نہ وہ پیمانہ ہے
یہ رازِ دل مجھے شک ہے نہاں رہے نہ رہے
کسے امید ہے منہ میں زباں رہے نہ رہے
بلا سے آپ کا خنجر رواں رہے نہ رہے
سچ بتاؤ تمہیں کیا اہلِ جفا ملتا ہے
اور بھی کچھ تمہیں اربابِ وفا ملتا ہے
ڈھونڈنے سے کہیں بندے کو خدا ملتا ہے
بیٹھے ہم حسرت سے گردِ کارواں دیکھا کئے
جا بجا ہم تو نشانِ رفتگاں دیکھا کئے
چاہیے ساقی نہ جام و بادہ و مینا مجھے
پردہ چھوٹے دل کو ہے اور دل سے ہے پروا مجھے
پس پردہ یہ کسی اور کی رعنائی ہے
اس کی کچھ سن لو ابھی طاقتِ گویائی ہے
لاکھ کوئی کہے دیوانہ ہے سودائی ہے
کھو دیا اپنا بھرم چشمِ تماشائی نے

ذوق نظارہ میں پنہاں تھا فریب ہستی	کھو دیا دل کہیں منت کش رعنائی نے
خود تماشا بھی ہے خود محو تماشا بھی ہے	رنگ بدلا ہے نرالا ترے سودائی نے

شوق

شوق:۔ علی محمد صاحب شوق ساکن منگرول۔ معمولی فکر کے شاعر ہیں۔ کلام سے سادہ گوئی اور سلاست ظاہر ہے۔ زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔ کلام یہ ہے:

ہو نظر سے کہیں اوجھل تو قیامت ہو جائے	عشق آنکھوں کو ہے اتنا تری تصویر کے ساتھ
کام کیا کیا مرے بن بن کے بگڑ جاتے ہیں	کامیابی کو بھی کچھ لاگ ہے تدبیر کے ساتھ

رحم کی آس اک ستمگر سے	کہیں نکلا ہے موم پتھر سے
تم نے سیکھا ہے یہ بگڑ جانا	کس کے بگڑے ہوئے مقدر سے
پاؤں پھیلا کے سو رہے ہیں ہم	چین پایا یہ مل کے خنجر سے
توڑتا ہے وہ بات بات میں دل	شیشہ ٹکرا رہا ہے پتھر سے

شوق

شوق:۔ حکیم تصدق حسین خاں معروف بہ نواب میرزا۔ لکھنوی۔ شاگرد خواجہ آتش۔ ان کی شہرت کے اربعہ عناصر چار مثنویاں ہیں۔ یعنی بہار عشق۔ زہر عشق فریب عشق۔ لذت عشق۔ یہ مختصر مثنویاں گویا اس زمانے کی رندیت اور عیاشانہ زندگی کا کھلے عشقبازی کا دفتر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان مثنویوں کا موضوع خیالی مضمون آرائی نہیں بلکہ آپ بیتی وارداتیں ہیں۔ ان مثنویوں میں سے اکثر سلاست بیان۔ واقعہ نگاری کی حسن ادا۔ فصاحت اور شگفتگی اسلوب اور صحت روزمرہ کے اعتبار سے بطور نمونہ پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن افسوس سے کہا جاتا ہے کہ بدتہذیبی اور عیاشانہ آوارگی کی پھٹکار ان اوصاف پر جن کا ابھی ذکر ہوا مٹھیاں بھر بھر کر خاک ڈالتی ہے کاش نواب مرزا پاک محبت۔ مظاہر قدرت۔ تصوف یا اخلاق جیسے موضوع پر قلم اٹھاتے۔ احساسات نفیس اور جذبات لطیف کی چمن طرازی کرتے تو ہم خرما و ہم ثواب کا مضمون تھا۔ مدت تک ان مثنویوں کی نشر و طباعت حکماً بند رہی۔ اب یہ قید

اٹھا دی گئی ہے۔ ۱۸۷۱ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ شوق کبھی کبھی غزل بھی کہتے تھے۔ مگر غزل میں وہ بات نہیں جو مثنوی میں ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

خوش چشم ہیں تو تجھ سے زمانے کی لڑی آنکھ
کس کس کی تری آنکھ کے اوپر نہ پڑی آنکھ

وہ بھی ہر کوئی حسن جیسے صورت تصویر
حیران نہ رہے دیکھ کے دو چار گھڑی آنکھ

منظور تھا اے حور نہ دیکھوں تجھے لیکن
انسان تو تھا رہ نہ سکا جا ہی پڑی آنکھ

ایک ایک سے دلچسپ ہے جو عضو بدن ہے
رہ رہ گئی پھر وہیں جس جا پہ پڑی آنکھ

ہم جان گئے آنکھ ملاؤ نہ ملاؤ
بگڑے ہوئے تیور ہیں تمہارے کئی دن سے

دیوانہ بھی سودائی بھی فرماتے ہیں اکثر
ان ناموں سے جاتے ہیں پکارے کئی دن سے

آخر مری آہوں نے اثر اپنا دکھایا
گھبرائے ہوئے پھرتے ہو پیارے کئی دن سے

اک شب سے گئے گھر اُن کے نہاں ہے شوقؔ
آتے نہیں اس شرم کے مارے کئی دن سے

شوق:- منشی ماکھن لال باشندہ بریلی شاگرد حضرت امیر مینائی و قیصر بریلوی۔ طبیعت میں جدت فکر میں پرواز تھی۔ ذہن کی رسائی قابل داد تھی۔ افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی۔ عین عالم شباب میں انتقال کیا۔ مرحوم سادہ زبان میں مضامین بلند ادا کرتے تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

ناحق ارمان ہے قاتل کو تماشا کیسا
محو لذت ہوں دم نزع تڑپنا کیسا

تھی کہاں تاب ستم وہ بھی ستادی تو نے
بدنما مجھ پہ ستم اے ستم آرا کیسا

شوق کہتا ہے کہ پھر عرض کر اُن سے مطلب
شرم کہتی ہے کہ ہر بار تقاضا کیسا

ضعف نے بلبل تصویر بنایا مجھ کو
اب بلانے کی بھی طاقت نہیں نالہ کیسا

میری قسمت میں ہو اک وقت تماشے شوقؔ
وصل کہتے ہیں کسے یار کا جلوہ کیسا

اُس سے بے خبر ہے کوئی تو میرا کے تا حال
ہر ایک کی زباں پہ مری داستاں ہے اب

شہرت ہے حقیقی خلق میں حسن و جمال کی
بدنام بھی ہیں اتنے ہی بد وضع سے آپ

اللہ مٹائے اس بُتِ مغرور کی خودی　　کہتا ہے طنز سے مجھے مانگیں خدا سے آپ

خزانہ جس کا پُر ہے ان میں دیکھا عیب خسّت کا　　کریمی کی صفت جن میں ہے ان کا ہاتھ خالی ہے

ہوس ہی عیش کی دل میں نہ ہے کیا عشق حاصل ہو　　بھرا ہے شیشہ اس مے سے جو کیفیت سے خالی ہے

شرمندۂ گناہ کا اعزاز دیکھئے　　آغوش میں لئے ہوئی رحمت خدا کی ہے

شوق

شوق :- پنڈت پرتھی ناتھ خلف پنڈت نرنجن ناتھ صاحب مشتاق مؤلف تذکرہ چمنستانِ کشمیر۔ پنڈت بشمبر ناتھ صاحب دہلوی آپ کے دادا دہلی سے جاکر الہ آباد میں مقیم ہوئے۔ اور علم و فضل حسنِ سلوک و حُبِّ وطن کی وجہ سے صوبۂ آئین کے مردِ بزرگ تسلیم کئے گئے۔ آپ کے خاندان کا شمار کشمیری پنڈتوں کے معزز خاندانوں میں ہے۔ آپ ۱۸۸۳ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ شوق صاحب نے طبیعت اچھی پائی ہے۔ علاوہ غزل کے جدید قسم کے موضوعوں پر بھی لکھتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

یہ بھی اک ادنیٰ کراماتِ فسونِ حسن تھی　　قطرۂ خون پر نظر اس کی پڑی دل ہو گیا

عشق کے اعجاز سے یہ منزلت دل کو ملی　　اب تو میرا دل بھی دل کہنے کے قابل ہو گیا

جو تیر ادھر آتا وہ تیر ادا ہوتا　　بھر ٹیس وہی اٹھتی پھر زخم ہرا ہوتا

قسّامِ ازل تو نے انساں کے پہلو میں　　جو چاہے دیا ہوتا یہ دل نہ دیا ہوتا

کسی کا کیا بھروسہ جا کے اس سے کچھ کا کچھ کہہ دے　　پیام اپنا لئے جاتا ہے دل پیغامبر ہو کر

پیدا مرے افسانے سے ہو درد جگر میں　　کھنچ آئے زمانہ وہ ہو تسخیر اثر میں

وہ مسکرا کے اور گراتے ہیں بجلیاں　　مجھ دل جلے پہ چھوڑے ستم آسماں کے ہیں

اس زمانہ میں نہیں گذری کسی کی ایک سی　　یوں دلاسا دیکے دل کو شاد کر لیتا ہوں میں

تڑپ نصیب ہوئی سوزشِ نہاں سے ہمیں　　وفورِ غم میں تشفّی ملی فغاں سے ہمیں

یہ چار تنکے ہی بس کائنات اپنی ہیں　　قفس میں ڈال نہ صیاد آشیاں سے ہمیں

جہاں میں آ تو گئے ہیں مگر نہیں معلوم
حیات لائی ہے اس دور میں کہاں سے ہمیں

ہستی کا ہوش آتے ہی مخمور ہو گیا
لایا ہوں ساتھ اپنے ازل سے خمار کو

اگر دل ضبط سے تنگ آ کے سرگرم فغاں پھر ہو
زمیں بدلے نئی صورت سے دور آسماں پھر ہو

نہ وہ بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی
تو کیونکر اعتبار انقلاب آسماں پھر ہو

کر چکے طے انتہائی مرحلے تدبیر کے
اب رہے باقی کرشمے دیکھنے تقدیر کے

کھینچ لائی انکو یاں تک جنکو تھا آنے میں عار
حوصلے دیکھے تو کوئی آہ دامن گیر کے

دل کی خاطر کھو چکے صبر و تحمل عقل و ہوش
رہ گئے نالے سو وہ ہیں منتظر تاثیر کے

ہوں گنہگار محبت یہ بھی کیا کم گناہ
کیا ضرورت عذر وہ ڈھونڈیں کسی تقصیر کے

میرا جوش جنوں جو بڑھنے لگا
لوگ سمجھے بہار آئی ہے

خندہ زن گل ہوئے کھلیں کلیاں
دل میں کیا جانے کیا سمائی ہے

موت آئی ہے کیسے جانے دوں
یہی اک عمر کی کمائی ہے

اُن سے کرتے رہے امید وفا
جن کا شیوہ ہی بے وفائی ہے

مایوسیاں ہیں میں ہوں ضبط غم نہاں ہے
جو سن سکے نہ کوئی وہ میری داستاں ہے

مجمع یاس کو لیکر شب غم آئی ہے
بھیڑ کی بھیڑ ہے تنہائی کی تنہائی ہے

ضبط کرتا ہوں تو آتا ہے کلیجہ منہ کو
آہ کرتا ہوں تو اُس شوخ کی رسوائی ہے

حب وطن

ترا ہی نام زمانے میں سب سے پیارا ہے
تو دل کا نور ہے آنکھوں کا میری تارا ہے

کوئی ملا نہ زمانہ کو چھان مارا ہے
جسے یہ کہہ سکیں ہم نہیں تو ہمارا ہے

جہاں میں جنکی ریاضت وطن پرستی ہے
انہیں کی زندگی ہے انہیں کی ہستی ہے

چلے خلاف اگر اب بھی راہ فطرت کے
نہ بچ سکے نہ آفات سے اصول فطرت کے

رہے نفاق اگر یوں ہی اہلِ ملت کے — تو پھر عبث ہیں گلے اور شکوے قسمت کے

وطن کے نام کو تم خیرباد کہہ دینا
اور اپنی قوم کو تم نامراد کہہ دینا

قرارِ دل کو نہیں بے کسی کا عالم ہے — وطن میں خونِ تمنّا کا اپنی ماتم ہے
زمانہ ہنستا ہے ہم پر ہمارا سر خم ہے — جواب دیں بھی تو کیا دیں کہ ہم میں کیا دم ہے

ہمارے دل میں جو الفت کی شمع جل جائے
تو جلد بادِ مخالف کا رُخ بدل جائے

پنہائی ہند کو بیڑی دغا کے ہاتھوں نے — اسیر ہم کو کیا مل کے بد صفاتوں نے
تمام کام کیا ان کی کوری باتوں نے — دیا فریب بھی کیسا بلا کی گھاتوں نے

جو اب بھی رازِ حقیقت سمجھ میں آ جائے
تو جلد رنگ زمانہ پہ اپنا چھا جائے

نہ ہو گلوں سے مزیّن تو پھر چمن کیا ہے — نہ گائے راگ وطن کا تو وہ دہن کیا ہے
چلے نہ راہِ وفا پر تو پھر چلن کیا ہے — ترے رفیق کو اندیشۂ محن کیا ہے

وفا کی راہ میں آسن جمائے بیٹھے ہیں
ترے ہی نام پہ دھونی رمائے بیٹھے ہیں

وفا سے شوقؔ جو دل بیقرار ہو جائے — تو جلد ختم حدِ انتظار ہو جائے۔
ہراس کیا ہے جو وہ جاں نثار ہو جائے — وطن کا ڈوبتا بیڑا بھی پار ہو جائے

جہاں میں کام وہ کر جاؤ آن رہ جائے
جو مٹ بھی جاؤ تو مٹنے کی شان رہ جائے

شوقؔ :- میر عبدالرؤف جعفری خلف مولوی عبدالکریم جعفری حصہ دار موضع اسلام آباد۔ نواب مقدم جنگ کے وارث ہیں۔ آپ کے والد اورنگ آباد

کے منصف و مفتی رہ چکے ہیں۔ اور وہ نواب قائم یار جنگ کے استاد تھے۔ ان کے بزرگ مضافات شیراز سے ہندوستان میں آئے تھے۔ اب سو سال سے زاید عرصہ سے ان کا خاندان دکن میں آباد ہے۔ سید شاہ عبد الحق اور مقدم جنگ ان کے اسلاف میں نہایت نامور تھے۔ شوق صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ابتدا میں مولوی سرفراز علی صاحب صفی سے اصلاح لیتے رہے۔ پھر حضرت حبیب کنتوری سے فیض سخن حاصل کیا۔ صیغہ داری معتمدی تعمیرات عامہ سرکار آصفیہ پر مامور ہیں۔ کلام یہ ہے: ؎

جہاں میں آکے خاصان خدا ہستی ہی پیدا ہیں
یہ دار الامتحاں باعث ہے عیش جاودانی کا

شہادت ہو گئی وجہ فروغ عاشق مضطر
کٹا جب سر کہ گل کترا ہے شمع زندگانی کا

چھپے ہیں پردۂ دل میں وہ آنکھوں سے نہاں ہو کر
کھلا ہے مجھ پہ عقدہ بعد مدت لن ترانی کا

یہ لعل بے بہا جن کا سر شوریدہ ہی معدن
جگر کا وی سے آئے ہیں زباں تک ٹکڑے ٹکڑے ہیں

اے فلک تجھ سے بر آئی اک جہاں کی آرزو
ہم جہاں سے لے چلے اس جانِ جہاں کی آرزو

واسطے دو دن کے بنواتے ہو کیوں قصر بلند
نا قلو بے سود ہے نام و نشاں کی آرزو

ذکر ان باتوں کا کیا جب دل ہی پہلو میں نہ ہو
شوق کیسا کس کی حسرت اور کہاں کی آرزو

وہ چال چل کہ دل نہ کسی کا ہو پائمال
اتنا نہیں عالم رفعت میں جا بیٹھے۔

شوق ـ رائے دولت رائے ولد رائے شیو سنگھ کایستھ باشندہ لکھنؤ محلہ اشرف آباد شاگرد جناب منشی مینڈو لال زار۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے ایک غزل کے چند شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں: ؎

یاد دنداں میں رہیں جانب اختر آنکھیں
کیا کہوں بند ہوئیں رات نہ دم بھر آنکھیں

شوق دیدار سے از بسکہ ہیں مضطر آنکھیں
ہیں کبھی گھر کی طرف اور کبھی باہر آنکھیں

بیخفا نہیں پاتیں نظر اس رخ روشن کا نیاں
ہم لڑاتے ہیں جو خورشید سے دن بھر آنکھیں

نہیں معلوم ترے طالب دیدار کو آہ	خواب کیا چیز ہے لگ جاتی ہیں کیونکر آنکھیں
دیکھ لے شوق ذرا گلشن عالم کی بہار	بند ہو جائینگی اک روز مقرر آنکھیں

شوق

شوق :- شنکر دت ورما ولد چودھری عطر چند یادو بنسی راجپوت ہیں نومشق نوجوان ہیں۔ یکم دسمبر ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوئے۔ پنجابی۔ ہندی اور انگریزی سے بقدر ضرورت واقف ہیں۔ تین چار برس سے شعر کہتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک سیّد ول محمد صاحب فضا سے تلمذ رہا۔ ۱۹۳۱ء سے خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت سے اصلاح لینی شروع کی ہے۔ ۸ شعر روانہ کئے تھے۔ جن میں سے مندرجۂ ذیل بغرض ملاحظہ درج ہیں :-

قبضہ ترا دلوں پر سکّہ ترا جہاں پر	تو ہے خدائے عالم۔ عالم غلام تیرا
راہب نے خاک چھانی زاہد نے ڈھونڈ مارا	لیکن نہ پا سکے وہ اعلیٰ مقام تیرا
آئے جو در پہ تیرے خالی نہ اس کو پھیرے	جاری جہان میں ہے کیا فیض عام تیرا

شوق

شوق :- منشی شیخ احمد علی قدوائی خلف شیخ کاظم علی قیس۔ آپ قاضی قدوۃ الدین رومی کی اولاد میں تھے۔ یہ خاندان اودھ میں عالی نسب اور گرامی قدر سمجھا جاتا ہے۔ حضرت شوق کی ولادت قصبہ جگور ضلع لکھنؤ میں ۱۸۵۲ء میں ہوئی ابھی دو ڈھائی برس کے تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم دس گیارہ سال کی عمر تک والدہ کی سرپرستی میں گھر پر ہوتی رہی جس کے بعد شیخ امیر الزمان صدیقی جو ان کے بہنوئی تھے۔ انہیں اپنے ساتھ اناؤ لے گئے۔ اور جب وہ ایک عہدہ پر فائز ہو کر رامپور گئے تو حضرت شوق کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اور وہاں اُن کی فارسی اور عربی کی تعلیم شروع کرائی۔ پھر جب صدیقی صاحب رامپور سے سہسوان ضلع بدایوں آئے۔ تو اُن کو بھی ساتھ آنا پڑا۔ سہسوان میں جناب شوق نے مولانا ریاض الحسن مرحوم سے علوم عربیہ کی تحصیل کی اور وہیں سکول

میں انٹرنس تک انگریزی بھی پڑھی۔ ابھی اٹھارہ برس کی عمر تھی کہ درس و تدریس کا سلسلہ بند کر کے ان کو وطن میں آنا پڑا۔ اب ان کا قیام کئی برس تک لکھنؤ میں ہوا۔ نوجوانی کا زمانہ اور لکھنؤ میں قیام سونے پر سہاگہ تھا۔ یہاں ذوق سخن کی ابتدا ہوئی۔ تھوڑے دنوں کے شغل کے بعد آپ حضرت تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیرؔ مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ اسیر مرحوم رشتہ میں ان کے دادا ہوتے تھے۔ منشی امتیاز علی مرحوم سابق وزیر ریاست بھوپال پھوپھی زاد بھائی تھے اس توسل سے اسی اثنا میں فکر معاش نے گھیرا تو کچھ مدت فیض آباد میں عہدۂ تحصیلداری پر مامور رہ کر ملازمت چھوڑ دی اور لکھنؤ چلے آئے اور اخبار آزاد نکال بیٹھے۔ یہ اخبار اپنے وقت میں مسالے کے اعتبار سے بہت دلچسپ تھا۔ کچھ برس اس شغل میں رہ کر اسے ترک کر دیا۔ اور بھوپال میں جا کر ملازم ہو گئے۔ یہاں نظامت کے عہدے تک پہنچ کر پنشن یاب ہوئے۔ آخر عمر میں رامپور میں کتب خانہ سرکاری کے انصرام سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہ رامپور کا کتب خانہ تھا یا محکمہ مال کا دفتر اور کچہری آپ کے ادبی مشاغل برابر جاری رہے۔ آخر عمر میں بوڑھے ضعیف اور مستغنی ہو کر ضلع بارہ بنکی میں آ کر اس ناگزیر ساعت کا انتظار کرنے لگے۔

اردو ادب کی خدمت اور اصلاح مذاق جو شوقؔ نے کی ہر ایک سے نہیں بن پڑتی۔ اسے حسن اتفاق کہئے کہ لکھنؤ نہ ان کا مولد و منشا تھا اور نہ ابتدائی عمر کا مسکن۔ وہ لکھنؤ ہو یا دہلی وہ لوگ جو ان مرکزی مقامات میں پیدا ہوتے اور وہیں بڑھتے چڑھتے ہیں۔ ان میں اہل زبان ہونے کا زعم او پندار پیدا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عموماً نہ اُن کا ذہن پورے طور پر ارتقا پذیر ہوتا ہے اور نہ وہ مسند اور منشور کے دائرے سے نکل کر زبان اور ادب کو ترقی کی شاہراہ پر لا سکتے ہیں۔ حضرت شوقؔ زبان اور ادب کے ساتھ اس طرح مسلوک ہوئے جس طرح ایک علم

کیمیا کا شائق و متحقق اپنے معمل میں مختلف آلات اور اشیاء سے مسلوک ہوتا ہے ان کی ادبی اور لسانیاتی تنقیدیں سائنٹیفک شان رکھتی ہیں۔ اور ادب کے متجسّس کے لئے سرمشق کا حکم رکھتی ہیں۔ آزاد۔ اودھ پنچ۔ زمانہ اور صبح امید آپ کے ادبی مقالات سے اکثر مالا مال ہوتے رہے ہیں۔ زبان کے معاملہ میں راقم کے خیال میں جو نظر غائر جناب شوق نے پائی تھی وہ کم آدمیوں کا حصّہ ہے۔

جب آپ لکھنؤ میں تھے تو مشاعروں میں اکثر شرکت فرمایا کرتے تھے ہفتہ وار مشاعرے امیر مرحوم کے مکان پر بھی ہوا کرتے اور اصلاح و تحقیق زبان کے بارے میں مباحثے رہتے۔ ان میں نواب مہدی علی خاں۔ نواب سرفراز الدولہ اور نواب سراج الدّولہ جیسے امرا بھی شریک ہوا کرتے۔ ہر کہیں اُردو سے متعلق مختلف مسائل پر گفتگو رہتی تھی۔ حضرت شوق ان مباحثوں سے فائدہ اُٹھاتے اور اپنی تحقیق فن کو بڑھاتے۔ لکھنؤ کے قیام میں ہی آپ نے مثنوی ترانۂ شوق تصنیف فرمائی جس کی اپنے وقت میں بہت شہرت ہوئی۔ اسی زمانے کے ایک مشاعرے کا ان کا یہ شعر بہت پھلا پھولا تھا اور ہر شخص کی زبان پر تھا ؎

قرآن اُٹھا رہے ہیں کہ بندہ حسیں نہیں | جھرمٹ سے عاشقوں کی وہ گھبرائے اس قدر

تھوڑے دنوں میں وہ صحبتیں درہم برہم ہوگئیں اور زمانہ کا مذاق بدل گیا۔ شوق مرحوم کے ادبی کارنامے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ اپنے عہد کے بہترین ماہرین فن اور ادیبوں میں تھے۔ آپ کی ہمہ گیر طبیعت اور تبحر کا بیان ایک دفتر چاہتا ہے۔ اکثر علمی مباحثوں میں آپ نے حصّہ لیا۔ اور اپنے تئیں شریک غالب ثابت کیا۔ آپ کی فضیلت اور پایۂ ادب آپ کے معاصرین کو تسلیم تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا کہ آپ ادیب ہونے کے علاوہ مصلح ادب بھی تھے۔ اگر آپ کی غزلیں میر مہبر درد کی یاد کو تازہ کرتی ہیں تو آپ کی معرکتہ الآرا تصنیف "عالم خیال" جو چار مثنویوں کا مجموعہ ہے اُردو ادب

اور اسلوب شاعری میں ایک نیا باب کھولتا ہے۔ اس پر آپ کے دوست اور مداح بابو جوالا پرشاد برق لکھنوی مرحوم نے نہایت عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔ مثنویوں کا یہ مجموعہ اردو نظم کا نیا راستہ نکالتا ہے۔ انہیں کسرۂ اضافت کہیں نہیں آتا۔ اس کے علاوہ ایک ایک شعر جذبات لطیف اور احساس واقعی کا آئینہ بردار ہے راقم کے نزدیک جہاں تک اصلی واردات قلب کا تعلق ہے یہ مثنویاں اپنی نوعیت کی اولین کتاب ہیں۔ گھریلو تعلقات میں فطرت کی عکاسی حضرت شوق پر ختم ہے۔

ایک اور مجموعہ آپ کی مثنویوں کا گنجینہ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں بعض نظمیں استدلالیہ بھی ہیں۔ جدید طرز کی ایک اور نظم نیرنگ خیال آپ کی تصنیف سے ہے جس کے چار جزء چار مختلف بحور میں ہیں۔ یہ جدت بھی مرحوم ادیب کے بعض اجتہادوں کی طرح تقلید کے قابل ہے۔ ایک ہی بحر میں بہت سے شعر خاصکر جبکہ مثنوی لمبی ہو قارئین کے لئے اکتانے والے ہوتے ہیں۔ ہندی میں گسائیں تلسی داس نے اس قباحت کے دفع کی یہ تدبیر نکالی کہ اپنی مثنوی رامائن تو ساری کی ساری ایک ہی بحر میں رکھی۔ لیکن مثنوی کے تھوڑے تھوڑے اشعار کے بعد اور دو مصرعی اصناف شعر مثل دوہے وغیرہ کے بیچ بیچ میں داخل کر دئے۔ شوق مرحوم کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے آزاد کی طرح پنجاب میں نئی (نیچرل) شاعری کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ لکھنؤ میں بیٹھکر جدت آفرینی اور اپنے ادبی اجتہادات کی اشاعت کی۔

قاسم و زہرہ اور ایک اور ڈراما بھی آپ کی تصنیف سے ہیں۔ لیکن آپ کا کوئی ڈراما مقبول نہ ہوا۔ بہرحال یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ثقافت اردو کو ادب کی اس صنف کی جانب توجہ ہونے لگے۔ ایک مسدس لیل و نہار بھی آپ کی تصنیف سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کا دیوان فیضان شوق کے

نام سے شائع ہو گیا ہے۔ جس میں غزلیات کے علاوہ چند قطعے اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ آپ کے نثر کے مضامین تنقیدی اور مقالات ادبی بھی کتابی صورت میں شائع کر دئے جائیں جو لٹریچر کے نکات اور زبان کے اہم مسائل سے مملو ہیں ؎

آگے لکھا گیا ہے کہ شوق کی غزلیں میر کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ غزل میں اگر کسی شاعر نے میر تقی کی واقعی اور عملی تقلید کی تو وہ منشی احمد علی شوق ہی ہیں۔ میر مبرور اور ان کے کلام سے شوق کو عشق تھا۔ پھر یہ روحانی ہم نشینی جمال آفرینی کیوں نہ کرتی۔ فرماتے ہیں۔ ؎

خدا بخشے بہت ہی شوق ہم کو یاد آتا ہے
وہ دل والا تھا درد اس میں جناب میر کا سا تھا

ایک اور غزل کا مقطع ہے۔

دکھاؤں شوق ہر ہر لفظ سے میں جذب کی قوت
جو مجھ پر مہرباں روح جناب میر ہو جائے

شوق مرحوم نے نہ صرف یہ کیا کہ جدت آفرینی۔ ذوق سلیم اور اجتہاد صالح سے اردو کے تموّل و تمدن کے سامانوں میں ایزادی کی بلکہ جب دیکھا کہ ناسمجھی یا ذکاوت احساس کی تحریک سے لفظی تنقید کے مکروہ پہلو اور متروکات کی تنگ دامانی کو رواج دینے میں لوگ ساعی ہیں ان کو روکا اور عالمانہ مقالات اور اس سے بڑھ کر اپنے طرزِ عمل سے ان کی تکذیب اور تردید کرتے رہے۔ مثلاً 'گو کہ'۔ 'پہ' بمعنی 'پر'۔ 'یوں ہی' بجائے 'یو نہیں' تلک وغیرہ کلمات ان کے ہاں بار بار آئے ہیں۔ قصہ مختصر تنقید۔ زبان کے تموّل۔ اسلوب اور صنف کے بارے میں اور نظم و نثر کو تازگی بخشنے میں جو کار نمایاں حضرت شوق سے بن پڑا۔ وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوا کرتا۔

سدا رہے نام اللہ کا۔ آخر یہ عالم متبحر اور ادیب کامل جس کے احسانات سے

۷۳ اُردو زبان اورادب عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ساٹھ برس اُردو کی خدمت کرکے تہتر سال کی عمر میں ۲۷ر اپریل ۱۹۲۵ء کو جان بحق ہوا۔

ان کے بیٹے منشی طاہر علی صاحب بی اے حکومت ہند کے دفتر وزارت میں معزز عہدے پر مامور ہیں اور مرحوم مؤلف تذکرہ ہذا کے احباب میں ہیں شوق کے عزیز شاگرد منشی محمد حسین صاحب محوی نے بہت محنت سے پرانے رسالوں اور اخباروں سے لیکر ان کا کلام مؤلف تذکرہ ہذا کے پاس بھیجا۔ اگرچہ اب فیضانِ شوق شائع ہوگیا تاہم محوی صاحب کا شکریہ ادا کرنا راقم کا فرض ہے۔ منشی خورشید علی مہر دہلوی سابق مدیر روزانہ اخبار دہلی مسٹر مشیر حسین قدوائی بیرسٹر (جو آپکے نواسہ بھی ہیں) آپکے شاگردوں میں ممتاز ہیں شوق مرحوم اور مؤلف مرحوم سے برسوں خط وکتابت رہی لیکن بعض اتفاقات ایسے پیش آتے رہے کہ ملاقات کبھی نہ ہو سکی۔ اب اس کا کیا ذکر۔ دونوں جنت میں ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو:۔

خرد کو عجز زیبا ہے ادب سے دم بخود ہوکر
کہ تیری معرفت تک غیر ممکن ہے رسا ہونا

خطا سے پیشتر ہیں ہم خطا کا معترف یارب
بشر ہوں اور نہیں ممکن بشر کا بے خطا ہونا

نہیں کیوں محرم رکھوا تے نے وصف عفو سی تجھکو
نہیں منظور یارب مجھکو اپنا پارسا ہونا

بکتے بکتے تو تو اے ناصح مرا سر کھا گیا
دل گیا میرا گیا تیری گرہ سے کیا گیا

ضبط گریہ نے کیا میری سب امیدوں کا خون
یہ سمجھ بیٹھا وہ بے پروا کہ اب صبر آگیا

تمہاری غیر کی ناصح کی اب تو سب کی سنتے ہیں
کسی کی ہم نہیں سنتے تھے وہ بھی اک زمانہ تھا

دل کھوتا ہی اس سے ہم کو رازِ عشق کہنا تھا
گھر کا بھید ہی لنکا ڈھائے اتنا سمجھ رہنا تھا

ابرو نے کعبہ آج سے یہ نام رکھدیا
ہمنے اٹھا کے طاق پہ اسلام رکھدیا

دلچسپ نام سنکے لگے مانگنے حسیں
کس نے ذرا سے خون کا دل نام رکھدیا

جوڑا جو بندھ گیا تو نئے دل کہاں پھنسیں
تو نے ادھر لپیٹ کے کیوں دام رکھدیا

گل ہو کے میں کیا ہنستا۔ ایسا نہ تھا غم میرا
شبنم کی طرح گذرا روتے ہی جنم میرا

جس رستے سے شحنہ آئے وہ رستہ ہی کیوں رکھو
سات سمندر پار ہی کعبہ سوچو اے مسجد والو

دل مرا ٹوٹا تو اُس کو کچھ ملال آ ہی گیا
ہنس کے بولے جب پھنسا بالو نہیں خون آلو وہ دل

تیر سے دل کو لگا وٹ ہے کہ اس کا پیکاں
سینکڑوں خوش قامت دلمیں ہیں اِک تم بھی سہی

لیگئے وہ میرے دل کے ساتھ دنیا بھر کا حسن
خدا بخشے بہت ہی شوق ہم کو یاد آتا ہے

ہونگے وہ اسکے شرر جگنو نہ کہدینا کہیں
مُنہ کی کھاتے کھاتے خاموشی ہیں اب کہتے ہیں حال

بدلی نہ میں بناؤں نہ گھرنے کا حکم دوں
کچھ ہٹا رنگ اُسکی مہندی کا تو لطف آئیگا

دشوار ہو گیا ہے مجھ کو خود اپنا ملنا
اوسط کا رنگ پایا صرف اس حسین رخ نے

ہے زیر جبیں نقش قدم ایک حسیں کا
گھبرا کے سینے میں دل صد چاک کے ٹکڑے

دل میں نہ تو قوت ہے نہ خون اور نہ امید
اُٹھتا ہی نہیں در سے ترے اشک ہو یا دل

جس دن سے قد اس کا نوا رفتار پہ مائل
اُلجھن ہے دل اے شوق پریشان کئے ہے

اے بت اتنا نہ ستا مجھ کو کہ مسجد ڈھونڈوں
بیٹھ کے اندر چمن لو رند و دروازہ میخانے کا

آؤ چلیں بھی چار قدم ہے دروازہ بتخانے کا
اپنے بچپن کے کھلونے کا خیال آ ہی گیا

ہاں پھیلایا تھا میں نے اسمیں لال آ ہی گیا
ہے نکیلا مرے بانکے کی نظر ہی کا سا

باغ الفت میں زیادہ اور اِک بوٹا ہُوا
جمع تھا اس میں مری آنکھوں کا سب لوٹا ہُوا

وہ دل والا تھا درد اسمیں جناب میر کا سا تھا
دیکھنا شب کو تماشہ تم ہماری آہ کا

ہم نے بدلا ہے طریقہ اس سے رسم و راہ کا
تو بہ جو ٹوٹ جائے تو میرا قصور کیا

چاند کا ٹکڑا وہ ہر ناخن پہ چمکانے لگا
ہے کیا وسیع عالم میری رہ بدگی کا

لاے کا رنگ گہرا اور گل کا رنگ پھیکا
ٹھیکا میری قسمت نے لیا روئے زمیں کا

پیوند کہیں میں نے لگایا ہے کہیں کا
یہ گھر ہے کسی خانہ بر انداز مکیں کا

جو ہے وہی ہو رہتا ہے گر پڑکے یہیں کا
گھر دیکھ لیا فتنۂ محشر نے زمیں کا

زلفوں ہی کے سر میں اسے مار آؤں تو اچھا
سر کو پٹکوں گا کہاں میں جو یہ در چھوٹ دل گا

کیا مجھے عشق میں سودا تھا کہ گھر میں رہتا
جبر شیوہ نہیں ارباب وفا کا ورنہ
غیر سے راز چھپانا تھا تو میری جانب
رکھ دیا آج ہم نے دل اے شوق
پھر دل عشق میں ہے لطف تمنا کیا کم
کس دل سے ہیں مشتاق ترے ناز کا ہونا
اس لذت حسرت کی خبر ہی نہیں ورنہ
اتنا نہ دھڑکتا کہ نکلتی کوئی آواز

ہمارا نالۂ دل سر اٹھا کے پائیگا
چھری لیے ہوئے نرمی کی تن کے بیٹھا ہے

آہوں سے تھک کے چپ جو ہیں ناکام ہو گیا
صبح شب وصال کے دھڑکے زبان [illegible]
مجھ کو تو ہوش بیخودی عشق میں کہاں
چھپیں تری نظر کی مجھی تک نہیں رہیا
مجھ کو کیا ہے حسن پرستی نے نامور
ہیں نالہ کش نہ ہوا جان کر انہیں [illegible]
پڑا ہے درد سے پالا دوا ہوا [illegible]
جنوں میں گھر کو مٹا کر غضب کیا میں نے

اخیر پھیر کے پانی جو وہ حباب گیا

حاصل گریہ ہے سامان فنا ہو جانا
[illegible] خموشی [illegible] فریاد

کہیں رہتا تو تری راہ گذر میں رہتا
تو مقید کشش دل کے اثر میں رہتا
کچھ تغافل نہ ترے انداز نظر میں رہتا
دوسرا نام بیقراری کا
کچھ ضروری نہیں معشوق کا پا ہی لینا
ہوتا تو نگاہ غلط انداز کا ہونا
دشمن وہ مرے طالع ناساز کا ہونا
کچھ پاس اگر دل کو مرے راز کا ہونا

یہ آسماں میں تنگی اٹھا کے مانے گا
وہ ایک دل کی گئی دل بنا کے مانیگا

وہ چپ دیا کہ درد کو آرام ہو گیا
ہونا تھا جو سحر کو سر شام ہو گیا
میں سن رہا ہوں یہ کہ میں بدنام ہو گیا
اک لطف چلے نامہ [illegible] عام ہو گیا
شوق اس قدر بڑھا کہ یہی نام ہو گیا
[illegible] وہ سنتے مری اور اثر تو کیا ہوتا
جو خون جم کے نہ بنتا جگر تو کیا ہوتا
وہ پوچھ بیٹھتے آنے کو پھر تو کیا ہوتا

استغنا [illegible] ڈوب گیا

قطرے [illegible] فنا ہو جانا
[illegible] ایک صدا ہو جانا

حسن خالق نے دیا تھا تو دیا تھا لیکن
اے مرے طالع ناساز ترے بخت پہ حیف

لطف ہیں غیر کی شرکت ہی تو ہیں جو رسوخ وش
حیف کم حوصلگی پر کہ جفا سے پہلے

اترا کے آئینے میں چڑھاتے تھے اپنا منہ
یہ بیخودی ہے کہ ہم پوچھتے ہیں لوگوں سے

رہ گیا عرض تمنا پر تبسم کرکے وہ
ہنسنے میں بھی آنکھوں سے نکل آتے ہیں آنسو

ضعف سے کچھ کیا نہیں جاتا
کیا کروں میں جو کچھ کہے ناصح
دل کے کہنے ہو عشق میں تم شوق

اب اس سے بڑھ کے کوئی طرز دل شکن سوچو
ذلیں اس نے کچھ ایسا کیا کہ صورت اشک

مدد کو ہجر میں دل یا جگر نہیں آتا
جفا پہ شکر کا امیدوار کیوں آیا

بتوں کے بدلے یہاں بس خدا کا نام ہے اب
ہے وعدہ شام کا اور ان سے اضطراب کیسا تھا

تضحیک مکرر کا ارادہ ہے کہ اس نے
نہ جسمیں آہ نہ دیوانہ پن نہ دامن چاک

وہ آج اگر مری بے تابیوں کے منکر ہیں
بڑی ہی انکو فکر ایسی جوانی کہ کہتے ہیں

یہ بھی کیا اس نے کہا تھا کہ ستمگر ہونا
تیری قسمت میں تھا میرا ہی مقدر ہونا

کون چاہے کسی دشمن کے برابر ہونا
دل کو میں نذر تمنائے جفا کر بیٹھا

دیکھا مجھے تو چھپ گئے منہ چھپا لیا
کہیں مکان اسی شہر میں ہمارا تھا

فیصلہ مشکل ہوا اقرار یا انکار کا
غم دیدہ ہیں ہم لوگ ہمیں لطف طرب کیا

دل کے پانی پیا نہیں جاتا
منہ کسی کا سیا نہیں جاتا
صبر تم سے کیا نہیں جاتا

ستم تو میری محبت کو کچھ گھٹا نہ سکا
گرا نظر سے تو کوئی مجھے اٹھا نہ سکا

الغل لغل مجھے کوئی نظر نہیں آتا
مری وفا کا اسے اعتبار کیوں آیا

میں ایسے کعبے سے گذرا مرا اسلام ہے اب
میں لڑ رہا ہوں سویرے ہی سے کہ شام ہے اب

پھر مجھ کو بٹھایا مرے دامن کو دبا کر
وہ زندگی کے لئے ننگ ہے شباب نہیں

تو کل کہینگے کہ بجلی میں اضطراب نہیں
یہیں تم مجھ سے کہہ دو جو نہیں کہنا ہے محشر میں

اب تو تیرے از خود رفتہ رہتے ہیں اس حالت میں
بیٹھے بیٹھے ہنستے ہیں اور بیٹھے بیٹھے روتے ہیں

تنہائی میں کوئی نہیں جو صلح کرائے
میں تجھ سے لڑوں گا سر بازار کسی دن

زندہ مجھے گاڑو تو میں احسان بھی مانوں
مرنے پہ کرو ہی گے یہ بیگار کسی دن

کیا جنوں خیز بہار آئی ہے گلزاروں میں
بلبلیں آگ دکھانے لگیں منقاروں میں

لاکھ باغوں کے گلوں کو یہ کفایت کرتا
رنگ جو صرف ہوا تیرے رخسار و نگاہیں

ہوس پہ عشق کی غیرت کا پاس غالب ہے
جو بے حجاب انہیں دیکھوں تو خود حجاب کروں

سکون قلب کے الزام سے بچوں کیونکر
کہاں سے ضعف میں سامان اضطراب کروں

تم نے الٹی بات پوچھی ہے کہ مرنے کا سبب
پوچھنا یہ تھا کہ زندہ آج تک کیونکر ہیں ہوں

میں بہرا ہوں تو دینا ہے انہیں کا منہ جواب انکو
وہ خود سنتے ہیں صلواتیں مجھے تو کیا سناتے ہیں

غرور جور کا بانی ہے اور کچھ بھی نہیں
یہ تقاضائے جوانی ہے اور کچھ بھی نہیں

کل تو شاداب نہ تھا وادی پہ خار اتنا
دیکھنا پاؤں کے چھالے تو نہیں پھوٹے ہیں

برا دونوں برابر کہتے ہیں لیکن ہے فرق اتنا
میں اپنے دل میں کہتا ہوں وہ میرے منہ پہ کہتے ہیں

نہ پوچھو غم میں دل کے ضعف کا حال
کہاں کا دل جو میں اب کیا ... ہیں

... دل ... چھپ کے ...
شوق ... ہو دل کو ... جانے دو

وہ ... وہ ... جان ... اب تو
... بات ... ہماری اب تو

کھویا ہوا بیٹھا ہوں ... دل میں ...
کس کی ... بیا ... مجھ کو

کیوں جنوں ... دل میں ... جانے دو
... کا ... کیا ... ذکر ... اب جانے دو

... میں پوچھتے کیا ہو ... کوئی ...
عشق ... میں آگ لگا کر ... پانی

... کیوں کسی کی یاد ...
... اپنے گھر کی راہ لو

چلمن ... مجھے ... ...
... سب ہیں ... کار رہ

جب اتنا کیوں ... عشق ...
... ہے ... اختیار رہ

دل لے کے گئی ہے کہ جگر لیکے گئی ہے
آج سُنبل - کل بلا - پرسوں کہوں کاکل کو سانپ
کبھی تولہ - کبھی ماشہ جو مزاج اس کا ہے
گور میں دو چار گز کپڑے کے شرمندہ ہیں شوقؔ
وہ خوش کہ ہیں جگر کو نظر میں لئے ہوئے
سُن کے میرا نام بولے کون شوقؔ
تو اب اُٹھنے پہ ہے یہ کہہ کے کہ نیند آئی ہے
حُسن نے عشق پہ حملہ کیا دو شکلوں سے
کیا کہیں زاہد بتوں سے کب کی رسم و راہ ہے
رشک کہتا ہے کہ اسکو میں کہیں جانے نہ دوں
دیکھنا ہو کچھ تو زاہد میرے بتخانے کو چل
بتو نکے سامنے محشر میں میری سی نہیں کہتے
ظاہر ہے میری شکل سے جو میرا حال ہے
زلف پر پیچ کا سودا لے دل
چشمِ جاناں کا کرشمہ دیکھو
صرف زنار ہی کیا ہے اے شوقؔ
جی دردِ دل کے مارے ہونٹوں پہ آ رہا ہے
ان بتوں ہی سے زمانے میں ہے جو کچھ کام ہے
دیکھ چل کر اپنے عاشق کو کہ بیچارے کیسا تھا
دردِ جاناں ہی نہیں اور اشک تھمتے ہی نہیں
کچھ دل کی سناؤں کچھ جگر کی

کچھ تو مرے پہلو سے نظر لے کے گئی ہے
لاکھ شوقؔ شئے گردِ تیرے سر کی چھوڑوں تو سہی
کل بدل جائے گا یہ رنگ جو آج اس کا ہے
اور اس دنیا سے ہم کیا خاک پتھر لے گئے
میں خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لئے ہوئے
سینکڑوں دنیا میں ہیں اس نام کے
دشمنِ جان تمنا تیری انگڑائی ہے
کچھ خداداد ہے کچھ اس کی خود آرائی ہے
ہم سے اوران سے بہت دور کی یاد اللہ ہے
جسطرف رُخ ہو یہ کہدوں میرے گھر کی راہ ہے
تیری مسجد میں تو بس اللہ ہی اللہ ہے
یہ سب کہتے ہیں مُنہ دیکھی خدا لگتی نہیں کہتے
پوچھو نہ کچھ فقیر کی صورت سوال ہے
کچھ تیری گانٹھ گرہ میں ہے بھی
خود ہی میکش بھی ہے خود ہی مے بھی
بول وہی ہم نے بتوں کی جے بھی
اپنے ہی تن کا پھوڑا ہم کو ستا رہا ہے
میں تو کہتا ہوں کہ بس آگے خدا کا نام ہے
زندگی وہ کر رہی ہے موت کا جو کام ہے
عشق کے ہر کام کو آغاز بے انجام ہے
بیٹھو تو کہوں ادھر ادھر کی

چاہی جو اجل میں نے تو وہ طنز سے بولا
جا کے دیکھا تو وہاں ہے فقط اللہ کا نام
شوق کافی ہے یہ لطف ان کا کہ آنے جانے
یہ دیکھو معجزہ کہ دو ہیں ایک شے کی صورتیں
قلمرو سخن کی ہر زمین پر ہوں حکم رواں
کیسے اچھے ہیں یہ بت جن کو برا کہتا ہے
بس اس سے بڑھ کے تحفہ ملیگا غربت میں
حرا میں کون ہے انساں جو ڈھونڈ کر دیتا ہوں
میرے سخن میں کہاں شوق میر و درد کا رنگ
جوش عشق میں اور باتیں تو عاشق سے
نہ سہتا ہیں تو ظلم کرتے وہ کیونکر

یہی مجنوں کو مجنوں مجھے جانتا ہے
نہ مانے وہ لیکن محبت ہے مجھ کو

وطن سے بڑھ کے محبت ہوئی وہاں کی ہمیں
اکیلے وادی غربت میں اب نہ ہمکو شوق
وعدے پہ جم کے ہیں تقاضے سنو جی کیوں
زندگی کا کیا بھروسہ یہ اجل کے ہاتھ ہے
اس کی جھوٹی قسم کا شکوہ کیا
کیسے ہی سخت ہو لیکن دلمیں جگہ تو دی ہے
بڑھا سکا نہ بڑھاتے جنوں کی رغبت کو
مرتے قتل پہ ندامت تمہاری

اچھی نہیں یہ خو تیری راحت طلبی کی
شیخ سمجھا تھا کہ کعبے میں خدا رکھا ہے
پوچھ لیتے ہیں کہ او خانہ خراب اچھا ہے
وہاں تو آنکھ میں نظر یہاں جگر میں تیر ہے
یہ میرا زور شوق فیض حضرت اسیر ہے
اللہ اللہ کرلے شیخ یہ کیا کہتا ہے
ہیں چل کے آپ ہی تحفہ خواں وطن کیلئے
کہ جان دیتا ہے یہ چار گز کفن کے لئے
دماغ چاہئے اُس بادہ کہن کے لئے
فقط اک ذرا سے جنوں کی کسر ہے
سب الزام آفت مرے صبر پر ہے

دل کو وہی خوب پہچانتا ہے
نہ جانے وہ لیکن خدا جانتا ہے

جہاں چپ ہوئے دو چار بے وطن دیکھے
اسی طرف کو چلو جس طرف زمانہ چلے
سیدھی سی بات ہے کہ کہا اور مکر گئے
آج جو کرنا ہو کر لے کل کی کل کے ٹھوکر
یہ بھی زمانے کی چیز نقش کمال
ظالم کی دشمنی بھی بجا ہے دوستی سے
سے ناکے کہ خدا کی بڑی خدائی ہے
تمہیں پہ ہے گواہ شہادت تمہاری

تری نظر کوئی جادو ہوئی نظر نہ ہوئی | وہ دل کو لے گئی لیکن مجھے خبر نہ ہوئی
سخن کے میکدے میں شوق میں نے جا کے دیکھا | کہ مے غالب نے پی لی صرف دُردِ جام باقی ہے
ہوئی ہے اس سے محبت میں تازگی پیدا | مناؤں گا نہیں سو بار میں خفا کر کے

قطعہ

ہم کو سامانِ تشفی مل گیا تقدیر سے | خود ہوں کاہل اور کوسیں بختِ نافرجام کو
حق پرستی چھوڑ دی رسمِ اخوت چھوڑ دی | طاقِ نسیاں پر دھرے بیٹھے ہیں ہم اسلام کو
ہو گئے ہیں کتنے بے پروا زمانے سے کہ ہم | سمجھے ہیں لڑکوں کی پھرکی گردشِ ایام کو
یوں ہمیں کھینچے لئے جاتی ہے ذلت جسطرح | مچھلیوں کو پھانس کر صیاد کھینچے دام کو
کر دیا ہے مُردہ دل اتنا ہجومِ یاس نے | کچھ نہیں احساس ناکامی دلِ ناکام کو
ہو نہیں سکتا جہاں میں اوج بے اسبابِ اوج | اتنا زینہ چاہئے ہو جتنی رفعت بام کو
اب بھی سیدھی راہ مل جائے جو آؤ ہوش میں | ہے غنیمت صبح کا بھولا جو آئے شام کو

رباعی

دُنیا میں وقار و اوج کچھ کھیل نہیں | مشکل یہ ہے کہ پھوٹ ہے میل نہیں
افلاس و نفاق و جہل اس پر نخوت | اے شوق منڈھے چڑھے یہ وہ بیل نہیں

شیدا

شیدا۔ منشی نبی بخش ولد میاں محمد بخش داروغہ مرحوم ساکن لاہور موچی دروازہ کشمیری الاصل میرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی مسیحیت و مہدویت کے قائل ہیں۔ ماسٹر نعمت علی خاں صاحب آزل سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ عرصہ ہوا گورنمنٹ سنٹرل پریس شملہ کے سٹور کیپر تھے۔ کلام کا انتخاب ہدیہ ناظرین ہے: ؎

ردّ و کد ہم سے ہے اے چرخِ ستمگار یہ کیا | رنج پر رنج ہے آزار پہ آزار یہ کیا
تو آؤ ذرا بیٹھو مرے دیدۂ تر میں | آ جائے گا ساون کا مزا ایک نظر میں

بے رخی یاد رہے گی تری قاتل مجھ کو / غیر کو بادہ دیا زہر ہلاہل مجھ کو
غرض کیا حوض کوثر سے ارم سے ہم کو کیا مطلب / تمہاری دل میں الفت ہو تمہارا سر میں سودا ہو
نظر آئیں کرشمے صنعت باری کے ذروں میں / اگر کچھ دیکھنے والی ہماری چشم بینا ہو

شیدا: سید علی مہتدی خاں رئیس امروہہ۔ آپ کے والد سید علی منتظم خاں منتظم تخلص کرتے تھے۔ جد امجد سید علی احسن خاں احسن فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ شیدا صاحب کے بزرگ بھی بڑے رئیسوں میں گذرے ہیں۔

جناب شیدا ذی استعداد نکتہ سنج تھے۔ منشی امیر احمد صاحب مینائی امیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آخر میں آپ نے ناظم تخلص کر لیا تھا۔ فکر سخن قدیم ایشیائی شاعری کی آئینہ دار ہے۔ جناب منظور احمد صاحب صدیقی امروہوی نے حالات اور کلام روانہ کئے۔ اُن کا انتخاب ہدیہ ناظرین ہے۔

زلف اُن کی چھپ گئی تو میں دنیا سے چل دیا / مہمان رات بھر کا مسافر سرا میں تھا
اے شاہ حسن کیوں نہ فقیروں کی لی خبر / تیرا ہی تھا بھلا جو کسی کی دعا میں تھا
شیدا دریغ جی نہ اُٹھا کیوں میں بعد مرگ / کیسا اداس وہ مری بزم عزا میں تھا
کیوں چھپاتے ہو اگر غیر کے گھر جاتے ہو / اچھی باتیں نہ کرو صاف کہو جاتے ہیں
آتے ہیں اُن کی زیارت کو فرشتے شیدا / شاہ کونین کے دربار میں جو جاتے ہیں

شیدا: منشی کریم اللہ خاں شیدا مولوی امو جان صاحب کے فرزند اور منشی عبدالرحیم خاں بیدل کے برادر عزیز تھے۔ دہلی کے مشہور اور باوضع رؤسا میں ان کا شمار تھا۔ اوائل عمر ہی سے فن سخن سے دلبستگی رہی۔ غدر کے بعد جتنے مشاہیر شعراء دور آخر میں دہلی میں ہوئے ہیں، اُن سب سے جناب شیدا سے دوستانہ تعلقات تھے۔ مولانا ظہیر، انور، سالک، مائل وغیرہ آپ کے دیوان خانے میں جمع ہوا کرتے۔ جناب شیدا کا خاندان دہلی کے مشہور محققین زبان اور مستند شخصوں میں تھا۔ بڑے اچھے اخلاق اور پاکیزہ صفات

شرفا میں تھے۔ راقم السطور اکثر انکی خدمت میں جایا کرتا تھا۔ انتخاب کلام یہ ہے۔

تجھے دیکھکر ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
وہ تھا کون سا جو تماشا نہ دیکھا

نہ تھی ایک بھی چیز جس میں کہ ہم نے
جمالِ رخِ عالم آرا نہ دیکھا

نظر کیا لڑی تھی کہ بجلی گری تھی
کہیں ہم نے ایسا تماشا نہ دیکھا

نہ سمجھو وہ آنکھیں ہیں بس دیکھنے کی
تمہارا جن آنکھوں نے جلوہ نہ دیکھا

بُرے حال سے آج آیا تھا شیدا
دوانے کا تم نے تماشا نہ دیکھا

اگرچہ مجھ سے بھی اچھی طرح کہا نہ گیا
پہ اچھے اچھوں سے دکھڑا مرا سُنا نہ گیا

جو ضبط ہو نہ سکے اس کو کیا کرے انساں
ٹپک پڑے مرے آنسو جو غم سہا نہ گیا

نہیں اک فقط میں ہی قربان تم پر
فدا ہے زمانہ مری جان تم پر

نرالی ہیں سب سے ادائیں تمہاری
نہ ریجھے بھلا کیونکہ انسان تم پر

یہ کہتے ہو مجھ سے کہو کب ملو گے
یہ کیا خوب فقرہ ہے قربان تم پر

بھلا تم کو شیدا سے کیا ہے تعلق
اُٹھاتے ہیں کیوں لوگ طوفان تم پر

مانگ زلفوں میں کیا نکالی ہے
اک بلا میں بلا نکالی ہے

جاؤ دشمن کے گھر بلا سے مری
تم نے چڑ میری کیا نکالی ہے

دیکھنے کے دکھانے کے دن ہیں
یہ کہاں کی حیا نکالی ہے

تُو نے رندوں کو چھیڑ کر واعظ
چھیڑ مردِ خدا نکالی ہے۔

شیدا ۔ ٹھاکر بھیروں سنگھ صاحب جھالا۔ مصاحب سرکار بھلوہ کلام اور حالات زیادہ نہ مل سکے :-

جفا کر کے کہتے ہیں خاموش رہنا
کہ تا لے ترے مجھکو رسوا کرینگے

کہا رحم کیجے تو بولے یہ ہنسکر
کہ پھر آپ اُلفت کا دعوےٰ کرینگے

شیدا ۔ نواب معین الدّین خاں نبیرۂ نواب غازی الدین خاں نظام رئیس کالپی شعرا

کے قدردان تھے۔ سیدھا سادہ شعر کہتے :-

اتنا نازک ہے مزاج اے بت قاتل تیرا
کہ تڑپتا نہیں دل کھول کے بسمل تیرا

شمع تک ٹھنڈی اٹھی بزم سے اس کے پیچھے
اٹھے تو جل کے اٹھے بیٹھے تو جل کے بیٹھے

شیدا

شیدا۔ نواب محمد حسن کاکوروی خلف رمضان علی خاں۔ تلمیذ خواجہ حیدر علی آتش۔ صفائی زبان کا خیال رکھتے تھے۔ مضامین فرسودہ اگر باندھے ہیں تو ان کو نیا لباس پہنایا ہے۔ شان تغزل کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے :-

ہنگام نزع وصل بت بے سبب ہوا
نسخہ یہ کیمیا کا لگا ہم کو مر کے ہاتھ

جب کہا آپ پہ مرتا ہوں تو ہنس کر بولے
منہ تو دیکھو یہ بڑے آئے ہیں مرنے والے

شیدا

شیدا۔ دیوان کشن گوپال صاحب۔ رئیس وزیرآباد ضلع گوجرانوالہ و تحصیلدار خوشاب۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ چند رسالہ جات نظم ان کی تصنیف سے شائع ہو چکے ہیں۔ الفاظ چست اور بندش درست ہوتی ہے۔ کلام سے مشاقی و پختگی پائی جاتی ہے :-

دیکھیں گے زہد و تقویٰ حضرت زاہد کا ہم
ہو گیا گر اس بت کافر ادا کا سامنا

کچھ نہ نکلا منہ سے شیدا لن ترانی دیکھ لی
ہو گیا جب اس بت کافر ادا کا سامنا

یہ لطف و مدارات بلا وجہ نہیں ہے
وہ ظلم میں تازہ کوئی ایجاد کریں گے

اب تشنہ چلے ایک تہی ہاتھ کے ہمراہ
ساقی ترے میخانے کو کیا یاد کریں گے

شیدا

شیدا۔ منشی بہاری لال صاحب باشندہ مین پوری شاگرد رشید جناب طاہر۔ سخن طراز و معنی سنج شاعر ہیں۔ آسان تشبیہات سے کلام میں رنگینی پیدا کرتے ہیں۔ تخیل بھی اچھا ہے۔ استاد کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ انتخاب یہ ہے :-

ساقی نے ذرا بھی نہیں آنکھیں تو یہ سمجھے
ابر نہ بنا تو کا ... نہ ہمارا

وہ ہم کو نہیں چاہتے ہیں نہیں اس کا گلہ
مسجد میں وہی جلوہ وہی بتخانے میں

محتسب کی نہ حکومت نہ یہاں قاضی کی
دَور دَورہ مرے ساقی کا ہے میخانے میں

بے قراری سے ہے کیفیت رقصِ بسمل
دیکھ لو سیر کہ مقتل میں تماشا ہوں میں

میری آنکھوں سے غم ہجر میں بہتے ہیں اشک
اپنی تقدیر کے لکھّے کو مٹاتا ہوں میں

ہر اک حسیں کا نہ شیدا ہو کہہ دو شیدا سے
جو قدر دل کی کرے اس کو دلرُبا سمجھے

عاشقوں کو نہ کرو قتل کہ پچھتاؤ گے
قدر اربابِ وفا بعدِ فنا ہوتی ہے

یہی گلہ ہے کہ خط کیا نہ آئی ہچکی تک
کیا نہ یاد کبھی بھولے سے تم نے جاکے مجھے

خطا کسی کی ہو کوئی ہو موردِ الزام
بُتوں نے طعنے دئے آہِ نارسا کے مجھے

اثر کیسا الٰہی آہِ سوزاں نے دکھایا ہے
کہ میرا جی جلایا ہے بُتوں کا دل دُکھایا ہے

دُعا وردِ زباں ہے وصل کی بیٹھا ہوں مسجد میں
خدا سے لو لگائی ہے بُتوں سے دل لگایا ہے

شیدا

شیدا:۔ حافظ محمد فاروق تلمیذ جناب ناطق لکھنوی۔ ۱۸۷۴ء میں بمقام اٹاوہ پیدا ہوئے۔ اور ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ اُردو فارسی اور انگریزی سے بقدرِ ضرورت واقف تھے۔ کہتے ہیں کہ انہیں کئی ہزار شعر حفظ تھے۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں کمال حاصل تھا۔ افسوس یہ ہے کہ مرحوم کا کلام ضایع ہو گیا۔ کیونکہ حالتِ سفر میں انتقال کیا۔ اور اولاد یا دوست کوئی ہمراہ نہ تھا۔ چند اشعار جو دستیاب ہوئے درج ذیل ہیں:۔

وہ جانگدازیاں ہیں نہ وہ اشکباریاں
اللہ رے ضبطِ غم کی کفایت شعاریاں

ہر جگہ ہے میکدہ جب ایک میخانہ نہ ہو
بادہ بے اندازہ پی جب کوئی پیمانہ نہ ہو

سب آفتوں سے زندگی دل گذر گئی
اک آرزوئے مرگ تھی سو وہ بھی مر گئی

دل تک جو اس کی جلوہ گری کی خبر گئی
آنکھوں سے مثلِ برق تڑپ کر نظر گئی

شیدا

شیدا:۔ منشی سید معشوق احمد خلف جناب شمیم برادر جناب ریاض۔ خوش فکر ہیں۔ طبیعت میں شوخی زیادہ ہے۔ اندازِ بیان دلکش ہے۔ حضرت وسیم خیرآبادی سے

مشورۂ سخن فرماتے ہیں:۔

ہیں اُن سے دُور ہوں مرا دل اُنکے پاس ہے　　اس کے نصیب اچھے ہیں میرے نصیب سے
دل تھا وہ نذرِ غمزہ و انداز ہو چکا　　اب کیا حضور چاہتے ہیں مجھ غریب سے
دیکھے تو شوق میں کوئی دیوانگی مری　　تدبیرِ وصل پوچھ رہا ہوں رقیب سے
حشر میں میری زباں پر جو شکایت آئی　　چٹکیاں لے کے وہ بولے کہ یہ کیا ہوتا ہے
جان دینے سے محبت میں ہوا یہ انجام　　آج تک قیس ترا ذکر وفا ہوتا ہے
پڑی ان پر نظر جس کی وہ ان کا ہوگیا بندہ　　دل آجاتا ہے صورت دیکھکر ان مہ جبینوں کی
کہاں کا دل ارے واعظ حسیں تو جان لیتے ہیں　　نگاہیں آپ نے دیکھیں کہاں دل لینے والوں کی

شیدا۔ قاضی قمر الدین احمد باشندہ قاضی پور۔ شوخ طبع اور عالی خیال ہیں انداز بیان میں چلبلاہٹ ہے:۔ شیدا

کلیجہ چٹکیوں سے یوں جو دل دیتا ہے رہ رہ کر　　چھپا ہے کوئی پہلو میں مرے دردِ نہاں ہوکر
نہ کچھ مسیح سے مطلب نہ کچھ فلاطوں سے　　تمہیں کو درد تمہیں کو دوا سمجھتے ہیں
بھلے وہی ہیں زمانے میں دیکھ لے شیدا　　جو اپنے آپ کو سب سے برا سمجھتے ہیں
وہ روکیں لاکھ ہاتھ اپنا چھری کب رکنے والی ہے　　کہیں رکنے سے رکتی ہے قضا بھی مرنے والوں کی
بہائے آنکھوں سے کس دن نہیں لہو آئے　　تمہاری بزم سے جب آئے سرخرو آئے
اک نظر جلوۂ دیدار دکھاتے جاتے　　داغ حسرت مرے سینہ سے مٹاتے جاتے
یہ دلفریب ادائیں یہ شکل زاہد کش　　ہر ایک دل میں نہ کیوں تیری آرزو آئے

شیدا۔ سید غلام محی الدین خلف سید غلام جیلانی۔ ساکن آگرہ۔ شاگرد میر محب علی سلیس سنہ ۱۲۸۶ھ میں بیس سال کی عمر تھی۔ مولوی نیاز علی صاحب پریشان سندیلوی مصنف تذکرہ شعر و سخن کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اسی زمانہ کی ایک غزل کے یہ چند اشعار ہیں:۔ شیدا

ازل کے روز سے یہ مظہر نور خدا ٹھہرے
رسول ہاشمی آئینۂ قدرت نما ٹھہرے

ہمارے خانۂ دل میں پریزادوں کا قبضہ ہے
بُتے مہمان سرکش ہیں پرائے گھر میں آ ٹھہرے

رقیبوں میں نہیں ممکن ہے شیدا وصل کی صورت
جو اپنا مدعی نکلے تو دل کا مدعا ٹھہرے

شیدا

شیدا :- قاضی میر قربان علی صاحب خلف قاضی سید محمد علی دہلوی ساکن قدیم بستی نظام الدین اولیا۔ علم عروض میں دخل تھا۔ فکر رسا رکھتے تھے۔ مشکل زمینوں میں شعر کہتے تھے۔ معرفت و حقیقت کے مضامین کیفیت سے لبریز ہیں۔ علاوہ نظم کے نثر میں بھی اچھی مہارت رکھتے تھے۔ ۱۲۴۷ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ فن شعر میں خدا بخش خاں صاحب متخلص بہ تنویر سے تلمذ تھا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے :-

نغمہ کہیں ہے بلبلِ شیریں مقال کا
نالہ کہیں ہے قمری شوریدہ حال کا

جن و بشر ہیں زلفِ مسلسل کے معتقد
کیا سلسلہ ہے یہ کسی صاحب کمال کا

نہ جام برف دے ساقی نہ کاسا مے لا
خمار عشق ہو جس سے شتاب وہ شے لا

کسی یہ بلبل بیدل کا آج ماتم ہے
چمن سے آتی ہے یار و صدائے وا ویلا

عشق میں درد و غم و رنج و الم چاروں ایک
دشمن جاں ہیں یہ عاشق کے بہم چاروں ایک

شوخی و ناز و ادا اور نگہ قہر انداز
مجھکو تو ہیں یہ ترے سر کی قسم چاروں ایک

دلبر آرام جاں لے گیا آرام دل
لے گیا آرام دل۔ دلبر آرام جاں

اے مرے غنچہ دہاں ہنس کے ذرا بول تو
ہنس کے ذرا بول تو اے مرے غنچہ دہن

نظیر رکھتا نہیں حسن بے نظیر اس کا
جو لاجواب ہو اس کا بھلا جواب کہاں

میری زنجیر جنوں اور یار کی زنجیر زلف
خوب باندھا عشق نے زنجیر سے زنجیر کو

بن نہیں آتی ہے مجھ کو کوئی بھی تدبیر وصل
بدلوں گر بدلے کوئی تقدیر سے تقدیر کو

جبہ سائی لاکھ کی پہ وہ نہ مانا سنگ دل
کس طرح پلٹے کوئی تدبیر سے تقدیر کو

گلشن دنیائے فانی اور ہے
سیر باغ جاودانی اور ہے

جو ہیں شمشیر محبت کے قتیل
اون کو ہر دم زندگانی اور ہے
جس سے دل بن جائے شیدا جام جم
وہ شراب ارغوانی اور ہے

شیدا

شیدا، خواجہ محمد باقر خلف شیخ عبداللہ عالی۔ تلمیذ بقا لکھنوی۔ قریب بیس سال دکن میں قیام رہا۔ سنہ ۱۹۲۳ء کے قریب انتقال فرمایا۔ کہنہ مشق شاعر تھے۔ کلام میں درد اور سوز ہے۔ زبان کا لطف اور بندش کا حسن دلفریب ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو۔

دل ہی رہا نہ عشق دل آزار ہی رہا
یہ جنس ہی رہی نہ خریدار ہی رہا

روز دل میں اُٹھتی ہے رہ رہ کے اک [illegible] کھٹک
ہائے یہ کیا تیس دن کا روگ شیدا ہو گیا

وہیں آسمان ہوتا وہیں جو تمہیں پرستے
جو جنت بیکسوں کا کہیں جا غبار ہوتا

جو تڑپ کے آہ کرتا وہ کلیجہ تھام لیتے
کبھو کس کے دم پہ بنتی جو نہ بیقرار ہوتا

ثابت ہے بعد مرگ بھی افسردہ خاطری
ہنستا نہیں چراغ ہمارے مزار کا

کٹتی ہے ہجر یار میں کس طرح زندگی
کیا پوچھتے ہو شکر ہے پروردگار کا

پھر شوخیاں یاد آگئیں اک آفت جاں کی
پھر چٹکیاں لینے کو اٹھا درد جگر آج

خنجر ہے کہ شمشیر ہے نشتر ہے کہ پیکاں
آنکھوں میں کھنچی جاتی ہے قاتل کی نظر آج

رہا ہوں عمر بھر پروانہ اسکے روئے روشن پہ
جلیں گی آرزوئیں شمعیں بنکر میرے مدفن پہ

مدد جوش شہادت نہ کہ وقت امتحاں آیا
نگہ قاتل کی خنجر بن کے اب آیا ہے چتون پہ

اُٹھ کے پہلو سے وہ جانے کو ہیں بیتابی دل
[illegible] کچھ ایسی کہ وہ جا ہی نہ سکیں

پہ غیروں سے لڑانا آنکھ کا خالی نہ تھا ہم کو
[illegible]

خندۂ صبح قیامت پہ ہنسیں جو جو
[illegible]

جان کو صبر کروں یہ تو ہے ممکن مجھ سے
[illegible]

ایسا اجڑا [illegible]
[illegible]

نہیں بھی [illegible] شہید [illegible]
[illegible]

ہائے بیتابی دل کو وہ مری کیا سمجھے
رقص بسمل کو جو اک کھیل تماشا سمجھے

شیدا

شیدا:۔ صاحب عالم میرزا قمر الدین عرف میر کلّو نبیرۂ شاہ عالم ثانی و داماد ابوظفر بہادر شاہ۔ میرزا آغا جان کے بیٹے اور خاقانی ہند حضرت ذوق کے شاگرد تھے ہنگامۂ غدر میں پچھتر برس کی عمر تھی۔ الزام بغاوت میں انہیں پھانسی دیگئی۔ کلام یہ ہے۔

کہتے نہ تھے ہم اے دل مت نام لے وفا کا
تو نے وفا کا ثمرہ خانہ خراب دیکھا

عدم سے آئی نہ یارانِ رفتگاں کی خبر
خبر نہیں وہ کہاں جا کے قافلہ ٹھہرا

ایک مدّت سے ہے نہی پہلو
نہیں معلوم کیا ہوا دل کو

ہم نہ کہتے تھے کہ شیدا اس پری وش سے نہ مل
اک نگہ میں کر دیا دیکھا نہ دیوانہ تجھے

شیدا

شیدا:۔ حکیم اسلام بیگ نبیرۂ حکیم نصر اللہ خاں وصال شاہجہان آباد کے رہنے والے صاحب فکر سلیم تھے۔ ریاست پٹیالہ میں ملازم تھے۔ کلام مزیدار ہوتا ہے۔ چند شعر یہ ہیں:-

دوست کیا دشمن جانی بھی ستمگر نہ ہوا
ہم کو تقدیر سے مرنا بھی میسّر نہ ہوا

بلائیں لکھی تھیں اپنی ازل سے قسمت میں
کچھ اور ہوتی بلا گر نہ آسماں ہوتا

بھرا ہے کی دھوم دھام ہے ابر بہار کی
رہ جائے آبرو مژۂ اشک بار کی

شیدا

شیدا:۔ میر چھبو خاں مرحوم شاگرد مومن و مصاحب نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ فکر میں رسائی تھی۔ بندش میں صفائی۔ کلام میں اپنے استاد کا رنگ قائم رکھا ہے۔ سنہ ۱۲۷ھ میں بعالم شباب وفات پائی۔ انتخاب یہ ہے:-

ناشکر ہم نہیں ہیں ادھر کو نگاہ ہے
پر وہ نگاہ جس میں عنایت عیاں نہیں

دریا بہیں کہاں۔ کہیں مژگان بھی تر نہ ہو
مر جائے کوئی۔ اور کسی کو خبر نہ ہو

وہ دشمنی میں لوپڑے ہوں یہ بات بھی نہیں
کہتے ہیں زہر دے کے الٰہی اثر نہ ہو

کہیں وہی نہ ہو شیدا کہ اسکے کرچہ میں
نظر پڑا تھا کل اک مضطرب غبار سمجھے

شیدا **شیدا:۔** حافظ محمد اسحاق دہلوی تلمیذ و برادر اصغر مولانا راسخ۔ خلف مولوی محمد حسین صاحب فقیر۔ پہلے ستمؔ تخلص تھا۔ بعد کو شیداؔ تخلص کیا۔ چند روز فکر سخن کر کے شاعری سے دست بردار ہوگئے۔ کچھ مدت ہوئی جب ایک رسالہ ’الوعظ‘ کے نام سے نکالتے تھے۔ ابتدائی عمر کا کلام یہ ہے۔

ہائے دلی ترے صدقے تری باتوں کے نثار
یہ زباں ڈھونڈے نہ پائینگے نکل کر باہر

شیخ کی شان میں گستاخ بنوں میں توبہ
لوگ کہتے ہیں نکالے گئے بُت خانے سے

دل لیا جس کا اسی کی جان کے دشمن ہوئے
ساری دنیا سے نرالا آپ کا دستور ہے

یاں تو اپنے حوصلے سے بھی کیا تھا بڑھکے کام
جان و دل لے کر وہ لوٹے بس یہی مقصود ہے

خدا حافظ مسافر۔ کوچۂ جاناں کی منزل کے
اسی رستے میں لٹتے ہیں ہزاروں قافلے دل کے

شیدا **شیدا:۔** منشی چندی پرشاد نگم دہلوی۔ خلف منشی رامجید اس۔ کالستھوں کے کے معزز فرقہ سے تعلق ہے۔ آپ کے بزرگ اکبر اعظم کے عہد میں جاجمئو ضلع کانپور سے دہلی میں آئے اور میر منشی کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ سنا جاتا ہے کہ بہادر شاہ کے وقت تک یہ عہدہ اس خاندان میں رہا۔ وہ لوگ زمانہ کی روش کے مطابق فارسی اور عربی میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ شیدا صاحب کے دادا شاعر تھے اور شوقؔ تخلص کرتے تھے۔ آپ کے والد حقیرؔ تخلص کرتے تھے۔ گویا شاعری شیداؔ صاحب کو بزرگوں سے میراث میں پہنچی۔ شیدا صاحب کی فارسی کی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ پھر علی گڑھ کالج میں الیف اے تک انگریزی کی تعلیم پائی۔ اسوقت مختلف تجارتی دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن راسخ مرحوم سے تلمذ ہے۔ شیدا صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں قدما کے طرز کے شیدا ہیں اور اسے خوب نباہتے ہیں۔ زبان کی فصاحت اور محاورے کی صحت آپ کے کلام کا جوہر ہیں۔ علاوہ غزل کے نظموں میں بھی گل افشانی فرماتے ہیں۔ رموز فن سے آگاہ ہیں۔ حسب ذیل اصحاب کو آپ سے تلمذ ہے۔ سید نواب حسین

صاحب سفیر مسوی۔ حکیم مدن لال صاحب مدن دہلوی۔ پنڈت وشوانا تھ صاحب رضا امرتسری۔ بابو چھیتر مل صاحب شمیم بھرتپوری اور صدیق حسن صاحب صدیق دہلوی حضرت شیدا کی تاریخ ولادت ۲۵ فروری ۱۹۰۷ء ہے اب کلام ملاحظہ ہو۔

بعد مدت دل شیدا ترا ارمان نکلا — موت کے بھیس میں وہ دشمن ایماں نکلا
آج خورشید قیامت کے چھٹینگے چھکے — جل کے فرقت میں شرارِ دل سوزاں نکلا
صد شکر ضبط رازِ نہاں پردہ پوش تھا — رگ رگ میں ورنہ بادۂ عرفاں کا جوش تھا
ہوش آگیا تو آپ تھے غائب نگاہ سے — آپ آگئے تو پھر سر و پا کا نہ ہوش تھا
بُت کر دیا ہے جلوۂ حیرت طراز نے — گویا کہ میں جہاں میں زبانِ خموش تھا
جلوۂ حق کا کرشمہ صاف پیمانے میں تھا — اک سرورِ بیخودی کا رنگ میخانے میں تھا
بیخودی شوق سے یہ لطف جل جانے میں تھا — شمع کی دلکی لگی کا سوز پروانے میں تھا
ظاہر و باطن اسی بت کا ہے جلوہ چار سو — کعبہ میں رو پوش تھا پیدا جو بتخانے میں تھا
آگیا ہے کس کا پرتو نور بنکر آنکھ میں — جلوہ فرما کون میرے دلکے کاشانے میں تھا
یہ بھی ہیں شاید شراب معرفت کے تشنہ کام — حضرت شیدا کا کل کچھ ذکر میخانے میں تھا
دکھایا یاس نے وہ عالمِ ہُو ہم کو فرقت میں — دل ویراں شدہ کے گوشہ گوشہ میں بیاباں تھا
نہ کیوں گرتے ہی گُم ہو کے چاک گریباں میں — کہ ہر آنسو مرے دل کا کسی کا رازِ پنہاں تھا
تری آنکھوں نے خونریزی وہ کی ہے بزم عالم میں — نگاہیں جسطرف کو اُٹھ گئیں گنج شہیداں تھا

طالب دیدار سے تھی لن ترانی کیا ضرور — برق کے پردہ میں یہ کیا نازِ معشوقانہ تھا
پلا دی آنکھ نے ساقی کی وہ مے الفت — ہمیں تو حشر کے دن بھی عجب خمار رہا
دکھائی رحمت باری نے شانِ غفاری — جہان بھر میں نہ کوئی گنہگار رہا

کُھل جائیگی سب تم کو جفاؤں کی حقیقت — جاؤ گے کہاں عرصۂ محشر سے نکل کر
نکل آیا ہے مقتل میں نگاہِ یار کا جوبن — چڑھا ہے چار چُلّو خون تیغ اصفہانی پر

شب فراق میں اشکوں نے دھو دیا اتنا
سفیدی پھیلی ہے آنکھوں کی چاندنی ہو کر

تشنگانِ رہِ تسلیم کا پردہ رہ جائے
تیغ کا گھاٹ رہے دامن دریا ہو کر

ملی تھی ہستی سراب ہو کر رہی ہے نقش بر آب ہو کر
کہ دل میں آئی حباب ہو کر سمائی آنکھوں میں خواب ہو کر

ہماری ہستی ہے خود نمائی ہماری ہستی خدا نما ہی
یہ بیخودی اپنی رنگ لائی چلی ہے جام شراب ہو کر

ہوا مخالف ہے ہر گھڑی کیا ہر ایک ساعت ہے موج دریا
یہ کشتی عمر بحر دنیا میں چل رہی ہے حباب ہو کر

ترے دہن کا معمہ کب انتخاب نہیں
یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں

ہر ایک ذرہ سے ہے رمز معرفت پیدا
یہ کون کہتا ہے دنیا کھلی کتاب نہیں

پکارتا ہے تصور میں یہ دل شیدا
نگاہ شوق کے آگے کوئی نقاب نہیں

قوت دل ہو گئیں نا رگ جاں ہو گئیں
وہ نگاہیں کیا مری ہستی کا ساماں ہو گئیں

پھانس ہی بن کر کھٹکتی ہیں کلیجے میں مرے
دل میں وہ ترچھی نگاہیں رہ کے ارماں ہو گئیں

دام میں لانے کو کیا زلف گرہ گیر نہیں
وحشت دل مری منت کش زنجیر نہیں

بت بے پیر سے ملنے کی دعا کرتا ہوں
مانگتا ہوں وہ مقدر میں جو تحریر نہیں

پرسش جرم پہ میں حشر کے دن کہہ دونگا
تیری تحریر ہے میری کوئی تقصیر نہیں

اگر ہے نور وحدت کا نہاں چشم بصیرت میں
عیاں ہے جلوہ معنی تو ہر اک اچھی صورت میں

بھلا کیجیو نہ شوق حقیقی سے کسی شے کو
یہی اک حکم ہے بس حضرت دل کی شریعت میں

اٹھا مشق تصور آنکھ سے جب پردۂ دوری
نظر آیا نہ مطلق فرق میری انکی صورت میں

ذرا دیکھو تو یہ ذرہ نوازی میں صنعت ہے
زمانہ بھر کا نقشہ کھنچ رہا ہے آنکھ کے تل میں

شعلہ کی طرح چمک گیا دل مٹ گئے ارماں
اکسیر کہوں کیا تری تاثیر نظر کو

خاموش لب تیغ ادا میں فغاں ہو
مرے دل کی طرح ٹکڑے زباں ہو

پیدا ہوئی نہ ایک نئی شورش لٹ گئی
گردن پہ تیغ تیز ہے بس دل کی آرزو

کیا بات نے کیا کہا تری ترچھی نگاہ نے
ہونٹوں پہ آکے رہ گئی بسمل کی آرزو

لئے جوش جنوں میں پنجۂ وحشت نے وہ لتّے
گریباں منزلوں تک ڈھونڈتا پھرتا ہے داماں کو

رہ بیخودی میں وہ بات ہی جو مٹے ہیں انکو ثبات ہے
یہ وہ شاخ نخل حیات ہے کہ جو خشک ہو کے ہری رہی

در و بام سے وہ ہوا عیاں کہ جو لامکاں میں بھی تھا نہاں
ہوا شکل آئینہ کل جہاں یہ نظر میں جلوہ گری رہی

سماں کثرت کا وحدت میں نگاہ حق نما لائی
تماشا آنکھ کی پتلی زمانے کا دکھا لائی

جگر میں دم نہیں باقی نہ قطرہ خون کا دل میں
نگاہ رخنہ گر کی چاہ پیغام قضا لائی

تصور ہے کسی کے عارض پرنور کا دل میں
کہ آدھ نیم شب خورشید محشر کو لگا لائی

ہم نے دس بیس ستم کش جو برابر میں رہے
کچھ وہ گھبرائے سے شرمائے سے محشر میں رہے

قتل کا لطف تو جب ہے سر مقتل قاتل
دم مرے سینے سے کھنچکر ترے خنجر میں رہے

دنیا میں مثل نقش قدم اپنا حال ہے
بیٹھے جہاں وہاں سے پھر اٹھنا محال ہے

پیر مغاں ہے کیا کسی زاہد کی روح بند
اس سبز سبز شیشے میں کیا لال لال ہے

ارماں نکل رہے ہیں پہلو بدل بدل کے
خنجر لگا رہا ہے قاتل سنبھل سنبھل کے

وہ مست ناز ہر سو جلوہ دکھا رہا ہے
آنکھوں میں بس رہا ہے دل میں سما رہا ہے

شیدا۔ منشی گرچرن لال ولد منشی گومتی پرشاد کایستھ سریواستو متوطن نبی نگر پرگنہ لاہرپور ضلع سیتاپور سال ولادت ۱۸۹۸ء شاگرد جناب میر نوروز علی عاشق سیتاپوری کہتے ہیں کہ دیوان مرتب ہو چکا ہے۔ مگر ہنوز شائع نہیں ہوا۔ اس وقت کورٹ آف وارڈس سیتاپور میں ضلعدار ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

پھر بہار آئی ہے پھر جوش جنوں بڑھتا ہے
چارہ گر ہونگے رفو چاک گریباں کیونکر

اب کہاں جائیں ٹھکانا بھی کہیں ہے ان کا
میرے مرنے پہ نہ ماتم کریں ارماں کیونکر

سمجھیں نہ آپ اس کو مرے دل کا آبلہ
سو حسرتیں ہیں دفن ذرا سے مزار میں

رند وہ رند کہ خم پی کے کبھی عار نہ ہو
مست وہ مست کہ تا حشر جو ہشیار نہ ہو

اک نہ اک روز نہیں دیکھ ہی لینگے شیدا
پردہ جب ہے کہ قیامت میں بھی دیدار نہ ہو

شیدا۔ مولوی سید نظیر حسین صاحب لکھنوی۔ آپ نواب مہدی حسین صاحب ماہر کے فرزند دلبند تھے۔ آپ کا عرف نواب بڑے صاحب تھا۔ قریب دس برس ہوئے انتقال کیا۔ علم عروض۔ معانی اور بیان میں کافی واقفیت حاصل تھی۔ نازک خیال اور مضمون آفرینی کی جانب رجحان ہے۔ اشعار میں لکھنؤ کا رنگ قدیم جھلکتا ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

بزم میں ساغر لئے جب وہ مہ انور اٹھا	جھوم کر آئی گھٹا گھن گھور ابر تر اٹھا
نشۂ دور جوانی خود ہے اپنی دیکھ بھال	اب تو اس عالم میں تیرا بھی نیا عالم ہوا
ذبح کو میرے نہ جن ہاتھوں سے خنجر اٹھ سکا	پھر انہیں ہاتھوں سے کیونکر غیر کا ماتم ہوا
گالیاں کھائیں نہ کیوں چھیڑ کے اسکو شب وصل	لطف ملتا ہے عجب اس کے بگڑ جانے میں
تھم کے یہ دریا ڈبو ہی دے گا کشتی عمر کی	روکنا اچھا نہیں ہے آنسوؤں کے تار کو

شیدا۔ حکیم میر محمد رسول خاں بہادر رضوی خلف الصدق حکیم میر ہاشم علی خاں سال پیدائش ۱۲۶۹ھ ہے۔ آپ کے مسلسل حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ میر صاحب موصوف قصبۂ موہان ضلع اناؤ کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے مورث اعلےٰ نواب میر مظفر علی خاں وحیدر علی خاں اکبر شاہ ثانی کے عہد میں امرائے دربار تھے۔ جن کو اعتماد الملک معتمد الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اور بستی کے علاقہ میں وصول پور کے نزدیک ایک لاکھ روپیہ کی جاگیر عطیۂ شاہی تھی۔ آپ کے بزرگ طبابت میں طاق اور ریاضی میں مشتاق تھے۔ آپ کے جد امجد حکیم میر کاظم علی خاں صاحب عرصہ تک عالی جاہ مہاراجہ دولت راؤ سیندھیا کے طبیب خاص رہ چکے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سکندر جاہ مرحوم دکن کے فرمانروا تھے۔ ان کے علاج ضرب المثل ہو گئے تھے۔ ان کو مہاراجہ سیاجی راؤ ثانی گائکوار بڑودہ نے معالجہ کے لئے طلب کیا۔ اور ان کی خدمات کا معقول صلہ دیا۔ مہاراجہ چندولال صاحب بہادر شادان سابق مدار المہام حیدرآباد دکن سے اس خاندان کے بڑے تعلقات تھے۔

حضرت شیدا آخر دم تک مہاراجہ سیاجی راؤ والیٔ بڑودہ کے حاضرباش طبیب رہے جنہوں نے اپنی مصاحبت اور کونسل عالیہ کی ممبری سے آپ کی قدر افزائی فرمائی۔

آپ کو خوش قسمتی سے شفیق اور کاملین زمانہ اساتذہ ہاتھ آئے۔ علوم رسمیہ مولوی غلام حسنین صاحب کنتوروی اور مولوی نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے حاصل کئے فن شعر گوئی میں انیس مرحوم سے اصلاح لی۔ فن طب کے علاوہ علمِ ریاضی میں تبحر حاصل تھا۔ عربی فارسی کے ادیب تھے۔ فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مرثیہ۔ قصیدہ۔ غزل کے علاوہ فن تاریخ گوئی سے خاص مناسبت تھی۔ ۱۳۱۲ھ میں جب آپ دوبارہ حیدرآباد تشریف لے گئے تو مہاراجہ سرکرشن پرشاد بہادر شاد سے ملے جو اُس زمانہ میں مدار المہام تھے۔ آپ نے اپنے قدیمانہ تعلقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ رباعی پیش کی:-

رباعی

چوں سلسلۂ لطف ز اجداد آمد　　دیرینہ عنایات بمن یاد آمد
خادم شدہ در دورۂ حضرت شاداں　　شیدا ز کرم ہائے تو ہم شاد آمد

کلام کا نمونہ یہ ہے:-

غیر کو صاحب وفا کہنا　　اس سمجھ کا تمہاری کیا کہنا
سنگدل تھا مگر پگھل ہی گیا　　دردِ دل اور پھر مرا کہنا

کاٹ دیتے ہیں ہر اک بات مری جھنجھلا کر　　آج غصہ میں وہ تلوار لئے بیٹھے ہیں
ان کی الفت نے یہ رسوا کیا آخر شیدا　　ہم تماشا سرِ بازار لئے بیٹھے ہیں
گر یونہی گھر میں ہے غیروں کی حکومت تو پھر　　آپ کس بات پہ سرکار بنے بیٹھے ہیں

سلام

نہ ظالم نہ شاہِ زماں رہ گئے　　سلامی ستم کے بیاں رہ گئے
نکل آیا حرُ تیر سا فوج سے　　کماں دار کھینچے کماں رہ گئے

غم حسین میں دل داغدار لے کے چلے | خزاں میں ساتھ ہم اپنے بہار لیکے چلے

عاشقانہ

ترکِ الفت بھی ہے اور نامہ و پیغام بھی ہے | مجھ سے نفرت بھی ہے اور درد مرا نام بھی ہے
ہیں نہ پینے کے بہانے تو ہزاروں ساقی | ورنہ شیشہ بھی ہے پیمانہ بھی ہے جام بھی ہے
پتا پوچھیں وہ لے کے قاصد تو کہنا | کسی سے آپ کو نفرت کبھی تھی

شیدا **شیدا:**۔ پنڈت کاشی ناتھ صاحب۔ دہلی کے باشندے ہیں۔ محکمۂ پولیس میں انسپکٹری کے فرائض ادا کر چکے ہیں۔ فنِ سخن میں شاہزادہ میرزا قیصر بخت مرحوم فروغ کے شاگرد ہیں۔ عرصہ دراز سے کچھ حال معلوم نہیں ہوا۔ سیدھا سادہ شعر کہتے ہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو

کرے نگاہ دم ذبح وہ مرے سر پر | حباب جس نے نہ دیکھا ہو آب خنجر پر
نظر کی طرح تمہاری بھی آمد و شد ہو | ہماری آنکھ کا پردہ اگر پڑے در پر
رگ گلو سے مرے خون کی جو نکلے دھار | رکھو اس کو وہ ستم آرا تو اپنے خنجر پر
سبک ہوں پھول کی صورت نگاہ عالم میں | الٰہی میں بھی جگہ پاؤں ان کے بستر پر

شیدا **شیدا:**۔ سید محمد ذکی صاحب فتح پوری۔ طبیعت میں عاشقانہ رنگ ہے۔ صاف ستھرا شعر کہتے ہیں۔ حشو و زوائد سے بچتے ہیں۔ زبان میں گھلاوٹ ہے۔ کلام یہ ہے:

حسن کی خیر ادھر بھی نظر لطف کوئی | جو غنی ہیں وہ فقیروں کی دعا لیتے ہیں
درد فرقت کسی پہلو جو نہیں کم ہوتا | دونوں ہاتھوں سے کلیجہ کو دبا لیتے ہیں
اور کچھ اشک فشانی سے نہیں ہے مطلب | اس بہانے سے لگی دل کی بجھا لیتے ہیں
وائے قسمت وہ مجھے دیکھ کے مشتاق جفا | ستم و جور سے بھی ہاتھ اٹھا لیتے ہیں

شیدا **شیدا:**۔ بابو رام رچھپال سنگھ صاحب شیدا۔ ملوتی۔ قوم کھتری۔ آپ اوائل عمری سے سخن گوئی کا مذاق و طبع سلیم رکھتے تھے۔ زندہ دل، ظرافت پسند اور شوخ مزاج ہیں۔ ذہن رسا۔ فکر فلک پیما۔ نظم و نثر دونوں میں یکتا پڑھے

کا انداز نرالا ہے۔ طرز شعر خوانی سے حسن کلام دوبالا ہو جاتا ہے۔

مدت ہوئی شغل صحافت کی طرف رجوع لائے۔ اس وقت آپ ہندوستان کے اُردو اخبار نویسوں میں عمدہ لکھنے والے شمار کئے جاتے ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں آپ نے دہلی سے ایک اخبار دوست نامی نکالا تھا۔ مگر اس زمانہ میں اخبارات کا عہد ابتدائی تھا۔ یہ پرچہ کچھ دنوں آب وتاب سے نکلا۔ پھر بند ہو گیا۔ ۱۸۹۵ء میں آپ اخبار "سول اینڈ ملٹری نیوز" لدھیانہ کے ایڈیٹر رہے۔ جو فوجی ملازمین کا آرگن تھا۔ کئی برس تک یہ اخبار آپ کے ہاتھ میں رہا۔ اس کے بعد سودیشی تحریک شروع ہوئی۔ ملک میں بیداری کے آثار نمایاں ہوئے۔ ہندوستان میں اخبار نویسی کا نیا دور شروع ہوا۔ اس زمانہ میں آپ لاہور میں اخبار کیسری اور ہندوستان کے ایڈیٹر تھے۔ لاہور میں کئی برس تک روزانہ اخباروں کو چلاتے رہے۔ اس کے بعد منشی نوبت رائے نظر مرحوم کے زمانہ میں اودھ اخبار کے اڈیٹوریل اسٹاف میں ملازم ہو گئے۔ مگر پنجاب کی محبت نے انہیں زیادہ دنوں تک لکھنؤ میں نہ رہنے دیا۔ اور پھر لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا۔ کچھ مدت دہلی کے اخبار ریاست سے متعلق تھے۔ شیدا صاحب نکتہ سنجی۔ ذہانت، شستگی زبان کی وجہ سے ہر ادبی مجلس میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ ہر مذاق کی خبریں شائع کرنے اور ان کے عنوانات گھڑنے میں آپ کو اعلےٰ درجہ کا ملکہ ہے۔ انگریزی رسائل وجرائد کے ترجمہ کرنے کی لیاقت عمدہ ہے۔ آپ عرصہ دراز تک اخبارات میں۔ "بھوتوں کے وجود" پر سلسلہ وار مضمون لکھتے رہے ہیں۔ اور ان میں روحانی نکات کو ظاہر کیا ہے۔ غرض آپ جس طرح ایک مشہور مضمون نگار ہیں اسی طرح شگفتہ مقال شاعر ہیں۔ ابتدا میں منشی بہاری لال مشتاق دہلوی شاگرد حضرت غالب کو دو چار غزلیں دکھائی ہیں۔ پھر دہلی رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جو کچھ لکھا اس پر کسی سے اصلاح نہ لی آپ غالب سے عقیدت رکھتے ہیں چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں:-

نہیں پسند کسی کا کلام اے شیدا   سوائے غالب شیریں سخن سرا کے مجھے

کلام میں مرزا کا رنگ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ایڈیٹری کی مصروفیت انہیں شعر کہنے کا موقعہ نہیں دیتی۔ اس وقت ستر برس کے قریب عمر ہے۔ اور حضرات ساقی اور ساحر و کیفی کے ہم مشق ہیں۔

مری قسمت میں گر آشفتگی ہے
کسی کا طرۂ طرار ہوتا

بپا کرے گا قیامت غرور جذبۂ دل
کہ آپ آئیں وہ لیجائیں خود منا کے مجھے

میں اپنے آپ سمجھ لونگا حشر میں واعظ
کہ نقشے یاد ہیں چلتے ہوئے بلا کے مجھے

یہ سر وبال دوش ہے اور جاں عذاب ہے
قاتل لگا نہ دیر کہ کار ثواب ہے

شیدا وطن میں بھی ہیں نہ غربت میں منزلت
اے ننگ خانداں تری مٹی خراب ہے

قیامت ڈھائیں گے رفتار سے اصلاً نہ مانیں گے
وہ جب تک شوخی بیباک ہو لیگا نہ مانیں گے

اگر وہ صاف باطن ہیں اگر وہ دل کے اچھے ہیں
برا ہے گر ہماری صاف باتوں کا مانیں گے

بجز عشق بتاں عشق خدا ہم مان لیں کیونکر
اگر سب مان بھی لیں حضرت شیدا نہ مانیں گے

صہبائے حسن و عشق سے سرشار جوش ہے
وہ مست ناز ہے تو یہاں کس کو ہوش ہے

کٹتے ہی سر کے ملک عدم کو پہنچ گئے
یہ سچ کہا کسی نے کہ سر بار دوش ہے

کیا زلف میں پتہ دل خانہ خراب کا
بیچاری زلف آپ ہی خانہ بدوش ہے

دل ہمیں رہتا ہے خون جگر پی رہا ہوں میں
سرگرم ایک انجمن ناو نوش ہے

ہو ثبات اور سکوں اس کو تو یہ نقطۂ دل
مرکز دائرۂ گنبد اخضر ہو جائے

بہار حسن جب گل عذار دیکھیں گے
ہم آج صنعت پروردگار دیکھیں گے

ہماری آنکھ سے دیکھیں اگر وفا والے
تو ایک جھپکنے کی گردش میں ہزار دیکھیں گے

ہم اپنے جذبۂ دل کو بھی آزماتے ہیں
کہ کس طرح نہیں آتا ہے یار دیکھیں گے

دیکھا عدو کو اس نے تو بسمل کیا مجھے
کیا بات میرے شوق کی ترچھی نظر کی ہے

آہ شرر فشاں نے جگر تک جلا دیا
ایدل ہوں ابھی مجھے باقی اثر کی ہے

کس کی نگاہ پھر گئی آنکھوں کے سامنے	پاؤں کی سدہ ہے اب نہ خبر مجھکو سر کی ہے

شیدا

شیدا - مسیح الملک حافظ حکیم محمد اجمل خاں صاحب رئیس اعظم دہلی۔ آپ کے اسلاف کشمیر سے ہندوستان میں آئے اور دہلی کو مستقر بنایا۔ آپ کے خاندان میں عالمگیر کے وقت سے طبابت چلی آتی ہے۔ آپ کے اجداد نے اس فنِ شریف میں بہت کچھ نام پیدا کیا۔ آپ بھی اپنے زمانہ میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ کا تبحّر علمی اور استعداد کلّی اپنی آپ نظیر تھا۔ اطراف و جوانب سے ہزاروں مریض آتے اور شفا پاتے۔ ہندوستان کا بچّہ بچّہ ان کے نام نامی سے واقف ہے۔

اگر آپ صدائے احتجاج بلند نہ کرتے تو علوم مغربی کی اشاعت اور ڈاکٹری نے یونانی طبابت کی گذشتہ عظمت کا خاتمہ کر دیا ہوتا۔ حکیم صاحب موصوف نے اپنی سعی بلیغ سے یونانی طبابت اور ویدک کے ستارۂ اقبال کو بلندی پر پہنچا کر ارباب ملک کے دل پر نقش کر دیا۔ کہ ہندوستان میں معالجہ کے وہ طریق زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جو اسکی آب و ہوا سے مناسبت رکھتے ہوں اور طبائع کے موافق ہوں۔ دورِ حاضر میں آپ کی ذات سے یونانی طبابت کو جو فروغ حاصل ہوا ہے۔ اور جدید تحقیقات سے اس میں جس قدر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس پر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام مشرقی دنیا کو ناز ہے۔ طبّی کانفرنس کی بنیاد آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے پڑی۔ اور آپ کے وقت میں دواخانہ کی ترقی اور دواؤں کے ملنے میں جو آسانیاں پیدا ہوئی ہیں۔ وہ پبلک کو آپ کا شکر گذار بناتی ہیں۔

جس طرح آپ ایک نامی اور زبردست طبیب تھے۔ اسی طرح سنجیدہ سیاسی لیڈر بھی تھے۔ آپ کے دل میں ملک اور قوم کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی سیاسی زندگی کی چپقلش نے آپ کی ذات کو نقصانات عظیم پہنچائے۔ مگر بہبودی وطن کی فکر آپ کے دل سے نہ جانی تھی نہ گئی۔ میدانِ عمل میں ثابت قدم رہ کر جو عظیم الشان قربانیاں آپ نے کیں۔ وہ ایسی نہیں ہیں کہ محبانِ وطن کے دل سے فراموش ہو جائیں۔ آپ کا

جذبۂ وطنیت حُبِّ انسانی کا مزاج تھا۔ دیگر علوم و فنون کے سوا اوائل عمر ہی سے آپ کا ذہن مذاقِ شاعری کا فریفتہ تھا عربی۔ فارسی۔ اُردو تینوں زبانوں میں آپ شعر کہتے تھے مگر شاعر کہلانے کا شوق نہ تھا زود گو اور جدّت پسند طبیعت پائی تھی نبض شناس معانی تھے شعر کے حسن و قبح کو خوب پرکھتے تھے دیوان چھپ چکا ہے مؤلف تذکرہ سے ملاقات تھی اور اپنا نیا مسودہ خاص بھیج کر جذبۂ کرم فرماتے۔ راقم پر خاص عنایت تھی ۱۹۲۷ء میں رحلت کی۔ جاوید بنی آپ کی زندہ یادگار ہے۔

اب آپکے ریاض سخن کی بہار سے سامعین لپنے دل و دماغ کو تازہ کریں۔

کاش سکھتے مرے پہلو میں شکیبائی بھی	تم جو ناں مرے پہلو میں اگر رکھا تھا
آشکارا یہ ہوا گورِ غریباں سے ہمیں	موت نے سب کیلئے ایک ہی گھر رکھا تھا
بہا اشکِ ندامت اور بھی کچھ داغ چھپا نہیں	ابھی [illegible] باقی ہے چشم نم میرا
کئے ہیں عیب کو چھپکر تم پہ عیاں سب ہیں	ابھی [illegible] میں [illegible] میرا
روزِ ازل سے تا ابد اپنی جیب کا	تھا ایک چاک جس کو ہمیں سیا گیا
اک آگ سی ہر سینۂ سوزاں میں بھر گئی	جو فصلِ گل میں عشق کو ہم نے نیا کیا
کچھ سے حالات [illegible]	[illegible] کیا
دیکھو اور شکایت [illegible]	[illegible] ہوا
یاس و نومیدی [illegible]	[illegible] ہوا
اب کہاں [illegible]	[illegible] ہوا
لذت افزا [illegible] کی حیف	[illegible] کلیف
عشقِ جاناں [illegible] آرام	[illegible] لطیف
[illegible] ستم	[illegible] تکلیف
[illegible]	[illegible]
پاس نزاکت [illegible]	[illegible] اٹھا کے دیا

عشق سے پوچھتا تھا میں سوزِ نہاں کی داستاں
نالۂ جاں گداز نے اُٹھ کے بتا دیا کہ یوں

شکوے بہت ہیں وقت کم تند ہی یار میں خموش
فکر ہے آج بزم میں یوں کہوں ماجرا کہ یوں

مستیٔ ناز کا سبق بھول گیا ہے دل مرا
روزنِ در سے جھانک کر یاد اُسے دلا کہ یوں

لطف ہو یا عتاب ہو دونوں ہیں ایک سی مگر
تجھکو خبر نہیں رہی کہتے ہیں یوں جفا کہ یوں

زہد آسان ہے۔ دشوار نہیں کچھ طاعت
کھیل الفت کے مگر کھیلنے آسان نہیں

تجھے کہاں تم۔ نہ چھپاؤ۔ کہ سمجھتا ہوں میں
تم ہو عیّار مگر میں بھی تو ناداں نہیں

نگاہِ ناز سے بسمل ہیں اہلِ انجمن سارے
چھپا ہے فتنۂ محشر تمہاری چشمِ پُرفن میں

الٰہی خیر پھر کوئی نیا گل کھلنے والا ہے
اشارے ہو رہے ہیں میرے دل اور انکی چتون میں

کتنا ہی دردِ دل ہو مگر چشم تر نہ ہو
مرنا بھلا ہے ضبط کی طاقت اگر نہ ہو

ایسی تو بے اثر نہیں بیتابیٔ فراق
نالے کروں میں اور کسی کو خبر نہ ہو

لازم ہے پاس رازِ محبت میں اسقدر
دل میں جو درد ہو جگر کو خبر نہ ہو

شیدا **شیدا:** جناب چودھری سید جواد حسین صاحب ساکن منجھن پور ضلع الہ آباد۔ شاعر خوش گفتار ہیں۔ مگر فکرِ سخن کیطرف توجہ کم فرماتے ہیں۔ آدمی خلیق وضعدار بامروّت اور ملنسار ہیں۔ یہ ان کا کلام ہے۔

آئینہ سے ہاتھ میں زلفوں کو سلجھاتے ہوئے
آرہے ہیں کس نزاکت سے وہ بل کھاتے ہوئے

ناگہانی مرگ کی میری خبر سنکر کہا
یوں نہ دیکھا تھا کسی کا دم نکلتے ہوئے

رازِ دل افسوس غیروں پر بھی ظاہر ہو گیا
سامنے میرے جو دیکھا ان کو شرماتے ہوئے

جیتے جی شیدا کے آنا ہے اگر تو آیئے
فائدہ کیا بعد مرگ آئے جو پچھتاتے ہوئے

شیدا **شیدا:۔** خواجہ غلام حسن میرٹھ شاگرد حضرت ناظم۔ مضمون آفریں طبیعت پائی ہے۔ کلام سے پختگی اور متانت ظاہر ہوتی ہے۔ کلام یہ ہے:۔

کوئی بلبل سے پوچھے حال میری چشمِ گریاں کا
کہ پل میں موتیوں سے بھر دیا دامن گلستاں کا

حقیقت آفتابِ چرخ کی عالم پہ روشن ہے / پہ اک ذرہ ہوا چھایا ہے میرے زخمِ پنہاں کا

خمیرِ توبہ کی ہو ابر آیا الٰہی توبہ / رہن پیمانہ اسی عہد میں پیماں ہوگا

دیکھ کر آئینہ خانے کو وہ ہوسکے حیراں / آئینہ خانہ انہیں دیکھ کے حیران ہوگا

زلف سلجھانے کا آیا بھی تو کب ان کو خیال / جب مرا مجموعۂ خاطر پریشاں ہوگیا

شیدا

شیدا: جناب چودھری بابو رام صاحب ولد چودھری لال بہاری صاحب کایست سریواستو۔ قصبہ مچھریٹہ ضلع سیتاپور میں زمیندار تھے ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ عدم توجہی سے زمینداری کھو بیٹھے۔ دیوان چھپنے گیا تلف ہوگیا۔ آخر عمر میں ضعف بصارت و ضعف دماغ کی وجہ سے شاعری سے دست بردار ہوگئے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں بعمر ۷۵ سال انتقال فرمایا۔ آپ کے صاحبزادہ منشی رام سروپ خزانہ صدر کلکٹری سیتاپور میں ملازم ہیں۔ اور ضبط تخلص کرتے ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

نالہ مرا دل میں ترے گھر کر نہیں سکتا / پتھر میں کبھی تیر اثر کر نہیں سکتا

عشق لب شیریں سے ہوا زندہ جاوید / میں نزع کی تلخی کا خطر کر نہیں سکتا

پہلو میں زیارت کیلئے کعبۂ دل ہے / زاہد ترے حجرہ میں سفر کر نہیں سکتا

غرقاب حیا دیکھ کے جو چشمۂ خورشید / چہرہ پہ نظر اس کے قمر کر نہیں سکتا

کچھ چشمک گری نے کام نہ زنجیر نے کیا / پابستہ مجھکو زلف گرہ گیر نے کیا

تدبیر کی خطا ہے نہ کوشش کا کچھ قصور / جو سرنوشت میں تھا وہ تقدیر نے کیا

نکل کے پہلو سے کس طرف تو وہاں پشیماں ہوا دل آنا / گیا جو کوچہ میں اسکے چھپ کر وہاں سے تیرا نہ ہوگا آنا

نہ آیا گلگشت کو وہ گلرو ہوا نہ آئی کیا خوشی ہو / فضائے بستاں میں شور ماتم ہے بلبلوں کا [illegible]

کس نے چہرہ سے رخ روشن نمایاں کر دیا / ذرہ خاک زمیں کو مہر تاباں کر دیا

۱؎ مومن خاں مومن کہہ گئے ہیں / آئینہ آئینہ دیکھے گا تو حیران ہوگا

یکساں ہیں مجھے گلشن توحید میں دونوں | گل دوست اگر ہونگے عدو خار نہ ہوگا

مسدس

کیا کروں سیر چمن کیا گل خنداں دیکھوں | بوئے گل سونگھوں میں کیا رنگ گلستاں دیکھوں
چشم مشتاق سے کیا روئے حسیناں دیکھوں | کس لئے مصر میں جاکر مہ کنعاں دیکھوں

کوئی جز اس کے نہیں ہے مجھے منظور نظر
حسن و خوبی میں نہ دیکھا کوئی اس سے برتر

اس کا دیوانہ ہوں دیوانۂ دنیا میں نہیں | حسن فانی کا کبھی محو تماشا میں نہیں
کنج وحدت سے نکلکر کہیں جاتا میں نہیں | دشت پیمائی کا دلدادہ و شیدا میں نہیں

جس کو آزاد کیا اس نے وہ کب ہوگا اسیر
لوگ کہتے ہیں مرے قید کی ناحق تدبیر

شیدا

شیدا ۔ مرزا عالیجاہ بہادر فیض آبادی خلف دلیر الدولہ مرزا محمد علی خاں عرف آغا حیدر شاگرد مرزا سرفراز علی قادر۔ شاعر پُرگو اور نازک خیال تھے۔ مضمون آفرینی اور خیال بندی کیطرف رغبت تھی۔ زبان صاف ہے۔ رعایت لفظی کے دلدادہ اور استعارات پر فریفتہ تھے۔ پورانی چال کے اچھے شاعر تھے۔ صاحب دیوان تھے یہ کلام ہے: ؎

پاؤں کیا کوچۂ دلدار سے اُٹھنے کے نہیں | سر عشاق در یار سے اُٹھنے کے نہیں
چھپائے سے نہیں چھپتی محبت کی کبھی پہچان | جو دیکھو غور سے ظاہر ہے دلکا راز آنکھوں نہیں
عجب کیا ہے صنم گر پتلیاں آنکھوں کی بول اٹھیں | تو وہ رشک مسیحا ہے کہ ہے اعجاز آنکھوں نہیں
سرف مطلب جو کہوں ملتا ہی یہ صاف جواب | تم کو منظور جو ہے ہم کو وہ منظور نہیں
خاموشیوں میں بھی ہے رضامندیوں کی بو | منظور ہاں نہیں ہے تو پیارے نہیں نہ ہو
کیوں کعبہ و کنشت میں ہوتا ہے تو خراب | جسکی تجھے تلاش ہے ظالم یہیں نہ ہو
سوزش عشق ہمارے دل بیتاب میں ہے | ہائے حیرت ہے یہاں آگ جو سیماب میں ہے

چاندنی دیکھنے وہ رشکِ چمن نکلا ہے
آج پھولوں کی مہک چادرِ مہتاب میں ہے

بند کر آنکھ تو ہو چشمِ بصیرت روشن
وہی بیدار ہے جو شخص یہاں خواب میں ہے

گل کو دامن ہو مبارک تو ہمیں عریانی
اب نہ الجھے گا کوئی خارِ بیاباں ہم سے

سب یہ اظہارِ محبت ہے زبانی صاحب
غیر سے کاہے کو ملتے جو ہمارے ہوتے

نہ بنا سے پہ اتنی جفا کیجئے
خدا سے بھی صاحب ڈرا کیجئے

جو کہیئے تمہارا ہے سودا ہمیں
تو کہتے ہیں اپنی دوا کیجئے

بلا زلف کو ان کے کہیئے اگر
تو کہتے ہیں اس سے ڈرا کیجئے

عشق میں آخر کو شیدا جان دی
جو ہمیں کرنا تھا وہ ہم کر چکے

ہم بھی کسی معشوق کا پھر ذکر کریں گے
غیروں کا نہ لو نام ستانے کو ہمارے

شیدا

شیدا:- بخشی میر زین الدین خاں صاحب شاگرد جناب ثاقب بدایونی سورت کے رہنے والے ہیں۔ اپنے عشقیہ جذبات کی تصویر یوں کھینچتے ہیں اور اسطرح اپنا جی خوش کر لیتے ہیں:-

قطعہ

تو ہی لے ہوش قاصد کو ذرا یہ تڑپ کے پوچھا
کہ پہلے تو وہ خطِ شوق لیکر دیکھیں بھالیں گے

پڑھیں گے پھر لفافہ کھول کر اوّل سے آخر تک
مگر ان نامہ پر پھیر نظر بس وقت ٹالیں گے

جھنکا کر سر چڑھا کر ناک تیوری میں بل دیکر
کبھی پھر تو وہ کچھ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں سنا لیں گے

بھری محفل میں دشمن کو دکھانے کیلئے وہ بھی
ذرا چپکے پڑھتا ہوں کے ذرا آنکھیں نکالیں گے

کسی صورت نہ ہوگا ضبط جب ان کو تو جھلا کر
سنا لیں گے وہ مجھ کو گالیاں اور منہ چڑھا لیں گے

کہے قاصد ذرا اس وقت تو دیکھنا ان کے
یہ بالا ہوش [illegible] کچھ دیا لیں گے

بچا کر آنکھ آخر پھیر کر منہ تیری زبان سے
[illegible] دیکھنے [illegible] الیں گے

عجب انداز سے کچھ [illegible]
کبھی خط کو [illegible] کبھی خط کو اٹھا لیں گے

کبھی ٹکڑے لفافے کے کبھی پرزے مرے خط کے
جلا کر بھی شرارت پھر جو بیٹھے بیٹھے سوجھیگی
اچانک پھر کسی کے حال پر کچھ رحم آئے گا
سر نامہ لگا کر مہر اپنے نام نامی کی
عوض لکھا مٹائیں گے مرا ہر سطر لکھ لکھ کر
کہینگے تجھ سے جا جلتے مرے کی کچھ خبر لانا

منگا کر شمع آگے خوب جل جل کر جلا لینگے
بنا کر ان کے پروانے گھڑی بھر کھیلیں کھا لینگے
تو وہ کاغذ قلم اور روشنائی سب منگا لینگے
پھر اوپر اسکے کچھ لکھینگے لکھکر چھپلیں چھالینگے
لباس ماتمی خط کو مرے پہلے پنھائینگے
مگر یہ کہتے ہی تیری طرف گردن جھکا لینگے

کہینگے تجھ سے جو کچھ تو وہ شیدا اسے چھپائیگا
خدا جانے کہ دم دیکر وہ کیا پٹی پڑھالیں گے

شیدا نواب

شیدا:۔ ہز ہائینس نواب محمد احمد علی خاں بہادر فرمانروائے ریاست مالیر کوٹلہ۔ آپ نواب ابراہیم علی خاں کے فرزند اکبر اور جانشین ہیں۔ مشتاقان سخن آپکے انداز بیان اور لطف زبان کا مزہ لیتے ہیں۔ ہر شعر صاف اور سلیس ہے۔ بندش نہایت چست اور نفیس ہے۔ زور طبع کو خوب جانتے ہیں۔ علم بدیع سے بھی بے خبر نہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو

رباعی

پی ہے جو شراب ارغوانی ہم نے
پایا ہے عجب لطف جوانی ہم نے
شادی و سرور میں گذاری شیدا
کس لطف سے اپنی زندگانی ہم نے

غزل

بچانا جان کا عشق رخ و گیسو میں مشکل ہے
طبیعت ہے ادھر مائل ادھر الجھا ہوا دل ہے
ازل سے جلوہ گاہ حسن معشوقاں مرا دل ہے
یہ پریوں کا اکھاڑا ہے حسینوں کی یہ محفل ہے
کہاں حسن رخ روشن سے انکے چاند کو نسبت
وہ گھٹتا ہے یہ بڑھتا ہے وہ ناقص ہے یہ کامل ہے

تمہیں ہم جانتے ہیں غیر کو تم پیار کرتے ہو — نباہیں کس طرح تم سے یہی تو سخت مشکل ہے

نمک چھڑکا ہے کیا اس شوخ کے شور محبت نے — کہ منہ کھولے ہوئے اس شوق میں ہر زخم بسمل ہے

سوال وصل پر ہر بار یوں ہنس ہنس کے کہتے ہیں — چلو رہنے بھی دو کیا چھیڑ کی باتوں سے حاصل ہے

محبت کیا جتائیں اس بت بیدرد سے شیدا
زمانہ بھر کا ہے جو بیوفا دل اس پہ مائل ہے

شیدا

شیدا:۔ نواب مرزا محمد شفیع خاں بہادر نیشاپوری۔ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ بہت پیارا اور دلنشین کلام ہے۔ کلام سے پختہ رنگی نمایاں ہے۔ یہ چند اشعار انکے ہیں۔

کبھی اس دلکی وفاؤں پہ مجھے ناز بھی تھا — اک زمانہ میں یہی ہمدم و دمساز بھی تھا

جام کوثر ہی کی واعظ نے نہ کی تھی توصیف — بلکہ کچھ تذکرۂ بادۂ شیراز بھی تھا

یاد پیری میں جوانی کی نہ آئے کیونکر — کہ اس انجام کا آخر کوئی آغاز بھی تھا

قتل عشاق پہ بیباک نہ تھا یوں پہلے — بانکپن میں تری کچھ شرم کا انداز بھی تھا

یاد میں اسکے عجب لطف اٹھائے شب ہجر — غم بھی تھا عیش بھی تھا سوز بھی تھا ساز بھی تھا

ہوا کن حسرتوں کا خون دل میں — کہ بوئے خوں ہے آہ خونچکاں میں

شیدا

شیدا:۔ محمد علی مراد آباد کے باشندے ملازمت پیشہ اور موزوں طبع شخص تھے اٹھارہویں صدی کے آخر میں حیات تھے۔ زیادہ حال اور کلام دستیاب نہ ہو سکا جسقدر ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے وہ سوا سو برس گزشتہ کی زبان کا نمونہ ہے۔

سبب تو قتل کا شیدا کے اس سوا نہ سنا — ہلا تھا دوسری بوسے کو اس کا لب اک دن

پڑی ہر جی ہی کے پیچھے ہے بے کلی دل کی — کسی ہوا سے بھی کھلتی نہیں کلی دل کی

ہزار وار یوں تو ہیں زلفیں پہ کچھ بلا ہے یہ زلف — کہ جس کے پیچ کے آگے نہ کچھ چلی دل کی

بتاں کے عشق کے شعلہ سے خاک بھی نہ رہی — جو کچھ متاع ہے گل میں سو سب جلی دل کی

چمکتے ہیں ستارے جس طرح تاریک بادل میں — ترے بازو میں زیر آستیں یوں نور تن چمکے

شیدا

شیدا:- پنڈت گنگا پرشاد رامپوری۔ شاگرد جناب تسلیم لکھنوی۔ زبان میں سادگی۔ طبیعت میں روانی ہے۔ بلیغ مضامین کو صفائی سے ادا کرتے ہیں۔ معاملہ کے شعر خوب کہتے ہیں۔ کلام یہ ہے:-

گھیرے ہوئے ہو چارہ گرو مجکو کس لئے
کیا دیکھتے ہو کوئی تماشا نہیں ہوں میں

میری وفا کی ایک زمانے میں دھوم ہے
نزدیک آپ کے مگر اچھا نہیں ہوں میں

میں نے کہا نہ میرے ہوئے تم نہ غیر کے
بولے کہ تم کو کیا ہو کسی کا نہیں ہوں میں

وہ گئے غیر کے گھر مجھ سے بگڑ کر دیکھو
یوں بگڑ جاتا ہے دم بھر میں مقدر دیکھو

رقصِ بسمل کی ذرا سیر گھڑی بھر دیکھو
تیغ کھینچی ہے تو اک ہاتھ لگا کر دیکھو

کیسے ارمان سے میں دیکھ رہا ہوں تم کو
میری جانب تو ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھو

پھر اُسی طرح نکالو مرے دل کی حسرت
پھر مجھے تم اُسی انداز سے ہنسکر دیکھو

کیا کہوں تم سے مزہ عشق میں کیا ہے ناصح
تم بھی دل اپنا کسی بت سے لگا کر دیکھو

حال ابتر ہے بہت ہجر میں میرا شیدا
دیکھنے اب بھی نہ آیا وہ ستمگر دیکھو

پونچھتے ہیں اپنے دامن سے وہ اشک
آنسوؤں کی یہ روانی اور ہے

عمر جاتی ہے نظر آتی نہیں
اپنی کشتی کی روانی اور ہے

قتل ہو کر زندۂ جاوید ہیں
یہ ہماری زندگانی اور ہے۔

شیدا

شیدا:- کسی گم نام شاعر کا تخلص ہے۔ جو شاہجہان آباد میں شاہ عالم ثانی کے عہد میں حلقہ بندی کا کام کر کے اپنی اوقات بسر کیا کرتا تھا۔ میر مہندی بیدار سے تلمذ تھا۔ اسکے سوا حال معلوم نہ ہوا۔ شوق کے تذکرے کی ترتیب سے قبل انتقال کر چکا تھا۔

لیکے دل کو دلربا کیوں اب قسم کھاتے ہو تم
ہم نظر بازوں کے آگے سے کہاں جاتے ہو تم

اک نرالے شہر میں بانکے تمھیں پیدا ہوئے
ہر گھڑی تیغ و سپر لے کے دھمکاتے ہو تم

آگے تم سے کیا توقع ہو کہ شیدا کو میاں
ایک بوسے پر چھری تلوار بتلاتے ہو تم

شیدا

شیدا:- میرزا محمود بیگ صاحب ساکن ریاست چرکھاری ملک بندیل کھنڈ۔ ان کے والد ماجد ریاست میں جیل کے داروغہ تھے۔ خود کچھ زمانہ گذرا کسی دفتر میں کلرک تھے۔ حضرت فتنہ سندیلوی سے تلمذ تھا۔ عمر قریب ۵۰ سال کے ہوگی۔ یہ چند اشعار ان کے ہیں:-

بھر رہا ہے نقشِ سر وہ پر فن کیسا ۔۔۔ جھلملاتا ہے چراغ سرِ مدفن کیسا

بیکسے شیدا کا وہ دل جان سے اب خواہاں ہیں ۔۔۔ یہ تو سب ہوش کی باتیں ہیں لڑکپن کیسا

پرسانِ حال خود ہی سمجھ لینگے حالِ دل ۔۔۔ قطرہ کوئی لہو کا اگر چشم تر میں ہے

پہنچی ہے حدِ مشق تصور یہاں تک اب ۔۔۔ ہر دم جمالِ یار کا جلوہ نظر میں ہے

شیدا

شیدا:- ٹھاکر گجادھر پرشاد رئیس و زمیندار سمبولیا ضلع سیتاپور۔ شعر کی بندشیں صاف ہوتی ہیں۔ طبیعت میں کسی قدر شوخی ہے۔

بروز حشر تمہیں دور ہی سے دیکھ کے ہم ۔۔۔ پکار اٹھیں گے کہ دیکھو وہ فتنہ خو آئے

لئے ہوئے کئی بیٹھے ہیں بوتلیں شیدا ۔۔۔ کہو کہ شیخ نہ اس وقت روبرو آئے

شیدا

شیدا:- مولوی عبدالحمید سہرامی شاگرد حضرت کوثر خیرآبادی و جناب وسیم۔ تخییل بلند ہے۔ فرسودہ مضامین کو نئے لباس میں مزین کرتے ہیں۔ بعض اشعار میں زبان کا بھی لطف ہے:-

بن کر ستارہ دامنِ گردوں میں رہ گیا ۔۔۔ ذرہ ہوا بلند جو اپنے غبار کا

ملنا کسی سے عیب نہیں ہے خطا معاف ۔۔۔ کیوں توڑتے ہو دل کسی امیدوار کا

سب یہاں کے رہنے والوں کی زبانیں بند ہیں ۔۔۔ بنگیا تصویر میں گورِ غریباں دیکھ کر

شیدا

شیدا:- شیخ غفور بخش صاحب آپ کے آبا و اجداد کالپی کے رہنے والے تھے۔ غدر کے بعد اٹاوہ میں قیام پذیر ہوئے۔ جناب شیدا اٹاوہ ہی میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں تعلیم پائی۔ فارسی اور ریاضی میں کمالات تحصیل ہے۔ عربی میں بھی اچھا دخل ہے۔ شاعری

کا شوق بچپن ہی سے ہے۔ اور خود بھی صاحب تلامذہ ہیں۔ آپ کے چند شاگردوں کے نام درج ذیل ہیں:-

۱۔ شمس جناب مرتضےٰ خاں صاحب۔ ۲۔ محسن، جناب محمد محسن صاحب۔ ۳۔ برق جناب محمد وکیع صاحب۔ ۴۔ جناب آفق اٹاوی۔ ۵۔ جناب عاشق اٹاوی۔

علم ریاضی اور شعر و شاعری میں کئی رسالے آپ کی تصنیفات سے ہیں آپ نے ایک ماہانہ رسالہ موسومہ ہلال بھی جاری کیا تھا جو آپ کی ادارت میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء تک اٹاوہ سے نکلتا رہا۔ علاوہ شاعر ہونے کے آپ ایک نہایت کامیاب معلم بھی ہیں۔ آپ نے ۷ سال تک مدرسہ انجمن ہدایت الاسلام اٹاوہ کی ہیڈ ماسٹری کے فرائض انجام دیئے ہیں اور فی الحال سپروائزر میونسپل بورڈ ہیں

نہایت منکسر المزاج۔ خلیق۔ متین اور مرنجان و مرنج بزرگ ہیں۔ بیشتر وقت علمی مشاغل میں بسر فرماتے ہیں۔

آپ کی شاعری صرف غزل گوئی تک محدود نہیں۔ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ زبان شستہ۔ اسلوب بیان دلکش اور تخئیل پاکیزہ ہوتی ہے غزل کیطرح نظم میں بھی حسن بیان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

تھاما ہے جس نے ہاتھ جہاں میں یتیم کا
حقدار ہو گیا وہ ثواب عظیم کا

ان کو بلایا حق نے وہ خود طور پر گئے
رتبہ یہ تھا نبی کا وہ رتبہ کلیم کا

واعظ اُسے ہو دہشت روز حساب کیا
شیدا کو آسرا ہے عفو الرحیم کا

چارہ گر بیتابیٔ قلب و جگر دیکھا کیا
اور میں حیرت سے شکل چارہ گر دیکھا کیا

دل ہمارا آپ کی ہر دم نظر دیکھا کیا
جو مقدر نے دکھایا عمر بھر دیکھا کیا

دیکھنا تھا کچھ تو چشم شوق کو وہ دیکھتا
ہاتھ رکھکر نبض پر کیا چارہ گر دیکھا کیا

کس قدر بیسود کیا اک وعدۂ دیدار نے
شام ہی سے کوئی آثار سحر دیکھا کیا

تھی رہائی کی تمنا یا قضا کا انتظار
اک گرفتار قفس کیوں سوئے در دیکھا کیا

دشمن بھی دیکھکر کف افسوس مل گیا
بدلے نہ تم اگرچہ زمانہ بدل گیا

تاریکیاں ہی کیوں نظر آتی ہیں چارسو
آنکھیں بدل گئیں کہ زمانہ بدل گیا

یہاں آکر نہ واعظ بے پیئے جا
تبرک میکدے کا کچھ لئے جا

ملائے جا مری نظروں سے نظریں
یونہیں بوچھار تیروں کی کئے جا

خدا جانے یہ کب تک تم کہو گے
کوئی دن اور وعدے پر جیئے جا

جنوں یہ کہہ رہا ہے مسکرا کر
جو سی سکتا ہے تو دامن سیئے جا

جب تک کہ نہ ہو عشق میں دیوانہ کسی کا
کیا خاک کوئی سمجھیگا افسانہ کسی کا

کس بات کی امید کرے پھر کوئی تم سے
تم نے تو کبھی حال بھی پوچھا نہ کسی کا

زانو پہ لٹائے ہیں وہ بیہوش سمجھکر
اب ہوش میں کیا آئیگا دیوانہ کسی کا

کچھ ہوش دیا ہے جسے دنیا میں خدا نے
بہتر ہے کہ ہو جائے وہ دیوانہ کسی کا

شیدا عبث اس سے تمھیں امید وفا ہے
ہوگا وہ ہمارا نہ تمہارا نہ کسی کا

وہ بھی کیا دن تھے کہ واقف ہی نہ تھے مشکل سے ہم
آشیانہ کی ہوا کھاتے تھے ٹھنڈے دل سے ہم

کس قدر سنجیدہ رہتے وارفتگی دل سے ہم
آہ! قاتل کا پتہ پوچھا کئے قاتل سے ہم

کوئی سن پائے اگر تو ہم کو دیوانہ کہے
چپکے چپکے وہ کیا کرتے ہیں باتیں دل سے ہم

اک یہی لے دے کے ہے اجڑے ہوئے گھر کا چراغ
کس طرح داغ محبت کو مٹا دیں دل سے ہم

دل پر اضطراب لایا ہوں
شوخیوں کا جواب لایا ہوں

کرم بے شمار دکھلا دے
گنہ بے حساب لایا ہوں

نقد دل ان کو دے کے اے شیدا
جان پر خود عذاب لایا ہوں

کسی کی مسرت سے غم کو نہ بدلا
ترے غمکشوں کی یہ خودداریاں ہیں

مریض محبت کا بچنا ہے مشکل
کہ دل ایک ہے لاکھ بیماریاں ہیں

جو لگ جائے نشانے پر اسی کو تیر کہتے ہیں
جو کام آجائے موقعہ پر اسے تدبیر کہتے ہیں

وہ کیا تصویر جو دیوار پر لٹکائی جاتی ہے
جو دل کے آئینے میں ہو اسے تصویر کہتے ہیں

جہاں آیا مرے دلمیں تمنا بنگیا دل کی
تری چٹکی میں جب تک تیر ہے سب تیر کہتے ہیں

بیخودی کہتی ہے محبوب کا جلوہ دیکھو
دیکھتے کیوں نہیں اے حضرت موسیٰ دیکھو

جان پر کھیل گیا اور نہیں چاہا دیکھو
میرا دل میری نظر میرا کلیجا دیکھو

جام جمشید مرا دل ہے کہاں جاتے ہو
یہیں بیٹھے ہوئے دنیا کا تماشا دیکھو

کس طریقے سے سکھاتے ہیں وہ مرنا مجھکو
مجھ سے کہتے ہیں کہ پروانے کا جلنا دیکھو

ہم اپنا جان کے کہنے میں آ گئے دل کے
یہ کیا خبر تھی کہ دے گا فریب پہل کے

وہ یادگار ستم ہیں یہ یادگار وفا
وہ تیرے تیر کے ٹکڑے ہیں یہ مرے دل کے

شیدا:- منشی بشیر حسن صاحب ریختی گو اکبر آبادی۔ چند سال قبل بمبئی میں قیام تھا۔ انہوں نے اس نئی روشنی کے زمانہ میں جان صاحب کے رنگ کو اختیار کیا ہے۔ ریختی کہتے ہیں۔ عورتوں کے محاورات اور بول چال کو نظم کرتے ہیں۔ ہر شعر ضلع جگت سے آراستہ ہے۔ لیکن سعادت یار خاں رنگین کا ریختی ایجاد کرنے سے صرف یہ منشا نہ تھا۔ کہ تلازمہ بندی سے شعر کی نوک پلک درست کریں۔ بلکہ ان کا مقصد زبان نسواں کی حفاظت تھا۔ شیدا صاحب کے یہاں ٹکسالی محاورات کم ہوتے ہیں۔ بازاری محاورات زیادہ نظم کرتے ہیں:- شیدا

آج کل اے چچی شیدا کا عجب نقشہ ہے
باتیں کرتا ہے نگوڑا مری تصویر کے ساتھ

یہ تاک جھانک تری ہر کہیں چلی ہو گی
نکسہ وال گلی میں مری گلی ہو گی

میں صاف کہتی ہوں گیندو کا نام بد ہو گا
گلاب خاں کو اگر اتنی بے کلی ہو گی

شمس النسا نہ جانئے مرزا قمر مجھے
آتی ہے کل سے آپ کی بدلی نظر مجھے

گلشن لگا کے عیب مجھے ہو گی کب نہال
اس صبر کا تو دے گا خدا ہی ثمر مجھے

شیدا تمہاری چاہ میں ایسی ہوں باولی — میکے میں بیٹھے دیکھو ہوا سال بھر مجھے

شیدا

شیدا۔ منشی سید کفایت علی صاحب مچھلی شہری۔ حضرت شہیر کے عزیز اور تلمیذ ہیں۔ بتلانا بجائے بتانا اور دکھلانا بجائے دکھانا۔ ان کے خیال میں مخل فصاحت نہیں ہے۔

آتی ہے یہ آواز دلِ زار و حزیں سے — الفت نہ کرے کوئی کسی پردہ نشیں سے
دکھلا دو ذرا عارضِ تاباں کی تجلی — سرکا دو نقاب رخِ پُر نور کہیں سے
دل جس نے چرایا ہے پتہ اس کا لگے گا — زندہ ہیں تو ہم ڈھونڈ نکالیں گے کہیں سے

شیدا

شیدا۔ منشی نبی بخش۔ داناپوری۔ شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ صوفی مشرب صاف باطن بزرگ تھے۔ ہمیشہ مشائخ کی صحبت میں رہتے تھے۔ ان کا دیوان رموز بلیغ کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہوا تھا۔ تذکرہ ضیغم سے چند شعر انتخاب کیے جاتے ہیں:۔

جو جاتا ہے شیدا کوئی واپس نہیں آتا — ہاں سچ ہے کہ لگ جاتا ہے دل جا کے وطن میں
عکسِ رخ سے ہو یہ حیراں بندہ پرور آئینہ — چشم جوہر کی بنے پتلی سمٹ کر آئینہ
آفتاب چرخ چارم جب انہیں کہتی ہے خلق — دیکھتے ہیں سورہ والشمس پڑھ کر آئینہ
پڑ گیا ہے جب سے ان کو اپنی خود بینی کا شوق — ہاتھ سے چھٹتا نہیں ہے انکے دم بھر آئینہ
عکس افگن ہو جو اے شیدا جمالِ روئے یار — کہہ اٹھے بیساختہ اللہ و اکبر آئینہ

شیدا

شیدا۔ جناب سید علی حیدر صاحب ساکن محلہ افضل پور شہر عظیم آباد۔ آپ کے والد ماجد سید شاہ ولی حیدر، ولی تلمیذ مرزا دبیر مرحوم تھے۔ شاعری کا شوق جناب شیدا کو بچپن ہی سے ہے۔ جناب شاد عظیم آبادی سے مشورہ سخن کرتے رہتے ہیں۔ استعداد علمی اچھی ہے۔ زبان صاف اور مضامین سنجیدہ ہوتے ہیں علاوہ غزل کے نوحے اور سلام بھی کہتے ہیں عمر اس وقت تقریباً ۵۰ سال کی ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

سنیئے گا کوئی تو محشر میں مدعا اپنا
بس ایک ہے یہی لے دے کے آسرا اپنا

نہ مثلِ بانگ جرس کس طرح کروں فریاد
لٹا ہے راہ میں دن رہتے قافلہ اپنا

مرا فسانۂ غم سن تو لو پھر اس کے بعد
تمہیں یقین نہ کرنے کا اختیار رہا

نکل گئی شب غم تجھ سے آہ آخر کو
ذرا سی بات پہ اے دل نہ اختیار رہا

آباد ہو گی مسجد زاہد تری کہاں سے
میخانے کھل گئے ہیں پہلے ہی کچھ اذاں سے

ہیں حسرتوں کو اپنی واللہ رو چکا تھا
امید بندھ گئی کچھ قاصد ترے بیاں سے

اس ڈر سے اپنے دل میں اک پھانس چبھ رہی ہے
کیا جانیں کیا وہ پوچھیں کیا نکلے یاں زباں سے

ترکِ ادب ہے ناصح یوں ان کا ذکر کرنا
پہلے درود پڑھ لے تب نام لے زباں سے

قاتل تری گلی کو مرنے پہ بھی نہ چھوڑوں
ڈانڈا ملا ہوا ہے فردوس کا یہاں سے

جب دل ہی اپنا غم سے مرجھا رہا ہے شیدا
مطلب بہار سے کیا پھر کام کیا خزاں سے

شیدائی

شیدائی۔ منشی رحیم داد خاں۔ باشندۂ جاورہ تلمیذ صاحب زادہ شرف
سلیم الطبع اور سادہ زبان ہیں۔

حرم میں دیر میں کعبہ میں مسجد میں کلیسا میں
تصور میں نظر میں دل میں میرے جا بجا تم ہو

پھرو محشر میں اٹھلاتے ہوئے کیوں خوف ہو تم کو
تمہارے اہل محشر مالک روز جزا تم ہو

جگر کے پار ہوا دل میں جا کے بیٹھ گیا
تمہارے تیر نظر میں کمال کیسا ہے

شیریں

شیریں:- جناب نواب شاہجہان بیگم صاحبہ سابق والیہ ریاست بھوپال۔ آپ ۶ ماہ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ مطابق ۲ جولائی ۱۸۳۸ء کو قلعہ اسلام نگر میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی والدہ نواب سکندر بیگم صاحبہ نے نہایت ناز و نعمت سے آپ کو پرورش کیا۔ بیگمات خواتین کی طرح تعلیم پائی ۱۸۵۵ء میں بخشی باقی محمد خاں بہادر نصرت جنگ سے شادی ہو گئی۔

۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء کو بیگم صاحبہ مسند نشین ریاست ہوئیں۔ نظم و نسق کی قابلیت

ابتدا ہی سے تھی۔ آپ نے والیہ ملک ہو کر قوانین دیوانی و فوجداری و مال وغیرہ میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ شہر کی صفائی و روشنی۔ ریلوے کا اجرا۔ محکمہ وظائف و مصارف آپ کے عہد کی عمدہ یادگار ہیں۔ پہلے شوہر کی وفات کے بعد ۸ر نومبر ۱۸۷۱ء کو لارڈ ارل میو گورنر جنرل بہادر کی منظوری سے آپ کا عقد ثانی نواب مولوی محمد صدیق حسن خاں کے ساتھ ہوا۔ مولوی صاحب مرحوم سکندر بیگم صاحبہ کے عہد میں افسر مدارس و مہتمم عملۂ تاریخ نگاری مقرر ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ کی سعی و کوشش سے انہیں سرکار انگریزی کی جانب سے امیر الملک والاجاہ کا خطاب ملا۔ نواب صاحب نے ۱۲۹۸ھ وفات پائی اور شاہجہان بیگم صاحبہ نے ۱۹۳۰ء میں انتقال کیا۔

آپ اہل سخن کی قدردان تھیں۔ آغا کمال الدین سنجر شیرازی۔ حافظ محمد خاں شہیر جیسے شعراء آپ کی طرف سے معقول وظائف پاتے تھے۔ ۱۲۶۸ھ میں آپ کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ انتخاب کلام نذر ناظرین ہے :-

پیچ جو اس زلف کا یاد آ گیا ۔۔۔ سانپ مرے سینہ پہ لہرا گیا

روشنی مہر کی ذرہ سے بھی کم ہو جاتی ۔۔۔ خیر گذری جو ترے رخ کے مقابل نہ ہوا

اسیر ہونے میں یہ دغدغہ ہے دل کو لگا ۔۔۔ پھرائے دیکھئے قسمت کہاں کہاں صیاد

فرقت میں تری کرتا ہوں دونوں کی تسلی ۔۔۔ رکھتا ہوں کبھی دل پہ کبھی ہاتھ جگر پہ

صانع مطلق نے عالم کو بنایا ہے طلسم ۔۔۔ عقل کیوں حیران نہ ہو دنیا کی صنعت دیکھ کر

بکھرنا جو زلفوں کا یاد آ گیا ۔۔۔ تو اس دم ہوئے کیا پریشان ہم

دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے میرے عشق کا ۔۔۔ سخت مشکل ہے کہ میں واقف کچھ اس فن سے نہیں

زیبا وہ رخ ہے قامت رعنا پہ اس طرح ۔۔۔ خورشید کا ہے پھول صنوبر کی ڈال میں

کیا تم سے میں کہوں کہ تمہارے فراق میں ۔۔۔ اتنے ستم اٹھائے کہ جن کا بیان نہیں

سنئے تو اپنے غم کی کہانی سنائیں ہم ۔۔۔ وہ حرف ہے کچھ ایسی بڑی داستاں نہیں

لگاؤ دل کا اگر واں نہیں تو یاں بھی نہیں
محبتوں کی نظر واں نہیں تو یاں بھی نہیں

پھر بہار آئی پھرے بلبل دلگیر کے دن
سیکڑوں کوس گئی گردشِ تقدیر کے دن

جوانی میں ہُوا یوں عشق ہمکو مہ جبینوں کا
صنم کا کھیل اکثر کھیلتے تھے ہم لڑکپن میں

ماہ کو داغِ غلامی جس کے چہرے نے دیا
اسکی پرچھائیں سے ہو کیونکر مقابل چاندنی

زیر کاکل ہے یہ عالم اس رُخِ پُر نور کا
ابر تیرہ میں ہو جیسے جلوہ گستر چاندنی

شب وصلت بھی دامن گیر ہے اندیشۂ فرقت
سحر تو دُور ہے میرا ابھی سے دم نکلتا ہے

شیفتہ

شیفتہ:۔ حافظ بڈھا صاحب۔ قصبۂ تھانا بھون ضلع مظفر نگر کے رہنے والے۔ زمانہ قدیم کے شعرا میں تھے۔ قدرت اللہ شوق کے تذکرہ سے چند اشعار انتخاب کئے جاتے ہیں۔

دل سے سب دُور کریں فکر غم و شادی کا
چشم بد دُور ہیں اوستاد ہوں آزادی کا

جادۂ راہ عدم نکلے ترے کوچہ سے
رُتبہ پہنچا ہے کہاں تک تری صیادی کا

شاہی حسن مسلّم ہے بُتاں راج کرو
پر یہ دل ملک ہمارا ہے نہ تاراج کرو

دختر رز کو بھرے بیٹھے ہو محفل میں لئے
میکشو تاک کی حرمت کی تو کچھ لاج کرو

رُخ سے جسوقت وہ بُرقع کو اُٹھا دیتا ہے
رنگ کچھ اور ہی عالم کا دکھا دیتا ہے

شیفتہ

شیفتہ:۔ حاجی مصطفےٰ خاں بہادر مرحوم رئیس دہلی و جاگیردار جہانگیر آباد۔ خلف عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضےٰ خاں بہادر مظفر جنگ۔ ان کے دادا کوہاٹ سے آکر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے والد نواب مرتضیٰ خاں نے لارڈ لیک کی رفاقت میں کارنمایاں کیئے جس کے صلہ میں ہوڈل پلول کا علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جاگیر میں دیا وہ علاقہ اس خاندان کے پاس سے نکل گیا۔ لیکن جہانگیر آباد کا علاقہ واقع ضلع میرٹھ جو انہوں نے خریدا تھا۔ اب تک ان کی اولاد کے قبضے میں ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں کی ولادت سنہ ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) میں دہلی میں ہوئی۔ اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت شروع ہو کر تکمیل کو پہنچی۔ عربی کے اچھے عالم اور فارسی کے عالم متبحر تھے۔ حج بیت اللہ سے بھی شرف اندوز

ہوئے۔ فارسی کے بھی اعلےٰ پایہ کے شاعر تھے۔ فارسی میں حسرتیؔ تخلص تھا۔ اور مرزا غالب سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ اردو میں مومن خاں کے ارشد تلامذہ میں سے تھے صحبتیں ایسی اُٹھائیں جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتیں۔ وہ زمانہ تھا کہ غالب اور مومن کے سوا ذوقؔ۔ نصیرؔ۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ۔ مولانا امام بخش صہبائی اور نواب ضیاء الدین خاں نیرؔ رخشاں وغیرہم کا نام ادب اور شاعری کے افق پر مہر نیم روز کی طرح چمک رہا تھا۔ تعلیم مکمل صحبت اتنی اعلےٰ اس پر طبیعت دقیقہ رس اور مذاق سلیم پھر شیفتہ مرحوم اُردو شاعری کے حق میں وہ کچھ کیوں نہ کر جاتے۔ جو انہوں نے کیا انہوں نے یہ کیا کہ اُردو شاعری یعنی غزل میں جو عوامیت اور سخافت آگئی تھی۔ اس کے روکنے اور لفظ کے ساتھ کلام میں متانت اور طاقت ڈالنے اور حسن ادا میں چستی اور دلاویزی پیدا کرنے میں مرزا غالب کے ساتھ اتحاد عمل کی طرح ڈالی۔ راقم کی رائے میں مرزا نوشہ کو شیفتہ پر ان دو وجوہ سے شرف اور فوقیت حاصل ہے ایک تو اولیت اور دوسرے اسلوب کلام کی اصلاح کے ساتھ تخیلی صناعی اور علوئیت اس کا ثبوت شیفتہ کا کلام اور خاصکر ایسے شعر ہیں۔

شیفتہ کیسے ہی معنی ہوں مگر نامقبول
اگر اسلوب عبارت میں متانت کم ہو
وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنی شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو

مختصر یہ کہ ان کی شاعری تخیل اور اسلوب کی صناعی اور فنی محاسن سے آگے نہیں جاتی۔ تخیل کی بلند پروازی ان کے ہاں ہے تو مگر کم۔ مرزا غالب کے لئے یہ بھی غنیمت تھا۔ اور وہ ان کی حوصلہ افزائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں :۔

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی و آنگاہ
حسرتی۔ اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غالب زحسرتی چہ سرائی کہ در غزل
چوں او تلاشِ معنی و مضموں نہ کردہ کس

قصہ مختصر نتیجہ یہ ہوا کہ دلی کی کہولت تجدید شباب سے اور لکھنؤ کی "دیوانی جوانی" صحیح الدماغی اور سلامت روی سے بدل گئی۔

شیفتہ جیسے اعلےٰ درجے کے شاعر تھے۔ ویسے ہی نقاد اور سخن فہم بھی تھے یہ ان کی تصانیف ہیں۔ دیوان اردو۔ دیوان فارسی۔ مجموعہ کلام نثر و خطوط فارسی۔ ایک سفرنامہ مسمے ترغیب السالک الی احسن المسالک۔ اس کا فارسی نام رہ آورد ہے۔ اور تذکرۂ گلشن بیخار۔ یعنی اردو شاعروں کا تذکرہ فارسی زبان ہیں۔ اس تذکرہ کی تالیف کے وقت ان کی عمر بیس سے کچھ کم ہی تھی۔ یہ عمر وہ ماحول اور میلان طبع۔ پھر جو نظیر اکبر آبادی کی نسبت اُنھوں نے یہ لکھدیا کہ:۔

"اشعار بسیار دارد کہ بزبان سوقیئن جاریست
نظر بہ آں ابیات در اعداد شعرائش نشاید شمرد"

تو تعجب کا مقام نہیں۔ کیونکہ اس وقت تک شاعری موضوع کی قید اور داخلیت سے معرا تھی۔ اور محض غزل اور مجاز کے مجلس ہیں مقید تھی۔

شیفتہ اور ان کے معاصرین وہ لطیف فضاء دنیائے اُردو میں پیدا کر گئے جو تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ کاش وہ بزرگ چالیس پچاس برس بعد پیدا ہوئے ہوتے۔ نواب شیفتہ صرف شاعر اور ادیب ہی نہ تھے۔ بلکہ ادیب ساز بھی تھے

خواجہ الطاف حسین حالی مرزا غالب کی سفارش سے نواب شیفتہ کے فرزند ارجمند نقش بند خاں کی اتالیقی پر ملازم ہوئے۔ انہوں نے شاید غالب کی شاگردی سے اتنا فائدہ نہیں اُٹھایا جتنا شیفتہ کی صحبت سے۔ کلام کی طرح شیفتہ کا شعار بھی متانت اور وجاہت سے آراستہ تھا۔ راقم کی رائے میں اگلے وقتوں میں جو درجہ میر درد کا میر اور مرزا کے مواجہہ میں تھا۔ اس سے کچھ زیادہ ہی نواب شیفتہ کا درجہ غالب اور ذوق۔ ناسخ اور آتش کے مواجہہ میں ہے۔ آخر اس صاحب کمال نے ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا نمونہ کلام یہ ہے:-

جب سے عطا ہوا ہمیں خلعت حیات کا — کچھ اور رنگ ڈھنگ ہوا کائنات کا
شیشہ اتار شکوے کو بالائے طاق رکھ — کیا اعتبار زندگی بے ثبات کا
یاں خار و خس کو بے ادبی سے نہ دیکھنا — ہاں عالم شہود ہے آئینہ ذات کا
اے مرگ آ کہ میری بھی رہ جائے آبرو — رکھتا ہے اس نے سوگ عدو کی وفات کا
کیا فائدہ نصیحت ناسود مند کا — کیا خوب پند گو بھی ہے محتاج پند کا
جب میں نہیں پسند تو پھر اور آ چکے — عاشق ہوں اس کی خاطر مشکل پسند کا
نالہ تو نارسا نہیں کیونکر گلہ کروں — میں شکوہ سنج ہوں تری کاخ بلند کا
کچھ انتظار مجھ کو نہ مے کا نہ ساز کا — ناچار ہوں کہ حکم نہیں کشف راز کا
ایمن ہیں اہل جذبہ کہ رہبر ہے ان کے ساتھ — سالک کو ہے خیال نشیب و فراز کا
پانی وضو کا لاؤ۔ رخ شمع زرد ہے — مینا اٹھاؤ وقت اب آیا نماز کا
ہائے اس برق جہاں سوز پہ آنا دل کا — سمجھے جو گرمی ہنگامہ جلانا دل کا
ہم سے پوچھیں کہ اسی کھیل میں کھوئی ہے عمر — کھیل جو لوگ سمجھتے ہیں لگانا دل کا
مصروف ہے بہت وہ ہمارے علاج میں — ہم بھی ذرا علاج کریں گے طبیب کا
شعلہ رو یار شعلہ رنگ شراب — کام یاں کیا ہے دامن تر کا

اس نے عاشق لکھا عدو کو لقب
ہائے لکھا مرے مقدر کا

قبر پر وہ بُت گلفام آیا
بارے مرنا تو مرے کام آیا

نہ لکھنا تھا غم ناکامیِ عشق
جواب نامۂ بے مدعا کیا

کس لئے لطف کی باتیں ہیں پھر
کیا کوئی اور ستم یاد آیا

آپ جو ہنستے رہے شب بزم میں
جان کو دشمن کی میں رو یا کیا

نہ دیا ہائے مجھے لذت آزار نے چین
دل ہؤا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھُلی
صبح تک وعدہ دیدار نے سونے نہ دیا

کہاں پھر وہ نایاب پایا جسے
غلط شوق ہے جنس نایاب کا

یں بے جرم رہتا ہوں خائف کہ واں
جفا میں نہیں دخل اسباب کا

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

نان و نمک کی تھی ہمیں توفیق شیفتہ
ساز و نوا کے واسطے برگ و نوا نہ تھا

حسرت سے اسکے کوچہ کو کیونکر نہ دیکھئے
اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

ساقی کی بے مدد نہ بنی بات رات کو
مطرب اگرچہ کام میں اپنے یگانہ تھا

دشمن کے فعل کی تمہیں توجیہ کیا ضرور
تم سے فقط مجھے گلۂ دوستانہ تھا

شیفتہ ہجر میں تو نالہ شبگیر نہ کھینچ
صبح ہونے کی نہیں خجلت تاثیر نہ کھینچ

چارہ گر فکر کر اس میں کہ مقدر بدلے
ورنہ بیہودہ اذیت پے تدبیر نہ کھینچ

ہر بُنِ مو سے دھواں اٹھتا ہے
آتشِ غم کو چھپاؤں کیونکر

میرے آنے سے تم اٹھ جاتے ہو
بزم دشمن میں نہ جاؤں کیونکر

یاد نے جس کی بھلایا سب کچھ
اس کی میں یاد بھلاؤں کیونکر

کچھ بیم قتل سے نہیں آنکھوں میں اشک سرخ
کھاتا ہے جوش خوں تری تلوار دیکھکر

جاتے ہیں اور منع کی طاقت نہیں مگر
رہ جائیں آپ وہ مجھے ناچار دیکھکر

کم رغبتی سے لیتے ہیں دل ہوشیار ہیں
بڑھتا ہے مول شوق خریدار دیکھکر

کہتا تھا وقت مرگ یہ ہر اک سے شیفتہ
دینا کسی کو دل تو وفادار دیکھکر

قدح سے دل ہی مراد اور نگہ سے عشق غرض
میں وہ نہیں کہ نہ سمجھوں زبان بادہ فروش

عبث ہی شیفتہ ہر اک سے پوچھتے پھرنا
ملیگا بادہ کشوں سے نشان بادہ فروش

اس تیرہ شب میں جائینگے کیونکہ عدو کے گھر
میرا رقیب وہ ہے جو ان کو دکھائے شمع

مطبوع یار کو ہے جفا اور جفا کو ہم
کہتی ہے بد عدو کو وفا اور وفا کو ہم

ہیں جاں بلب کسی کے اشارہ کی دیر ہے
دیکھی ہے اس نگہ کو قضا اور قضا کو ہم

بچتے ہیں اسقدر جو ادھر کی ہوا سے ہم
واقف ہیں شیوہ دل شورش ادا سے ہم

کم فہم ہیں تو کم ہیں پریشانیوں میں ہم
دانائیوں سے اچھے ہیں نادانیوں میں ہم

شعر اب میں نہ کہونگا کہ کوئی پڑھتا تھا
اپنے حالی مرے اشعار ترے کوچہ میں

ملک الموت کے گھر کا تھا ارادہ اپنا
لے گیا شوق غلط کار ترے کوچہ میں

کیا تجاہل سے یہ کہتا ہے کہاں رہتے ہو
تیرے کوچہ میں ستمگار ترے کوچہ میں

واں ہے وہ نغمہ جس سے کہ حوروں کے ہوش جائیں
یاں ہے وہ نالہ جس سے فرشتے حذر کریں

اہل زمانہ دیکھتے ہیں عیب ہی کو بس
کیا فائدہ کہ شیفتہ عرض ہنر کریں

کس نے سنا دیا دل حیرت زدہ کا حال
یہ کیا ہوا کہ آئینہ اب روبرو نہیں

بے طاقتی نے کام سے یہ کھو دیا کہ بس
دل گم ہوا ہے اور سر جستجو نہیں

ہم کو مقصد سے زیادہ ہے ادب میں کوشش
ورنہ کچھ غیر سوا ہم سے جسارت میں نہیں

دل کے بدلے میں طلبگار نہیں کچھ غم سے
شیفتہ زمرۂ ارباب تجارت میں نہیں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

عذر اک ہاتھ لگا ہے انہیں یاں آنے میں
کیوں کہا میں نے کہ چلئے مرے غمخانے میں

مت چھیڑ کہ یار سے جدا ہوں
اے مرگ میں آپ مر رہا ہوں

کہتا ہوں جو غیر سے نہ ملئے / کہتا ہے وہ کیا میں بے وفا ہوں

کن حسرتوں سے مرتے ہیں ہم تم کو غم نہیں / اپنی بھی مرگ تمنا سے کم نہیں

شکوہ آئین محبت میں ہے ایجاد لطیف / نسخۂ اصل میں ہر چند کہ یہ باب نہیں

واں شوق داستان ہے یاں داستان شوق / پر کیا کروں کہ دوست کوئی قصہ خواں نہیں

حرف درشت غیر سبک وضع بھی سہے / میں وہ ہوں جس پہ بار امانت گراں نہیں

ہم آج تک چھپاتے ہیں یاروں سے راز عشق / حالانکہ دشمنوں سے یہ قصہ نہاں نہیں

آرام سے ہے کون جہان خراب میں / گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

سب اسمیں محو اور وہ سب سے علیحدہ / آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

معنی کی فکر چاہیئے صورت سے کیا حصول / کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سراب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا / وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ / معنی شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو

حجاب منظر مقصود ہے طلسم خودی / جو یہ طلسم نہ ٹوٹے تو فتح باب نہ ہو

غیر سے حرف تمنائے جفا کہتے ہو / کس سے کہتے ہو خبر ہے تمہیں کیا کہتے ہو

اڑتی سی شیفتہ کی خبر یہ سنی ہے آج / لیکن خدا کرے یہ خبر معتبر نہ ہو

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی / میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

پھر وہی بے قراری تسکیں / وہی تسکیں بے قراری ہے

ہر چند کہ ہے آپ سے ملنے کی تمنا / پر آپ سے ملنے کی تمنا نہیں کہتے

دل لگایا تو ناصحوں کو کیا / بات جو اپنے جی میں آئی کی

جس لب کے بوسے غیر لیں اس لب سے شیفتہ / کمبخت گالیاں بھی نہیں تیرے واسطے

قطعہ

منظور ہے حکیم کو ہر شے کی معرفت / حالانکہ اپنی معرفت اس کو محال ہے

ارباب حکمت نظری کو عمل نہیں
جن کو کہ دستگاہ ہے فنِ نجوم میں
مفلس کو فکر ہے کہ کسی ڈھب سے کچھ ملے
جی میں کسی کے خواہش آرائش لباس
کوئی طلب میں اشہب گلگوں نظیر کی
کوئی فدائے قامت آفت خرام ہے
ناحق کسی کو شکر کسی کو شکایتیں
کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ

اہل کلام کو ہوس قیل و قال ہے
عمر ان کی صرف زائچۂ ماہ و سال ہے
منعم غریق لجۂ بیم و زوال ہے
دل میں کسی کے حسرت جاہ و جلال ہے
کوئی اسیر شوق شکار غزال ہے
کوئی خراب نرگس جادو مثال ہے
بے وجہ کوئی خوش ہے کسی کو ملال ہے
اس کا ہو دیکھئے تو بہت کم خیال ہے

شیفتہ:۔ بابو سوہن لال صاحب۔ عرصہ ہوا علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے افسوس کہ مزید حالات نہ معلوم ہو سکے۔ یہ کلام ان کا ہے۔:

دل کہاں سے کہاں کو جا نکلا
ہاتھ قاتل کا جب پڑا بھرپور
غیر کے ساتھ اور یہ رسوائی
شرم کیا کیا نہ تھی گناہوں سے

تم تو تم وہ بھی بے وفا نکلا
زخم کے منہ سے مرحبا نکلا
نام یہ آپ کا بُرا نکلا
درِ توبہ مگر کھلا نکلا

دل دیجئے یوں نہ رنج محبت میں چاہئے
ساقی وہی نگاہ وہی آنکھ پھیر سے
اے شیفتہ نہ آپ بگاڑیں رقیب سے

کچھ شکر کی جگہ بھی شکایت میں چاہئے
اک جام اور مجھ کو مروت میں چاہئے
دشمن سے دوستی بھی ضرورت میں چاہئے

شیفتہ:۔ سید محمد حسن صاحب۔ ساکن قصبہ سندیلہ۔ ڈپٹی کلکٹر میں پوری بغرض تحصیل علم لکھنؤ گئے اور وہیں حضرت اسیر کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ شیریں مقال شاعر تھے۔ مولوی نیاز علی صاحب پریشان کے خاص عزیز اور حضرت فائز سندیلوی کے تانہالی بزرگوں میں تھے۔ کلام یہ ہے:۔

تری زلفوں کے سودائی نہ دو دن ایک جا ٹھہرے
کبھی جنگل میں جا ٹھہرے کبھی بستی میں آٹھہرے

مقابل اس ستمگر کے کوئی جانباز کیا ٹھہرے
ستم جس کا کرم ٹھہرے جفا جسکی وفا ٹھہرے

قیامت عاصیوں کا انتظار روز فردا ہے
مری خاطر سے یارب آج ہی روز جزا ٹھہرے

قضا کا سامنا ہو ڈر سے آنکھیں تلملاتی ہیں
رُخِ سفّاک پر میری نگاہِ یاس کیا ٹھہرے

جمالِ روئے جاناں دیکھئے کب جلوہ آرا ہو
کئی دن سے تو راہوں پر ہیں مشتاقِ لقا ٹھہرے

شیفتہ

شیفتہ:۔ منشی محمد علی خاں ولد لطف اللہ خاں ساکن راوت پور آگرہ ان کے بزرگ کوہاٹ سے آکر فرّخ آباد میں نواب بنگش کے ملازم ہوئے۔ ایّام غدر میں خیر خواہی کے صلہ میں مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیا والیِ گوالیار نے ان کی کچھ پنشن بھی کر دی تھی۔ فیروز خاں صاحب فیروز اپنے تذکرہ میں ۱۳۰۳ھ میں ان کی عمر ۷ برس کی لکھتے ہیں۔ اور حضرت داغ کا شاگرد بتاتے ہیں۔ ؎

ہوائے گورِ غریباں سے دور دور آیا
یہ کس کی خاک اڑا کر اسے شعور آیا

ہو گیا نقطۂ موہوم دہن کو لکھ کر
فکر کرتا جو سخن کی تو مرا سر پھرتا

ہر وقت نہیں کا تو سبق یاد ہے ان کو
بھولے سے کبھی کہتے ہوئے ہاں نہیں دیکھا

شیفتہ

شیفتہ:۔ منشی سید کاظم حسین کنتوری خلف سید خادم حسین باشندہ کنتور ضلع بارہ بنکی صوبہ اودھ۔ اپنے وقت کے مطابق کہتے تھے۔ طبیعت کا زور مراعات النظیر اور روزمرّہ کی بندش نظر بانوں پر صرف کرتے تھے۔ عرصہ ہوا کہ اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ یہ ان کا کلام ہے۔

جا چکی تھی جان اپنی صدمہ ہائے ہجر سے
آ گئے تم خیر جینے کا سہارا ہو گیا

اگر دم بھر کو بے پردہ رُخ دلدار ہو جاتا
تماشا گاہِ عالم حشر کا بازار ہو جاتا

نہ دل سے عشق جاتا ہے نہ وہ سفّاک آتا ہے
مجھے تو ہر طرح اے شیفتہ مشکل ہے مشکل پر

ٹھکانا کیا کہیں افتادگاں دشت وحشت کا
یہ بیچارے جہاں بیٹھے بسر کر دی وہیں سو ل

جلا کر دل مضامین کو سخنور مول لیتے ہیں
لہو کو خشک کر کے مصرعِ تر مول لیتے ہیں

زبردستی سے لینا مفت لینا کام ہے ان کا
کہیں عشاق کے دل کو ستمگر مول لیتے ہیں

متاعِ حسن ہم نے مول لی ہے نقد جاں دیکر
سب اچھی چیز کو قیمت بڑھا کر مول لیتے ہیں

خوش رو جواں ہزاروں مٹی میں گڑ گئے ہیں
لاکھوں بنے بنائے نقشے بگڑ گئے ہیں

نشتر سے کم نہیں ہیں اے شوخ تیری باتیں
باتوں سے تیری دل میں ناسور پڑ گئے ہیں

اللہ کا خیال بھی عشقِ بتاں میں ہے
جاتا ہوں بتکدہ کو تو کعبہ کی راہ سے

صدمۂ عشق سے گھبراؤ نہ اے حضرتِ دل
اور دیکھو گے بہت کچھ ابھی دیکھا کیا ہے

غربت میں بیکسوں کو میسر نہیں کفن
لپٹی ہے لاش چادرِ گردِ ملال سے

پھیرے گا مردہ مرا سوئے خانۂ محبوب
لحد میں لاش رہے گی نہ قبلہ رو میری

شگفتہ

شگفتہ :- سید عبداللطیف گیاوی ۔ نواب صاحب رئیس گیا کے دفتر میں منشی تھے۔ ۴ ستمبر ۱۹۰۸ء کو ایک طوائف کے مکان پر شراب نوشی کے جلسہ میں شریک تھے کسی نے ساغر میں زہر ملا کر دے دیا۔ جس کے پیتے ہی راہیِ ملکِ عدم ہو گئے :-

غلطاں ہے کون خاک پہ ہے کون جاں بلب
تم جھانک کر ذرا پسِ دیوار دیکھنا

اللہ ری ڈھٹائی کہ وہ بزمِ ناز میں
کہتے ہیں اس طرف نہ خبردار دیکھنا

صبحِ شبِ وصال وہ اس کا سدھارنا
حسرت سے میرا ہر در و دیوار دیکھنا

شگفتہ

شگفتہ :- داروغہ شیخ سرفراز علی خاں خلف انتظام علی خاں صاحب شاگرد امیرؔ لکھنوی ۱۸۶۷ء میں سلون کے ناظم تھے، سید حسین مرزا صاحب عشقؔ اور جناب انسؔ لکھنوی کے ہم مشاعرہ تھے۔ ۱۲۹۴ھ کے لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں جو غزل پڑھی تھی۔ اس کا انتخاب یہ ہے۔ ؎

تراش کر بت بڑھی اللہ کیا توقیر پتھر کی
جگہ کعبہ میں پائی دیکھنا تقدیر پتھر کی

ہمارا شیشۂ دل ہوچکا ہے چور مدت سے	کہاں تک بارشیں اے آسماں پر پتھر کی
جگہ دل میں جو دیں اس بت کو ہم تقصیر کیا واعظ	خدا کے گھر میں کیا پہلے نہ تھی تصویر پتھر کی
در بت پر جبیں سائی کرے جب یا خدا مجھ سا	چمک جائے نہ کیوں اے شیفتہ تقدیر پتھر کی

شیون

شیون: جعفر علی متخلص بہ شیون۔ ابن شیخ باقر علی۔ کاکوری کے رہنے والے تھے۔ بقول جناب مولوی محمد علی حیدر صاحب علوی کاکوروی مصنف "تذکرہ مشاہیر کاکوری" بہت قابل انشا پرداز تھے۔ حضرت مولانا شاہ تقی علی قلندر قدس سرہٗ کے مرید تھے۔ شعر و سخن میں مولوی محی الدین خان ذوق سے تلمذ تھا۔ سنا جاتا ہے کہ نظم و نثر کلام بہت کچھ تھا، مگر بیشتر کلام ضائع ہوگیا۔ فارسی میں بھی نظم و نثر دونوں ہی لکھی ہیں۔ کلام اردو کا نمونہ یہ ہے:

کہیں ایسا نہ ہو وحشت زدہ کی نیند اچٹ جائے	مسیحا قبر پر رکھنا قدم آہستہ آہستہ
پس مدت ہی نیند آئی کہو بھونسی غنچوں سے	ہنسیں تربت پہ اے رو کے کرم آہستہ آہستہ
کہو شیون نہ بگڑیں وہ ابھی تو ہجر تازہ ہے	یہ زور وحشت دل ہوگا کم آہستہ آہستہ
دل و دین و جوانی کھو کے دولت ہاتھ آئی ہے	محبت کو نہ چھوڑینگے بہت کچھ کھو کے پائی ہے

شیون

شیون: عبدالرزاق صاحب باشندہ ناسک۔ زیادہ حال معلوم نہ ہوسکا طرز بیان سے نومشق معلوم ہوتے ہیں۔ زبان صاف ہے:

پھیری ہے سر محفل شمشیر نظر تو نے	کیوں قتل پہ اے قاتل باندھی ہے کمر تو نے
کیوں کنج قفس میں تو گلشن سے یہاں لایا	صیاد سے کیا مقصد کترے ہیں جو پر تو نے

کیا کیا نہ ستایا ہے شیون کو شب فرقت
بیتابی دل تو نے اے درد جگر تو نے

تتمّۂ ش

شعلہ

شعلہ:- لالہ دوارکا داس۔ خلف لالہ نرائن داس مالک دکان دوا خانہ انگریزی واقعہ انارکلی لاہور۔ معزز فرقہ کھتری سے اور لاہور کے رہنے والے ہیں۔ پیدائش سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ انگریزی بھی جانتے ہیں اور اُردو سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ طبیعت شاعری سے مناسبت رکھتی ہے۔ خوش فکر ہیں۔ مگر کم کہتے ہیں۔ جو کچھ بھی کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں۔ یہ نمونۂ کلام ہے:-

طبیعت میری یونہی گھبرائے گی کیا
مجھے موت سے پہلے موت آئیگی کیا!

دیکھ کر کالی گھٹا آنکھوں میں آنسو آگئے
پھر کسی کی یاد نے اک درد پیدا کر دیا

اے دلِ ہنگامہ پرور اے سکوں ناآشنا!
راز جو میں نے چھپایا تو نے افشا کر دیا

خدا کا نام بڑا ہے مگر پتہ نہ ملا
کسی کو بھول بھلیاں میں راستہ نہ ملا

نہ ہے نصیب کہ بجلی نے شمع دکھلائی
بہت تلاش کے بعد آج آشیانہ ملا

گیا میں کعبہ بھی اور بتکدے بھی ہو آیا
کہیں بھی تیرے سوا کوئی دوسرا نہ ملا

تلاشِ حق میں نہ دنیا کو چھوڑ اے زاہد
کہیں کا بھی نہ رہے گا اگر خدا نہ ملا

تمام عمر تلاشِ معاش میں گذری
ملی تو زیست مگر زیست کا مزا نہ ملا

بتوں کو چھوڑ کے کھوئے گئے کدھر شعلہ
خدا کی راہ میں اپنا بھی کچھ پتہ نہ ملا

جب سے کسی کے حسن کا دیوانہ ہو گیا
دل بے نیاز کعبہ و بُت خانہ ہو گیا

کوئی تمہارا حسن جہاں سوز دیکھکر
دنیائے ہست و بود سے بیگانہ ہوگیا

وارفتگیِ شعلہ شوریدہ سر نہ پوچھ
دیوانہ تو نے کردیا دیوانہ ہوگیا

مری زباں سے مرے غم کا ماجرا سن لے
کہ سلب ہونے کو ہے طاقتِ بیاں صیّاد

نہیں ہے تاب نظارہ قفس سے پھل
میں دیکھتا ہوں کہ جلتا ہی آشیاں صیّاد

ہر بات کا جو تیری بگڑ کر جواب دے
اُس بدزباں سے شعلہ کبھی گفتگو نہ کر

تیرے بغیر کون ہے پرسانِ حالِ دل
موت اور زندگی ہے برابر ترے بغیر

ہاں تیرے دم سے رونقِ بزمِ شہود تھی
ہاں زندگی سے موت ہے بہتر ترے بغیر

ناآشنائے فکر تھے دیوانگانِ شوق
ہونا پڑا ہے رنج کا خوگر ترے بغیر

مجھ سکون ناآشنا کی بے بسی تو دیکھئے
زندگی میں زندگی کا آسرا ملتا نہیں

مجھے وہ جرأتِ رندانہ بخش اے ساقیِ کوثر
کہ اپنے دلکو وقفِ اشتیاقِ ہاؤ ہو کرلوں

لڑکپن کے دن بادشاہی کے دن ہیں
جوانی کے دن کم نگاہی کے دن ہیں

اجڑتا ہے کسی کا گھر تو کوئی شاد ہوتا ہے
بہت ہنستی ہے دنیا جب کوئی برباد ہوتا ہے

میرے صبر کی انتہا دیکھ لیجے
پھر اپنا بھی زورِ جفا دیکھ لیجے

لیکے دل مجھکو دولتِ غم دی
خوب نعم البدل دیا تو نے

یا تو نگاہِ لطف سے دیکھا نہ کیجئے
گر دیکھئے تو دیکھ کے پردا نہ کیجئے

ناکامِ آرزو کو ناکام رہنے دیجے
بدنام ہوچکا ہوں بدنام رہنے دیجے

سمجھائیے نہ مجھ کو انجامِ شوق بے حد
ہاں مجھ کو بے نیازِ انجام رہنے دیجے

مرنے کے بعد جاگے ہیں کسکے نصیب آج
یہ کسکے غم میں آج کوئی سوگوار ہے

دنیا کی کچھ نہ پوچھئے بس رہنے دیجئے
دنیا بکارِ خویش بہت ہوشیار ہے

کیا پوچھتے ہو شعلۂ شوریدہ سر کا حال
بے چارہ مضطرب ہے بہت بیقرار ہے

مجھے غمہائے ہست و بود نے برباد کر ڈالا
مری تقدیر کی برگشتہ سامانی نہیں جاتی

نجانے کون سے غم نے کیا یہ حال شعلہ کا
کہ بے چارے کی صورت بھی تو پہچانی نہیں جاتی

شوق

شوق:- جناب حافظ احمد علی خانصاحب رامپوری خلف اصغر علی خاں صاحب تحصیلدار شرفائے رامپور میں نامدار تھے۔ انکے بزرگ زمانۂ قدیم سے ریاست کے نمک خوار معتمد اور دربار میں ذی رسوخ رہے۔ جناب شوق سخن سنج، علم دوست ادیب تھے۔ نظم و نثر دل آویز لکھتے۔ سفرنامۂ ابن جبیر کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ پیری میں بھی طبیعت جوان تھی۔ شعر میں عاشقانہ معاملات کو خوب ادا کرتے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

یارب تو مجھے غیر کی تقدیر عطا کر
میں تجھ سے کسی چیز کا سایل نہیں ہوتا

تمہاری جدائی میں مرنا گوارا
عدو کی خوشامد ہو مشکل یہی ہے

مجھے زندہ رہنا ہے وعدہ پر آساں
مگر وعدہ پورا ہو مشکل یہی ہے

شوق

شوق:- نواب منجھو صاحب لکھنوی تلمیذ حضرت جلیس مرحوم اور حالات نہ معلوم ہو سکے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

اک نہ اک طوفان ناحق لے پری پیکر اٹھا
کوئی آ بیٹھا جو محفل میں تری رو کر اٹھا

آگیا وقت خمار آنے لگیں انگڑائیاں
ساقیا جلدی سبو لے ہاتھ میں ساغر اٹھا

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے شمع بھی روئی ضرور
بزم میں تیرے شہید ناز کا ماتم ہوا

اک نہ اک ایذا رہی فرقت میں ہم کو تا سحر
دردوں کا جب گیا درد جگر کچھ کم ہوا

شوق

شوق:- مشتاق احمد صاحب رئیس موضع مونڈیا ضلع بریلی۔ حضرت بشیر کے

تلامذہ سے ہیں۔ پرانی روش کے دلدادہ ہیں۔ تشبیہ و استعارہ کو پسند کرتے ہیں۔

تری زلف معنبر کا اگر مضموں رقم ہوگا	سیاہی مشک ہو گی سنبل تر کا قلم ہوگا
تصور میں در دنداں کے جب اے شوقؔ سوتا ہوں	تو میری چشم دریا بار سے موتی بکھرتے ہیں

شوق

شوق:۔ جناب میرزا محمد آغا جان صاحب لکھنوی۔ تلمیذ جناب امیرؔ۔ زندہ دل سخنور۔ معنی پرست شاعر تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں انتقال کیا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:

یہ کہنا قاصد اس پردہ نشیں سے	کہ آیا ہے کسی کا خط کہیں سے
تغافل نے اداؤں نے کسی کی	مجھے تو کھو دیا دنیا و دیں سے
ہزاروں نے کفن میں منہ چھپایا	جو دیکھا تم نے چشم شرمگیں سے

شوق:۔ مراد علی شاہ خلف منشی مہتاب شاہ۔ لاہور کے رہنے والے اور حضرت خورشید لکھنوی کے تلمیذ تھے۔ مضامین قدیم پر خامہ فرسائی کرتے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

جلتا ہے سوز عشق سے یہ جسم مثل شمع	پروانوں کی طرح سے ہیں ارماں نثار دل
اے شوقؔ پہلے مانگ کے دل ہم سے لے گئے	اب کہہ رہے ہیں ہم سے اٹھے گا نہ بار دل

شوق

شوق:۔ سید صالح حسین خلف مولوی نجم الحسن صاحب مرحوم۔ عمر تخمیناً ۳۸ سال ساکن محلہ مبارک لین۔ چھپرہ ضلع سارن۔ علی گڑھ کالج میں بی۔ اے تک تعلیم پائی ہے۔ جناب سید معین الدین احمد صاحب قیس رضوی اپنی تصنیف گلشن حیات میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ جناب شوقؔ ایک سچے مسلمان۔ پابند صوم و صلوٰۃ اور ہمدرد قوم ہیں۔ زبان با اثر۔ خیالات بلند و عارفانہ ہیں۔ نشست الفاظ و سہولت نظم کا لحاظ رکھتے ہیں۔ حضرت شاد عظیم آبادی سے تلمذ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

یوں تو فرقت کی ہر اک رات ہے آفات کی رات	پر غضب ڈھاتی ہے بے یار کی برسات کی رات

دیکھکر آنکھ تری بزم میں سب تھے مدہوش
کیا بھلی لگتی تھی وہ بزم خرابات کی رات

ڈالے نہ آنکھ حور بھی گر آرزو کرے
یہ شان ہے اسی ترے خانہ خراب کی

روئیں نہ دوست نزع کیحالت کو دیکھکر
کٹتی ہے میرے پاؤں سے بیڑی عذاب کی

نرگس فقط تجھی کو نہیں انتظار دید
دریا میں کتنی پھوٹی ہیں آنکھیں حباب کی

کیا جانئے گل کھلیں گے کیا کیا
آتے ہیں بھرے ہوئے چمن سے

شوخی پہ ہے شباب حیا پیش وپس میں ہے
بجلیں نثار ہونے کو اگلے برس میں ہے

چہرہ اداس رہنے کا کچھ پوچھئے نہ حال
اپنی ہنسی خوشی کسی ظالم کے بس میں ہے

شوق

شوق:۔ چودھری مصطفےٰ حسین صاحب۔ رئیس ضلع بارہ بنکی شاگرد حضرت ثاقب بدایونی۔ سنجیدہ طبع۔ زود فکر ہیں۔ بندشیں صاف ہوتی ہیں اور ترکیبیں سلجھی ہوئی۔ کلام یہ ہے:

ذرا سا کام بھی اے جذب کامل ہو نہیں سکتا
کسی صورت سے انکا دل مرا دل ہو نہیں سکتا

یہ کیا ہی آج وہ کیوں خود بخود شرمائے جاتے ہیں
یہ کیا ہے آئینہ ان کے مقابل ہو نہیں سکتا

رہ رہ کے اب بھی ہوتی ہے اے چارہ گر خلش
باقی ہے جو رزخم جگر خاک ہو گئے

اے شوق باغ دہر کی لوٹی نہ کچھ بہار
ہم آتے ہی شباب حسینوں پہ مر گئے

شوق

شوق:۔ شیخ عنایت اللہ صاحب سُجان پور ضلع گورداسپور کے باشندے ہیں۔ ۲۵؍اپریل ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی عزیز الدین صاحب محکمہ جنگلات میں ڈپٹی انجینیر کے عہدہ پر متعین رہ چکے ہیں۔

شوق صاحب ابتدائے عمر سے شعر وسخن کے مفتون ہیں۔ اردو و فارسی میں کافی استعداد ہے۔ انگریزی میں انٹرنس تک تعلیم پائی ہے۔ پنجاب کی ادبی انجمنوں اور مشاعروں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ انہوں نے کیمبل پور میں انجمن خاصانِ ادب کی داغ بیل ڈالی تھی۔ راولپنڈی جیسے مقام پر مجالس مشاعرہ کا انعقاد انہی کی جد وجہد سے

تھا۔ طبیعت مضمون آفرین ہے۔ مگر صحتِ زبان کا چنداں لحاظ نہیں۔ متروک الفاظ تلک، وغیرہ بے تکلف شعر میں لکھ جاتے ہیں۔ بندشیں۔ ترکیبیں دورِ موجودہ کے اخباری شعرا سے ملتی جلتی ہوئی ہیں۔ مگر کہیں کہیں چشم سرگیں۔ تیکھی چتون۔ اٹھتے جوبن کے مضامین عاشقانہ شاعری کی گذشتہ تاریخ کو یاد دلا دیتے ہیں۔ بایں ہمہ کلام کا حصہ معنوی خوبیوں اور شوکتِ الفاظ سے لبریز ہے۔ مگر کہیں کہیں محتاجِ اصلاح ہے شعر زوردار کہتے ہیں۔ طبیعت شاعری کے مناسب اور موزوں پائی ہے مشق اور مشورہ سلیم سے کلام میں ترقی کی امید ہے۔ آپ زبان کے ہمدرد اور علم ادب کے شیدائی ہیں۔ مؤلفِ تذکرہ ہذا کے پاس جو چند اوراق بغرض اندراج تذکرہ روانہ کئے تھے۔ ان کا انتخاب درج کیا جاتا ہے:۔ سہ

نہاں مری بیخودی میں گویا ہزار رنگ آفرینیاں ہیں　　بنے ہیں جو نقش ان کے در پر نیاز ہو وہ مری جبیں کا
ادھر بیمارِ غم کا آخری دو ہچکیاں لینا　　ادھر ان کا سنورنا سیر کو تیار ہو جانا
جھپاکنا حسن کا اور قلبِ مضطر کا تڑپ اٹھنا　　کسی کا جھانک لینا اور پسِ دیوار ہو جانا
کارواں منزل پہ پہنچا اور میں　　پاؤں پھیلائے ہوئے سویا کیا
دل کو پایا کارفرمائے جہانِ حسن و عشق　　اس سے بڑھ کر اور کوئی رہبرِ کامل نہ تھا
رہ گیا ایک داغ سا بجھ گئی شمعِ انبساط　　گردشِ چرخِ پیر نے منظرِ غم دکھا دیا
وہ مسکرا کے دل پہ گراتے ہیں بجلیاں　　ارمان پوچھتے ہیں دلِ بے قرار کا
کہتے ہیں یاد کرکے مرے دل کے داغ وہ　　دیکھی تھی ہم نے سیرِ چراغاں مگر کہیں
یہ تو ممکن ہی نہیں وہ ہمیں آزاد کریں　　لاکھ دل کھول کے ہم نالہ و فریاد کریں
تمنا ہو اگر نظارۂ سیرِ چراغاں کی　　ہزاروں داغ روشن ہیں مرا دل دیکھتے جاؤ
کیا پوچھتے ہیں لوگ مری زندگی کا راز　　وہ گلستاں ہوں جو کبھی پھولا پھلا نہ ہو
جل جائے اک شرارۂ برقِ غضب سے جو　　دل ہو بشر کا اور وہ درد آشنا نہ ہو

وہ رُوٹھے رہے ہیں منانا رہا　　اسی کشمکش میں سحر ہو گئی
بھلا کیا ہاتھ آیا ہے صبا کے　　چراغِ تربتِ بیکس بجھا کے
نہ پوچھو ماجرائے شامِ فرقت　　پھرا اکثر مرا دم لب پہ آکے
ذرا دیکھو وقارِ شمعِ محفل　　کہ کیسی دم بخود ہے سر کٹا کے

سخت جاں ہوں ہیں دمِ ذبح ہی تشویش مجھے　　ٹکڑے ٹکڑے نہ کہیں خنجرِ قاتل ہو جائے
نقشِ قدم قدم پہ قیامت کے دیکھ لیں　　اُن کا خرامِ ناز اگر فتنہ جو رہے

شوق

شوق:- سید احمد حسین کاکوری۔ ۱۹۰۷ء میں بمقام کلکتہ قیام پذیر تھے۔ شعر میں معاملہ خوب کہتے ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو:-

دل سوز درد مند کوئی ہم نشیں نہیں　　دنیا میں رسمِ مہر و وفا اب کہیں نہیں
غیروں سے مل کے سہتے ہو رسوائیاں مگر　　اس پر بھی اعتبار کہ قابل ہمیں نہیں
گلگونۂ شفق بھی ان آنکھوں کا فیض ہے　　اشکوں سے لالہ زار فقط آستیں نہیں
جب نہ چھوٹا سوزِ غم نے کچھ بھی سازو برگ عیش　　دردِ دل کی لذتیں راحت کا ساماں ہو گئیں

شوق

شوق:- ڈاکٹر مہادیو پرشاد صاحب لکھنوی ولد منشی بھیروں پرشاد صاحب مرحوم کالیستھ سریواستو۔ اکتوبر ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بڑے بھائی جناب بالا پرشاد صاحب مرحوم لکھنؤ کی تجارت پیشہ جماعت میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے جناب شوق نے ۱۹۰۵ء سے تجارت کی تربیت حاصل کر کے ۱۹۰۷ء سے ایک دوکان امین آباد میں کھولی۔ جو اب تک قائم ہے۔ ۱۹۱۵ء سے ہومیوپیتھک ڈاکٹری شروع کی جس میں آپ کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ لکھنؤ کے چند بہترین اطبا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کے مطب سے غریب امیر سب کو مفت دوا تقسیم ہوتی ہے۔ ۱۹۱۰ء سے شاعری کا شوق ہوا۔ کچھ عرصہ بعد جناب ریاض سے تلمذ اختیار کیا۔ خود اپنے مکان پر بھی نہایت کامیاب مشاعرے کئے۔ کئی سال سے طبق

مشاغل میں اسقدر مصروف رہتے ہیں۔ کہ شاعری بالکل ترک کردی ہے۔ انتخاب کلام نذر ناظرین ہیں:ـ

اب ہو کہ نہ ہو حشر میں دیدار کسی کا　　ہے ناز کہ میں بھی ہوں گنہگار کسی کا
کچھ دیر سے مطلب ہے نہ کعبہ سے غرض ہے　　منہ دیکھتے ہیں کافر و دیندار کسی کا
یہ بھی نگہ شوق کی تقدیر کا لکھا　　بند آج ہوا روزنِ دیوار کسی کا
شوق رسوا ہو نہ کوئی اس نظر سے دیکھنا　　بزم میں آنسو نہ نکلیں چشم تر سے دیکھنا
دولتِ دیدار سنتا ہوں لٹے گی حشر میں　　دیکھنے والو انھیں میری نظر سے دیکھنا
شکر ہے اتنا تو شب کو پوچھتے تھے غیر سے　　یہ صدا نالوں کی آتی ہے کدھر سے دیکھنا
اپنی زلفوں کی تو سن لیجئے سنئے نہ مری　　کان میں کہتی ہیں کچھ حال پریشاں میرا
قبر پر غیر کی سنتا ہوں جلاؤ گے چراغ　　کام چل جائے تو لے لو دلِ سوزاں میرا
چھالے تلوؤں میں خلش دل میں زباں پر کانٹے　　شوق منہ دیکھتے ہیں خار بیاباں میرا

نسیم شمع لحد کو ذرا بچائے ہوئے　　کہ مرمٹوں کا کوئی اور سوگوار نہیں
پہنچ کے تیری گلی میں نہ یہ بہک جائیں　　جناب خضر کا بھی ہم کو اعتبار نہیں
بہار آئی ہے تم نے ضرور پی ہوگی　　تمہاری توبہ کا اے شوق اعتبار نہیں

بس مُردن بھی سب کہتے ہیں کچھ ہی سانس سہل ہیں　　یہ کیا اعجاز ہے یارب ہوئے کشتے قاتل ہیں
بتوں کا نام تو وردِ زباں ہر وقت رہتا ہے　　خدا کو یاد کرتا ہے مگر انسان مشکل ہیں
یہ سچ ہے شوق کہنے کو تو اس دنیا میں لاکھوں ہیں　　وہ انسان ہے جو کام آئے کسی بیکس کی مشکل میں
نہ جانے اصل قاتل کون ہے لیکن زمانے میں　　یہ غفلت مرنے والے ہیں تمہارا نام لیتے ہیں
گئے پہلو سے مدت ہوگئی لیکن یہ عالم ہے　　جو دل کا نام آتا ہے کلیجہ تھام لیتے ہیں

مر کے کیا قبر میں راحت ہوگی　　آنکھ کھلتے ہی قیامت ہوگی
تم دمِ نزع ذرا ہٹ جانا　　نگہ یاس قیامت ہوگی

یہی کافی ہے مرے جاتے ہیں — اور کیا شرح محبت ہوگی

دم نکلنے دو مرا پھر جانا — اک ذرا دیر کی زحمت ہوگی

جا کے کعبہ سے پھر آئے اے شوق — بتکدے میں کوئی صورت ہوگی

کہتی ہے اب روش یہی لیل و نہار کی — ناساز ہے ہوا چمن روزگار کی

دامن اٹھا کے چلنے سے بدنامیاں ہیں — ہستی ہی ورنہ کیا تھی چراغ مزار کی

بیکسی دیکھ کوئی گھر نہ ملے گا ایسا — قدم آگے نہ بڑھانا میرے ویرانے سے

اے فلک صبح شب وصل ہو وہ جاتے ہیں — فرش مہتاب اٹھائے مرے کاشانے سے

کیوں مجھے کوئی کہے عقل سے بیگانہ ہے — تم اگر ناز سے کہہ دو مرا دیوانہ ہے

رات دن اب ہیں در یار کے سجدے اے شوق — یہی کعبہ ہے ہمارا یہی بت خانہ ہے

کٹی ہیں رو رو کے غم کی راتیں تڑپ تڑپ کر سحر ہوئی ہے — نہ پوچھئے حال مجھ حزیں کا یہ عمر یوں ہی بسر ہوئی ہے

اٹھے تھے بستر سے شادماں ہم پڑا یہ دھوکا ہوا شب غم — چمک تھی زخم جگر کی ہمدم اسی کو سمجھے سحر ہوئی ہے

کہاں وہ شب بھر میں ختم ہونا کہاں وہ جل جل کے عمر کھونا — نہ ہے جگر سوختہ کے آگے خفیف شمع سحر ہوئی ہے

کچھ آنکھ نرگس کی بھی ہے پرنم ٹپک رہے ہیں کچھ اشک شبنم — چمن میں اس کا ہے آج ماتم گلوں میں جس کی بسر ہوئی ہے

شوق :- منشی بیجناتھ پرشاد صاحب نگم دہلوی تلمیذ حضرت آغا شاعر دہلوی۔ آپ کے کلام کا مجموعہ (جس میں علاوہ غزلوں کے مختلف مضامین پر نظمیں بھی ہیں)۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دو ایک برس بعد انتقال کیا۔ محاورات اور سلاست زبان آپ کے کلام کے جوہر ہیں۔ آپ کی نظمیں بیشتر حب الوطنی کے جذبات سے معمور ہیں یا اخلاقی مضامین سے متعلق ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔ شوق

پیام ایک آیا ہوا ہے کسی کا — سنو تم سے کچھ مدعا ہے کسی کا

عبث تم نے محفل میں بگڑی ہیں باتیں — بگاڑا بھلا ہم نے کیا ہے کسی کا

خدا کے لیے روٹھنا چھوڑئے اب — نہ آنکھوں میں دم آ چلا ہے کسی کا

دیکھ لے آکر کوئی ذوقِ تمنا کی بہار
آنکھ سے جو خون کا آنسو گرا دل ہو گیا

دم رُک چلا ہے ضعف سے مجھ خستہ حال کا
جاؤ بھی اب یہ وقت نہیں دیکھ بھال کا

جوشِ وحشت نے ہمیں جان سے بیزار کیا
ابھی دامن نہ سیا تھا کہ گریبان نکلا

آنا تو در کنار خط شوق بھی نہیں
قاصد گیا تو اسکو بھی رستہ بتا دیا

کیوں چڑھی تیوری کہو تو کیا ہُوا
ابرؤں پر بل ہے کیوں آیا ہُوا

آج تو ساقی اُلٹ دے خم کے خم
کیا ہُوا کیا ابر ہے چھایا ہُوا

چارہ گر پھر ٹیس سے رہنے لگی
پھر کوئی زخم کہن تازہ ہُوا

رمضان ختم ہُوا عید کی صورت دیکھی
لے چلی جانب میخانہ تمنائے شراب

ہر بات ایک چال ہے ہر چال اک فریب
جو دوست ہوں رقیب کے ہیں میرے یار کب

کدھر ہے ساقی مہوش کہ اب تو جاں چلی
مہینوں ہو گئے دیکھے شراب کی صورت

پھر فلک ہی کو کیا غرض ہم سے
جب تمھیں کو نہیں ہمارا درد

سحر کرتے ہیں ہم فرقت کی راتیں
تری تصویر سینے سے لگا کر

وعدے پہ ستمگر کے یقین آ نہیں سکتا
تحریر کا رنگ اور ہے قاصد کا بیاں اور

اے شوق ہوا حضرت شاعر سے تلمذ
اب رنگِ زباں اور ہے اندازِ بیاں اور

ناکامیوں نے خوب نکالے ہیں حوصلے
حسرت برس رہی ہے ہمارے مزار پر

ہم کو معلوم ہُوا دل میں ہے تصویرِ عدو
نیچی نظریں نہ کریں سر نہ جھکائیں کیونکر

دم میں دم آئے ذرا چین سے دل ٹھہرے
قصۂ دردِ شبِ ہجر سُنائیں کیونکر

تم نہ آؤ گے نہ آؤ گے غلط کہتے ہو
میں نہ مانوں گا نہ مانوں گا بہانہ ہرگز

پہنچا دیا ہے مجھ کو عزیزوں نے گور تک
صد شکر آ گیا ہے مسافر وطن کے پاس

انتہائے یاس تھی میری مرے خط کا جواب
رو دیا میں دیکھتے ہی نامہ بر میری طرف

دیکھنا محفل میں کوئی اس پری کی شوخیاں
جام دشمن کو دیا اور ہے نظر میری طرف

فلک کے ستم دیکھے بھالے ہوئے ہیں ترے جور سب سے نرالے ہوئے ہیں
کسی کی بزم میں رہ کر یہ رتبہ شوق نے پایا کہ اب دشمن تو دشمن دوست بھی سب رشک کرتے ہیں
وہیں ہم کو ہوتی ہے مٹنے کی حسرت جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
کس کی اس زلف تک رسائی ہے دل بیتاب شامت آئی ہے
کس ہوا میں ہے کہ ملتا ہی نہیں اس کا دماغ کس کے کوچہ سے نسیم سحری آئی ہے
جیتے جی دل نہ لگائینگے کسی سے اے شوق اب تو ہم نے بھی محبت کی قسم کھائی ہے

شوق

شوق:۔ محمد عبد اللطیف مالک اخبار شوخ مونگیر شاگرد جلال لکھنوی زبان صاف ہے۔ طرز ادا بھی بری نہیں۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں :-

وہی شکل پھرتی ہے آنکھوں میں ہر دم غضب ہو گیا اک نظر دیکھ لینا
دل اپنا سوئے قبلہ کرنا نہیں رخ ستم تھا صنم تیرا در دیکھ لینا
توقع نہ وعدہ۔ مگر اپنی خو ہے تری راہ شام و سحر دیکھ لینا
یہ کیسی کھٹک ہو گئی دل میں پیدا پھرا دو جانے والے ادھر دیکھ لینا
تمھیں پر بس اے شوق بجلی گریگی ان آہوں کا اپنی اثر دیکھ لینا

شوق

شوق:۔ محمد عبد العلی سندیلوی۔ خلف مولوی علی حسن۔ شوق کا سن اسوقت چوالیس سال کے قریب ہوگا۔ شرفا کے خاندان سے ہیں۔ ان کے نانا منشی عاشق علی اٹاوہ میں کلکٹری کے سررشتہ دار تھے۔ وہاں ان کی ملک کے کچھ مکان تھے جن کے مالک اب شوق صاحب ہیں پہلے سندیلہ میں بنک گھر پھر میونسپل کمیٹی میں ملازمت کا سلسلہ رہا۔ وہاں سے مستعفی ہو کر اب ایک وقف کے مدرسے میں جو سندیلہ میں ہے۔ معلم اعلےٰ ہیں۔ تعلیم انٹرنس تک ہوئی۔ طبیعت میں مزاح اور دل لگی کا مادہ از حد ہے۔ جو کبھی کبھی ستم ظریفی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے ابھی چند برس گذرے کیا کیا۔ کہ پندرہ غزلیں تصنیف فرما کر چالیس کے قریب اساتذہ

عصر اور ادیبوں کے پاس بغرض اصلاح بھیجیں۔ صرف چند اصحاب نے کم فرصتی کی وجہ سے انکار کیا۔ ورنہ سب اس اصلاحی جال میں پھنس گئے۔ یہ غزلیں اور ان پر اصلاحیں شوق صاحب نے ۱۹۲۶ئ میں کتاب کی شکل میں شائع کر دی ہیں۔ اور غضب یہ کیا ہے کہ اس سلسلے میں حضرات اساتذہ کے جو نجی خطوط آئے تھے وہ بھی شائع کر دئے ہیں۔ شوق صاحب نے تو ان سادہ دل اُستادوں کو بنایا۔ لیکن نقادانِ سخن کو طبع آزمائی کا ایک مضمون ہاتھ آگیا۔ کتاب چھپنے پر مہینوں تک ان اصلاحوں پر نقد و نظر ہوتا رہا۔ اس کتاب کا نام اصلاحِ سخن رکھا ہے۔ شوق صاحب کی طبیعت میں شعریت ضرور ہے۔ بہت کم کہتے ہیں۔ لیکن جو کچھ بھی کہتے ہیں۔ اچھا ہوتا ہے۔ کلام جاندار ہے۔ ملاحظہ ہو: ؂

خوبرویوں سے کہیں کہہ کے محبت اے شوق
نہ خدا کے لئے محصورِ بلا ہو جانا

اب اپنا دل تنگ ہے زندانِ تمنا
اللہ رے یہ جوشِ فراوانِ تمنا

تیری نگہ لطف تھی تمہیدِ محبت
میری نگہ شوق ہے عنوانِ تمنا

اک نگاہِ یاس سے قاتل کے تیور بجھ گئے
اک چھینٹے سے لہو سے کُندِ خنجر ہو گیا

آہ ظالم ہو چکی اک منتظر کی آنکھ بند
اب ترا آنا نہ آنا سب برابر ہو گیا

ساتھ دینا جا ذرا اے ضبط تھوڑی دیر اور
دم اِدھر نکلا کہ میدانِ وفا سر ہو گیا

زباں سے اُف نہ کرنا شمع ساں جل جل کے مر جانا
بالآخر رفتہ رفتہ حدِ ہستی سے گزر جانا

حیات و موت بیمار امید و بیم کی کیا ہے
نہ جینا سہل ہے جس کا نہ ہے آسان مر جانا

یہی دو حرف آہ سرد کے شرحِ غمِ دل ہیں
طویل اک داستاں ہے جس کو تم نے مختصر جانا

مآلِ کار اپنی ہستئ موہوم کا یہ ہے
حیات چند روزہ۔ وہ بھی غفلت میں گزر جانا

زباں پر ذکر۔ دل میں یاد۔ اور سر میں ترا سودا
نظر کو جستجو تیری جہاں جانا جدھر جانا

نہ پوچھو کوئے محبت کی واردات کا حال
کہ ایک دشمنِ جنسِ وفا نے لوٹ لیا

کیوں اُلجھتے ہو سنوارنے کی نہیں زلف دراز … کہیں یہ بھی مری بگڑی ہوئی تقدیر نہ ہو
عشق کی ہے یہ کرامت مجھے ساکت پاکر … ان کو دھوکا ہے کہ یہ بھی مری تصویر نہ ہو
پس فنا بھی مری بے قراریاں نہ گئیں … تڑپ مٹے پہ بھی ہر ذرّۂ غبار میں ہے
جدھر نگاہ پھری سامنے وہ شکل تھی شوق … یہ رنگ آنکھ کا اب جوشِ انتظار میں ہے
جو آنا ہے تو آکر دیکھ جاؤ وقت آخر ہے … ہُوا جاتا ہے دم بھر میں کوئی تصویرِ عبرت کی
یہ دل کے بہلنے کی تدبیر نظر آئی … بند آنکھ جو کی تیری تصویر نظر آئی
یہ عالم یہ محویت یہ جذبِ تصوّر ہے … ہر چیز میں تیری ہی تصویر نظر آئی
بالآخر بے زبانی پہ دہاں زخم بسمل کی … زبان تیغِ قاتل سے صدائے آفریں نکلی
نگاہ شوق کی گرمی سے اڑ جاتا ہے رنگ اس کا … تری تصویر تجھ سے بھی زیادہ نازنیں نکلی
آئینہ خیال کی صورت نمائیاں … تصویر کھینچتی ہیں شبابِ بہار کی
کس کو دماغ سیرِ چمن لے صبا یہاں … سر میں بھری ہوئی ہے ہوا کوئے یار کی
ہستی کا کچھ آسرا نہیں ہے … یہ نقش تو دیر پا نہیں ہے
کشتی کا خدا تو ہے نگہبان … کیا ڈر ہے جو ناخدا نہیں ہے
بیجا ہے ہزار دن کا شکوہ … یہ کون کہے بجا نہیں ہے
نُور ہے دیدہ و دل کا اثر مشق خیال … بند آنکھوں سے ہمیشہ تری صورت دیکھی
ایسی کیا خوشخبری لائے ہو اے حضرت تنگ … دل مسرت سے اچھلنے لگی دیوانو نکلے
لخت لخت دل صدپارہ کی اُف رے خلشیں … اِک اِک ٹکڑے میں سو سو ٹکڑے ہیں پیکانوں کے
غفلت سے آنکھ کھول کے دیکھا تو یہ کھلا … ساری خرابیوں کی بنا ما و من میں تھی

شوقی:۔ مولوی ستار حسن صاحب اوورسیر نہر سرہند۔ تلمیذ مولوی احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی کلام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں۔ کلام یہ ہے:۔ شوقی

بہا دیں ہم نو پانی کی طرح خوں اپنے ارماں کا … مٹے بھی یا خدا دھبا کہیں قاتل کے داماں کا

بچکے تیغ یاس سے حسرت نے لی دل میں پناہ — المدد شوق بتاں۔ گھر میں خدا کی خون ہو

رُباعی

عشاق کی تم شرر فشانی دیکھو — دلدادوں کی اپنے تفتہ جانی دیکھو
خود شمع کو آگ لگ نجائے کیونکر — پروانہ کا یہ سوز نہانی دیکھو

شوکت

شوکت:- منشی محمد یعقوب۔ ساکن بھتری ضلع غازیپور شاگرد جلال لکھنوی مضمون آفرینی کے ساتھ زبان کا لطف بھی کلام میں موجود ہے۔ تشبیہ اور استعارہ کا استعمال کم ہے۔ رعایت لفظی کی پابندی سے بعض اشعار میں آمد کا مزا نہیں آتا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

بعد مرگ اس شوخ گل نے یوں چڑھائے آ کے پھول — کھل کھلا کر ہنس پڑا عاشق کا مدفن دیکھ کر
دست رنگیں میں لئے ہیں وہ لبالب ساغر — دیکھئے کس کو مئے ہوش ربا دیتے ہیں
کہتی ہے دل سے آنکھ مجھے جانتا نہیں — گھر میں لگاؤں آگ وہ گھر کا چراغ ہوں
آوارگی سے اپنی ہوئی عشق کی نمود — میں بے نشانیوں سے خود اپنا سراغ ہوں
لاشے وہ دلجلوں کے ہیں جو داغ داغ ہوں — مدفن وہ عاشقوں کے ہیں جو بے چراغ ہوں
اُن کی نزاکتوں کا بھلا پوچھنا ہے کیا — غنچوں کے مسکرانے سے جو بد دماغ ہوں
شوکت وہ تیرہ بخت ہوں روز الست سے — مرقد پہ میرے آپ سے سب گل چراغ ہوں
لگاوٹوں کو بھلا اُن کی کون پہچانے — نگاہِ ناز میں ہے لطف بھی غضب بھی ہے
تحفظ آبرو کا چاہیئے ہر ایک حالت میں — جہاں میں قدر گوہر کی فقط ہوتی ہے پانی سے

شوکت

شوکت:- جناب نواب یار محمد خاں خلف اصغر نواب فوجدار محمد خاں مرحوم ۱۲۴۹ھ میں پیدا ہوئے۔ نواب شاہجہان بیگم مرحومہ رئیسۂ بھوپال سے قرابت قریبہ ہے۔ استعداد علمی معقول تھی۔ اور فن آبائی یعنی سپہگری میں دستگاہ کامل پہلے آپ

نے مرزا غالب کو اپنا کلام دکھلایا۔ پھر مولانا محمد عباس رفعت کو استاد بنایا۔ تصانیف میں دیوان شوکت۔ تذکرہ فرح بخش۔ چار باغ شوکت۔ گلدستۂ نرگس۔ ہفت خوانِ شوکت قرابادینِ شوکت۔ باز نامہ۔ فیل نامہ۔ مراسلات شوکت۔ انشائے نورچشم۔ شہنشاہ نامہ وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔ بہت سے علوم و فنون سے دلبستگی رکھتے تھے۔ چند اشعار حاضر ہیں:۔

یوں ہر اک کوچۂ سفاک سے باہر نکلا
کوئی بسمل کوئی زخمی کوئی مضطر نکلا

آگئی موت مگر ہم کو یہ حسرت ہی رہی
دم نہ بیمار کا عیسیٰ کے قدم پر نکلا

ہست اور نیست میں ہے سب کو کلام
عقل حیراں دہان تنگ میں ہے

وہ بھی کچھ کم نہیں ہے رستم سے
نشۂ زر کی جو ترنگ میں ہے

شوکت

شوکت:۔ مولوی محمد رفیق انصاری۔ زمانہ حاضر کے ترقی یافتہ شاعر ہیں۔ ملازمت کے سلسلہ میں چین کے دارالسلطنت پیکن ہو آئے۔ عرصہ ہوا رسالۂ مخزن میں اپنا کلام بھیجتے تھے۔ ہجر و وصل کے راگ میں مناظر فطرت اور کرشمۂ قدرت کا بیان کرتے ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

بلا کی غمزۂ ستم کی گھاتیں لڑا کے آنکھیں بنائے باتیں
وہ بانوں باتوں میں لے گئے دل دکھا دکھا کر بتا بتا کر

ہماری بھی کر تو آزمائش ذرا تو رخ سے نقاب اٹھا کر
کلیم ہونگے وہ جنکو بے ہوش کر دیا اک جھلک دکھا کر

نہ کیجے ما ہر یاں جہاں سے کیوں دو چار آنکھیں
خدا نے دیکھنے کو دی ہیں قدرت کی بہار آنکھیں

مداوائے درد عشق دوست لطف زندگی تب ہے
کہ ہو دل مضطرب آٹھوں پہر اور اشک بار آنکھیں

یہ مُنّد جائینگی رستہ دیکھتے ہی دیکھتے اکدن
کریں گی کب تلک آخر تمہارا انتظار آنکھیں

تماشائے دو عالم کو جو یہ نیرنگیاں بخشیں
تو دو چار اور دی ہوتیں ہمیں پروردگار آنکھیں

نہ لوٹے پھر بھی سب کچھ کہہ گئیں آنکھوں ہی آنکھوں میں
ہیں شوکت ترجمان دل وہ انکی پُرخمار آنکھیں

شوکت

شوکت:۔ سید کاظم علی صاحب بلگرامی۔ آپ سادات بلگرام سے ہیں۔ ۱۲۱۰

رمضان المبارک ۱۲۹۳ھ۔ روز سہ شنبہ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ مولانا غلام علی صاحب آزاد مؤلف تذکرہ خزانۂ عامرہ آپ کے اجداد میں ہیں۔ نازک خیال شاعر ہیں۔ طبیعت نہایت رسا ہے۔ پہلے حضرت امیر مینائی مرحوم کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ ان کے بعد حضرت جلیل سے استفادۂ سخن حاصل کرتے رہے۔ انتخاب کلام یہ ہے۔

تمہارا نام جو سن پایا ہے شوالوں میں
ملے ہیں کعبہ نشیں جا کے دیروالوں میں

ادھر قفس تو ادھر باغ پھنک گیا سارا
بلا کی آگ بھری ہے ہمارے نالوں میں

خیال مرگ کو سمجھے تھے خواب مر کے کھلا
کہ تھا وہ خواب گئی عمر جن خیالوں میں

کہیں نکلتے ہیں بیدرد بے سبب آنسو
ضرور ٹھیس لگی میری دل کے چھالوں میں

عجیب رنگ ہے شمع لحد کے پھولوں کا
نہ ہنسنے والوں میں ہیں یہ نہ رونے والوں میں

زباں حال سے سب اپنا حال کہتے ہیں
نئی طرح کی خموشی ہے مرنے والوں میں

شوکت :- آل احمد صاحب خلف سید اصغر علی مرحوم متوطن موضع رہمائی ضلع گیا۔ مولوی حکیم اولاد علی کاہش جونپوری شاگرد شیخ مصحفی سے تحصیل علم کی۔ بعد تحصیل فارسی و عربی۔ مختاری کا امتحان دے کر کامیاب ہوئے۔ ایک عرصہ تک مختاری کرتے رہے۔ آخر عمر میں ریاست بادشاہ نواب صاحب رئیس عظیم آباد کے مختار عام اور مینجر ہو گئے۔ ۱۳۱۷ھ میں بعمر ۶۵ سال رہگرائے عالم آخرت ہوئے ایک دیوان اردو ان سے یادگار ہے۔ کلام ملاحظہ ہو :-

یہ سوز ہے نالہ و فغاں کا کہ غل ہے عالم میں الاماں کا
نکل رہا ہے دم انس و جاں کا زمیں کو دھڑکا ہے آسماں کا

غضب ہیں آنکھیں بلا نگاہیں کہ کھنچ رہی ہیں ہزاروں آہیں
مرے وہ بھبوت جس کو چاہیں بُرا ہے احوال اک جہاں کا

وثوق دعدے پہ ان کے کیا ہو کبھی جو وعدہ وفا ہُوا ہو

توانکی باتوں کی دل میں جا ہو نہیں ہے پاس انکو کچھ زباں کا
نہ آئینگے وہ بلا کے دیکھو جو دیکھنا ہو تو جا کے دیکھو
مناؤ جا کے منا کے دیکھو خیال کیسا یہاں وہاں کا
کبھی فغاں ہے کبھی بکا ہے یہ رات دن کا جو مشغلہ ہے
برا ہے شوکتؔ بہت برا ہے خلل ہے اسمیں تمہاری جاں کا

سمجھتا ہے کہیں دیوانہ کچھ بھی
یہ دیوانے ہیں جو سمجھا رہے ہیں

گھبرا گیا ہوں زندگی مستعار سے
اے مرگ مجھکو ایک گھڑی ایکسال ہے

آنکھوں میں پھر رہی ہے شب وروز شکل یار
پھر جائے اور سمت نظر کیا مجال ہے

بیکار حسرتیں ہیں تمنائیں ہیں فضول
شوکتؔ خیال وصل خیال محال ہے

شوکتؔ

شوکت:- خان بہادر قاضی محمد شوکت حسین خاں خلف الصدق قاضی محمد تجمل حسین خاں صاحب رؤسائے مراد آباد میں معزز ہیں۔ آپ کے آبا و اجداد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے وقت سے مراد آباد میں رہتے چلے آئے ہیں۔ عہدۂ قضا بھی اسی زمانہ میں عطا ہوا تھا۔ موجودہ حکام بھی آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں ۱۸۸۶ء کی پیدائش ہے۔ ابتدائے عمر سے شاعری کا شوق ہے۔ حضرت داغ کے قدیم شاگرد ہیں۔ آغاز شباب میں شاہد سخن کے دلدادہ تھے۔ ان دنوں میں حضرت داغ کا قیام رامپور میں تھا۔ وہ رامپور سے آتے اور جاتے مراد آباد میں شوکت باغ میں قیام کرتے۔ شعر و سخن کا شغل جاری ہوتا۔ وہیں شاگردوں کے کلام میں اصلاح دیجاتی۔ قاضی صاحب نے استاد کے فیض صحبت سے عرصہ تک استفادہ حاصل کیا ہے۔ ایک زمانہ میں آپ کے دولت کدہ پر ماہانہ مشاعرہ ہوتا گلدستۂ شوکت سخن جاری تھا۔ جس میں چیدہ کلام کی اشاعت کا انتظام تھا جب حضرت داغ نے رامپور کو خیرباد کہا تو مراد آباد کی بزم سخن بھی درہم برہم ہوگئی

قاضی صاحب کا شوق بھی کم ہو گیا۔ بلدیہ کی ممبری۔ آنریری مجسٹریٹی کے خدمات اور علاقہ کی نگرانی میں مصروف رہنے سے ادھر توجہ نہ ہوئی۔ تاہم جس زمانہ میں آپ نے کہا جو کچھ کہا خوب کہا۔ ۱۹۲۶ء میں ڈیرہ دون میں ایک بزم مشاعرہ منعقد کی جس میں اکثر اساتذہ شریک تھے۔ آپ کے کلام میں اپنے استاد کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ روزمرّہ صاف اور تشبیہات اور استعارات دلکش استعمال کرتے ہیں۔ وسیع مضامین کو مختصر الفاظ میں خوب ادا کرتے ہیں محاسن و معائب شعر سے باخبر ہیں۔ اُستاد کا رنگ اکثر اشعار میں جھلکتا ہے۔ اگر آپ نے ترک سخن نہ کیا ہوتا۔ تو اب تک کئی دیوان مرتب ہو چکے ہوتے۔ کلیاتِ شوکت معروف بہ شوکتِ سخن ۱۹۱۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مؤلف تذکرہ ہذا کے مخلص دوستوں میں تھے۔ دو سال کے قریب ہوئے کہ انتقال کیا۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو:-

وہ ہر بات پر رُوٹھ جانا کسی کا
وہ رُوٹھے ہوئے کو منانا کسی کا
وہ ہنگامِ محشر مری دادخواہی
وہ کچھ سوچ کر مسکرانا کسی کا
دلِ زار میں چٹکیاں لے رہا ہے
تسلّی مجھے دے کے جانا کسی کا

بچینگے بھلا آپ شوکتؔ سے کب تک
لگا لے گا وہ راہ پر دیکھ لینا
یہ نہ کہئے ترے مرنے سے مرا کیا ہوگا
آپ کے سر کی قسم آپ کا چرچا ہوگا
نہ رکھا اس لگاوٹ نے کہیں کا
عداوت تھی کسی کا پیار کیا تھا
کیا حقیقت دولتِ دنیا کی اس کے روبرو
مل گیا سب کچھ اگر معشوق اچھا مل گیا
کیا کہوں خاک کہوں طول ہے افسانۂ غم
عرصۂ حشر فقط چار پہر کا ٹھہرا
کیا کہا اس جستجو سے تم کو کیا مل جائیگا
آپ کیا ہیں ڈھونڈھنے سے تو خدا مل جائیگا

محبّت اگر ہے تو رنجش بھی ہوگی
کبھی طے یہ جھگڑا ہوا ہے نہ ہوگا
مریضِ محبّت نہ سنبھلا نہ سنبھلے
وہ کمبخت اچھا ہوا ہے نہ ہوگا

دل نہ بہلا کسی سے اور کہیں
آخرش پھر اسی کو پیار کیا

وہ بھی یارب نہ چین سے بیٹھے
جس نے یوں مجھ کو بے قرار کیا

خون مرا معجزۂ عشق سے
تیری ہتھیلی میں حنا ہوگیا

جاتے جاتے جس طرح راحت گئی
آتے آتے صبر بھی آجائے گا

ہاتھ سے شوکت کو اے ظالم نہ کھو
آدمی ایسا نہ پھر ہاتھ نہ آئیگا

جب ان سے مانگتا ہوں دل یہ کہکر ٹالدیتے ہیں
ادھر دیکھو ادھر دیکھو یہاں ہوگا وہاں ہوگا

اے فسوں ساز ستمگار بھری محفل میں
اُف ترا آنکھوں ہی آنکھوں میں اُڑانا دل کا

جب مچل کر مرے پہلو سے نکل جاتا ہے
کوچۂ یار میں ملتا ہے ٹھکانا دل کا

صدقے ایسے بھولے پن کے اس لڑکپن پر نثار
سُن کے میرا قصۂ غم کہتے ہیں پھر کیا ہوا

جب وہ دشمن تھی مرے ساری خدائی تھی دوست
اب جو وہ دوست ہیں دشمن ہے زمانہ میرا

نہیں معلوم یہ شوخی ہے کہ نادانی ہے
وہ ابھی کھیل سمجھتے ہیں ستانا میرا

وہ حیا سے کچھ نہ بولے دم صبح وقتِ رخصت
مگر آنکھ اُٹھا اُٹھا کر مجھے بار بار دیکھا

کبھی یہ خوش ہوں کہ اچھا ہوا جو کچھ نہ کہا
کبھی یہ رنج ہے کیوں حال دل بیاں نہ ہوا

جگر میں درد رہا دل میں اضطراب رہا
تپ سے فراق کا صدمہ کہاں کہاں نہ ہوا

کھا کھا کے ستمگر تری تلوار کا چرکا
ہنسنا کوئی دیکھے دہن زخم جگر کا

دیکھ لو دل کی خرابی میں ہے نقصاں کس کا
سوچ لو گھر یہ بگڑتا ہے مری جاں کس کا

آہ وزاری سے جتایا تو جتایا کیا عشق
لطف تو جب ہی کہ ہوجائے خبر آپ سے آپ

نہ قضا آئے نہ وہ آئیں نہ صبر آتا ہے
سب کے سب پھر گئے تاثیر دعا کی صورت

مجھ سے ہے سارا زمانہ آجکل بگڑا ہوا
انکی عادت کیطرح مری طبیعت کیطرح

کوئی ہو تو شب فرقت میں جس سے دل بہلے
الٰہی درد ہو ہمدرد ہم زباں فریاد

یہ نہیں زلف پریشاں کہ بنائے سے بنے
بات جب اپنی بگڑ جائے بنائیں کیونکر

رنگ کیا تھا بزم کا واں ہم نشیں تھا کون کون
چُپ ہوں میں تو وہ مغرور بتاتے ہیں مجھے
نہ ملا ہے نہ ملے گا مرے شکووں کا جواب
چھوڑ دو حسن پرستی کا یہ لپکا شوکت
بگڑے بنے۔ بلا سے مری کچھ ہوا کرے
اٹھا جو بزم سے میں تو نگاہ تک نہ اٹھی
نہ کیجیے تذکرہ میرا عدو سے
زلفِ رسا سے پوچھ لو دل چھیننے کے پیچ
اشارہ ہوں کسی ابرو کا خنجر مجھ سے کہتا ہے
ضبط کر ضبط اے دلِ مضطر
دل دیا ہے نیا نیا ہم نے
شمع کی طرح گھُل رہا ہے بدن
انقلاب دہر سے ہیں بے خطر رنگیں نہاد
خلق سے اخفائے جوہر ہے شرافت کی دلیل
یہ کس بیتاب کی آہیں تمہیں بے چین کرتی ہیں
نہ میں حرفِ غلط ہوں جو مٹائیں صفحۂ دل سے
دلِ ناداں کو فرقت میں کبھی کہہ کہہ کے روکا ہے
ہوں صحبتِ احباب میں پر سب سے جدا ہوں
نہ پوچھو ہم سے کیوں بیٹھے ہوئے آنسو بہاتے ہیں
جوابِ نامۂ دلبر نہ لائے نامہ بر یارب
ہمارے لختِ دل کو لپکا ہے دامن چاک کرنے کا

نامہ بر آیا ہے تو کس کس کو بیٹھا چھوڑ کر
بات کہتا ہوں تو کہتے ہیں کہ فریاد نہ کر
نہ سنا ہے نہ سنے وہ یہ فسانہ ہرگز
بھول کر بھی نہ کہیں آنکھ لگانا ہرگز
اب مجھ کو تیری زلفِ پریشاں سے کیا غرض
چلے رقیب تو اُٹھ کر کہا خدا حافظ
جہاں کی بات ہو رکھئے وہیں تک
چوری کی گھات سیکھ لو دُزدِ حنا سے تم
قضا ہنس ہنس کے کہتی ہے کہ قاتل کی ادا ہو کیں
دیکھ اپنے پرائے بیٹھے ہیں
تازہ اِک چوٹ کھائے بیٹھے ہیں
لو کسی سے لگائے بیٹھے ہیں
گلشنِ تصویر میں خوفِ خزاں ہوتا نہیں
آتشِ یاقوت سے شعلہ عیاں ہوتا نہیں
یہ کس کے نالۂ دل رات بھر تم کو جگاتے ہیں
نہ میں نقشِ کفِ پا ہوں جو وہ مجھکو مٹاتے ہیں
ذرا تو صبر کر وہ کوئی دم میں آئے جاتے ہیں
کیفیتِ غربت مجھے حاصل ہے وطن میں
وہ چرچے یاد آتے ہیں وہ جلسے یاد آتے ہیں
زبانی یہ کہے آ کر چلو تم کو بلاتے ہیں
حفاظت سے ذرا رکھیے قیامت اپنے داماں کو

رخِ روشن کو چھپایا نہ کرو پردے میں
شمعِ رخسار چراغ تہِ داماں کیوں ہو

ہے جو مرنا ہی عدو کو تو کہیں اور مرے
آپ کی جان سے دور آپ پہ قرباں کیوں ہو

اس کے آتے ہی سب ارمانِ دلی بر آئے
کوئی حسرت نہ رہی دل میں قسم کھانے کو

ہمارے قتل کا الزام دیکھو کس کے سر ٹھہرے
ادا کچھ اور کہتی ہے قضا کچھ اور کہتی ہے

ہم اپنا خون سمجھے تھے ستمگر تیری گردن پر
مگر ان گورے ہاتھوں کی حنا کچھ اور کہتی ہے

دعائیں مانگتے پھرتے ہیں سب احباب جینے کی
سرہانے میرے ہنس ہنس کر قضا کچھ اور کہتی ہے

شکایت نہ تم سے نہ چرخِ بریں سے
ہمیں اپنی قسمت سے لمنا نہیں ہے

کچھ حیا بھی آنکھ میں تھی کچھ جوانی کا بھی جوش
وہ سوالِ وصل پر گردن جھکا کر رہ گئے

رُخ سے بل کرتی ہیں شانے سے اُلجھ پڑتی ہیں
تم نے زلفوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے

قیامت کریگی جوانی تمہاری
ابھی خیر سے ابتدا ہو رہی ہے

وہ خنجر اُٹھاتے ہوئے آرہے ہیں
قیامت میں آفت بپا ہو رہی ہے

جسے دیکھتا ہوں وہ عاشق ہے تیرا
خدا کی خدائی فدا ہو رہی ہے

وہ آئے ہیں مرے گھر آپ سے آپ
خدا کی شان ہے قدرت خدا کی

اب تو دل دیکر سہے جور و ستم
خیر آگے کو نصیحت ہو گئی

گرہ سی ہے جو زلفوں میں تمہارے
یہی ہے ہاں ہمارا دل یہی ہے

دل دیا بھی تو دیا ہم نے کسے وائے نصیب
جان پہچان ہے جس سے نہ شناسائی ہے

جبتک جواں تھے ہجر کی گھڑیاں گنا کئے
پیری میں فکر پڑ گئی روزِ حساب کی

مجھ کو سُنا سُنا کے وہ کہتے ہیں غیر سے
کچھ لوگ آج بزم سے اُٹھوائے جائینگے

یہ ابر یہ بہار یہ ساقی یہ جام مے
مستوں پہ آج رحمتِ پروردگار ہے

اُن سے اب باقی ہے اتنی راہ رسم
مل گئے صاحب سلامت ہو گئی

شوکت:۔۔۔ دیوگام کے کسی شوخ طبع رنگیں مزاج شاعر کا تخلص ہے۔ باوجود　شوکت

کوشش کے نام اور حالات معلوم نہ ہوسکے۔ کلام سے کہنہ مشقی پائی جاتی ہے۔ مندرجۂ ذیل یہ تین اشعار ان کے ہیں:۔

خم کے عوض اِک سُبو بہت ہے	بلبل تجھے گُل کی بُو بہت ہے
اثباتِ دہن میں اُس پری کے	گنجائشِ گفتگو بہت ہے
جب سے مرے حلق پر پھرا ہے	خنجر ترا سرخ رُو بہت ہے

شوکت:۔ مولوی احمد حسن باشندہ موضع رامپور ضلع سہارنپور۔ عربی اور فارسی میں صاحب استعداد۔ اردو میں شعر کے نقاد۔ اعلےٰ درجہ کے نثار۔ مشہور مضمون نگار تھے۔ طالب علمی کا زمانہ ختم کرنے کے بعد آپ نے اخباری دنیا میں قدم رکھا۔ دہلی میں خیر خواہ عالم اور لاہور میں اخبار کوہِ نور کے ایڈیٹر رہے نکتہ چینی کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ اخبار نویسی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ کبھی اس زمانہ کے لیڈروں کی خبر لی۔ کبھی مقرروں پر اعتراضات کئے۔ کبھی شعرا سے چھیڑ چھاڑ کی۔ لاہور چھوڑنے کے بعد لکھنؤ میں اودھ اخبار کے صیغہ ادارت میں ہو گئے۔ یہاں منشی نولکشور کے کتب خانہ کا مطالعہ کیا اور علمی استعداد کو بڑھایا۔ عرصہ تک ادبی اخلاقی اور تمدنی مضامین دیکھتے رہے۔ وہاں بھی زیادہ عرصہ چین سے نہ بیٹھے غلام محمد خاں طپش اور ان سے بگاڑ ہو گیا۔ اخبارات میں فریقین کے زوردار مضامین نکلے اودھ اخبار کی ملازمت چھوڑنے کے بعد میرٹھ میں تشریف لائے، اخبار شحنۂ ہند جاری کیا۔ غیر مقلدین کی تائید کرنے سے نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے حوصلہ افزائی کی ان کا سالانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ اسی زمانہ میں بعض دل آزار فقرے ان کے قلم سے نکل گئے حنفی جماعت سے ضبط نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زد و کوب تک نوبت پہنچی۔ آپ حضرت یزدانی میرٹھی کے ہمعصر تھے۔ ان سے اُن سے ہمیشہ چلتی رہتی سجاد حسین ریحانی طوطی ہند کے ایڈیٹر کا بھی انہوں نے مقابلہ کیا۔ بھوپال کی امداد

بند ہو جانے کے بعد اخبار شحنۂ ہند مذہبی پالیسی کا اخبار نہ رہا۔ بلکہ اس میں شعراء پر اعتراض ہونے لگے۔ اسمیں شک نہیں کہ آپ اردو زبان میں فنِ "تنقید" کی ابتدا کرنے والوں میں ہیں۔ مگر ذاتی کاوش کی وجہ سے اس کو آخر وقت تک نباہ نہ سکے۔ عربی شعراء میں متنبی پر اعتراضات جڑے۔ اصلاحیں فرمائیں، فارسی میں نظامی۔ عُرفی اور نظیری پر نکتہ چینیاں کیں۔ اردو میں غالب۔ مومن کے منہ آئے۔ خاقانی اور بیدل کا کلام بھی اصلاح سے نہیں بچا۔ رسالہ پروانہ کے صفحات دنگل تھے۔ جس میں شوکت جیسے پیر کہن سال جوان طبع شعرا سے زور آزمائی کرتے تھے۔ خود ستائی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ فارسی میں خاقانی اور اردو میں غالب کے کمال کا اعتراف تھا۔ قصائد خاقانی اور دیوان غالب اردو کی شرح لکھی ہے۔ افسوس ہے کہ خود ستائی کی وجہ سے ان کی قدر نہ ہوئی۔ ورنہ بہ فنِ سخن کے اچھے ماہر ادیب تھے۔ شاگردوں کے کلام کو اصلاح خوب دیتے تھے۔ ارد گرد شاگردوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود ماننا پڑے گا۔ کہ علم وفضل اور ادبی مستعدی میں آپ کے معاصرین میں کوئی آپ سے بڑھ کر نہ تھا۔ آپ کی جگہ اپنے زمانے کے اعلیٰ ادیبوں اور فاضلوں میں ہے اگرچہ شوریدہ مزاجی کی وجہ سے آپ کو اپنے کمالات کی پوری داد نہ ملی۔ لیکن آپکی لیاقت کا لوہا ہر ایک کو ماننا پڑا۔ اپنے کو مجدد السنہ شرقیہ لکھتے اور لکھواتے۔ فارسی کلام متانت اور سنجیدگی سے معمور ہے۔ اردو میں اکثر مومن خاں کی تقلید کرتے۔ بلاغت اور پختگی آپ کے کلام کا خاص وصف ہے۔ بعض مضامین بہت ادق آجاتے ہیں۔ شعرائے متاخرین میں آپ کا دم غنیمت تھا۔ چند سال ہوئے انتقال کیا۔ اب کلام ملاحظہ ہو

بے ثباتی کی ہوا میں اڑ رہا ہوں رات دن	یا خدا رنگ پریدہ ہوں میں کس تصویر کا
اہل زر کو زر ہی کرتا ہے گرفتار بلا	فلس ماہی خود بنے حلقہ دام ماہی گیر کا
ہیں نکمے نوجواں گر ہمتِ پیراں نہ ہو	منحصر بل پر کمانوں کے ہے اڑنا تیر کا

ازل سے چشم نظارہ ہے گلچیں حسن جاناں کا
ہُوا کم ایک بھی پتا نہ ابتک اس گلستاں کا

بہار ایسی دکھائی آبلوں کی خونفشانی نے
کہ پھولوں پر لگا تلنے ہر اک کانٹا بیاباں کا

تھا عشوہ فتنہ خیز مکین و مکاں نہ تھا
تھا جلوہ برق ریز زمین و زمان نہ تھا

پہنچتے تھے بگولے آسماں تک دور وحشت میں
کہ میرے پاؤں کے چکر سے چکر میں بیاباں تھا

مشرب جام و صراحی رقص آزاد نہ تھا
دست ساقی رات رہن بیعت خمخانہ تھا

خواب غفلت نے تھپک رکھا تھا گوش ہوش کو
صرف ایک افسوں ہماری عمر کا افسانہ تھا

چشم پوشی شمع کی دیوار نظارہ نہ تھی
پردۂ فانوس نور دیدۂ پروانہ تھا

وُہ بُت ہیں شرم سے بوسوں کی گویا
لگیں مہریں لب مہر مبیں پہ

تمنا ہے تمہارے کشتۂ ناموس الفت کی
کہ چشم جوہر خنجر سے بھی مقتل میں پردا ہو

کیا ہے مجکو پامال خرام اک فتنہ قامت نے
ہیولی مہر محشر کا بنائیں گے مری گل سے

خدا کا گھر بھی نکلا دل لگی کی شکل سے خالی
مری چھاتی پہ توڑے سنگ اسود کم نہیں سل سے

بغل میں اسکے دریا ہے مگر ہے خشک لب پھر بھی
جہاں میں شور بختی کسکی ہو گی بڑھ کے ساحل سے

کب کشود کار ہو گر ہو نہ مژگاں کی خلش
زخم دل کی فتح ہے وابستہ نوک تیر سے

عروج خاکساری خاک تجھسے اے زمیں بنتا
مری خاک آسماں سے بھی کبھی دب کر نہیں نکلی

مرقع عالم صورت کا دیکھا چشم وحدت سے
تو ہر صورت سے شکل شان صورت آفریں نکلی

بڑا دھوکا دیا زاہد نے مجھ سیدھے مسلماں کو
کہاں مے خلد میں تو نہر شیر و انگبیں نکلی

رباعی

تار نفس سرد میں غم کی لے ہے
ہے نغمۂ جانفزا فقط خاموشی
اس بزم میں خون جگر و دل مے ہے
گلبانگ شکست رنگ بانگ نے ہے

شوکت :- محمد شوکت حسین صاحب رئیس قصبۂ نہٹور ضلع بجنور۔ خوش مزاج

زندہ دل ہیں۔ کلام سادہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ:۔

بُت خانہ و کعبہ کو سمجھتا ہے برابر
شوکت سا کوئی ہم نے مسلماں نہیں دیکھا

وفا شعاروں کو جی کھول کر ستا لیں آپ
نہ لب کھلیں گے کبھی شکوۂ جفا کیلئے

شوکت:۔ منشی محمد اسمٰعیل خاں صاحب۔ ساکن کلکتہ شاگرد ناسخ مرحوم۔ رفعت خیال و حسنِ مقال قابلِ داد ہے۔ اچھا شعر کہتے ہیں۔ انتخاب یہ ہے:۔ شوکت

گلہ کس سے کروں دردِ جگر کا
ہُوا ہے ناک میں دم چارہ گر کا

تجلی طور پر جو حضرتِ موسیٰ نے دیکھی تھی
میسّر ہو مجھے گھر بیٹھے اُس کا دیکھنا یارب

یارب نہ کرنا مجھکو کبھی مبتلائے حرص
تل بھر جگہ بھی رہنے کو دل میں نہ پائے حرص

پھر بہار آئی ہوا پھر جوشِ سودا کا فزوں
دوڑتا ہے ہاتھ پھر اپنا گریباں کی طرف

اگرچہ منزلِ ہستی بھی رکھتی ہے بہت وسعت
سمندِ عمر میرا طے کرے گا دو قدم میں

دعائے مرگِ دشمن اسلئے کرتا نہیں حق سے
نصیبِ دشمناں وہ بھی تو ہونگے سوگوار نہیں

شوکت:۔ میر حسین علی مفتی صدر الدین خاں مرحوم صدر الصدور دہلی کے ناظرِ عدالت تھے۔ موزوں طبع شاعر اور علومِ متعارفہ میں اچھی مہارت رکھتے تھے:۔ شوکت

زاہد خود کام کرتا ہے ستائش حور کی
تو بھی تو رُخ سے نقاب اپنی پری پیکر اٹھا

دورِ چشمِ یار میں سب ہو گئے باہم رقیب
ایک ادنٰے یہ فریبِ نرگسِ مستانہ تھا

ساقی ترے طفیل سے ہم کو مدام
معلوم ہی نہیں کدھر آیا کدھر گیا

اُس سنگدل کے دلمیں تو تاثیر کچھ نہ کی
کیا فائدہ فلک سے جو نالہ گذر گیا

جی لگ گیا قفس سے ہمیں کچھ نہیں خیال
موسم بہار کا کدھر آیا کدھر گیا

شوکت نے جان دی ترے در پہ ہزار بار
وہ مرتے مرتے آہ بڑا کام کرے گا

جُرم سے مستی کے کعبہ میں نہ ہو تو رہ نہو
میکدے کا تو ہمارے فضل سے ہے در کھلا

جبکہ ابرو کا اشارہ ہی کرے عالم کو قتل
اُس ستمگر کی بلا لیتی ہے خنجر ہاتھ میں

وصل کا وعدہ نہیں تو قتل کا وعدہ سہی ۔۔۔ دل کے بہلانے کو میری کوئی صورت چاہیئے

شوکت

شوکت:۔ میر شوکت علی خلف سید عوض علی ڈپٹی کلکٹر اودھ ۱۳۰۳ھ میں ۲۵ سال عمر تھی۔ اور الہ آباد میں سرکاری ملازم تھے۔ سید محمد نوح رئیس مچھلی شہر کے حقیقی بھانجے ہیں۔ تلمذ بھی انہیں سے ہے۔ رعایات لفظی کا شوق ہے:۔

آپ کے عاشق کی تربت پر چڑھانے کیلئے ۔۔۔ چاندنی مہتاب لایا شامیانے کے لئے

عارضِ تاباں پہ انکے گیسوئے پیچاں نہیں ۔۔۔ جال ہے یہ طائر دل کے پھنسانے کیلئے

اور بھی تو ہیں کسی پر ظلم یہ ہوتا نہیں ۔۔۔ کیا ہمیں اک عاشقوں میں ہیں ستانے کیلئے

شوکت

شوکت:۔ سید یعقوب حسین باشندۂ دیوبند۔ مولانا سیف الحق صاحب ادیب مرحوم کے شاگردوں میں ہیں۔ مولوی انوار الحق میر منشی ریذیڈنسی راجپوتانہ کے صاحبزادوں کو درس دیتے تھے:۔

ایسی خاموشی بھی ہجر یار میں اچھی نہیں ۔۔۔ ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

چلے ہیں میکدے میں منہ چھپا کر حضرت واعظ ۔۔۔ الٰہی ڈھانک لے رحمت سے پردہ پارسائی کا

قیامت کا ہے وعدہ گر جواب صاف پر الجھو ۔۔۔ یہ قسمت ہے تمنا کی مقدر ہے وہ ارماں کا

شوکت

شوکت:۔ ڈاکٹر محمد علی خاں صاحب لکھنوی حضرت فصاحت لکھنوی مرحوم سے تلمذ رکھتے تھے۔ دیرینہ سال بزرگ تھے۔ مگر شعر کے تیور خوب ہوتے تھے طبیعت میں روانی تھی۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

سب کی آنکھیں ہیں جھکی تو شوق سے خنجر اٹھا ۔۔۔ جاں نثاروں سے یہ کیسی شرم قاتل سر اٹھا

عمر بھر ایذائیں جھیلیں سوئے ہیں اب چین سے ۔۔۔ ان کے کشتوں کو نہ اے ہنگامۂ محشر اٹھا

ہے یہ مطلب تیرا جس دل میں رہے تڑپا کرے ۔۔۔ چٹکیاں لیتا سکھاتا ہے کوئی سوفار کو

چٹکے غنچے۔ گل کھلے چہکے عنادل باغ میں ۔۔۔ فصل گل آتے ہی سامانِ خزاں برہم ہوا

شوکت:۔ حنیف علی شوکت چھریرے بدن کے اور بہت نحیف آدمی تھے۔ نہایت

خوش خُلق و شیریں زبان تھے۔ شاعری میں غلام علی عشرت کے شاگرد تھے۔ طبیعت کا میلان میر سوز و سید انشا کی طرز پر تھا۔ پُرانے آدمی تھے۔ پُرانی زبان ہے:۔

کس سے پوچھوں کیا کروں بیٹھے بٹھائے ہمدمو ۔۔۔ آہ کل اک راہ چلتا دل کو لے چلتا ہوا
تیری آنکھوں کی ڈوروں کا تصوّر جب میں کرتا ہوں ۔۔۔ تو ٹُوٹے ہے وہیں زخمِ دلِ صد چاک کا ٹانکا
حیران ہوں موجد تری تصویر کا ہے کون ۔۔۔ مانی سے یہ نقشہ ہے کہ بہزاد سے ایجاد
پھر پھر کے نہ چوسوں لب میگوں ترے کیونکر ۔۔۔ چھٹتی ہے کہیں مے لبِ میخوار سے لگ کر
تجھ کو کیا ہم باز آئے خیر خواہی سے تری ۔۔۔ ناصحا اپنا تو سر پھٹتا ہے اس تکرار سے
نہ تیری سرخ چوڑی سی شفق ہی خواں میں غلطاں ہے ۔۔۔ قبائے گُل کا بھی تو چاک تا دامن گریباں ہے

شوریدہ

شوریدہ:۔ شجاع الدین خاں خلف الصدق وجہ الدین خاں نبیرۂ نواب عظمت اللہ بقول تذکرہ شوق جوان۔ قابل خوش اخلاق اور جملہ اوصاف میں طاق تھے۔ چند اشعار جو ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔ اُن کی طبع رسا اور ذوقِ سلیم کا کافی ثبوت ہیں:۔

آبلے پڑتے ہیں دم لیتے زبان پر اپنی ۔۔۔ کب بیاں کر سکیں یہ سوزِ دروں ہم اپنا
بیکسی میں نہیں یاری کی کسی سے اُمید ۔۔۔ دل سلامت ہے اور دیدۂ پُرنم اپنا
صبح تک شمع جلی دیکھ مرا سوز و گداز ۔۔۔ داغِ فرقت سے ہُوا رات وہ عالم اپنا
بسکہ پُرخوں دل ہمارا درد سے لبریز ہے ۔۔۔ ہر فغاں ہے غم فزا ہر نالہ وحشت خیز ہے
عشق کے کوچہ میں یکساں ہیں فقیر و بادشاہ ۔۔۔ کون سمجھے واں کہ وہ فرہاد وہ پرویز ہے
کچھ ادب مانع ہے کچھ تیرا شکوہِ حسن و ناز ۔۔۔ ورنہ دل شکووں سے تیرے بیوفا لبریز ہے

شہباز

شہباز:۔ مولوی عبدالغفور صاحب۔ قابل ادیب اور انشا پرداز تھے۔ کلکتہ کے اخبار "دارالسلطنت" اور "اُردو گائیڈ" میں خوش بیانی اور شوخ نگاری کے نمونے دکھا چکے ہیں۔ جناب سید محمد صاحب آزاد کے رفیق تھے۔ اور وہ ان کی قدر کرتے تھے۔ حضرت آزاد مرحوم نے جو ظریفانہ مضامین اودھ پنچ میں لکھے تھے۔ انہیں آپ نے "خیالاتِ آزاد"

کے نام سے مرتّب کر کے چھپوایا۔ بنگالی مسلمانوں میں قابل انگریزی دان تھے۔ اورنگ آباد کے کالج میں علمِ طبعیات کے پروفیسر مقرر کئے گئے تھے۔ طبیعت مضمون نگاری اور شاعری کے مناسب تھی۔ ان کی اکثر مزیدار نظمیں اودھ پنچ کے دورِ آخر میں شائع ہو چکی ہیں۔ نظامی پریس بدایوں نے ان کو مجموعی شکل میں "خیالاتِ شہباز" کے نام سے شائع کیا۔ نظیر اکبرآبادی کی سوانحعمری یعنی "زندگانی بے نظیر" بھی انھیں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ رباعیات کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ انہوں نے زمانہ کی رفتار کو دیکھتے ہوئے بعض مغربی استعارات و تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ اور صدیوں کے فرسودہ خیالات سے اپنی شاعری کو بچایا ہے۔ عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے :۔

کیوں نہ آیا قتل کو میرے وہ قاتل کیا ہوا　　جذبۂ شوقِ شہادت جذب کامل کیا ہوا

دیدۂ خونبار بتلا ہے کہاں لختِ جگر　　پہلوئے بیتاب فرما پارۂ دل کیا ہوا

اغمازِ نگہ آپ کو ہے ورنہ ہمارا　　دل تیر سے باہر نہ جگر تیر سے باہر

ہاں دید میسّر نہیں اور شوق وہ چاہیے　　جو بات کہ ہو گردشِ تقدیر سے باہر

قول سے پہلے ہے اثر مطلوب　　آہ سے پہلے ہے اثر کی تلاش

رباعیات

رنگین ہیں اُس صاحبِ قدرت کے بھید　　ہر رنگ میں قدرت ہے جھلکتی جاوید

چرتی ہے ہری دوب، جو کالی بکری　　ہے لال لہو کہیں۔ کہیں دودھ سفید

اکھتے ہیں سوانح کے امین ہیں انگریز　　ہر حال میں اپنے نکتہ چین ہیں انگریز

اعمال ہیں اپنے ذرّہ ذرّہ لکھتے　　آپ اپنے کراماً کاتبین ہیں انگریز

کس لطف سے کھیت میں کھلی ہیں کلیاں　　آباد ہیں اس سبز نگر کی گلیاں

تسبیح زمرّدیں سے ہے ان کو لگاؤ　　ہیں کس کی یہ انگلیاں مٹر کی پھلیاں

ہے بزم میں ایک صدر و پائیں ہم کو
ہم غیر سے بھی کرتے ہیں بھائی کا سلوک
ملحوظ ہیں اخلاق کے آئیں ہم کو
شیرازہ اتفاق ہے دیں ہم کو

کیونکر کوئی اسرار الٰہی جانے
آنکھوں سے حجاب وہم اٹھنا معلوم
کیا تاب کہ انسان کماہی جانے
باتیں یہ خدا کی ہیں خدا ہی جانے

حسین ساگر (حیدرآباد دکن)

صفت ہے کونسی وہ شیخ حوضِ کوثر میں
نہیں بوجہ حسن جو حسین ساگر میں
بتائیں اس کو ہم آئینہ سکندر جب
کہ لہریں ایسی ہوں آئینہ سکندر میں
نکل رہی ہیں لطافت سے موج کی سطریں
بھری ہوئی ہے بلاغت صبا کی مسطر میں

میں

کبھی حسن انجام ہوں میں ابد میں
ازل میں کبھی حسنِ آغاز ہوں میں
سمجھ میں حکیموں کی کچھ بھی نہ آیا
خدا جانے کیا بھید کیا راز ہوں میں

آبِ رواں

انگریز شاعر سوڈی کے طرز پر

اڑا طرز خرام البیلیوں سے
چلا آبِ رواں اٹکھیلیوں سے
کھلاتا کھیلتا ہنستا ہنساتا
تھرکتا۔ ناچتا گاتا بجاتا
مٹکتا۔ جھومتا۔ تنتا۔ اکڑتا
گرجتا۔ گونجتا۔ بنتا۔ بگڑتا
چھلکتا۔ جھلملاتا۔ جگمگاتا
پھسلتا۔ لڑکھڑاتا۔ ڈگمگاتا
لپکتا۔ دوڑتا۔ پھرتی دکھاتا
اُچھلتا۔ کودتا چکر لگاتا

سمٹتا۔ پھیلتا۔ مُڑتا۔ مڑاتا اُبھرتا۔ ڈوبتا۔ اُڑتا۔ اُڑاتا
الف ہونا بڑا کاوے لگاتا دولتی چھانتا۔ پُتنگ اُڑاتا
کبھی گھوڑ دوڑ میں کف منہ پہ لاتا کبھی فوجوں میں گھسکے ہنہناتا
گریباں چاک کرتا سر پٹکتا رگڑتا ایڑیاں دامن جھٹکتا
اُٹھا کر سونڈ فوارہ اُڑاتا دھوئیں کے زور سے پارہ اُڑاتا
تڑپتا۔ لوٹتا۔ چڑھتا اُترتا جھپٹتا۔ باولا ہوتا۔ بپھرتا
کھسکتا۔ بھاگتا۔ رُکتا۔ بھڑکتا جھٹکتا۔ جھاڑتا۔ بہتا۔ بھڑکتا
کبھی ڈنڑ پیلتا جوڑی ہلاتا کبھی خم ٹھوکتا تیوری چڑھاتا
پہاڑوں کا کہیں دامن دباتا درختوں کی کہیں شاخیں ہلاتا
صدف میں گوہر نایاب بھرتا گہر کی شیشیوں میں آب بھرتا
زمرد پر کہیں پارہ بچھاتا کہیں پارے کو فیروزہ اُڑاتا
ستاری چھیڑتا۔ ارگن بجاتا ادھر حوریں۔ اُدھر پریاں نچاتا
کبوتر بجرے کو مرغابی بناتا بشر کو مردم آبی بناتا
مکلف منبر پہ چادر بچھاتا معلق شہر کو دعوت کھلاتا
بڑھاتا ہر طرف موجوں پہ موجیں چڑھاتا ہر طرف فوجوں پہ فوجیں
پنہاتا شمس کو زرتار سائے بناتا چاندی سے چاندی کے پائے
کھلاتا روز و شب سورج کے غوطے اُڑاتا عقل کے ہاتھوں کے طوطے
زمیں کی گود میں گرداب بھرتا بھنور کی ناف میں سیماب بھرتا
بناتا مورچے توپیں چڑھاتا سجاتا پلٹنیں فوجیں بڑھاتا
نکلتا سیپیاں موتی اُگلتا جماتا قفلیاں۔ سانچے میں ڈھلتا
گراتا پھینکتا۔ چنتا۔ اُٹھاتا چمٹتا۔ چومتا۔ پلٹتا۔ سماتا

کبھی پچکاریوں کا ڈالتا ڈھنگ
زباں بنکر کہیں جا چاٹتا سنگ
کبھی پتھر سے ٹکراتا ہوا سر
کبھی ذرّوں پہ چمکاتا ہوا زر
نگینے سنگ ریزوں کے بناتا
طلسمی سرمہ آنکھوں میں لگاتا
غرض آبِ رواں یوں جہد کرتا
ہر اک کوشش سے سو سو عہد کرتا
ہزاروں تازہ دم چشموں سے ملتا
کروڑوں پیارے ہمچشموں سے ملتا
جلو میں ندیوں نالوں کو لیتا
کروڑوں کشتیاں اُلفت کی کھیتا

سمندر

بڑی ہی اِک عظیم الشّان شے ہے
پڑے جس میں کروڑوں ان ٹلے سے
ہزاروں جس میں مخفی گنج شاہی
کروڑوں جس میں اسرار الٰہی
خیالوں سے بڑھا پھیلاؤ جس کا
سمیٹے خوبیاں سمٹاؤ جس کا
نگاہیں جس کا پایاں پا نہ سکتیں
حدیں جس کا سرا بتلا نہ سکتیں
فلک جس کے قدم لینے کو جھکتا
زمانہ جس پہ دم لینے کو جھکتا
ستارے جس پہ شیدا ماہ مفتوں
بلاگرداں ہے جس کا مہر گردوں
گھٹا چمکی ہوئی جس کی بدولت
شفق پھولی ہوئی جس کی بدولت
پہاڑوں کو جہاں روڑوں کا رتبہ
جہاں موروں سے کم گھوڑوں کا رتبہ
جہازوں کو جہاں قطرے نچاتے
چٹانوں کو جہاں ذرّے پچاتے
جہاں ہر بوند بنتی بند صبا چل
جہاں ہر موج جنتی سو ہما چل

ہم آغوشی

عبارت مختصر اُٹھ کے سنبھل کے
مطابق فارسی کی اس مثل کے
کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

بنا آبِ رواں اک قلزم جوش
ہوا آخر سمندر سے ہم آغوش

شہرت

شہرت:۔ منشی مہربان علی خاں متوطن میرٹھ۔ شاگرد حکیم میر محمد خاں مضطر معمولی فکر کے شاعر تھے۔ غدر کے پندرہ بیس برس بعد بریلی میں رہتے تھے کلام حاضر ہے

نور اللہ کا آنکھوں میں سما جاتا ہے
جلوۂ حسن بتاں پر جو نظر کرتے ہیں

میں وہ میکش ہوں کہ بعد مرگ میری خاک سے
کیا عجب اے میکشو جو میکدہ تعمیر ہو

وہ کون ہے کہ جو اس میکدے میں عالم کے
پیئے شراب خودی اور ہوشیار رہے

وہ ہم کو ساقیا اک جام مے عنایت ہو
کہ جس کا نشہ ہمیں تا دم شمار رہے

عیادت کو آیا وہ رشک مسیح
مری زیست بار دگر ہو گئی

شہرت:۔ صاحبزادہ احمد حسین خاں ساکن رامپور تلمیذ داغ۔ خوش فکر ہیں۔ زبان صاف ہے۔ طبیعت اچھی ہے۔ یہ کلام ہے۔

دن رات کے یہ صدمے زندہ نہ رہنے دیتے
وعدہ کسی کا لیکن ہم کو جلا رہا ہے

دیر و حرم کا پردہ اُٹھ جائے تو میں پوچھوں
اب کون ایک جلوہ ہر جا دکھا رہا ہے

ناحق بگڑ رہے ہو شہرت کی کیا خطا ہے
یہ جھوٹی سچی باتیں دشمن بنا رہا ہے

ضبط غم اس طرح نہیں ہوتا
خون جب تک جگر نہ ہو جائے

تم جو چاہو تو روز کا جھگڑا
ختم اک بات پر نہ ہو جائے

شہرت

شہرت:۔ امیر بخش دہلوی خلف عیسیٰ خاں تلمیذ ثناء اللہ خاں فراق۔ دکن پہنچکر راجہ چندو لال کے ملازم ہوئے۔ غدر سے بیس پچیس برس پیشتر دکن میں بسر روزگار تھے۔ خوش فکر شاعر تھے۔ کلام یہ ہے:۔

ہزار افسوس اب یوں خاک میں ملنا ہی اے شہرت
یہ طفل اشک وہ ہے اپنی جو آنکھوں میں پلتا تھا

ہو کے ہر اک پہ مبتلا سہتا ہے جور اور جفا
اسمیں ہی اس کو کیا مزا یہ تو ہمیں بتائے دل

دم دلاسے جانتے ہیں سب ترے ایجان ہم
دل جو دی بیٹھیں تجھے ایسے نہیں نادان ہم

وہ تو کہتا ہے قسم ہے ہم اِدھر دیکھیں تو
چل تو اے آہ رسا تیرا اثر دیکھیں تو

حسرت پڑی ٹپکتی ہے شمع مزار سے
آئینہ کو جلا دو ہمارے غبار سے

شہرت

شہرت:۔ منشی محمد علی دہلوی۔ محمد یحیٰی اماں کے مشہور شاگردوں میں تھے۔ قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں اچھے شعرا میں گنے جاتے تھے۔ کلام سیدھا سادہ اور صاف ہے۔

دیوانہ پن یہاں تک مشہور ہے ہمارا
ہر خار کی زباں پر مذکور ہے ہمارا

کہہ کے ناخوش مجھے محفل سے اٹھا مت ظالم
کرتے ہیں اسکی خوشی اپنے جو گھر آتا ہے

گھر سے لڑکے کو اکیلا نہیں جانے دیتے
اس لئے اشک کے ہمراہ جگر آتا ہے

کم نصیبی سے ملاقات نہیں ہوتی آہ
جب میں جاتا ہوں اُدھر تب وہ اِدھر آتا ہے

میرے ہی گھر کی طرف اُسکے قدم پڑتے ہیں
میں تو حیران ہوں وہ آج کدھر آتا ہے

نہیں معلوم کہ کیوں آج نہایت غمگیں
شہرت اُس کوچہ سے با دیدۂ تر آتا ہے

دل ڈھونڈھتے ہو پاس مرے دل تو کہاں ہے
ایک شعلۂ آتش ہے کہ پہلو میں نہاں ہے

آپس میں یوں وہ کہتے ہیں سب پڑھکے فاتحہ
شہرت تھا جن کا نام یہ اُن کا مزار ہے

شہرت

شہرت:۔ صاحب عالم میرزا حاجی خلف مرزا قیام الدین ابن شاہ عالم بادشاہ شروع میں حافظ عبدالرحمٰن خان احسان اور نظام الدین ممنون سے اصلاح لی۔ ان کی وفات کے بعد مفتی صدرالدین خاں آزردہ کو غزل دکھائی ۱۲۶۱ھ میں تئیس برس کا سن تھا۔ غدر سے پہلے انتقال کیا۔ مرثیہ گو۔ اور صاحب دیوان تھے۔ کلام میں تازگی ہے۔ اسلوب برجستہ اور تخیل اعلٰے ہے۔ یہ اُن کا کلام ہے:۔

غبار اٹھا نہ مرے دل سے وہ منہ لے ظالم
ہماری جان کو اک وہ بھی امتحاں ہوتا

ہم بڑی چیز سمجھتے تھے پہ میخانے میں
نکلا اک جام کی قیمت بھی نہ ایماں اپنا

کچھ نشاں مجھ بے نشاں کا بعد مردن بنگیا
حسرتیں ہو ہو کے یکجا جمع۔ مدفن بن گیا

ہائے جی بھر کے وہ دیدار میسر نہ ہُوا
حشر کا دن شب غم کے بھی برابر نہ ہُوا

کفر و دیں میں کچھ نہ تھا عقدہ بجز بند نقاب
اس کے اُٹھتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہوگیا

کیا وہ جگر کہ جس پہ نہیں داغِ جانگداز
کیا دل وہ بیقرار جو آٹھوں پہر نہیں

یہ تو خبر نہیں ہے کہ کیا حال ہے پر آج
شہرتؔ کا بار بار ہے جانا جگر پہ ہاتھ

نہ چھوٹا زلف سے دل۔ اور نہ تم زلفیں بنانے سے
یہ وہ جنجال ہے جس سے نہ تم نکلے نہ ہم نکلے

اُٹھے تو نالہ کش ہوئے۔ بیٹھے تو آہ کی
کیا یاد ہم کرینگے کہ ہم نے بھی چاہ کی

کس کس کی جان لیکے بڑھائی ہے اپنی عمر
میرے ستانے کو فلک بد شعار نے

لبوں پہ آنے نہ پایا تھا اپنے حرف امید
کہ اتنی دیر میں وہ ہوگئے خفا ہم سے

شہرت

شہرت:۔ منشی ہیرالال۔ ڈپٹی کلکٹر۔ دیوانِ ریاست الور۔ متوطن خورجہ ضلع بلند شہر۔ شاگرد منشی پربھیشری سہائے مسرورؔ۔ ان کے والد منشی ابدل رائے ولیش خورجہ کے ساہوکاروں میں تھے۔ زبان اچھی ہے۔ جدّت طرازی طبیعت میں زیادہ ہے اور تخئیل بھی پاکیزہ ہے۔ یہ ان کے کلام کا انتخاب ہے:۔

نہ کر محرومیِ دیدار کا شکوہ تو اے زاہد
پڑا ہے پردہ آنکھوں پر تری زعم عبادت کا

آب خنجر کی لگائی ہے ستمگر نے سبیل
دہن زخم جگر کو لب سائل سمجھا

چھپتے اگر وہ ہم سے تو چھپتا نہ راز عشق
پردہ رہا اسی میں کہ پردہ نہیں رہا

رہے دیر و حرم میں جسکے جویا رات دن شہرتؔ
وہ نکلا دل کے پہلو میں کہاں ڈھونڈا کہاں پایا

ہُوا معلوم چھٹنا عمر بھر بند تعلق سے
غمِ دنیا سے گر چھوٹے غمِ عقبےٰ نکل آیا

ہُوا اچھا سمجھ کر اپنے دل میں ہم چلے آئے
نہ تھا بدمستیِ ساقی سے رنگِ انجمن اچھا

اِک سرسری نگہ سے ہوا کام ہی تمام
یہ تیر نیم کش بھی بڑا کارگر ہُوا

تُو ہے تو تری بدولت اے دل
کیا کیا نہ ستم اُٹھائیں گے ہم

شہرت

شہرت :- سید باقر حسن عرف اچھے صاحب لکھنوی خلف جناب میر سید حسن صاحب متخلص بہ لطافت۔ آپ کے جدِ امجد ہندوستان کے مشہور شاعر جناب سید آغا حسن صاحب امانت تھے۔ بلحاظ شرافت و عزت ان کا خاندان ممتاز ہے۔ جناب امانت کے دو صاحبزادوں میں ایک جناب لطافت مرحوم تھے۔ جو جناب شہرت کے والد ماجد تھے۔ دوسرے فرزند سید عباس حسن صاحب فصاحت مرحوم تھے جنہوں نے حال ہی میں کربلائے معلیٰ میں انتقال فرمایا۔

جناب شہرت ۱۸ ماہ رجب ۱۲۸۳ھ کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے اور ان کے والد نے اِن کا تاریخی نام شہرت حسین رکھا۔ ابتدائی درسیات کی تکمیل کے بعد ۱۶ یا ۱۷ برس کے سن میں اپنے والد کے شاگرد رشید اور عربی و فارسی و عروض کے بڑے ماہر جناب قاری یعقوب علی خاں صاحب نصرت لکھنوی سے تعلیم فارسی۔ عربی اور فنِ عروض وغیرہ حاصل کیا۔ جناب شہرت نے کچھ دنوں اپنے والد سے اصلاح لی۔ ان کے انتقال کے بعد قریب دس برس تک اپنے چچا جناب فصاحت سے اصلاح لیتے رہے۔ آخر کار رنگ کلام کے اختلاف کی وجہ سے جناب فصاحت سے اصلاح لینا ترک کر دیا۔ اور اساتذۂ فن کی کتابوں اور دواوین کو بطور استاد سامنے رکھا اور پھر اصلاح کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

جناب شہرت شاہزادہ مرزا سلیمان قدر کی سرکار میں ملازم رہے اور وہیں نواب میر محمد حسین خاں صاحب شاگرد جناب میر مونس مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ اور ان کے اصرار سے اُن کے دو تین مشاعروں میں بھی شرکت کی پھر اودھ کے مشہور علم دوست تعلقہ دار راجہ نوشاد علی خاں صاحب مرحوم تعلقہ دار ضلع بارہ بنکی سے برسوں مخلصانہ مراسم رہے ان کی صحبت میں شعر و شاعری کے خوب چرچے رہتے تھے۔ اب کچھ عرصہ سے جناب شہرت کا زیادہ حصّہ وقت اپنے قدیم کرمفرما

اور باوضع مخلص علم دوست جناب سید علی حامد صاحب حامد رئیس جبرن پور اور اڈیشنل جج صوبہ اودھ کے ساتھ گذرتا ہے۔

جناب شہرت کی عمر ۱۹۳۱ء میں ۶۵ یا ۶۶ سال تھی۔ ہر رنگ کے مضامین میں غزل کہنے اور اصلاح دینے پر قادر ہیں۔ فن عروض اور نکات شاعری سے باخبر ہیں۔ کلام میں مزا اور پختگی ہے۔ نہایت خلیق۔ بےنفس عبادت گذار۔ قانع اور منکسر مزاج ہیں اور عہد قدیم کے اخلاق کی یادگار۔ بلحاظ کمالات شاعری خاندان امانت کے درخشندہ آفتاب ہیں۔ بڑے بڑے کامل شعراء کا زمانہ دیکھا ہے۔ شاعری کے سلسلہ میں جسقدر جھگڑے اور جتھے بندیاں ہوتی ہیں ان سب سے یہ الگ رہے۔ شعراء اور رؤسا سب انکی عزت کرتے ہیں مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی فرمائی ہے اب جناب شہرت کے جواہر افکار ملاحظہ ہوں:۔

انتخاب غزلیات

کسی نے بزم میں پہلے ادھر دیکھا ادھر دیکھا
فلک کو ہجر کی شب یاس سے باچشم تر دیکھا

ادا کے ساتھ پھر خنجر کمر سے کھینچکر دیکھا
نہ جب تصویر دود آہ میں رنگ اثر دیکھا

یوں نہ انگشت نما اے مہ نو تو ہوتا
لوگ آنکھوں پہ جگہ دیتے جو ابرو ہوتا

بات وہ میرے رلانے کو نکالی ہوتی
جسمیں ہنسنے کا بھی صاحب کوئی پہلو ہوتا

یاد آگیا جو طول مجھے زلف یار کا
ٹوٹا نہ سلسلہ مرے اشکوں کے تار کا

عاشق بتوں پہ کیوں ہوئے پوچھیگا جب خدا
کہدونگا روز حشر کہ دل کا قصور تھا

وہ ترک دل سے مرے کھینچ لے عتاب میں تیر
بہت کشاکش ارماں سے ہے عذاب میں تیر

تری نگہ کا نہیں ساغر شراب میں تیر
ہر ایک کو نظر آتا ہے آفتاب میں تیر

بلبل کی ہی بہار ہیں پھولوں سے بڑھ کے لو
باہر پہنچ گئی وہ یہ اندر چمن کے ہیں

دو طرح کی بہار ہے میرے مزار پر
کچھ پھول ہیں چراغ کے کچھ گل چمن کے ہیں

شہرت ہماری نظم کا شہرہ ہے دُور دُور
ہم خوشہ چیں جو خرمن اہل سخن کے ہیں

فرقت میں اسلئے ہے خیال وصالِ یار
کچھ تو رہے خوشی کا بھی پہلو ملال میں

سجدہ کعبہ میں کیا چوم کے بتخانے کو
آج سوجھی یہ نئی آپ کے دیوانے کو

دل میں وہ قصر ہے اور قصر میں جلوہ اس کا
کہ ہے کعبہ لئے آغوش میں بتخانے کو

اب مجھے بیدم کیا دونوں طرح تقدیر نے
کچھ اُڑائے ہوش تُو نے کچھ تری تصویر نے

خون کی رفتار روکی حسن کی تاثیر نے
کر دیا تصویر مجھ کو آپ کی تصویر نے

جو آج آئینہ فنا سے دوچار اپنی نظر ہوئی ہے
بنائی ہے جو بہرو نکی کثرت اِدھر کی دنیا اُدھر ہوئی ہے

وہیں دعا بھی وہیں اثر بھی وہیں تصور وہیں نظر بھی
وہیں ہے دل بھی وہیں جگر بھی ادھر کی دنیا اُدھر ہوئی ہے

وہ اُٹھ کے پہلو سے جا رہا ہے اندھیرا آنکھوں میں آ رہا ہے
فلک یہ کس کو چھڑا رہا ہے۔ یہ کیا مقدر دکھا رہا ہے

ٹکڑے ٹکڑے پیرہن کیجے جنوں کا ہے یہ حکم
نام کو بس اک نفس کا تار رہنے دیجئے

جلنے سے یاس بھی ہے امید شفا بھی ہے
بالیں پہ میری وہ بھی کھڑے ہیں قضا بھی ہے

میری ہی آہ سے نہیں الٹی نقاب رُخ
غصہ فقط مجھی پہ نہ کیجے ہوا بھی ہے

ایک قصیدہ کے دو شعر

جب کہ مجلس میں کہوں میں سرِ منبر جب تک
دل کہے صلِّ علیٰ لب کہیں حیدر حیدر

یا خدا روزِ جزا سب کہیں نفسی نفسی
ہم اُٹھیں قبر سے کہتے ہوئے حیدر حیدر

رباعی

ذرے کی طرح سے کم حقیقت بھی ہوں
مشہور برائے نام شہرت بھی ہوں
ہاں یہ بھی شرف کہ ہوں لطافت کا خلف
پیرو بھی نبیرہ امانت بھی ہوں

شہرت ۔ منشی نثار علی دہلوی۔ افسر سررشتہ تعلیم ریاست جموں و کشمیر آپ کے

ت

والد منشی حسین علی فرحت شاہ نصیر مرحوم کے تلامذہ سے تھے۔ آپ نے پہلے اپنے والد سے اصلاح لی۔ پھر حکیم مولا بخش قلق کے شاگرد ہوئے۔ قدیم انشاء پرداز اور ابتدائی دور کے اخبار نویس تھے۔ اخبار انجمن پنجاب۔ پنجاب پنچ۔ خیر خواہ عالم دہلی وغیرہ کے ایڈیٹر اور کشمیر۔ جے پور۔ میرٹھ میں برسر ملازمت رہے۔ باوجود پیرانہ سالی قلم کو ہاتھ سے نہ رکھا۔ کئی سال لاہور میں مضمون نگاری کرتے رہے۔ دیسی ریاستوں کے معاملات پر خامہ فرسائی کا ملکہ تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے قریب لاہور میں انتقال کیا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

رکھ دیا مثلِ تبرک طاق میں کیوں دی بھی دے
کیا کان میں کہا کہ وہ مجھ سے بدل گیا

یہ ہے لحاظ تیرا مجھے کوئے غیر میں
یہ جنت ایک بلا میں باغ ہے اس گل کے ایواں کا

فنا ہوتے ہی پہنچا ایک منزل اس سے بھی آگے
ہیں سب میں داغ لیکن ہیں ستارے اس میں نور افشاں

ہوگئی سرخی نمایاں دیدۂ مخمور میں

ساقیا کیا جام مے زاہد کا ایماں ہو گیا
افسوس ہے کہ چھوڑ رقیبوں کا چل گیا

آنکھوں کے بل گیا میں کبھی سر کے بل گیا
جہنم اک شرارہ ہے ہمارے داغ سوزاں کا

پتہ کوئی بتاتا ہی نہ تھا عمر گریزاں کا
کہاں ہے ماہ میں عالم ترے ماتھے کی افشاں کا

آتشِ سیال آئی ساغر بلور میں

شہرت (حاشیہ)

شہرت:۔ میرزا محمد مہدی علی خاں خلف میرزا مہدی حسن خاں رفعت لکھنوی شوخ بیان ہیں۔ طبیعت چلتی ہوئی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

قاصد بھی گیا ہوا ہے دل بھی
کوئی نہ پھرا ادھر سے جا کر

کہتے ہیں وفا کی بو ہے ان میں
میرے پھولوں میں پھول اٹھا کر

جس کو ہر بار دیکھتی ہے
تیری تصویر مسکرا کر

شہید:۔ جناب منشی محمد بخش شہید ابن منشی خدا بخش خوش نویس باشندہ قصبہ رسڑا ضلع ہردوئی شاگرد حضرت ناسخ و میر علی اوسط رشک مرحوم۔

جناب شہید نے محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ بادشاہانِ اودھ کا زمانہ دیکھا ۱۲۳۳ھ میں ان کے والد منشی خدا بخش کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ انہوں نے خواجہ وزیر اور حضرت اسیر کی صحبتیں اٹھائی تھیں۔ ان حضرات کے مکانوں پر جس جس طرح میں مشاعرے ہوا کرتے تھے ان میں انکی غزلیں موجود ہیں ۱۲۷۰ھ میں حیات تھے۔ سنِ وفات نہ معلوم ہو سکا۔ شباب و شیب کا زمانہ لکھنؤ کے شعرا کی صحبتوں میں گذرا۔ خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے رعایت لفظی کے دلدادہ تھے اور اپنے اُستاد حضرت ناسخ کے پیرو۔ بڑی بڑی مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کے جوہر دکھائے ہیں۔ کوئی شعر مضمون آفرینی اور جدت طرازی سے خالی نہیں۔ لیکن سوز و گداز ان کے کلام میں کم نظر آتا ہے مگر یہ مجبور تھے۔ کیونکہ وہ زمانہ ایسی ہی شاعری کو پسند کرتا تھا۔ ہر طرف گل و بلبل کے افسانے اپنا رنگ جمائے ہوئے تھے۔ شہید کا کلام اپنے معاصرین کے کلام سے کسی طرح کم نہیں۔ قصائد۔ غزلیات۔ رباعیات۔ مثنویاں اور تاریخیں کثرت سے کہی ہیں۔ کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا اور اپنے عقائد کے بہت سخت پابند تھے۔ اچھے پُرگو شاعر تھے مگر جیسا کہ اُس زمانے کا مذاق تھا۔ کلام میں رکاکت اور ابتذال کی کمی نہیں۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

کہتا ہے کون یہ کہ مجھے شہد ناب دو
لیکن زبان کا کہ دہن کا لعاب دو

کیا شوخ ہے کہ ہونٹھ مسی میں نہ ملائے ہونٹھ
دانتوں سے اُس صنم نے مری کاٹ کھائے ہونٹھ

کہا جاتا ہے کہ کلام میں اکثر فارسی اشعار کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً بیدل کا ایک شعر ہے :-

مردہ ہم فکرِ قیامت دارد
آرمیدن چہ قدر دشوار است

جنابِ شہید فرماتے ہیں :-

لحد میں بھی یہ دھڑکا ہے کہ محشر سر پہ آتا ہے
نہیں ہے جائے آسائش کہیں سارے زمانہ میں

مگر یہ کوئی عیب نہیں۔ اس کو ترجمہ کہا جائے یا توارُد۔ کس کے کلام سے نہیں نکالا جا سکتا ہے۔ سوال سلیقہ ادا کا ہے۔ انتخابِ کلام ملاحظہ ہو۔

افشاں ہے زلفِ شب پہ نہیں ہیں نجومِ چرخ
تاروں سے کس نے چہرہ سنوارا ہے رات کا

شہید تیغِ عشق اپناہی کرا اتنی تمنا ہے
کہ مرنا معرکہ میں نام ہے مردِ سپاہی کا

بجا کہتے ہیں انساں کوٹھڑی کا جل کی دنیا گو
نہیں ممکن لگے دھبا نہ عصیاں کی سیاہی کا

سیکھ لے انداز اگر بلبل مری فریاد کا
گُل تو کیا ہے ٹکڑے ہوجائے جگر صیاد کا

واہ رے ذوقِ گرفتاری کہ پھر مدت کے بعد
ڈھونڈ کر ہم نے نکالا آپ گھر صیاد کا

تا بہ لب آیا نہ کوئی حرف تک اللہ رے عب
سامنے اس بت کے جاکر میں بھی پتھر ہوگیا

ہنسوں کہ زرد ہے رُخ مثلِ زعفراں اپنا
نہیں بہار سے کم موسمِ خزاں اپنا

کلام یار سے ثابت دہانِ تنگ ہوا
بتا دیا مجھے عنقا نے آشیاں اپنا

یہ محو ہم ہیں تری یاد میں کہ خود پر بھی
کبھی گماں ہے تیرا کبھی گماں اپنا

شہید حضرتِ ناسخ کے انتظار میں روز
یہی کلام ہے ہر لحظہ ہر زباں اپنا

دمیکہ یار گذارد قدم بخانۂ ما
سزد کہ کعبہ شود سنگ آستانۂ ما

نام آیا جب آشنائی کا
پھر گلہ کیا ہے بے وفائی کا

شاخ طوبےٰ کا ہاتھ آتا ہے
ہاتھ آتا تری کلائی کا

حال بختِ سیاہ کا جو لکھوں
رنگ اُڑ جائے روشنائی کا

بیٹھے کیا ہو چلو شہید کہیں
وقت ہے قسمت آزمائی کا

شکوہ جفاؤں کا نہ دلِ زار نے کیا
سمجھا اسے کرم جو ستم یار نے کیا

دل جلاتا تجھے حاصل ہو صفائے باطن
ہاتھ جلتا نہ اگر یوں یدِ بیضا ہوتا

اثرِ تربیتِ حضرتِ ناسخ ہے شہید
شہرہ کیوں کر نہ بھلا میرے سخن کا ہوتا

ہولی میں سرخ رنگِ رُخِ یار ہوگیا
چہرہ گلال ملنے سے گلنار ہوگیا

ہمیشہ عارضِ پُرنور بے حجاب رہا
اک آفتابِ قیامت تہِ نقاب رہا

سبک روانِ جہاں سب سے رہتے ہیں بالا
کبھی حباب نہ دریا میں زیرِ آب آیا

اس مرتبہ ہے مجھکو توارد سے تنافر
بھولے سے قدم نقشِ قدم پر نہیں رکھتا

ساقی کی جدائی نے بنایا مجھے زاہد
اب گھر میں کبھی شیشہ و ساغر نہیں رکھتا

کم ہنڈولے سے نہیں پست و بلندِ آسماں
ہوگیا کوئی تو نیچا کوئی اونچا ہوگیا

اس کے جلوے سے مصوّر ہوگئے دیوار و در
تھا جو روزن میرے گھر میں چشمِ بینا ہوگیا

رشک ہے کیونکر نہ ہر عاشق کو اس انجام پر
بخشتے ہیں پڑھکے وہ قرآن میرے نام پر

ایکدن اس گل کی آنکھوں کا کیا تھا سامنا
آجتک پتھر پہ پتھر پڑتے ہیں بادام پر

نانِ جویں پہ کیوں نہ کروں بار بار شکر
مجھسا فقیر اور یہ نعمت ہزار شکر

خواب میں آکے وہ بُت کہتا ہے
دیکھ لے دولتِ بیدار ہوں میں

دل روشن کا پھنسنا یاد آیا زلفِ پیچاں میں
اگر جگنو کبھی چمکا شبِ تاریکِ ہجراں میں

لگائے وار اس شیریں ادا نے مجھ پہ ہنس ہنس کے
نمک کی جا بھروں شکر دہانِ زخمِ خنداں میں

کب ترے در پہ اژدہام نہیں
حشر کس روز زیرِ بام نہیں

تنِ پرنور اس کو کہتے ہیں
سایہ تک بھی سیاہ فام نہیں

ساقیا مے پئیں گے چلّو سے
ہاتھ تو ہیں بلا سے جام نہیں

ایک دم لگتی نہیں اپنی پلک سے اب پلک
کس کی یا رب طالبِ دیدار آنکھیں ہوگئیں

ہیں کہاں بارِ غمِ فرقتِ احباب کہاں
صدمۂ ہجر اٹھاؤں یہ مجھے تاب کہاں

یہی کہتے ہوئے ساتھ انکے چلے جاتے ہیں
لئے جاتے ہو ہمارا دلِ بیتاب کہاں

کس نے چھپا لیا رُخ روشن نقاب میں
فرق آگیا ہے روشنی آفتاب میں

کس طرح کوئی اُن سے برآئے کلام میں
کہئے جو ایک بات تو وہ دیں جواب دو

قدر کیا جنّت میں ہو گی تیرے آگے حور کی
رُخ ترا سب کو دکھائے گا تجلّی طور کی

یہ بھی کہا نہ یار نے منہ سے کہ بیٹھ جا
شرمندگی کمال ہوئی جا کے سامنے

اس پیار کی نگاہ سے دیکھا کہ مر گیا
مجنوں جو آگیا کبھی لیلےٰ کے سامنے

رات دن دردکش ساقی مخمور رہے
نشۂ آنکھوں میں رہا نشۂ میں ہم چور رہے

بچایا فلسفی کو آپ نے کس کس توہّم سے
دہن تھا شکل نقطہ خط بنا موجِ تبسم سے

تیرے دست نگاریں کا کہاں مضمون باندھا ہے
نکالی ہے نئی رنگت کی مچھلی بحر قلم سے

لب پر آئے گی جو میری داستاں
بزم ساری نوحہ گر ہو جائے گی

شہید

شہید:۔ جناب میر احمد علی خاں صاحب شاگرد رشید حضرت شاہ نصیر دہلوی۔ شاہجہان آباد کے رہنے والے تھے۔ آب و دانہ کی کشش نے دکن میں پہنچا دیا۔ اور پھر یہ وہیں ہو رہے۔ حضرت ذوقؔ کے ہمعصر تھے۔ اشعار مزیدار ہوتے ہیں محاورات کی خوبی اور مضمون کی خوش اسلوبی دل نشین ہے۔ طبیعت جدّت آفریں۔ قدیم مضامین کو نیا جامہ پہنایا ہے۔ زبان و تخئیل میں وہی زمزمے ہیں۔ جو حاتم اور سودا کی زبان پر تھے۔ ادائے بیان کی لطافت نے ان کو دلفریب بنا دیا ہے ۱۲۷۰ھ میں بعہد نواب سکندر جاہ مرحوم دکن میں موجود تھے۔ رؤسائے حیدرآباد کی قدر دانی سے سرفراز اور دربار میں ممتاز تھے "میر الشعرا" کا خطاب پایا تھا۔

دیوان ۱۳۰۹ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ جس کا تاریخی نام نظم شہید ہے۔ ان کو متروکات کا بلبشتر لحاظ تھا۔ ٹک۔ تلک۔ متروک الاستعمال الفاظ کلام میں

ہیں ہیں تو سہی مگر خال خال۔ انتخاب یہ ہے ؎

اعضا ہیں سڈول ایسے کہ صنّاع ازل نے
سلچے میں ہی قدرت کے تری جسم کو ڈھالا

نوکِ سرِ ہر خار گلِ باغِ ارم ہے
جس دشت میں پھوٹا ہی مرے پاؤں کا چھالا

ہے تنِ کاہیدہ کو کتنا غنیمت رنگِ زرد
ہر قدم پہ ہے تماشا کہربا و کاہ کا

وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا
اس کے گھر میرا آنا جانا تھا

یار کی چشمِ مست کے آگے
پانی پانی شراب خانہ تھا

یادِ رُخ نے صورتِ آئینہ حیران کردیا
فکر نے زلفِ پریشاں کی۔ پریشان کردیا

باعثِ رونق تھی جب ہم سے قفس آباد تھا
داغِ دل اپنا چراغِ خانۂ صیّاد تھا

دیوانہ ہوں ساقی تری جادو نظری کا
جلوہ نظر آیا مجھے شیشہ میں پری کا

اُڑ تو بھی کہ جاتا ہے اُڑا رنگ ہمارا
اے ہوش ارادہ ہے اگر ہم سفری کا

ہستی ہی شہید اہل سخن کی تو سخن ہے
گر میں نہ رہونگا مرا دیوان رہیگا

تری تلاش میں آئے عدم سے ہم یاں تک
وگرنہ ہستی ناپائدار میں کیا تھا

زخموں سے تن بنا ہے مرا صورتِ چمن
داغوں سے سینہ تختہ ہے اک لالہ زار کا

نام کو ہر چند زندہ ہوں مگر بے جان ہوں
ایک عالم ہے مرا اور طائرِ تصویر کا

جوں عکسِ چراغاں ہو تہِ آب نمایاں
یوں جامۂ آبی میں ہے رنگ اسکی بدن کا

ڈروں میں کس لئے رنجش سے یار میں کیا تھا
ہیں اب خزاں کو جو روؤں بہار میں کیا تھا

اے وائے ہم آپ ہو گئے گم
لیکن نہ ملا سراغ دل کا

جلوہ عارض پہ ہے اُسکی زلفِ مشکیں فام کا
سر زمیں پر رُوم کے اُترا ہی لشکر شام کا

ناصح خدا کے واسطے جا اپنی راہ لے
بیٹھا ہے کیوں عبث مری چھاتی کا سِل بنا

کشتہ تو ہیں سب آپکے پر ہے یہی حسرت
ہیں کشتۂ شمشیرِ تغافل نظر آیا

تجھ کو لطیف طبع کیا شکلِ بوئے گل
مجھ کو برنگِ بادِ صبا دربدر کیا

طرز اس تری غزل کی نئی دیکھکر شہید
یاروں نے وجد کیا کہوں میں کس قدر کیا

شہ نصیر اک مرا اُستادِ یگانہ ہے شہید
میرے اشعار میں اُستاد کا ڈھنگ آ ہی گیا

کب دل میں ترے خال کا سودا نہیں آتا
کب گانو میں گوکل کے کنھیا نہیں آتا

کہتے ہیں جسے عشق حقیقت میں خدا نے
ہے نورِ خدا قالبِ انسان میں ڈالا

ہے طرز کہنہ شعر کی اب مجھ سے تو شہید
مضمون نئے زباں نئی ہے سخن نیا

تلاشِ دیں نہ رہی فکرِ دنیوی کے سبب
بتوں کو چھوڑیئے اب کس لیئے خدا تو گیا

کان کے بالے میں دُر ملتا ہے اُس مغرور کا
جھولتا ہے جیسے گہوارے میں بچہ حور کا

تیرے قامت نے کیا خوب ہی سیدھا اسکو
سروِ گلشن کو بہت دعوی رعنائی تھا

ہم ہوں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
کب ہو جنّت میں گذر ہم سے گنہگاروں کا

حلقۂ گیسو سے اس کے سبز خط کو کیا گزند
جب زمرّد پر نظر کی سانپ اندھا ہو گیا

جب چمن میں یاد آیا ساقیِ توبہ شکن
ساغرِ مے گل بنا اور سروِ مینا ہو گیا

دیکھا نہ باغ حیف یہ پھولا پھلا ہوا
میں فصلِ گل کے بعد قفس سے رہا ہوا

محوِ کلامِ دوست کو افسانہ کیا ضرور
کیوں غیر کی سُنے دلِ دیوانہ کیا ضرور

چل دیئے صبر و خرد بیتابیِ دل دیکھ کر
راہ لی ہمراہیوں نے وقتِ مشکل دیکھکر

کیا ذکر ہے ناصح مرے دامانِ قبا کا
وحشت میں کروں چاک گریبانِ سحر تک

مرنا مرا سُن وہ شوخ بیباک
کہنے لگا "خس کم و جہاں پاک"

سیر اک جہاں کی کرتے ہیں دل کے مکاں میں ہم
اُڑتے ہیں شکلِ مرغِ نظر آشیاں میں ہم

آنکھوں سے متصل ہے رواں کاروانِ اشک
یوسف کی طرح رہتے ہیں اب کارواں میں ہم

تقلید کب پہنچتی ہے تحقیق کو شہید
ہندی ہیں شعر کہتے ہیں ہندی زباں میں ہم

بتوں کو کیا کوئی الزام دے کہ ہے معدوم
وفا کی جنس خدائی کے کارخانے میں

جو تیرے جی میں آئے سو تو کہہ لے ناصحا
ہم کو کہاں دماغ کہ ہم گفتگو کریں

کانٹے پڑے ہیں اب سوزِ دروں سے ہیں زباں میں
جوں شمع ہے آتش مرے تارِ رگِ جاں میں

آرزو اچھی ہے وصلِ یار کی
اور کوئی آرزو اچھی نہیں

تری تلاش میں ہیں سب کے سب نہ ایک نہ دو
تمام رکھتے ہیں تیری طلب نہ ایک نہ دو

غنچہ و گل سے غرض کیا مرغِ حسرت زاد کو
آنکھ جب کھولی تو دیکھا صورتِ صیاد کو

منظور ہے گر مشقِ ستم اور زیادہ
لیجے سرِ عشاق قلم اور زیادہ

کیا نغمہ و ترانہ ہو کیا شاہد و شراب
جو کچھ تمہیں حرام ہے ہم کو حلال ہے

کم قیامت ہے اس کے قامت سے
ہے دو بالا وہ قد قیامت سے

ہوش اڑتے ہیں مستی میں تری جلوہ گری سے
نسبت جو تجھے مے سے تو مے کو ہے پری سے

حضرتِ دل تم کو قاصد جان کر بھیجا وہاں
کیا قیامت ہو کہ تم جا کر وہیں کے ہو رہے

غیر حالت تری اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی
سانس لینی تجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

دیکھا تو حسن و عشق میں الفت کمال ہے
یاں دل پہ داغ ہے تو وہاں رخ پہ خال ہے

شہید

شہید: مچھن صاحب۔ باشندہ لکھنؤ شاگرد حضرت جاوید لکھنوی یہ شعر ان کے ہیں۔

میری قسمت کی برائی سب پہ ظاہر ہو گئی
نام جس نے لے لیا میرا اُسے بھی غم ہوا

خوگرِ ایذا ہوں اک مدت سے ہے بیمارِ ہجر
درد جتنا بڑھ گیا اس کو بھی سمجھا کم ہوا

حالِ دل کہنا ہو جو کچھ اُن سے کہہ لے اے شہید
رحم کی چتون بتاتی ہے کہ غصہ کم ہوا

شہید

شہید: مولوی مولانا صبغت اللہ۔ علمائے فرنگی محل کے خاندان سے ہیں عربی میں معقول استعداد ہے۔ آپ دینی اور قومی کاموں سے نہایت دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس وقت (۱۹۳۲ء) عمر ۳۵ سال کے قریب ہے۔ کچھ زمانہ تک اخبار خادم الحرمین کی ادارت فرمائی ہے۔ فنِ شعر میں جناب آرزو لکھنوی سے تلمذ ہے۔

چھیو نہ تیغِ ادا کی جھلک دکھا کے مجھے
نہیں شہیدوں میں ملنا لہو لگا کے مجھے

بھٹکتا پھرتا ہے صحرا نورد عشق ابتک	خضر بھی بھاگ گئے راستہ بھلا کے مجھے
شہید جن کی کدورت گئی نہ تا دم مرگ	وہ آج روتے ہیں کیوں خاک میں ملا کے مجھے

شہید

شہید:۔ مولوی غلام امام صاحب شاگرد مرزا قتیل و مصحفی۔ باشندہ امیٹھی ضلع لکھنؤ۔ آپکے والد مشہور مشائخ سے تھے۔ آپ نے آغا اسمٰعیل مازندرانی سے عروض علم معانی کی کتابیں پڑھیں۔ زبان فارسی میں پوری استعداد تھی۔ صنائع بدائع پر عبور تھا۔ فارسی میں صاحب دیوان تھے۔ انکو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا۔ مگر حضرت غالبؔ مرحوم نے اپنے ایک شاگرد کو خط لکھتے ہوئے ان کے کلام پر کوئی عمدہ رائے ظاہر نہیں کی ہے کبھی کبھی اُردو زبان میں بھی شعر کہتے تھے۔ اُردو نثر میں روضۂ تاج گنج کی تعریف خوب لکھی ہے۔ انشائے بہار بے خزاں۔ مولود شریف۔ رمز الشہادتین۔ آپ کی تصنیفات سے ہیں۔ اور مقبول خاص و عام ہیں۔ آغا سید محمد اصفہانی اور میرزا ناطق مکرانی کے ہمعصر و ہم مشاعرہ تھے قتیل اور مصحفی کے علاوہ شیخ غلام مینا ساحر سے بھی استفادہ حاصل کیا تھا۔ الہ آباد میں عہدۂ پیشکاری صدر۔ نظامت پر فائز تھے اپنے گھر پر مجلسِ میلاد کرتے اور تازہ نعتیہ کلام نہایت خوش الحانی سے پڑھتے۔ نواب محی الدولہ بہادر نے ان کے نعتیہ کلام کی شہرت سُنی تو ایک ہزار روپیہ زاد راہ بھیجکر حیدرآباد دکن میں بلایا۔ آپ سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد وہاں تشریف لے گئے۔ سرکار نظام سے چارسو روپیہ ماہوار آپ کا وظیفہ مقرر ہوگیا۔ جب آپ نے دکن سے حج کا عزم کیا۔ تو راجہ گردھاری پرشاد باقی نے زاد راہ اپنی جیب خاص سے مرحمت فرمایا۔ اور پانچسو روپیہ نواب سرسالار جنگ نے عطا کئے۔ نواب کلب علیخاں خلد آشیاں بھی آپ کی قدر فرماتے تھے۔ عرصہ ہوا کہ اس عالم فانی سے سفر آخرت کیا۔

آپ کا اُردو کلام نعتیہ دستیاب ہوا۔ اس کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

بند اوّل از ترجیع بند

قد رعنا کی ادا جامۂ زیبا کی پھبن | سرمہ گیں آنکھ غضب ناز بھری وہ چتون
وہ عمامے کی سجاوٹ وہ جبین روشن | اور وہ مکھڑے کی تجلّی وہ بیاضِ گردن
وہ عبائے عربی اور وہ نیچا دامن | دلربایانہ وہ رفتار وہ بلیساختہ پن
مُردہ بھی دیکھے تو کر چاک گریبان کفن | اُٹھ چلے قبر سے بیتاب زباں پر یہ سخن
مرحبا سیّد مکّی مدنی العربی | دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

بند مخمسہ بر غزل خسرو

ہے ختم تیری ذات پر اوصافِ امت پروری | اللہ کے محبوب سے کس کو مجالِ ہمسری
پائی ہے کس محبوب نے یہ دلبری یہ سروری | نوازپری چابک تری وز برگِ گل نازک تری

دز ہر چہ گویم بہتری حقّا عجائب دلبری

ہمسر نہیں تیرا کوئی حور و ملک جنّ و بشر | مکھڑے سے تیرے سربسر نورِ خدا ہے جلوہ گر
لیکن چراغِ مہر گر ڈھونڈے فلک بھی دربدر | ہرگز نیابد در نظر صورت زرویت خوبتر

شمسی ندانم یا قمر یا زہرۂ یا مشتری

از قصّۂ حضرت حلیمہ سعدیہ

ایک عاشق تھی حلیمہؓ دائی | جس نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی
وہ کچھ اِس رمز سے آگاہ نہ تھی | اس کی قسمت میں یہ دولت تھی لکھی
یعنی اُس شاہ کو لائی گھر میں | نور اللہ کو لائی گھر میں
واہ کیا طالع بیدار ملے | جس کو کونین کا سردار ملے
نور سے کیوں نہ ہو معمور وہ گھر | جلوہ افزا ہو جہاں پیغمبر
کس طرح گھر نہ ہو وہ نورانی | جس کی جبرئیل کرے دربانی

آستانہ ہُوا وہ شام و سحر — سجدہ گاہِ ملک و جنّ و بشر
در و دیوار سے آتی تھی صدا — کہ حلیمہ پہ ہُوا فضلِ خدا
شکر کرتی تھی خدا کا پیہم — کہ نہ تھے مستحق اس فضل کے ہم
حق نے بخشی مجھے دولت یہ عجیب — مجھ حلیمہؓ کے کہاں تھے یہ نصیب
دُودھ اس گل کو پلاتی تھی وہ — گل سی پھولی نہ سماتی تھی وہ
کبھی مکھڑے کی بلائیں لیتی — صدقے ہو ہو کے دعائیں دیتی
کبھی صورت کا تماشا کرتی — ٹکٹکی باندھ کے دیکھا کرتی
چومتی تھی کبھی پیشانی کو — کبھی اُس چہرۂ نورانی کو
کبھی نہلاتی تھی خوش ہو ہو کر — پانی پیتی تھی قدم دھو دھو کر

اسی قصّہ کا آخری حصّہ

بہر محبوب تھا آنا جانا — واہ کیا خوب تھا آنا جانا
یاں نہ آنا ہے نہ جانا بنتا — نہ تو رہنے کا ٹھکانا بنتا
حرص دنیا کے جو پابند ہیں ہم — دل سنبھلتا نہیں معذور ہیں ہم
ہم کو واں جانے کا مقدور نہیں — وہ اگر چاہیں تو کچھ دور نہیں
کون حال دل ناشاد سُنے — بیکسوں کی وُہی فریاد سُنے
آستانے پہ بلائے ہم کو — اپنا دیدار دکھائے ہم کو

از قصّہ استن حنانہ

واں ملک مائل نظارہ ہُوا — یاں جگر غم سے پارہ پارہ ہُوا
ساری رونق گئی نگار کے ساتھ — رنگ جاتا رہا بہار کے ساتھ

جب وہ جمگھٹ گیا رقیب کے پاس	کون آتا ہے پھر غریب کے پاس
نہ ملی جب سعادتِ پابوس	دل سے بولا کہ صد ہزار افسوس
ہیں نے جس کے لئے وطن چھوڑا	اُس نے صد حیف مجھ سے منہ موڑا
سر پہ آرا چلا تبر کھایا	نخل سے کٹ کے یہ ثمر پایا
گھر بھی چھوٹا دیار بھی چھوٹا	کیا ستم ہے کہ یار بھی چھوٹا
کچھ تو مجھ سے ہوئی ہے ایسی خطا	کہ جدا ہو گیا وہ مہر لقا
کچھ تو ایسا ہوا ہے مجھ سے گناہ	کہ خفا ہو گیا وہ غیرت ماہ
کچھ تو ایسا ہوا ہے مجھ سے قصور	کہ ہوا اس نگار سے مہجور
کچھ تو ایسی ہی ہیں نے کی تقصیر	کہ ہوئی میرے حق میں یوں تعزیر
کیا کروں بے بسی سے ہوں مجبور	کہ زمیں سخت آسماں ہے دور

شہید

شہید:- مولوی فخر الدین حسین خاں۔ وطن شاہجہان پور تھا۔ غدر سے پیشتر شاہجہان آباد میں مسکن اختیار کر لیا تھا۔ فارسی و اُردو میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ مرزا شاہرخ خلف بہادر شاہ کی اُستادی کے وسیلے سے دفتر شاہی کے عہدہ سررشتہ داری پر ممتاز ہوئے۔ خوش اخلاق و مرجع ارباب تھے۔ سنہ ۱۲۸۰ھ میں وفات پائی۔ کلام یہ ہے:-

سینہ ہے آئینہ مرا اس میں ہے تیرا خیال	دل نے تیری شکل کا اک دوسرا پیدا کیا
وہ تپش ہی میرے نامہ میں کہ بس تڑپا کیا	جب نہ کاٹ بال کبوتر سی نہ اس کو وا کیا
مرغ دل چہرہ گلفام کو گلشن سمجھا	حلقۂ کاکل پیچاں کو نشیمن سمجھا
ہوا سینہ میں آتش زن تصور کس کے عارض کا	کہ پھاہا داغ دل کا رشک ہے خورشید تاباں کا

شہید

شہید:- میر و مرزا کے ایک خاندان کا تخلص ہے۔ نام معلوم نہ ہوا۔ کلام سے پختگی ٹپکتی ہے۔ کلام یہ ہے:-

بہار آخر ہوئی جب ہم ہوئے آزاد یا قسمت
گئے برباد اپنے نالہ و فریاد یا قسمت

شہید آخر مقرر تھا ہمیں حسرت میں جی دینا
ہمارے سر پہ آکر پھر گیا جلاّد یا قسمت

شہید:۔ مولوی سید حسن مجتبیٰ لکھنوی۔ حضرت خورشید کے برادر عم زاد و شاگرد تھے۔ شاعر خوش فکر تھے۔ زبان شُستہ ہے۔ ۱۹۲۸ء کے قریب انتقال کیا۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو:۔

جوشِ وحشت میں جو پڑ جائیگی مجنوں کی نگاہ
محمل لیلےٰ کا پردہ دھجّیاں ہو جائے گا

ذکرِ عصیاں پر چھپا لوں گا جو میں سرِ حشر میں
کیا مرا مالک نہ مجھ پر مہرباں ہو جائے گا

غیر سے کہتے رہے جو میرے غم کی داستاں
دیکھئے کس کی زباں پر کس کا افسانہ رہا

اِس طرح سے گذر گئی اے دل شبِ وصال
جس طرح دیکھتے ہیں کوئی چیز خواب میں

بُرائی آگئی جب ان کے جی میں
تو خاک اچھّے رہے ہم عاشقی میں

اثر تیرا کبھی کم ہو نہ اے عشق
رہوں میں ہوش میں یا بیخودی میں

شہید بے نوا کا پوچھنا کیا
پڑا ہوگا وہ دلبر کی گلی میں

وفا کا دھیان جفا میں جو ہو ستمگر کو
ٹھہر ٹھہر کے پھرائے گلے پہ خنجر کو

دل عاشقوں کے اس سے نکلتے نہیں کبھی
کیا پیچ ان کی زلفِ شکن در شکن میں ہے

جل کے بھی صدقہ قدم پر شمع کے پروانہ ہے
اس کو جرأت کہتے ہیں یہ ہمّتِ مردانہ ہے

ساربان نے جب کہا لیلیٰ سے کچھ کہتا ہے قیس
آئی محمل سے صدا بکنے دے یہ دیوانہ ہے

کیں صلح کی باتیں مری بالیں پہ دمِ نزع
پھر ٹال دیا موت کو بہلا کے کسی نے

شہید:۔ سید نور شہید از فرزندانِ سید محمد شاہ جہان آبادی۔ قدرت اللہ شوق کے زمانہ میں حیات تھے۔ افسوس ہے کہ زیادہ حال دریافت نہ ہو سکا۔

آتا ہے مجھ پہ درد کو بے اختیار درد
روتا ہے دیکھ حال مرا زار زار درد

میں نہ مرتا بلبلوں کے آشیاں ہوتے خراب
کچھ بھی ہوتی باغباں سے گر شناسائی مجھے

شہید

شہید: مولوی سید احسن صاحب نقوی۔ رئیس شمس آباد ضلع فرخ آباد ڈی۔ ٹی۔ ایس۔ آفس ٹونڈلہ میں ہیڈ کلرک تھے۔ طبیعت قدرتاً شاعری کیطرف مائل تھی۔ عرصۂ دراز سے کچھ حال معلوم نہیں ہوا۔ دورانِ قیام کانپور میں حضرت ناطق لکھنوی سے تلمذ اختیار کیا۔ شعر میں جذبات غم کا اظہار زیادہ تر ہوتا ہے کلام یہ ہے:-

یہ قید فصلِ گل کاٹے نہیں کٹتی ہے زنداں میں
ہمیں سنتے ہی چمن دیکھ کوئی دیوار گلستاں میں

مست اک آہ تھی کہ نکہت بنتی تری زلفِ پریشاں میں
اِدھر سونگھا اُدھر جاں آگئی بیمارِ ہجراں میں

ذرا اے چلنے والے پاؤں رکھ آہستہ آہستہ
شہیدِ ناز محوِ خواب ہے گورِ غریباں میں

ہو چکی صحت عیادت کے لئے وہ آچکے
دم کوئی دم کا ہے اب مہمان تنِ بیمار میں

تم کو دیکھا جان میں بیمار کے جان آگئی
قطرۂ آبِ بقا ہے شربتِ دیدار میں

چاند سے رخسار کے بوسے لئے ہیں زلف نے
دیکھئے کیا دوستی ہے کافر و دیندار میں

ایک تو ہے ہجر کے صدمے اٹھاتا ہے شہید
ایک بلبل پر لئے پھرتی ہے گل منقار میں

میں تکتا ہوں انہیں حسرت سے وہ آنسو بہاتی ہیں
محبت کا مزہ آیا ہے وقتِ واپسیں مجھکو

تصور میں جو اُس کوچہ کے آنکھیں بند کرتا ہوں
دکھا دیتا ہے دل تصویرِ فردوسِ بریں مجھکو

وہ مشتاقِ شہادت ہوں گلا خود رکھ دوں خنجر پر
مری ہمت پہ قاتل بھی کہے صد آفریں مجھکو

اگر لیجائے قسمت روضۂ شاہِ شہیداں تک
شہید آئے نظر دنیا ہی میں خلدِ بریں مجھکو

ادائے قتل بھی ان کی ادائے دلنشیں ہوتی
چھری چلتی گلے پر لب پہ میرے آفریں ہوتی

میں تکتا ہوں انہیں حسرت سے وہ آنسو بہاتی ہیں
ٹھہر جا موت شوقِ دید کی سیری نہیں ہوتی

وہ یوں محشر میں آتے خود خدا کو اُن پہ پیار آتا
حیا سے سر جھکا ہوتا نگاہِ شرمگیں ہوتی

شہیدِ ناز کی کیا موت تھی وہ خود یہ کہتی ہیں
بہت ہوتی ہیں موتیں موت پر ایسی نہیں ہوتی

کفن میں شرم سے منہ اپنا ہم چھپائے ہوئے
حضورِ حق گئے صورت نئی بنائے ہوئے

ہمارے پاس نہیں کوئی شئے نذر کے قابل
دل و جگر ہیں سو وہ بھی جلے جلائے ہوئے

کرم سے عفو سے خاطر ہو مرنے والونکی — الٰہی آئے ہیں مہماں ترے بلائے ہوئے
کہاں کا دعویٰ خوں۔ حشر میں یہ اور ہے حشر — کھڑے ہیں سامنے میرے وہ سر جھکائے ہوئے
شہید موت مبارک کہ زندگی ہے یہی — وہ تیری قبر کو سینے سے ہیں لگائے ہوئے

شہید

شہید:۔ محمد باقر طہرانی الاصل تھے۔ گجرات میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۸۵ھ میں اورنگ آباد میں قیام تھا۔ صاحب دیوان تھے۔ عہد عتیق کی زبان ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

غنیم نفس کو ہرگز نہ دے دستِ تصرف توں — خدا کیواسطے اے دل شرم رکھ اپنی بستی کا
توں قانونِ عمل کا تار مت توڑ — کمر طاعت سوں خم کر چنگ ہو جا
شہید اس نفسِ کافر کیش کو مار — حقیقت کا مظفر جنگ ہو جا
شہید اوراقِ ہستی جمع کر جیوں بیڑۂ پاں توں — یہ رنگیں بھیس سوں شاید کہ معنی یار کو پہنچے

شہیدی

شہیدی:۔ منشی کرامت علیخاں شہیدی۔ باشندہ موضع ہڑیا پور ضلع اناؤ صوبہ اودھ۔ عروض اور حساب کے علم میں لاجواب تھے۔ ان کے والد ایک ہوشیار اور قابل معلم تھے۔ راجہ ٹکیٹ رائے جو لکھنؤ کے قدیم رؤسا میں نامور تھے۔ فارسی میں حضرت شہیدی کے والد کے شاگرد تھے۔ شہیدی عالم شباب میں لکھنؤ تشریف لیگئے یہ وہ زمانہ تھا کہ شیخ ناسخ کی اُستادی کا عَلَم شہرت بلند ہو رہا تھا۔ آپ نے شیخ صاحب سے ملاقات کرنی چاہی۔ وہ غرور بیجا اور تفاخر سے ایک نوجوان شوخ مزاج شاعر کو دھیان میں نہ لائے۔ اور اپنی زیارت سے محروم رکھا۔ یہ نہایت آزردہ ہوئے۔ شیخ صاحب کے ملازم سے دیوان منگوایا اور اُسی وقت ان کی مشہور غزل پہ غزل کہی اور وہ وہیں چھوڑ کر چلدئے۔ غزل مذکورہ کا مطلع یہ ہے۔ ؎

مرا سینہ ہے مشرق لودوباشِ شیر یزداں کا — فضائے لامکاں سی قرب ہے میری نیستاں کا

شیخ صاحب نے ہرچند تلاش کیا۔ مگر پھر ان کا پتہ نہ چلا۔ صرف اتنی سی بات ہے جس پہ تذکرہ نگاروں نے طرح طرح کے حاشئے چڑھائے ہیں۔ اور شہیدی کو ناسخ کا شاگرد مشہور کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ابتداء میں مصحفی کے شاگرد تھے۔ اور بزمانۂ آمد و رفت دہلی چند غزلوں میں

شاہ نصیر دہلوی سے اصلاح لی تھی شاہ صاحب کی ایک غزل پر ایک مخمس بھی ان کا موجود ہے۔

"سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ فقیرانہ لباس میں کئی بار دہلی آئے مشاعروں میں طبع خدا داد کے جوہر دکھلائے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ایک انگریز کے منشی مقرر ہوئے۔ اس کے ساتھ دہلی میں وارد ہوئے۔ ان کا قیام اکثر پنجاب و گجرات میں رہا ہے۔ کبھی کبھی دلّی میں آجاتے ۱۸۵۰ء میں شیفتہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ان کی نسبت لکھتے ہیں کہ "مرد بے تکلف وارستہ مزاج۔ وسیع المشرب اور آزادانہ زندگی بسر کرنے والا ہے"۔

آغاز شباب میں عشق مجازی کے مرد میدان تھے۔ بقول فرانسیسی تذکرہ نگار رسال دتاسی۔ یہ ایک لڑکے گنگا پرشاد پر عاشق تھے۔ اور ذوقِ محبت میں اس کو خدائی اختیارات دیدئے تھے۔ وہ ان کی نگاہ میں قدرت کے تمام کاموں پر حکمران تھا۔ ہر ایک کتاب پر جو ان کی ملکیت تھی بجائے بسم اللہ اور یا فتاح کے گنگا پرشاد کا نام لکھ دیا کرتے۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ شہیدی نرگس شہلا چشم غزالاں سے صرف عالم خیال میں متاثر نہ ہوئے۔ بلکہ عشق کے حقیقی جذبات اور دلی واردات کو اپنی شاعری میں ظاہر کرتے اور بہ فحوائے ع - جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا۔

سیر گاہ مجاز کے بعد طریقِ فقراء اختیار کر لیا۔ بریلی میں عرصہ تک کمبل پوش بن کر رہے۔ بعض لوگوں کو ان کی کرامت کا بھی عقیدہ ہے ۱۲۵۵ھ میں سفر حجاز طے کرتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے اور ادائے حج کے بعد مدینۂ منورہ کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ چہارم صفر ۱۲۵۶ھ کو ابھی مدینے کے قرب و جوار ہی میں تھے کہ دُور سے گنبد روضۂ مبارک کو دیکھ کر عالم بیتابی میں رحلت فرمائی۔ اپنے بزرگانِ مذہب کی ستائش ہر قوم کی شاعری میں داخل ہے۔ نعت میں عجم و عرب کے شعرا کی طرح شہیدی نے بھی نام پایا ہے۔ اور وہ ہندوستان کے پہلے نعت گو شاعر ہیں جن کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ کلام میں سوز و گداز اور بلا کا اثر ہے۔ ان کے کامل شاعر ہونے

میں کلام نہیں۔ آپ کی شاعری کا زمانہ عہد قدیم سے بہت متصل تھا۔ اس لئے کہیں کہیں پرانے الفاظ نظر آتے ہیں۔ مگر درد اور عاشقانہ مضامین کے تیر و نشتر دل میں چبھ جاتے ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

چمن پیرائے کن فکاں جسکی بزم رنگیں ہیں
بہار آفرینش ایک بوٹا اسکی مسند کا

تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کی جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

شوق وصال سینہ میں آزار بن گیا
میں خواہش طبیب میں بیمار بن گیا

معرکہ میں عاشقی کی فتح اسکے نام ہے
خنجر بیداد سے جو خستہ تن ٹکڑے ہوا

عبث رنج دیتا ہے تو مجھکو ناصح
نہ ہوگا یہ سودا ابھی جب سر نہ ہوگا

دل سی دلدار ہے جب دل نہیں کیسا دلدار
جاں سے جاناں ہے چلی جان تو جاناں کیسا

مینہ کے بدلے مے برستی کوسوں میخانے کی گرد
گر مرا ساقی دعائے ابر رحمت مانگتا

عشق میں ہے بار ناموس دو عالم میرے سر
ضعف سی ملتی تو میں تھوڑی سی مہلت مانگتا

ہو کے رخصت کیا خجل بیٹھا ہوں انکی بزم میں
کاش پہلے اپنے دل سی میں اجازت مانگتا

یہی نماز جماعت ہے رندوں کی زاہد
کہ جھکتے ہیں جھکے جس دم امام شیشہ کا

جس کو سینہ سے نکالا تو نے پیکاں جانکر
دل ہے اے قاتل وہ تیرے عاشق دلگیر کا

ہو چلا خنجر بیداد سے بسمل ٹھنڈا
لے ہوا اب تو کلیجہ ترا قاتل ٹھنڈا

سینہ پر مہندی بھرے ہاتھوں کو رکھکر بولا
لے شہیدی۔ ترا بس اب تو ہوا دل ٹھنڈا

غیر کے کہنے پہ ناداں مجھ سے بدظن ہو گیا
جھوٹ کو بھی کیا اثر ہے دوست دشمن ہو گیا

دل نے رسوا چار سو ہم کو کیا
در بدر اور کو بکو ہم کو کیا

گذر جی سے اگر طالب ہے عمر جاودانی کا
چھپا ہے گور کی ظلمت میں چشمہ زندگانی کا

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

ادب نہ وادی وحشت کی مجھ سی ترک ہوئے
جنوں میں ہوش رہا ہے برہنہ پائی کا

لذت قتل سے آگاہ جو قاتل ہوتا
اپنے خنجر کے تلے آپ ہی بسمل ہوتا

عام ہیں اسکے تو الطاف شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

گر ہمارے میکدے میں ہو گذر
خم کے بدلے توبہ توڑے محتسب

پہلو میں تپش دل کو ہے بسمل کے برابر
بسمل بھی نہ تڑپے گا مرے دل کے برابر

اسقدر ظالم نہیں ہیں قابل آزار ہم
اب ترے دشمن سہی آخر کبھی تھے یار ہم

کہتے ہیں وہ دیکھنا ہم کو بہت اچھا نہیں
اُن سے کہدو آپ بھی آئینہ کم دیکھا کریں

عاشقوں پر اسقدر ظلم و ستم اچھا نہیں
دیکھ اے ظالم کہے دیتے ہیں ہم اچھا نہیں

کی ہے وحشت کے دنوں میں ہم نے اک عالم کی سیر
یار کے کوچہ سے کچھ باغ ارم اچھا نہیں

رحم آتا ہے مجھے اس نوجوانی پر تری
اے شہیدی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

قطعہ

اک روز میں نے پوچھا کہ اے جان بے سبب
آزردہ خاطروں کے ستانے سے فائدہ

بولے کہ ہاں جی ہاں بڑے بیداد گر ہیں ہم
پر ہم سے دل کسی کو لگانے سے فائدہ

دل کے جانے کا شہیدی حادثہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ گر ہم عمر بھر رویا کئے

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے

جی چاہیگا جسکو اُسے چاہا نہ کریں گے
ہم عشق و ہوس کو کبھی یکجا نہ کریں گے

کیوں دل سے نہ مٹ جائیگا اندیشۂ حرماں
جب ہم نے یہ ٹھانی کہ تمنا نہ کریں گے

مشامِ گلبیں میں رشکِ گل سی ہنوز بو بھی گئی ہے
ابھی وہ نام خدا ہی غنچہ نسیم چھو بھی نہیں گئی ہے

بلا کو اسکی خبر ہے کہتے ہیں کسکو معشوق کیا ہے عاشق
ہنوز کان نہیں اس پری کی گفتگو بھی نہیں گئی ہے

شہیدی سے نہیں واقف ہیں ہم اتنا تو واقف ہیں
کوئی راتوں کو یاں کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

شہیر۔ سید محمد نوح رئیس مچھلی شہر خلف میر رعایت علی۔ ان کے والد کو خیر خواہی کے صلہ میں سرکار انگریزی سے تین ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر ملی تھی۔ مگر رئیسانہ شان و شوکت کے برقرار رکھنے میں اس کا بڑا حصہ تلف ہو گیا۔ دولت تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے

وہ کس کی ہو کر رہی ہے۔ مگر علم و ہُنر عمر بھر انسان کا ساتھ دیتے ہیں۔ سید صاحب موصوف ذی استعداد اور باکمال بزرگ تھے۔ فنِ شعر میں سب سے پہلے خواجہ بادشاہ سفیر خلف خواجہ وزیر لکھنوی سے استفادہ کیا اس کے بعد سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی کے شاگرد ہوئے۔ فرخ آباد میں عرصہ تک ان سے مستفید ہوئے۔ کلام میں زور اور طبیعت میں شوخی ہے۔ بندش صاف اور مضامین اعلیٰ ہوتے ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو

بُرا ہوں میں جبھی تک تم مجھے جبتک نہیں ملتے
جو مل جاؤ تو کوئی مجھ سے اچھا ہو نہیں سکتا

بھلا سُنو تو سہی کیا خطا ہوئی مجھ سے
بتائیے تو مجھے کیا قصور میں نے کیا

حُور و کوثر کے بھلاوے میں نہ زاہد آئینگے
تُو نے اے شیخ کہا اور اُنھیں باور آیا

تم اگر ہو تو لطفِ دنیا ہے
جاں ہے تو جہان ہے گویا

شانِ خدا بتوں میں جو تُو دیکھتا نہیں
اے شیخ یہ قصور ہے تیری نگاہ کا

اے بُت خدا سے مانگوں میں کیونکر دعائے وصل
پتھر کے نیچے ہاتھ ہے میرا دبا ہوا

مٹے گا دیدۂ تر سے نصیب کا لکھا
پھر لگا رونے سے پانی میرے مقدر پر

پردہ میں بھی شوخی و شرارت نہیں جاتی
بجلی سی نظر لڑتی ہے چلمن سے نکل کر

ٹھہر جائے دل۔ جانِ مضطر نہ نکلے
کوئی آکے یہ کہہ دے وہ آرہے ہیں

اِدھر دیکھ اے چشمِ مخمورِ ساقی
ترے مست پھر ہوش میں آرہے ہیں

ہو دیکھنا اگر ستمِ روزگار کو
دیکھو قفس میں مجھ کو چمن میں بہار کو

رکھتے نہیں کسی سے کدر ہم اپنا دل
آئینہ میں جگہ نہیں دیتے غبار کو

خرابی جو نہ لکھی ہو مری قسمت میں اب لکھ دو
بڑھا دو اور بھی کچھ تم خطِ تقدیر کے نیچے

میں اس نامہ سے باز آیا میں ایسے خط سے درگذرا
سلامِ غیر بھی ہے یار کی تحریر کے نیچے

اے شیخ اگر شراب حقیقت میں ہے خراب
تو خاص کیوں کیا اسے جنت کے واسطے

سچ ہے مریضِ ہجر و محبت کی جان کیا
کیوں کوئی آئے میری عیادت کے واسطے

بہار میکدہ آئیگی حوض کوثر پر — وہاں بھی رندونکی ٹکڑی الگ جمی ہوگی
وصال حور کی ہے کیوں ہوس تجھے اے شیخ — ارے وہ تجھ سے کہیں عمر میں بڑی ہو گی
عجب انداز ہیں اس خوش ادا کے — کہ شوخی ناز اٹھاتی ہے حیا کے
ہر دم کی بیقراری و فریاد و آہ سے — دل خون ہو کے بہہ گیا آنکھوں کی راہ سے
لب بند ہیں اس چشم فسوں کار کے آگے — عیسیٰ کی بھی چلتی نہیں بیمار کے آگے
گاہک کوئی دل کا ہو تو ہم حال بتائیں — قیمت کہی جاتی ہے خریدار کے آگے
اللہ سلامت رکھے خوبانِ جہاں کو — دنیا میں مزا خلد کا آنا ہے انہیں سے
اُٹھنا درِ جاناں سے تو دشوار ہے یارب — ہاں سہل یہ ہے تو مجھے دنیا سے اُٹھا لے
دُنیا نہ سہی حشر سہی آج نہیں کل — دیکھیں گے کسی دن تو تمھیں دیکھنے والے
مزا جاتا رہا جینے کا تو جینے سے کیا حاصل — خدایا بخشنے جوانی ہی نہیں تو زندگی کیسی

رباعی

کچھ نیک عمل نہ بہر انجام کیا — دُنیا کے مزے اڑائے آرام کیا
کھایا پیا سوئے جاگے اُٹھے بیٹھے — کام اتنے کئے مگر نہ کچھ کام کیا

شہیر۔ حافظ خان محمد خاں المخاطب بہ افتخار الشعرا۔ ان کے والد مولوی غلام محمد خاں تحصیلدار اضلاع متوسط ریاست رامپور کے باشندے تھے لیکن ملازمت کے باعث زیادہ تر بھوپال میں رہے۔ مرزا غالب کے تلامذہ میں تھے۔ فارسی میں اچھا ملکہ تھا۔ نظم و نثر برجستہ لکھتے۔ جملہ اصناف سخن میں اپنے اُستاد کی پیروی کرتے۔ نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے بیٹوں کے اُستاد رہے تھے۔ شعر کے حسن و قبح کو سمجھتے تھے۔ ان کے ارد گرد شاگردوں کا مجمع رہتا۔ فارسی زیادہ کہتے تھے۔ اُردو کلام جو کچھ دستیاب ہوا مندرجہ ذیل ہے:۔ شہیر

میں نامراد ہجر عدو کامگار وصل
وہ کام کر گیا ہے تو وہ نام کر گیا

پوچھو نہ اہلِ عشق کو کیا ہیں کہاں کے ہیں
اچھّے ہیں جس طرح کے ہیں جو ہیں جہاں کے ہیں

غیر تھا بدمستِ مے ہم کامیاب
یار بھی قسمت سے اچھے پڑے ہے

بزمِ جاناں میں جو جاتا ہوں تو فرماتے ہیں
ایک یہ بھی مرے ایّام کی شامت آئی

شہیر

شہیر۔ محمد یعقوب علی خاں خلف محمد جعفر علی خاں باشندۂ ریاست رامپور یہ شعر ان کے ہیں۔

کیوں باغ میں چلتے ہو ادا سے
کیوں ملتے ہو دل کلی کلی کا

حیا سے تم جو چھپتے ہو چھپو آکر مرے دلمیں
کہ اس سے کوئی خلوت خانہ اچھا ہو نہیں سکتا

وہ مجھ سے پوچھتے تیری دل میں آرزو کیا ہے
کہوں کیا مجھ سے اظہار تمنّا ہو نہیں سکتا

شیخ

شیخ۔ شیخ مصطفے حسین قوم شیخ قریشی ولد شیخ مرتضے حسین مرحوم۔ وطن قدیم لکھنؤ۔ عمر تخمیناً ۳۵ سال۔ تعلیم ابتدائی مدرسۂ ناظمیہ چاہ کنکہ لکھنؤ میں پائی۔ جو اب ناظمیہ کالج کے نام سے مشہور ہے۔ بعدہٗ جناب احسن مرزا صاحب شرر لکھنوی مصنّف کتاب "فلسفہ صرف و نحو" سے تعلیم و تربیّت حاصل کی۔ ۲۲ سال تک شہزادی مکرمہ منیر النساء نواب بادشاہ بہو صاحبہ مرحوم کے ہاں ملازم رہے۔ اب بارہ سال سے ایک نرسری کے کارخانہ میں ملازم ہیں۔ ڈیوڑھی چھوٹی شہزادی صاحبہ مرحومہ میں رہتے ہیں۔ شعر گوئی کا ذوق ہے۔ کلام احدیت طرز سے معصوم ہے پھر بھی بعض شعر بہت اچھے کہتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہائے کس ظالم سے یارانہ ہُوا
جو نہ اپنا اور نہ بیگانا ہُوا

نشۂ ہستی سے غافل ہوشیار
عمر کا لبریز پیمانہ ہُوا

ہنس کے فرماتے ہیں مجکو یاد ہیں
قیس جن باتوں پہ دیوانہ ہُوا

تم وہاں بھی یاد آؤگے ہمیں
جب ہمارا خُلد میں جانا ہُوا

کیا بُری ہوتی ہے یہ دل کی لگی
مُفت جل کر خاک پروانہ ہُوا

خود ہُوا بدنام دُنیا میں مجھے رسوا کیا
اے دلِ ناکام کیا سوجھی یہ تو نے کیا کیا

اس نے اتنا بھی نہ پوچھا کیسی ہو کیا حال ہے — ہجر میں جس بیوفا کی مدتوں تڑپا کیے
رنج و غم سے چھُوٹ گیا دل ہو گئے آزاد ہم — قطع الفت آپ نے کردی بہت اچھا کیا
یوں چھلکتے ہوئے چشمے کو اُبلنے نہ دیا — ضبط نے اشک کو رخسار پہ ڈھلنے نہ دیا
بزم ارباب وفا کا ہے زمانہ دشمن — ان ہواؤں نے کسی شمع کو جلنے نہ دیا
ہمیں تھے رات کو بیدار تیری فرقت میں — وگرنہ خواب مسرت میں اک زمانہ تھا

جب کہا میں نے دل کو چھین لیا
ہنسکے کہنے لگے کہاں کیونکر
آتش حسن روز افزوں ہے
دل جلوں کو ملے اماں کیونکر
پھر گئی آنکھ کھنچ گئے ابرو
درد دل اب کروں بیاں کیونکر
جس پہ گذری ہے بس وہی جانے
دل میں لیتے ہیں چٹکیاں کیونکر
ضبط کرنے کے ہم تو عادی ہیں
دل سے اُٹھنے لگا دھواں کیونکر

رُخ پہ بکھری ہی جو زلف پرشکن دونوں طرف — کیا لگا ہے چاند میں اب کی گہن دونوں طرف
دل جگر دونوں پھنکے جاتے ہیں سوز عشق سے — ہو رہی ہے میرے پہلو میں جلن دونوں طرف
آثار نشہ کا اچھا نہیں جوانی میں — ابھی نہ تھیں یہ نگاہیں خمار کے قابل
غبار دشت جنوں اُٹھکے پردہ پوش ہُوا — ہماری لاش ہی کب تھی مزار کے قابل
تمام عمر بسر ہو گئی مگر اے شیخ — ہمیں کوئی نہ ملا اعتبار کے قابل

دفعتًہ برہم طبیعت ہو گئی
زلف چھو لینا قیامت ہو گئی
جس پہ دل آیا وہ نکلا بے وفا
کیا بُری اس دل کی قسمت ہو گئی
یہ کبھی دل کو نہیں آتا یقیں
آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی

ہماری مشکلیں آساں ہوں دل کا مدعا نکلے — دم مشکل الٰہی لب سے یا مشکل کشا نکلے
گلے میں غیر کے انگڑائی لیکر ڈالدیں باہیں — ستمگر ظلم بھی کرتا ہے وہ جس میں ادا نکلے
اثر جب کچھ نہیں ہوتا تو ان نالوں سے کیا حاصل — بس اس سے ضبط بہتر ہے جو آہ نارسا نکلے

ص

صابر

صابر:۔ محمد صدیق صاحب باشندہ کانپور۔ شاگرد اطہر کانپوری۔ انہیں طرز جدید کی ہوا ابھی نہیں لگی۔ خیالات قدیم کو تازہ جامہ پہنا کر محفل ادب میں لا بٹھاتے ہیں:۔

قدم جمائے ہوئے موسم بہار رہا	ہمارے سر پہ جنون مثل جن سوار رہا
بنے ہیں گبر و مسلماں تمہارے پروانے	چراغ دیر و حرم روئے شعلہ بار رہا
اُسی کے سر رہا سہرا ابھی جاں نثاری کا	عروس تیغ ستم سے جو ہم کنار رہا

صابر

صابر:۔ مولوی شیخ محمد اسمٰعیل۔ عمر پچاس سال پیشہ سابق تجارت و حال معلمی ساکن لکھنؤ ڈیوڑھی بادشاہ محل خلف مولوی شیخ محمد عابد علی صاحب پیراک مرحوم۔ کہتے ہیں کہ نانہالی سلسلہ بہادر شاہ ظفرؔ شاہ دہلی تک پہنچتا ہے۔ پیشتر جناب نواب باقر علی خاں صاحب مشتاقؔ لکھنوی سے تلمذ تھا۔ فی الحال حضرت خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرتؔ لکھنوی سے تلمذ ہے۔

کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ رنگ قدیم کے دلدادہ ہیں۔ پرانے مضامین پرانی باتیں دُھراتے ہیں ترکیبیں بھی اکثر قدیم ہیں۔ امید ہے آئندہ کلام کا رنگ بدلے۔ رعایت لفظی کا شوق ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو:۔

یہ کس سے آتی ہے اس کو غیرت نہیں دکھاتا جو اپنی صورت
فلک پہ دنیا سے اس طرف منہ پھرائے ہے آفتاب کیسا

بنا ہوا ہے نزاکت کا وہ حسین پتلا کیا جو زلفوں میں شانہ تو دردِ شانہ ہوا

بر آئی خاک نہ امید قلب محزوں کی
موافق اپنے نہ صابر کبھی زمانہ ہوا

تھم گئے اشک مری چہرہ پہ لائی جو وہ زلف
جھٹ پٹے وقت میں بہتا ہوا دریا ٹھہرا

اے عشقِ خال عارض جاناں ادھر نہ آ
تل بھر جگہ نہیں ہے دل داغدار میں

پھولوں سے خوب قبر ہماری بسی رہی
اُس گُل کی یاد لے جو گئے تھے مزار میں

چلا جاتا ہوں میں دیوانہ بنکر بزم جاناں میں
ملا دیتی ہے مجھ کو بیخودی عشق دلبر سے

صابر

صابر:- صاحب عالم مرزا محمد قادر بخش گورگانی دہلوی ابن مرزا مکرم بخت آپ کی ولادت سنہ ۱۲۲۳ھ میں لال قلعہ میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شمیم اقبال خسروی سے ایک عالم کا دماغ معطر ہو رہا تھا۔ ہر طرف عیش و مسرت نے اپنا سکہ جما رکھا تھا آپ نے بھی آنکھ کھول کر یہی دیکھا کہ راجہ سے پرجا تک سب رنگ رلیاں منا رہے ہیں ایک عرصہ تک یہی منظر پیش نظر رہا۔ یکایک شاہانہ درخت اقبال نے جڑ چھوڑ دی لال قلعہ تباہ و برباد ہو گیا۔ اور تخت شاہی پر ایک نئی بساط بچھی۔ وہ بساط جس کو بابر نے ہندوستان کے تخت پہ بچھایا تھا۔ چشم زدن میں اُلٹ گئی۔ مرزا صاحب کے بڑے صاحبزادے مرزا قیصر بخت کا عقد بنارس میں ہوا تھا۔ مرزا صابر بھی بعد غدر بنارس ہی میں جا رہے مگر وطن کی کشش ایسی نہ تھی کہ ان کو وہاں رہنے دیتی چنانچہ اکثر دہلی آتے رہتے اور اپنے یاران طریقت سے مل جُل کر واپس ہو جاتے قدرت نے ان کو اور خوبیوں کے علاوہ شاعرانہ طبیعت بھی عطا کی تھی۔

جس وقت مرزا صاحب نے شعر کہنا شروع کیا تھا۔ حافظ عبدالرحمن خاں احسان سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا امام بخش صہبائی کی طرف رجوع لائے اور پھر آخر تک انھیں کی اُستادی کا دم بھرتے رہے۔ غالب و ذوق و مومن سے معاصرانہ ربط رہا۔ اور اپنی شرکت سے ان کی محفلوں کو ہمیشہ گرماتے رہے خاندان تیموریہ میں شاید شاہ ظفر کے سوا حضرت صابر کا سا کوئی باکمال شاعر نہیں ہوا

آپ کے کلام میں جو لذّت ہے اس کے مزے سے دل ہی آگاہ ہو سکتا ہے محاورات جس قدر آپ کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ وہ موجودہ زمانے کے فصحا اور شرفاء کی زبان زد ہیں۔ رعایت لفظی کی پابندی اور تشبیہات کی قید سے آپکا شہبازِ خیال آزاد نظر آتا ہے، پاکیزہ تخیئل کے ساتھ زبان کی سلاست اور اندازِ بیان کی دلفریبی جو لطف دیتی ہے اس کا اظہار زبانِ قلم سے کافی نہیں ہو سکتا۔ گلستانِ سخن ایک تذکرۂ شعرا بھی آپ نے لکھا تھا۔ آپ کے تلامذہ میں۔ مرزا عبد الغنی ارشد گورگانی سحر، شاکر، عاقل وغیرہ باکمالوں کا کلام موجود ہے۔ جن کو آپ کے خرمن سخن سے برسوں گلچینیاں کرنے کا فخر حاصل رہا ہے۔

آپ نے ۱۲۹۹ھ میں بمقام بنارس ۷۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ آپ کا دیوان ریاضِ صابر کے نام سے موجود ہے۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

رکھوں زاہد کی زباں اسمیں کہ گویا ہو جائے — آج ساقی نے دہانِ خمِ صہبا کھولا

ترقی میں تنزل واہ رہی تقدیر صد رحمت — بڑھا میں جسقدر رتبہ ہُوا اُتنا ہی کم میرا

تجھی سے خوف ہے اور تیرے ہی ملنے کی خواہش ہے — کہ تُو ہی مدعی بھی اور تُو ہی مُدعا اپنا

مشکل ہے چھپ کے دیکھنا اس رشکِ ماہ کا — رخسار پر نشان ہُوا ہے نگاہ کا

ہے نگاہ آشنا کو ہر جگہ جلوہ سے ربط — دیر بھی کعبہ تھا جب میں ناصیہ فرسا ہُوا

لطف نیش کو کہوں یا درد کی لذت کو ہائے — دلکے ایک ایک داغ پر ہے زخم سو سو نیر کا

عمر بھر چھوٹے نہ ہرگز کشمکش کے دام سے — ہم جسے سمجھے تھے ہستی دام تھا تزویر تھا

خمار آلودہ کیوں رہتی ہے چشمِ نیم خواب انکی — نگہ ہے آنکھ کے ڈوروں میں الجھا نشہ صہبا کا

سامنے رندوں کے اے ساقی جھجکتا کیوں نہیں — کیا خمِ صہبا بھی سر ہے زاہد مغرور کا

زاہد کا علم بے عملی سے ہُوا خراب — کھا جاتا ہے کتاب کو کیڑا کتاب کا

وہ ابتدا دوست ہوں گر آئے تو تیغِ ستم لیکر — جیوں سو بار مرنے کو ترے خنجر سے دم لیکر

ہماری ناتوانی میں توانائی کوئی دیکھے
چلے ہیں منزل دنیا سے سر پہ کوہ غم لیکر

گر یہی کثرت اعدا ہے تو گھبرا کے کبھی
اپنے در پر تمھیں بیٹھو گے نگہبان ہوکر

شاید نظر چڑھے یہ کسی خود پسند کی
رکھدینگے دل کو آئینہ گر کی دکان پر

قطعہ

بات مطلب کی جو لکھتا ہوں کبھی
تو وہ ہنس کر یہ کہا کرتے ہیں

دے چکا ہے اونھیں اللہ جواب
بے حیائی سے جیا کرتے ہیں

حقدار نہ تھا نقد شہادت کا کوئی اور
ایسا نہ ہوا اس میں بھی گلا میرا کٹا ہو

صائب گیا تھا کعبہ کو اب تک پھرا نہیں
رستے میں ملگیا کہیں پیر مغاں نہ ہو

اک چھیڑ چلی جائے محبت ہو کہ رنجش
کچھ اس سے نہیں چاہتے ہم اور زیادہ

کہتا ہوں اضطراب میں اک اک سے حال دل
رسوا کرے گی خلق میں میری زباں مجھے

ہے ہجوم نگہ شوق ترے رخ پہ نقاب
بے حجابی میں بھی اب تک ہے یہ پردا باقی

قطعہ

رات بھر جاگنے سے نیند کا آنکھوں میں خمار
اور کچھ کچھ اثر نشۂ صہبا باقی

بھینی بھینی سی وہ خوشبو وہ پریشاں ترکیب
لب پہ بدرنگ سا کچھ پان کا لاکھا باقی

آنکھوں کے ڈورے نہیں کم کم سی وہ سرخی کی نمود
تھوڑا تھوڑا سا اک انداز سے سرمہ باقی

اب نہ وہ شب کا مزہ ہے نہ وہ صبح کا لطف
رہگیا ہے کف افسوس کا ملنا باقی

اندھیری رات میں بھی روشنی نکلتی ہے
یہ جانتے ہیں کہ لاکھوں میں دل جلے ہوئے

زاہد تجھے کرامت رنداں دکھاؤں چل
کہتے ہیں ان کی بزم میں چلتی شراب ہے

[illegible] گلا ہے کی ملاقات تھی یہ بھی نہ سہی
اور کیا اس کے سوا بات تھی یہ بھی نہ سہی

صابر

صابر:۔ نصیر الدین خاں ابن غلام حسین خاں جیلانی۔ علم ادب میں بڑے فنی کمال تھے۔ چوّن برس کی عمر ۱۲۶۶؁ھ میں رامپور میں انتقال کیا۔ ان کی اولاد میں کوئی علمی مذاق نہ تھا۔ اسلئے کلام تلف ہوگیا۔ اردو کا صرف ایک شعر تذکرہ انتخاب یادگار میں ملا وہ نذر ناظرین ہے:۔

آنا تو بصد منّت آنا اسے کہتے ہیں	جانا ہے تو دل لیکر جانا اسی کہتے ہیں

صابر

صابر:۔ مولوی محمد یوسف حسین۔ شاگرد مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی۔ فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ یہ کلام کا نمونہ ہے:۔

جوہر شمشیر قاتل ہنس کے یوں گویا ہُوا	گر نہ زخم دل ترا۔ اچھا ہُوا۔ اچھا ہُوا
بے حاصلی ہے میری ترقی پہ روز و شب	یہ پھل ملا ہے مجکو نیاز قدیم کا
ہم کو شب فراق ہے مثل شب وصال	ہے داد سے سوا کہیں بیداد کا مزا
اُٹھ اُٹھ کے تیری در پہ جو گرتے ہیں بار بار	جا کر انھیں سے پوچھ اس افتاد کا مزا

صابر

صابر:۔ ماسٹر ست دیو راٹھور۔ خلف مسٹر سی۔ ڈی راٹھور۔ ۱۹۰۳؁ئہ میں بمقام لدھیانہ پیدا ہوئے۔ اُردو میں پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم اور انگریزی میں بی۔اے پاس کیا ہے۔ شاعری میں منشی پیارے لال صاحب آنند تلمیذ جناب درگا سہائے سرور سے تلمذ ہے۔ جناب صابر کا کلام اکثر رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ہر سال بسنت کے موقعہ پر ایک بزم مشاعرہ منعقد کرتے ہیں۔ آٹھ نو سال سے ہائی سکول لکھنؤ میں معلّم ہیں۔ نہایت خلیق اور ملنسار ہیں۔ جو تین چار غزلیں روانہ کی ہیں۔ ان کا انتخاب یہ ہے:۔

دردِ دل۔ داغِ جگر۔ سوز دروں۔ رنج و الم	ایک دل دیکر ہمیں کیا کیا ہی حاصل ہوگیا
کشتی امید طوفاں میں خدا پر چھوڑ دی	کیا ہُوا گم اپنی نظروں سے جو ساحل ہوگیا
نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں صابر جنکو مدت سے	چھپے بیٹھے ہیں دلمیں میری آنکھوں سے نہاں ہوکر

ہو دل کا راز فاش یہ مدِ نظر نہیں
ہیں خون رو رہا ہوں مگر آنکھ تر نہیں

درگاہ بے نیاز میں سجدہ کناں ہوں میں
صابر جھکیگا اور کے آگے یہ سر نہیں

مصیبت میں نہ دیگا ساتھ کوئی
عبث امید ہے اہل جہاں سے

بہت رو رو کے برسوں کیں دعائیں
نہ نکلا کام کچھ آہ و فغاں سے

بلائیں بن کے آئی ہیں مجھی پر
دعائیں میری واپس آسماں سے

نہ کوئی بات بنتی ہے نہ کوئی کام ہوتا ہے
تمناؤں کا اپنی خون صبح و شام ہوتا ہے

ستائش سی غرض کیا ہو وطن پر مرنیوالونکو
فدایانِ وطن کا موت ہی انعام ہوتا ہے

خدا جانے قفس سی اسقدر دلبستگی کیوں ہے
کہ مرغِ خوشنوا از خود اسیر دام ہوتا ہے

مری قسمت میں ناکامی ہی روزِ آفرینش سے
مرے آغاز سے ظاہر مرا انجام ہوتا ہے

مجھے شوقِ شہادت کھینچ کر لایا ہی مقتل میں
شہیدانِ وطن میں دیکھئے کب نام ہوتا ہے

بہارِ حسنِ بُتِ گلعذار دیکھیں گے
کمالِ صنعتِ پروردگار دیکھیں گے

قفس سے اپنی رہائی تو غیر ممکن ہے
"وہ بہار دیکھنے والے بہار دیکھیں گے"

کرینگے تھام کے دل ہم کچھ اسطرح نالے
نظر اُٹھا کے وہ بے اختیار دیکھیں گے

صابر

صابر:- لالہ بھولا ناتھ صاحب کنجاہ ضلع گجرات کے باشندہ تھے۔ فن شعر میں جناب قدوسی سے تلمذ تھا۔

چمکا ہے داغ ہو کے نہ چھوٹیگا حشر تک
لایا ہے رنگ خونِ شہیداں نئے نئے

سرکاٹ کر کیا ہے سبک دوش یار نے
کرتا ہے مجھ غریب پہ احسان نئے نئے

محتاج وحشت اپنی نہیں ہے بہار کی
ہوتے ہیں روز چاک گریبان نئے نئے

صابر

صابر:- مسٹر علی احمد باشندہ رہتک۔ علی گڈھ کے گریجویٹ ہیں۔ سادگی اور صفائی زبان پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ اضلاع ورنگل میں مددگار مہتمم بندوبست بھی رہے ہیں۔ کلام یہ ہے:-

دسترس پائی ہے تصویر پہ تیری اس نے | آئینہ گویا نصیبے کا سکندر نکلا
غیبت غیر سے عشق اپنا ہوا اس پہ عیاں | راہزن جس کو سمجھتے تھے وہ رہبر نکلا

خدایا جب مری قسمت میں بیدردوں کی الفت تھی
تو پھر پہلو میں میرے یہ دل درد آشنا کیوں ہے
نقاب الٹو ادھر دیکھو ہمیں بھی پیار کرنے دو
نہیں جب غیر سے پردہ تو پھر مجھ سے حیا کیوں ہے
لگاوٹ ہے نہ چاہت ہے نہ وہ لطف و عنایت ہے
خدا جانے خفا ہم سے بتِ نا آشنا کیوں ہے
نہ چھوٹے ساغرِ مے ہاتھ سے جب روز و شب صابرؔ
تو پھر لوگوں کے بہکانے کو بنتا پارسا کیوں ہے

صابرؔ۔ پنڈت شمبھو ناتھ صاحب سپرو خلف رائے پنڈت اجودھیا پرشاد صاحب اسسٹنٹ کمشنر صوبۂ اودھ۔ آپ نظم کم کہتے تھے۔ اور جو کچھ کہا وہ ضایع ہو گیا۔ نثر کی تصانیف تزک جرمنی اور سراب حیات وغیرہ ہیں۔ اکثر انگریزی ناول آپ کے ترجمہ کئے ہوئے ہیں۔ آپ نے اردو میں رامائن لکھنی شروع کی تھی۔ مگر پایۂ تکمیل کو نہ پہنچی۔ جو کچھ ہے اکثر جگہ نظر ثانی کی محتاج ہے۔

جناب صابرؔ مدت تک اضلاع اودھ میں منصرم رہے اور اسی عہدے سے آپ نے پنشن حاصل کی۔ پنڈت تربھون ناتھ صاحب ہجرؔ آپ ہی کے فرزند تھے۔

اب جناب صابرؔ کی رامائن سے کچھ اشعار انتخاب کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں

تقریر سیتا کے چند اشعار

یہ کہتے کیا ہو یہ تقدیر کیا ہے | تمہارے خواب کی تعبیر کیا ہے

نہیں کھلتا ہمیں یہ نالہ زار
تمہارے راز کی تفسیر کیا ہے

کوئی پوچھے جو ہم سے اپنی تدبیر
بتائیں ہم اسے تدبیر کیا ہے

جو ہیں تقدیر پر شاکر وہی لوگ
سمجھتے خوب ہیں تقدیر کیا ہے

رام چندر جی کا سیتا کو خطراتِ صحرا سے آگاہ کرنا

سن اے سیتا سن اب تو میری پیاری
کہ آئی ہے مرے کہنے کی باری

یہ تیری آرزو اور یہ تمنا
کہ تو مسکن کرے صحرا کو اپنا

یہ بے سود اور نادانی کی تجویز
یہ نافہمی کی کم سمجھی کی تجویز

ہراس و یاس ہے سامانِ صحرا
مصیبت کا ہے گھر دامانِ صحرا

غم و اندوہ سے صحرا بھرا ہے
نہیں صحرا ترے رہنے کی جا ہے

کہاں تو اور کہاں وہ دشت ادبار
کہاں تو اور کہاں دامانِ کہسار

صابر

صابر:- مولوی محمد ایوب صاحب مرحوم خلف مولوی علی محمد وکیل ساکن امروہہ ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ تمام عمر شادی نہیں کی۔ فارسی عربی۔ اُردو اور انگریزی میں اچھی قابلیت تھی۔ مراد آباد میں اہلمد اسلحہ کلکٹری کی خدمت پر مامور تھے شاعری کا شوق لڑکپن سے تھا۔ قاضی عبدالحیٔ متخلص بہ چین سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ جو حضرت داغ مرحوم کے شاگرد تھے۔ اچھے مضمون نگار تھے۔ باوجود مشاغل سرکاری مراد آباد کے لوکل اخبارات کو قلمی امداد دیتے تھے۔ مولوی محمد داؤد ان کے بھائی بھی شاعر تھے اُن کا ذکر جلد سوم میں ہے طبیعت رنگِ تغزل کی باریکیوں سے واقف تھی۔ انداز بیان دلکش ہے صاف اور سیدھے سادے شعر میں بھی بانکپن کی شان نکلتی ہے۔ معاملہ نگاری میں حضرت نظام رامپوری کے پیرو تھے۔ علم دوست اور یار باش آدمی تھے۔ مراد آباد میں سنبھلی دروازہ کی سرائے کے قریب رہتے تھے۔ ان کی قیام گاہ میں شام سے رات کے ۱۲ بجے تک شعراء اور دوستوں کا مجمع رہتا تھا

۱۸۹۸ء میں انتقال کیا۔ ایک دوست نے جو کلام روانہ کیا تھا۔ اس کا انتخاب یہ ہے :۔

ایک دل کمبخت کے جانے سے کیا جاتا رہا
بیٹھنے اُٹھنے کا ہنسنے کا مزا جاتا رہا

مٹ گئیں ساری امیدیں حوصلہ جاتا رہا
دل گیا کیا درد اُلفت کا مزا جاتا رہا

حضرت صابرؔ اٹھو ملکِ عدم کی راہ لو
آج کل دُنیا میں رہنے کا مزا جاتا رہا

ادائیں تو ادائیں ہیں بھلا اُن کا تو کیا کہنا
تڑپ جاتا ہے جی ظالم ترے بیساختہ پن پر

تمہاری تیغ نے چوما گلا جس دم تو حسرت سے
ہر اک عضو بدن کو رشک آیا میری گردن پر

ہجوم یاس حسرت اور غم و اندوہ و حرماں سے
لگا رہتا ہے میلہ سا ترے کشتہ کے مدفن پر

چھریرا سا بدن اٹھتی جوانی چمپئی رنگت
بہار حسن ہے جوبن پھٹا پڑتا ہے جوبن پر

ہم بھی چھپائیں گے نہ کسی سے تمہارا حال
تم نے ہماری باتیں رقیبوں سے گر کہیں

شکوہ جور پہ وہ کہتے ہیں
دل کہیں اور لگالے کوئی

پریشاں حال نیند آنکھوں میں اور اُترا ہوا چہرہ
عجب وضع سے گیا کوئی مرے گھر سے سحر ہوتے

پوچھتے ہیں وہ مری چارہ گروں سے پس مرگ
ان کو کیا ہو گیا ایسے تو یہ بیمار نہ تھے

وہ اتنا روئے کہ آنکھوں کو لال کر بیٹھے
عدو کے سوگ میں غیر اپنا حال کر بیٹھے

کسی کا مجھ سے وہ انجان بن کے کہنا ہائے
یہ کیا ہوا تمہیں کیا اپنا حال کر بیٹھے

کلیجہ تھام کے اُٹھے کسی کی محفل سے
کسی کی بزم میں ہم دل سنبھال کر بیٹھے

کوئی خطا کوئی تقصیر کوئی بات بھی ہو
وہ مفت بیٹھے بٹھائے ملال کر بیٹھے

وہ ان کا مجھ سے دم واپسیں یہ کہنا ہائے
ابھی سے قطع امید وصال کر بیٹھے

کسی کی یاد کسی کا خیال ہے دل میں
کسی کا تیر نظر دیکھ بھال کر بیٹھے

صابری

صابریؔ :۔ شاہ محمد ارشاد حسین صاحب ابن حضرت شاہ محمد قطب الدین صاحب۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت علی شیرِ خدا کرم اللہ وجہ تک پہنچتا ہے۔ آپکے جدّ امجد

عرب سے گنگوہ تشریف لائے۔ اور اپنے پیر دستگیر حضرت شیخ محبوب الٰہی صاحب گنگوہیؒ کی اجازت سے امبیٹھہ پیرزادگاں ضلع سہارنپور میں قیام پذیر ہوئے۔

جناب صابری کی ولادت ۱۷ جولائی ۱۸۹۶ء کو ہوئی۔ مذہبی تعلیم ختم کرنے کے بعد اُردو۔ فارسی کی تکمیل حضرت مولانا مولوی صدیق احمد صاحب انصاری سے کی۔ اس کے بعد دہلی میں انگریزی شروع کی۔ ابھی انٹرنس بھی پاس نہ کیا تھا کہ اپنے اخی معظّم شاہ انعام حسین صاحب مرحوم اسسٹنٹ انجینیر کے فرمانے سے امبیٹھہ انجینیرنگ سکول کی اورسیر کلاس میں داخل ہو کر کامیاب ہوئے اور اورسیر کے عہدہ پر مقرر ہو کر پنجاب۔ بمبئی۔ سندھ۔ اور ایران وغیرہ میں رہے۔

شاعری کا مادّہ آپ کی طبیعت میں فطرتاً موجود تھا۔ لیکن ۱۹۲۴ء سے آپ کی شاعری کی ترقی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ احباب بمبئی کی صحبت شاعرانہ سے متاثر ہو کر ذوق شعر و سخن میں ایک خاص جذبہ پیدا ہوا۔ بمبئی کے متعدد مشاعروں میں شرکت کر کے آپ نے کافی شہرت حاصل کی۔

۱۹۳۵ء میں جناب غریب سہارنپوری سے تلمّذ حاصل کیا۔ ان کے انتقال کے بعد اس خیال سے کہ اُستاد سے ہر حالت میں اُستفادہ حاصل کرنا چاہئے۔ جناب افسرؔ صدیقی امروہی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔

آپ کو امیرؔ و غالبؔ کے کلام سے عشق ہے۔ کلام میں بیشتر انہیں حضرات کی تقلید کرتے ہیں آپ کا قول ہے کہ جب تک شاعر فنا فی الشعر نہ ہو جائے شعر گوئی بیکار ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

فنا فی الشعر ہو جاتا ہوں ہمدم مجھے دُنیائے دوں کی کیا خبر ہو

آپ ہندو مسلم مذاہب سے کنارہ کش ہو کر فرمایا کرتے ہیں کہ میرا مذہب اخلاق ہے۔ جو اس مذہب سے نہیں وہ انسان نہیں۔ آپ خوش خلق منکسر المزاج دور اندیش

اور ہنر شناس ہونے کے علاوہ نہایت متواضع واقع ہوئے ہیں۔ آپکی خوش کلامی اور شیریں بیانی ہر شخص کو ایک ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ کر لیتی ہے۔ تخیل شاعری عام طرز تغزل سے بہت اعلےٰ ہے۔ کہیں کہیں غالبیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اسلوب چست اور زبان فصیح ہے۔ باوجود تخیلی صنّاعی کے تغزّل کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہ اوصاف عہد حاضر کے شعرا میں کم پائے جاتے ہیں۔

ضمیمہ رحمت مطبوعہ۔ فروغ بیان۔ زیر طبع خیالات زریں غیر مطبوعہ آپ کی تصنیفات ہیں۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

جلوہ ریز ناز ہے نقشہ ہر اک تصویر کا
دہر کیا ہے اک مرقع حسنِ عالمگیر کا

زندہ باد اے سازشِ روح و عناصر زندہ باد
خندہ زن ہر ایک رخنہ ہے مری تعمیر کا

میرے جذبِ شوق نے کھینچی وہ تصویرِ بہار
خانۂ صیّاد کو رشکِ گلستاں کر دیا

پردہ داری دیکھئے حسنِ حجاب آلود کی
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہو گیا

تم تسلّی مجھے دیتے تو تسلّی ہوتی
تم پریشاں مجھے کرتے تو پریشاں ہوتا

تماشا ہوں میں عالم کی نظر ہائے پریشاں کا
کہ نقشہ ہوں کسی کے جلوہ ہائے حسنِ پنہاں کا

افق پر کیوں گماں کرتی ہے وحشت چاک داماں کا
شفق بھی ایک ٹکڑا ہے مری رنگیں گریباں کا

میں وہ حسرت کشِ نظارۂ عالم ہوں دنیا میں
جہاں چاہوں میں نقشہ کھینچ دوں صحنِ گلستاں کا

گناہوں پر مری کیوں جوش آئے تیری رحمت کو
یہ خود پلہ پکڑ لینگے ترے داماں رحمت کا

قفس میں تو نے جو صیّاد دیکھا
وہ اک نقشہ ہے مری بے لسی کا

نہ دے تکلیف اظہارِ حقیقت اے دلِ ناداں
میں جس کا راز ہوں وہ آپ ہی ہے رازداں اپنا

جذبۂ کامل سے قائم تھا نظامِ کائنات
اس کا مٹنا تھا کہ کل عالم ہی مٹ کر رہ گیا

دم کے دم میں کر دیا دنیائے دل کا خاتمہ
آفریں صد آفریں اے جنبشِ ابروئے دوست

میرے دلِ خموش نے آخر وہی کیا
جو چاہتے تھے تم ستمِ ناروا کے بعد

اس درجہ کر دیا ہے سبک عرضِ حال نے
اپنی نگہ سے آپ گرے التجا کے بعد

کیا سنائیں تم سے بیدردو نکو اپنا حالِ غم
درد والے ہی سنیں گے داستانِ اہلِ دل

شوق بن بن ہیں دیدہ و دل بیقرار
ہو گئی محفل کی محفل بے قرار

فرصتِ نظارۂ عالم کہاں
اپنے جلووں میں ہے بسمل بیقرار

کیا سکونِ کشتیِ عالم رہے
موج مضطر اور ساحل بیقرار

موج ہوا جو لے چلی کوچۂ یار کیطرف
رشک ہوا بہت مجھے اپنا غبار دیکھکر

لذتِ سوزِ خلش ہے سازِ لطفِ زندگی
کیف آور ہوں نہ کیونکر نغمہ ہائے دردِ دل

اور بلند ہو گئے عالمِ لامکاں سے ہم
اُٹھے تو اسطرح اُٹھے آپکے آستاں سے ہم

سعی لاحاصل بھی قسمت سے مجھے حاصل نہیں
وائے بدبختی کہ علمِ دوریِ منزل نہیں

ہوشیار بیخودی کو عقل دیتی ہے سبق
واقفِ معنی نہیں اپنے سے جو غافل نہیں

کیا کائناتِ حسن میں تو جلوہ گر نہیں
حاصل ابھی کمالِ مذاقِ نظر نہیں

احساسِ غم بھی وقفِ خلش ہو کے رہ گیا
مجھ کو کچھ اب اذیتِ زخمِ جگر نہیں

یادِ وطن کو ساتھ لئے جا رہا ہوں میں
اس کے سوا کوئی بھی مرا ہمسفر نہیں

نہ وہ ولولہ۔ نہ وہ کیفیت۔ نہ مزا ہے سوز و گداز میں
نہ خلش ہے شوقِ نیاز میں۔ نہ کشش ہے حسنِ مجاز میں
میں سناؤں نغمۂ زندگی کبھی سوز میں کبھی ساز میں
میں کمالِ ضبط کو ڈھونڈتا ہوں کسی کے قلب گداز میں

نہ جانے کس کی خاکِ راہ کا پُرنور ذرہ ہوں
کہ خورشیدِ فلک ہو کر زمانہ میں چمکتا ہوں

کرشمائے نگاہِ حسنِ فطرت سے یہ پوچھونگا
وہ کیا رازِ حقیقت ہے کہ جس کا میں معمّا ہوں

مجھے اسدرجہ بیخود کر دیا ہے نا امیدی نے
ہجومِ حشر میں اپنے کو میں تنہا سمجھتا ہوں

مٹا کر غمِ تمنا ہائے رنگیں کی اذیت کو
بہاریں بنکے آبیٹھو فضائے داغِ ہجراں میں

ہر اک ذرہ ہے تصویر بہار گلشن امکاں
گلستاں ہی گلستاں دیکھتا ہوں میں بیاباں میں

جور بیجا کا تسلسل خود دلیل شکوہ ہے
مُہر خاموشی ہیں بھی میں مظہر فریاد ہوں

ہے مری نشو نما وابستۂ ملک عدم
منزل دنیا میں اک راہ عدم آباد ہوں

الگ بیچل مجھے ای الفت وحدت کی نیرنگی
نہ محفل میرے قابل ہے نہ میں محفل کے قابل ہوں

خزاں بردوش ہے گر جس نے کاٹی زندگی اپنی
وہی ای ہمصفیرو میں بہار گلشن دل ہوں

ٹھہر جاتے ہیں مجھکو دیکھ کر صحرائے الفت میں
ہیں اہل کارواں کیواسطے اک حد منزل ہوں

سامنے وہ تھے نہ ان کی چاندنی تصویر تھی
سب مرے حسن نگاہ شوق کی تاثیر تھی

کس طرح تکمیل پاتا خود نمائی کا مذاق
اپنے جلووں میں نہاں خود آپکی تصویر تھی

جلوے فریب نہیں ترے حسن ناز کے
کچھ دور اور چاہیئے حد نظر مجھے

میں تھا، ترا جمال تھا، اور حسن التفات
بیگانگی ہوش میں تھی یہ خبر مجھے

منت کش نگاہ ہے ہر پردۂ جمال
کیونکر نہ ہو عزیز یہ تار نظر مجھے

دھندلے نقوش زیست ہیں اتنی شب فراق
ہر ایک کہہ رہا ہے چراغ سحر مجھے

کس درجہ محترم ہیں مرے جرم ناروا
ڈھانکے ہوئے ہے رحمت پروردگار بھی

ہو چکی پردہ دری اب پردہ داری کیجئے
عشق رسوا ہو تو اس کا حسن پر الزام ہے

میری ہستی سے ہے ظاہر ہستی دنیائے دوں
میں نہ ہوں دنیا میں تو کس شئی کا دنیا نام ہے

اچھا دیا سکون دل مبتلا مجھے
اے برق حسن اور بھی تڑپا دیا مجھے

دلبری کیسا تھا دلداری بھی لازم ہے تجھے
اے فریب حسن دنیا بدگماں ہونے کو ہے

نظر شاید مری حسن آفریں معلوم ہوتی ہے
سماتی ہے یہ جس شئی میں حسیں معلوم ہوتی

ہم ہیں جہاں جمال بھی ہے اور جلال بھی
پہنچا سکا نہ کوئی وہاں تک خیال بھی

خود نمائی کے لئے انجمن آرائی ہے
کیا تماشا ہے کہ اک خلق تماشائی ہے

وہ ترا حسن کرم ہو کہ مرا حسن نظر
ذرے ذرے میں تری شان نظر آئی ہے

میں سجدے کرتے کرتے جا ہی پہنچونگا سرِ منزل
ترا نقشِ قدم منزل بمنزل میرا رہبر ہے

کون ساجد کس کا سجدہ کسکو ہے شوقِ سجود
اپنے جلووں میں نہاں ہے آستاں تیری لئے

دل میں تو جلوہ فگن آنکھوں میں تو جلوہ نما
وقف ہیں دونوں کی دونوں آستاں تیری لئے

وہ عیش کیا کہ نہو جس میں تلخی کلفت
بہار ہو کے ترستا ہوں میں خزاں کے لئے

وہ دل ہی کیا کہ نہوں جسمیں شور شیں نہاں
وہ آنکھ کیا جو نہو جلوۂ نہاں کے لئے

تمنّائیں تیرے دیدار کی ایسی بڑھیں آخر
نکل آئیں نگاہِ شوق بنکر چشم حیراں سے

پردہ داری کیا اسی کا نام ہے اے حسنِ دوست
ذرہ ذرہ مدعیٔ جلوہ گاہِ ناز ہے

دیکھتے ہیں جب نگاہِ شوق سے اُڑتا ہے رنگ
حسن کو نظارۂ عاشق پر پرواز ہے

کیا تعجب ہے اگر بلبل قفس کو لے اُڑے
حسرتِ سیر گلستاں بھی پر پرواز ہے

کچھ بادیہ پیما کی حسرت تو ہوئی پوری
جس سمت نظر کیجے صحرا نظر آتا ہے

گم گشتۂ منزل ہوں للہ خبر لینا
دل شام غریبی میں کھویا نظر آتا ہے

کر دیا ختم آج ہی قصّہ
حشر کا انتظار کون کرے

آپ کیا جانیں وفا میں خوبیاں ہیں کسقدر
آپ کیا جانیں محبت کا مزا کیا چیز ہے

نظارہ جمال سے حیرت کدہ ہے خلق
کس کس کے حسنِ دید کو دیکھا کرے کوئی

کیوں نہیں ہوتے ہیں جلوے برق پاشِ حسنِ ناز
حسن پردہ پوش ہے یا آنکھ پردہ پوش ہے

مری فکر رسا کا ہے تعلق میری ہستی سے
کوئی سمجھے نہ سمجھے مجھ کو اس سے واسطہ کیا ہے

صاحب: منشی صاحب رائے مورّخ کایستھ سریواستو متوطن لکھنؤ۔ نواب آصف الدّولہ بہادر کے عہد کے شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ تھا۔ صاحب عہدۂ جلیلہ تھے۔ طبع متین اور فکر سنجیدہ رکھتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہے ہیں۔ صاحب

ایک دن نواب آصف الدّولہ بہادر عیش باغ کے پھاٹک سے جا رہے تھے۔

دیکھا پھاٹک پر جو مٹی کا شیر ہے۔ اس کے مُنہ میں طوطے نے گھونسلا بنایا ہے۔ نواب صاحب نے صاحب رائے کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے عرض کیا:۔

قربان شہ کے صدقے کیا عدل کا نشاں ہے	جو شیر کے دہن میں طوطے کا آشیاں ہے

تذکرہ شوق سے دو اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

کرچکا مجھ کو نہایت عشق کا آزار زار	سانس بھی لینا ہوا ہے اب مجھے ہر بار بار
عشق وہ شے ہے کہ رسوائی سی کرتا ہے فنا	آہ پاوے اس طرح منصور سا سر دار دار

صاحب صاحب:۔ نواب سید شبیر زمان خاں دہلوی نبیرۂ حافظ عبدالرحمٰن احسان تلمیذ غالب ۷۲ برس کی عمر پاکر ۱۳۱۲ھ میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ شیریں مقال اور روشن خیال شاعر تھے۔

کس کس کو میں بتاؤں کہ بارِ غم فراق	دل پر نہیں۔ جگر پہ نہیں جاں پر نہیں
ذرا آنکھوں نہیں رکھتا اسکو صاحب	کہیں یہ طفل اشک ابتر نہ ہووے
عقدہ جو تیرے جعد کا رشکِ قمر کھلے	عشاق کے دلوں کی گرہ سر بسر کھلے
جان ان کی آسمان کو پرواز کرگئی	لیکن کبھی نہ تیری اسیروں کے پر کھلے

صاحب صاحب:۔ جناب مولوی صاحب عالم۔ سجادہ نشین مارہرہ۔ ضلع ایٹہ۔ شاگرد میرزا قتیل۔ غالب کے دلی دوست تھے۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ فارسی کا ایک دیوان بھی ان سے یادگار ہے۔ اُردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

جب سے پہلو میں ہمارے وہ پریزاد نہیں	دل دیوانہ کسی طرح کبھی شاد نہیں
ضعف سے حال یہ پہنچا ہے اسیروں کا ترے	قوت نالہ نہیں طاقت فریاد نہیں
میر کی طرح دل اپنا بھی ہوا گم صاحب	کسکو دے آئے کہاں بھول گئے یاد نہیں

صاحب صاحب:۔ جارج فانتوم خلف کپتان برنارڈ فانتوم۔ تذکرۂ انتخاب یادگار مؤلفہ سنہ ۱۲۹۰ھ میں جناب امیر احمد صاحب مینائی نے عمر ۲۵ سال لکھی۔ فارسی۔ عربی

اور عروض کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ اصل میں فرانسیسی تھے۔ مگر سرکار رامپور سے آبائی توسل تھا۔ غالبًا اسی وجہ سے علوم مشرقیہ سے شوق رکھتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ یہ اُن کا کلام ہے۔

تم کو ہے پاس غیر کا صاحب — تو ہمارا بھی ہے خدا صاحب
میرے آنے سے گر ہوئے ناخوش — تو یہ لو میں ابھی چلا صاحب
رُو نمائی میں نذر کیا کیجے — دل تو گیسو نے لے لیا صاحب
ایسی کیا مجھ سے ہو گئی تقصیر — اس قدر کیوں ہو بدمزا صاحب
ملنا ہر ایک سے نہیں اچھا — اس کو کہتے ہیں سب بُرا صاحب
چال ایسی چلو تو بہتر ہے — کہ کہیں تم کو سب بھلا صاحب
صدقہ اس عقل اور فراست کے — کیوں نہ تم پر میں ہوں فدا صاحب
آشناؤں کو اپنے سمجھو غیر — اور غیروں کو آشنا صاحب

مہ کیا ہے مہر تجھ سے مقابل کبھو نہو — حیرت سے آئینہ بھی تیرے روبرو نہو
اُس غنچہ لب سے گل نہو روکش مجھے ہے ڈر — صد برگ کی طرح تو کہیں زرد رو نہ ہو
ناصح نے آکے میرا گریباں سیا تو کیا — جز تار زلف چاک جگر کا رفو نہ ہو
جس کے نہ دل پہ داغ محبت ہو لالہ سال — عشاق گلعذار میں وہ سرخ رو نہو
پروانہ دیکھ پائے اگر تجھ کو شمع رو — تو شمع انجمن کی اُسے آرزو نہو
پھولوں کی سیج بستر آتش ہے بے تجھے — اے غیرت بہار جو پہلو میں تو نہو
دشمن کا کیا قصور ہے عادت کو دخل ہے — کژدم کبھی نہ کاٹے اگر اُس کی خو نہ ہو
ہم کو تو چشم ساقی مہوش سے کام ہے — مست نگہ کو خواہش جام و سبو نہ ہو

دیکھنے والے قد بالا کے ہیں — کیوں نہ ہم چشموں میں ہو اونچی نگاہ

ہے آرزو نہ بیعت آنے کی مجھے ای شوخ — کہ جھوٹے وعدوں پہ بھی انتظار باقی ہے

صاحب

صاحب :- امۃ الفاطمہ مشہور صاحب جی۔ تذکروں کی ورق گردانی سے پتہ نہیں چلتا کہ بازاری عورت تھی یا پردہ نشین۔ حکیم محمد فصیح الدین صاحب رنج تذکرہ بہارستانِ ناز میں تحریر فرماتے ہیں کہ "۔۔۔۔ رونق افزائے خطۂ لطافت بنیاد شاہجہان آباد ہو کر کچھ بیمار رہی۔ حکیم مومن خاں مومن نے علاج کیا۔ صحت پا کر ایک سال تک حکیم صاحب مرحوم کے ہم پہلو رہی۔ پھر لکھنؤ کی طرف چلی گئی" مندرجہ بالا سطور سے قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً کوئی بازاری عورت رہی ہوگی۔ "مثنوی قول غمیں حکیم صاحب مغفور نے اسی دلربا کے خیال میں تصنیف کی ہے"۔

بقول جناب شیفتہ مغفور (مؤلف تذکرہ گلشن بیخار)

"بفیض صحبت شاں (یعنی حکیم مومن خاں) دلش بشعر و شاعری میل کرد"

کلام ملاحظہ ہو:۔

رقیبوں کا جلنا کہاں دیکھتا تو
گنہ کیا صنم کے نظارہ میں زاہد

کھولے ہیں اس نے پیرہن یوسفی کے بند
نظر ہے جانبِ اغیار دیکھئے کیا ہو

جو خطِ جبیں کا مرے کاتب ہے اسی کو
صاحب جو بنایا ہے تو مانند زلیخا

سماں میرے گھر میں جو آیا تو دیکھا
یہ جلوہ خدا نے دکھایا تو دکھایا

تہ کر رکھے نسیم سے کہہ دو قبائے گل
پھری ہے کچھ نگہ یار دیکھئے کیا ہو

دکھلا تو مرا نامۂ اعمال الٰہی
یوسف سا غلام اک مجھے دے ڈال الٰہی

صاحبقران

صاحبقران - امام علی نام باپ کا نام سید غلام حسین رضوی تھا۔ بلگرام ضلع ہردوئی وطن تھا۔ جرأت اور انشا کے معاصر تھے۔ طبیعت ہزل اور فحش گوئی کی طرف رجوع ہو گئی تھی۔ کہیں دو چار شعر اچھے بھی کہہ گئے ہیں۔ جناب مولوی عبدالباری صاحب آسی تحریر فرماتے ہیں "صاحبقران کے یہاں مضامین دلکش کی کمی نہیں مگر خواہشات نے اس طرح ان کے کلام کے حصوں کو گھیر رکھا ہے جس طرح کہ گلاب کے

پھول کو کانٹے گھیر لیتے ہیں"۔ تاہم جہاں تک تذکروں سے معلوم ہوتا ہے بذاتِ خود مرنجاں و مرنج خوش مزاج تھے۔ اور ان کے کلام سے ان کے کیرکٹر کو کوئی قریبی نسبت نہ تھی۔

ایک غیر مطبوعہ دیوان صاحبقران کا بعض قدیم کتب خانہائے لکھنؤ میں دستیاب ہوتا ہے۔ انتخاب کلام یہ ہے:۔

جب کہ جلوہ ہوا محفل میں ترے آنے کا
رات کو شمع سے جی بھر گیا پروانے کا

گرچہ ہر خانہ پر درد میں دم رکتا ہے
پر تری زلف میں یہ دم نہیں گھبرانے کا

جی نکلتا ہے مرا کیا کروں کس سے پوچھوں
کوئی ڈھب یاد نہیں مجھکو تو مر جانے کا

نیم جاں ہو ترے بوسے کی تمنا سے میں
تالب گور ترا عشق نہیں جانے کا

خون دل ٹپکے ہے ان آنکھوں سے پانی کیطرح
اب نظر آتی نہیں کچھ زندگانی کی طرح

اس ستمگر بے وفا کو آہ دونوں یاد ہیں
مہربانی کی طرح نامہربانی کی طرح

دیکھی ہے جب سے ابروئے خمدار کی شبیہ
آنکھوں میں اپنے رہتی ہے تلوار کی شبیہ

ہزل کے شعر

اک فقط روتا ہوں میں اس یار جانی کیلئے
ورنہ سب روتے ہیں خالا اور ممانی کیلئے

جسے تو خوب سمجھی ہے اسی سے رات دن خوش رہ
مرے اس شہر میں صاحبقراں سے یار کتنے ہیں

د صاد۔ حکیم محمد طیب باشندۂ بمبئی برادر میاں عبداللطیف و شاگرد حضرت داغ مرحوم۔ زیادہ حالات کا پتہ نہ چلا۔ مضمون آفرین و معنی طراز طبیعت ہیں۔ کلام یہ ہے:۔

اللہ رے شعلہ ہجر کی شب برق آہ کا
روشن ستارہ ہو گیا بخت سیاہ کا

اسکی چشم شوخ ہے درپردہ پردہ در
چلمن ہجوم ہو گئی تار نگاہ کا

مٹ مٹ کے کوئے یار میں نقش قدم مرے
کچھ دیتے ہیں پتہ دل گم کردہ راہ کا

ہیں قیامت انکی چشم فتنہ زا کی گردشیں
لائے روز حشر بھی کیا انقلاب آنکھ کو ہے

صادق :- مرزا صادق حسین لکھنوی خلف مرزا تصدق حسین۔ تلمیذ جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرتؔ لکھنوی۔ لکھنؤ میں کٹرہ اعظم بیگ مرزا دبیر کی گلی میں رہتے ہیں۔ جوان عمر ہیں۔ طبیعت شاعری کی طرف مائل ہے۔ فیضان استاد سے امید ہے اچھا کہنے لگینگے۔ گوٹا سازی کے کارخانہ سے تعلق ہے۔ کلام یہ ہے:-

آپ کے تیرِ نظر سے مجھے اندیشہ ہے ۔۔۔ آئینہ بھی نہ ہو غربال مرے دل کی طرح
محبت کھینچ تو لائی انھیں گورِ غریباں تک ۔۔۔ اوداسی آپ کہہ دیگی یہ مجھ بیکس کی میت ہے
اثر الٹا ہوا ہے اور دونی ہو گئی الفت ۔۔۔ یہ سنتے ہی کہ انکو چاہنے والے سے نفرت ہے
جینے کو تو اے خضر جئیں لاکھ برس ہم ۔۔۔ لیکن کبھی جینے کا بھروسا نہ کرینگے
ہم آپ ہی چھوڑینگے تو چھوڑینگے مے و جام ۔۔۔ زاہد ترے کہنے سے تو ایسا نہ کرینگے
کیا غضب ہے ہائے تو نے قطع کی میری زباں ۔۔۔ بات کہنے دی نہ ظالم وہ جو میرے دل میں تھی
آج اے صادق نہ سرِ مقتل کسی کی آرزو ۔۔۔ جوہرِ شمشیر بن کر قبضۂ قاتل میں تھی
تابشِ حسن سے کیا دید کے ارمان نکلے ۔۔۔ بن کے محفل میں وہ خورشیدِ درخشاں نکلے
عشقِ مژگاں کا تصور ہے یہ اعجاز نما ۔۔۔ سینکڑوں قلب میں ڈوبے ہوئے پیکاں نکلے
فصلِ گل آتے ہی دیوانوں کو یہ جوش ہوا ۔۔۔ ٹکڑے دامن کے کئے چاک گریباں نکلے
ہم جنھیں دوست سمجھتے رہے اپنا صادق ۔۔۔ آج دیکھا تو وہی جان کے خواہاں نکلے
کہا یہ شمع نے پروانوں سے سرِ محفل ۔۔۔ کہ جلنے والے تمہیں کیا جلا نہیں سکتے
موجیں ساحل تک قسم ہے کہ آئیں گی ضرور ۔۔۔ جائیں گے جب سوئے دریا وہ نہانے کیلئے
ان حسینوں نے کمر باندھی ہے کیوں پھر ظلم پر ۔۔۔ اے فلک تو کم نہ تھا میرے ستانے کیلئے
رہائی جب ہوئی قیدِ قفس سے باغباں میری ۔۔۔ پروں کو نوچ کر صیاد نے کاٹی زباں میری
بس اب اپنی اسیری کا زمانہ ختم ہوتا ہے ۔۔۔ رہائی کی صدائیں دے رہی ہیں بیڑیاں میری
نگاہیں تیر بن بن کر کلیجے میں اترتی ہیں ۔۔۔ قیامت کرتے ہیں معشوق مڑ کر دیکھنے والے

نہیں ہی شاعری پر ناز مجکو لیکن ای صادق
بہت اس بزم میں بیٹھے ہیں جوہر دیکھنے والے

جو گھر سے سیر گلشن کے لیئے وہ دلربا نکلے
چمن سے پیشوائی کے لئے باد صبا نکلے

اگر انصاف کرنے ہم سے بیٹھے ہو غیروں کا
سزا بھی اسکو دینا چاہیئے جس کی خطا نکلی

غصہ میں وہ بڑھے تو ہیں تلوار کی طرف
نازک بہت ہیں دیکھئے کیونکر اٹھائینگے

ساقی کی چشم مست کے صادق ہیں شیفتہ
اب ہم تو میکدہ سے نہ بستر اٹھائینگے

صاف ظاہر ہے یہ نگاہوں سے
نابلد ہیں وفا کی راہوں سے

اس کے دل پر اثر نہیں ہوتا
آسماں ہل گیا ہے آہوں سے

مجکو اٹھوا دیئے نہ محفل سے
یوں گراتے نہیں نگاہوں سے

ظلم کرنا بتا دیا کس نے
وہ نہ واقف سے ایسی راہوں سے

صادق

صادق:- شیخ صادق علی صاحب اکبر آبادی۔ راجپوتانہ میں کسی مدرسہ میں معلم تھے زیادہ حال معلوم نہیں۔ کلام نا شگفتگی کا حامل ہے نہ تخئیل کی تازگی کا۔ رعایت لفظی کے پیچھے دیوانہ ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ اور چمنستان سخن نام رکھا تھا۔ کلام یہ ہے:-

نہ چھوڑینگے اسے مر کر بھی میری خاک کے ذرے
رہونگا ساتھ اُس یوسف کی گرد کارواں ہوکر

چھپا لیتی ہیں منہ اپنا جو زلفوں میں وہ ای صادق
تو رہ جاتا ہے رُخ پر صبح کاذب کا گماں ہوکر

اُٹھا کچھ ایسا درد دل بے قرار میں
دل تھام کر میں بیٹھ گیا کوئے یار میں

جانتے بھی وہ نہ تھے آرائشیں زیبائشیں
آئینہ لے کر جو دیکھا چار آنکھیں ہوگئیں

نہیں ہوجب سر شام سے کنگھی چوٹی
کھل گیا بھید کہ تم غیر کے گھر جاتے ہو

غم و اندوہ کی اک بھیڑ لگی ہے دل میں
راہ ملتی نہیں ارماں نکلنے کے لئے

شیریں دہن آپ کا لقب ہے
باتیں تو کرو نہ پھیکی پھیکی

تڑپتے ہیں یہ دونوں روبرو یوں تیغ قاتل کے
نکلتے کے مقابل دل کلیجا سامنے دل کے

صادق:۔ مسٹر محمد فاروق خلف مولوی برہان الدین صدیقی امروہوی۔ مدرس مدرسہ عربیہ امروہہ۔ عربی اُردو۔ فارسی کی تعلیم اچھی پائی ہے۔ زمانہ طالب علمی سے شعر گوئی کا شوق اور تحقیق و مضامین نویسی کا ذوق ہے۔ عرصہ تک حضرت افسر صدیقی امروہوی کی خدمت میں رہ کر فنِ شعر کو حاصل کیا ہے۔ طبیعت ہونہار ہے۔ نہایت ذکی و ذہین ہیں۔ اور ۲۳-۲۴ سال کی عمر ہے۔ آج کل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سیکنڈ ایئر ایف۔ اے میں تعلیم پا رہے ہیں۔

جناب شاہد علی صاحب طالب کے فرستادہ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

دیر و کعبہ سے غرض کافر و دیندار کو ہو — ہم تو وہ ہیں جنھیں مقصود ہے سجدا کرنا
اس ادا سے دمِ پرسش مجھے دیکھا اس نے — مجھ سے ممکن نہ ہوا ظلم کا شکوا کرنا
وُہ یہ کہتے ہیں کہ تم جان کو قربان کرو — بعد اس کے مرے ملنے کی تمنّا کرنا

کسی پہ رنگِ وفا آجکل نہیں چڑھتا — سفید ہو نہ گیا ہو لہو زمانے کا
آسماں کو بھی کوئی جرعۂ مے اے ساقی — دیر سے گھوم رہا ہے تیری میخانے پر

ترا جانا تو اے بادِ صبا ہوتا ہے روزانہ — سُنا دینا جو موقعہ ہو کسی دن داستاں میری
یقیں آتا نہیں اُن کو مرے دردِ محبّت کا — معاذ اللہ کتنی بے اثر ہے داستاں میری
سُناؤں گا انھیں اب حالِ دل اشعار میں صادق — کرے شاید اثر منظوم ہو کر داستاں میری
ہو کے بیدار ہزاروں کی مٹا دی ہستی — فتنۂ حشر جگایا تری انگڑائی نے
اب ترے ہاتھ ہے پوشیدگیِ رازِ وفا — مرتے دم تک تو چھپایا ترے شیدائی نے
کچھ اپنے دل کے جانے کا رنج و الم نہیں — وہ دل بھی لے کے خوش نہیں اسکا ملال ہے

صادق:۔ میاں صادق علیخاں فیلبان سرکار مرزا سلیماں شکوہ بہادر خلف شاہ عالم ان کی دانشمندی و فرزانگی کے حالات مشہور ہیں۔ جوانی میں شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کی۔ جب اپنے آقا کے ساتھ لکھنؤ گئے تو وہاں سید انشا کے شاگردوں میں

داخل ہوئے۔ صاحب دیوان ریختہ تھے۔ شیعہ مذہب تھے۔ بہادر شاہ کے عہد میں انتقال کیا۔ اکثر دشوار زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام ملاحظہ ہو۔

اس نے کھینچی جو کل نشے میں تیغ ۔۔۔ میں نے پوچھا غضب ہے کیا کرتا
مجھ سے کہنے لگا بگڑ کر یوں ۔۔۔ کیوں مرے منہ ہے تو لگا کرتا

دے ملا خاک میں جب گردش افلاک ہوس ۔۔۔ اس کے ملنے کی نکالے کوئی کیا خاک ہوس

جس نے دیکھا ہے تری جلوہ گری کا نقشہ ۔۔۔ اسکو بھاتا ہے کب اے یار پری کا نقشہ
جلد آ جلد دم بازپسیں ہے میرا ۔۔۔ نظر آتا ہے چراغ سحری کا نقشہ

دوستی کیونکہ رہے دیکھئے اب یار کیسا تھ ۔۔۔ دیکھتا ہوں اُسے ہر وقت میں اغیار کیساتھ

پورب میں جز اذیت حاصل ہوا نہ کچھ بھی ۔۔۔ صادق چلے چلو تم دکھن بغیر لیے کچھ بھی
خدا ہی جانے اسے کیا ہوا ہے اے صادق ۔۔۔ کچھ آپ ہی آپ جو سینے میں جی سلگتا ہی

صادق۔ لالہ ہیبت رام صاحب کسی زمانہ میں بریلی کے قانون گو تھے۔ پرانے الفاظ و قدیم محاورات بہت عزیز تھے۔ خط و خال کی شاعری سرمایۂ ناز تھی۔

ہے زلف و رخ کا اُس کے ہر دم مجھے تصور ۔۔۔ کس طرح خوش نہ گذرے لیل و نہار میرا

مرے دل حزیں کو تم افگار کر چلے ۔۔۔ اے واہ وا میاں یہ بھلا پیار کر چلے
دل کے تئیں تو کہتے ہیں سب خانہ خدا ۔۔۔ تم خانۂ خدا کو بھی مسمار کر چلے

صادق: جناب محمد صدیق صاحب خلف مرزا چھجو بیگ صاحب عاشق "ستم ظریف" لکھنوی طبیعت میں ظرافت اور شوخی ہے۔ ایک عاشقانہ مثنوی آپ کے نام سے شائع ہو چکی ہے جس میں محاورات اور عورتوں کے بول چال کو خوب نظم کیا ہے اپنے والد کی طرح مشہور نہیں۔ رسائل وجرائد میں بھی ان کا نام نظر نہیں آتا۔ مشاعروں میں بھی شریک نہیں ہوتے۔ ادبی مجالس میں نمایاں ہونے کے بجائے گوشۂ تنہائی پسند

ـــ انتخاب یادگار ناظرین سنہ ـ ص

جان دینا مجھے آساں بہت خوش خو ہوتا
دم آخر مری بالیں پہ اگر تو ہوتا

کعبہ و دیر سے رندونکو غرض کیا اے بت
سر جھکاتے یہ اُسی سمت جدھر تو ہوتا

غم نہ آئے نہ سہی موت ہی آتی مری جاں
چین دل کو شب فرقت کبھی پہلو ہوتا

موجیں دریا کی نہ اسطرح سے سر ٹکراتیں
بال بکھرائے ہوئے تو جو لب جو ہوتا

سامنا اُس رُخ روشن کا جو ہوتا صادقؔ
گھٹکے خورشید جہانتاب بھی جگنو ہوتا

ہم سے جلے بھنوں کی نہ لے آہ آسماں
دم میں اُلٹ پلٹ نہ یہ سب کارخانہ ہو

نکلیں جو آہ سرد کے ہمراہ حسرتیں
کیا ٹھنڈے ٹھنڈے قافلۂ دل روانہ ہو

اے جاں صفائے قلب یہی ہے جو عشق میں
دل کا مکاں عجب نہیں آئینہ خانہ ہو

صادق:- صادق علیشاہ تلمیذ شاہ نصیر دہلوی۔ بہت پُرگو اور پاکیزہ خیال شاعر تھے۔ نظم کے مختلف اصناف میں جولانی دکھاتے تھے۔ اپنے معاصرین سے قبولیت کی سند پائی۔ صاحب دیوان تھے۔ ملکہ شاعری خداداد تھا۔ استعارہ اور تشبیہ کے جال سے ان کا طائر خیال آزاد تھا۔ یہ کلام ہے:-

نالہ پُر درد یارب لب پہ اب آنے لگے
ڈر ہے کھل جائے نہ پردہ اُس پر اپنی چاہ کا

راتدن پھرتا تھا آہیں جو گلی میں آپ کی
آج دُنیا سے سُنا ہے وہ جواں جاتا رہا

گو دل کی تپش نے مجھے بیمار تو رکھا
پر گرم ترے حسن کا بازار تو رکھا

پیدا ہو خریدار کوئی یا کہ نہ ہووے
لیجا کے میں دل کو سر بازار تو رکھا

پورب کے پریزادوں نے اندازسی اپنے
اس شہر کے ہر کوچہ کو پنجاب بنایا

نہ بڑھا اس کا پھر قدم آگے
اس کے جو آستاں سے گذرا

کیا ہی عاشق مزاج تھا صادقؔ
آخرش اپنی جاں سے گذرا

میرے آگے غیر سے کرتے ہو تم اختلاط
تاز بیجا مجھ سے یہ کیونکر اُٹھایا جائے گا

نہ کھل جائے کہیں راز محبت
میں کشتہ ہوں نگاہ شرگیں کا

دُنیا کو کچھ بھی ہم نے ہرگز نہ مال جانا
جوشِ جنوں ہی یہ ترے عاشق کو ان دنوں
ہوتا ہی بات بات میں چیں بر جبیں وہ شوخ
کئی دن سے نہیں ہی دانۂ تسبیح کی کھٹ پٹ
بُتِ ناداں سمجھ کر اس سی ہم نی دل لگایا تھا
پھرتے ہی آج دیوانہ سا صادق کچھ نہ کچھ تو ہی
لے چلی بےتابی دل جب بیاباں کیطرف
کس نزاکت سی چلا دامن جھٹک کے رات کو
آہ جس جا پہ مرا رشک چمن رہتا ہے
صادق بتوں کے عشق مجازی کے ہاتھ سی
کیوں بارِ گراں پھرتا ہے تو تیغ کا باندھے
غضب جادو ہی ان کا فریب زادوں کی ہاتھوں میں
گالیاں دیتا ہی لاکھوں مُنہ پہ میرے دم بدم
طوفاں کہیں بپا نہ کریں خوف ہے مجھکو
ہوتا ہے ہراز خشم کہن آمد گل میں
لگ نہ چل اتنا بھی اے دل یار سی لگتا ہے ڈر
خوب جھڑیاں لگائیں ساون کی
اسکے بوٹے سے قد کو دیکھو تو
مطلق کھلا نہ بھید ہمایں اسس جہان کا
خوش آئے نہ کیوں کج ادائی تمہاری
جب کبھو رہی چوٹی اس کی یاد مجکو آئے ہے

ہستی کو اُس کی دائم خواب وخیال جانا
کہتا ہے آسماں کی جو پوچھو زمیں کی بات
چھیڑے بھی کوئی اس سی جو خوبانِ چین کی بات
ہوئی شاید کہیں بنت العنب سے شیخ جی غٹ پٹ
ولے پُرفن وہ نکلا اپنے فن میں ایک ہی نٹ کھٹ
یقیں ہی ہو گئی ہے یار سی آپس میں کچھ کھٹ پٹ
تب لگا دستِ جنوں جانے گریباں کیطرف
ہاتھ دوڑایا جو میں اس گل کی داماں کیطرف
روز اُس کوچہ میں ہوتے ہیں دو چار کی پھول
پکڑے گئے ہیں مفت پشیمانیوں میں ہم
ابرو ہی ترے چاہیں جسے مار اُتار دیں
لگائی ان سی جب بازی وہیں دل ہار بیٹھے ہیں
جس پہ کہتا ہے ہر اک سی میں تو کچھ کہتا نہیں
اشک آنے لگے دیدۂ پُرنم سے زیادہ
لگتا ہے مجھے ڈر اسی موسم سے زیادہ
ان بتوں سی خوب ہی صاحب سلامت دور کی
چشمِ تر واہ تجھ کو رحمت ہے
فتنہ ہے قہر ہے قیامت ہے
آئے تھے ہم کہاں سے اور اب ہم کہاں چلے
بتو آجکل ہے خدائی تمہاری
سانپ سا چھاتی پہ میری اس گھڑی لہرائے ہے

صادق:۔ پنڈت دیبی پرشاد عرف بقایا بریلوی خلف پنڈت کشن لال کشمیری الاصل حضرت منیر شکوہ آبادی۔ لالہ مادھو رام جوہر اور ڈپٹی کلب حسین خاں نادر کی صحبتیں اٹھائی تھیں پہلے فخر تخلّص کرتے تھے۔ مگر حضرت منیر کے مشورہ سے صادق تخلّص رکھا اور انھیں سے مشورہ سخن بھی کرتے تھے۔ ۹۷ برس کی عمر میں ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا کلام میں پختگی و متانت ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔ صادق

خوش طینتی سے ابدل ہوتا ہی نام سب کا
نافہ سے اپنے آہو مشہور ہے خلق میں

کیوں نہ برسات میں ہو سبز دوپٹے کی بہار
رنگ بہتر نہیں کوئی دنیا میں کوئی دھانی سے

جب نہ ہو خرچ تو کیا مال سی حاصل ہی حریص
یوں تو ہر غنچے کی مٹھی میں بھی زر ہوتا ہے

سخت دل بھی سو سے خالی نہیں ہوتے صادق
دیکھ پتھر کے بھی سینے میں شرر ہوتا ہے

صادق:۔ بابو چھجو سنگھ بی۔اے وکیل اجاین متوطن بلند شہر عمر تخمیناً ۴۰ سال بطور نمونہ مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں۔ صادق

اس نے خنجر جو پئے قتل اٹھانا چاہا
ہم تو ہم غیر نے گردن کو جھکانا چاہا

کیا اعتبار ہستیٔ ناپائیدار کا
اک کھیل تھا کہ دم میں بنا اور بگڑ گیا

ظالم نے دشمنی سے مجھے یاد جب کیا
ہچکی ہی لیتے لیتے مرا دم اکھڑ گیا

نہ لے ساتھ اپنے گناہوں کا توشہ
عدم کے مسافر سفر کرنے والے

صادق:۔ ریاست کاشمیر میں ملازم تھے۔ غزل کمتر نظمیں زیادہ لکھتے ہیں۔ اشعار ذیل رسالہ مخزن کی ایک جلد میں نظر سے گذرے وہ ہدیہ ناظرین ہیں:۔

شوخ چشمی نے کیا دختر رز کو بدنام
یہ نہ ہو اسمیں تو یہ خانہ خراب اچھی ہے

ہستی بحر حوادث ہے فنا کی تعلیم
زندگی تھوڑی ہی لے طفل حباب اچھی ہے

غیر سے بزم تہی شکوہ سے دل ہو خالی
اس فراغت سے ملے تو مئے ناب اچھی ہے

صادق:۔ سید صادق علی رضوی باشندۂ بریلی۔ کچھ زمانہ گذرا بمبئی میں قیام تھا

وہاں کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ زبان اور سادہ گوئی کے دلدادہ ہیں:-

کوچۂ جاناں میں ہم بستر لگائینگے ضرور
پاسباں سی اور ہم سے آسماں جھگڑا کیوں نہ ہو

دستِ نازک سی اُٹھے لیلے کہ یہ مشکل ہے قیس
پھول سی بھی گو سبک محمل کا پردہ کیوں نہ ہو

نامراد ایسا بھی اُٹھا ہے زمانہ سے کوئی
حسرتوں کا تربتِ صادق پہ میلا کیوں نہ ہو

صادق ـ **صادق**:- میرزا صادق خاں حیدرآباد دکن کے قدیم شعرا میں درجہ امتیاز رکھتے نواب آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں بقیدِ حیات تھے۔ دولت آصفیہ کے منصب داروں میں ان کا شمار تھا۔ علمی استعداد اچھی تھی۔ زندہ دل۔ یار باش۔ شوخ طبع تھے۔ زیادہ کلام دستیاب نہوا۔ صرف دو شعر ملے وہی درج کیے جاتے ہیں:-

بدقت اشک اب نکلا ہے شاید
ہوا آنکھوں میں لختِ جگر بند

کہاں نکلے ہے تارِ زلف سی دل
کرے پرواز کیونکر مرغ پر بند

صادق ـ **صادق**:- شیخ صادق حسین خاں ساکن لکھنؤ متوطن بریلی شاگرد حضرت میر علی اوسط رشک و خلیفہ بشیر۔ فنِ بدیع اور علمِ عروض سے واقف تھے۔ مگر شعر میں مزہ نہیں ہے الفاظ کی تخفیفات کا شوق تھا۔ کلام یہ ہے۔

لاکھ چمکے رُوئے جاناں کا نہ ہوگا شک ذرا
ہوش میں آئے کسی غافل کو دے جُل آفتاب

شکلِ نخشب جھانک کر عکسِ رُخِ پُرنور سے
کیا اُتار و گے میانِ چاہِ بابُل آفتاب

جو ہے فقیر کو حاصل غنا بدولت فقر
امیر ہیں نہ تونگر نہ بادشاہ میں ہے

صادق ـ **صادق**:- غلام محمد صادق۔ دہلوی۔ رعایت لفظی پر فدا ہیں۔ کلام میں اور کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ یہ دو شعر اُن کے ملاحظہ ہوں۔

بڑا ہے استقدر رُتبہ سخن گوئی کے دیواں کا
کہ پایا پایۂ مضموں نے پایۂ عرشِ یزداں کا

سدا ہیں باغ معنی میں گلِ مضموں پہ ہوں شیدا
کہ میرا مرغِ دل بلبل ہے صادق اُس گلستاں کا

صادق ـ **صادق**:- مولوی محمد عزیز الدین ولد مولوی اساس الدین تلمیذ اسد اللہ خاں غالب اصلی

وطن بدایوں تھا۔ مگر دہلی کو وطن بنالیا تھا۔ استعداد علمی و خُلق حد کمال تک فائز تھا سنہ ۱۳۰۳ھ میں پیلی بھیت میں منصف تھے۔ عرصہ ہُوا انتقال کر گئے۔ یہ کلام ہے۔

یہ کس سے اُٹھ سکے ستم اس رشکِ ماہ کا ۔۔۔ اوروں پہ لطف مجھ پہ نہ کرنا نگاہ کا
اس میں تا آئے نظر جلوہ خدا کے نور کا ۔۔۔ بُت بنانے کے لئے زیبا ہے پتھر طور کا
وہ بہا خونِ جگر میرے دہانِ زخم سے ۔۔۔ چادرِ آبِ رواں پھاڑ بنا ناسور کا
نشتر تھا یا کہ تیر نظر کا گذر ہُوا ۔۔۔ کیا تھا الٰہی سینہ میں جو کارگر ہُوا
اللہ ری تیری بے ادبی نالۂ سحر ۔۔۔ وہ مست ناز خواب سے بیدار ہو گیا
گذر کیونکر ہو ایسے آستاں تک ۔۔۔ تصوّر بھی نہیں جاتا جہاں تک
یہی گر آہ و نالہ ہے تو صادق ۔۔۔ رہیگا دم نہ تاثیر فغاں تک
سارے انداز ستم ختم نہ کر تو مجھ پر ۔۔۔ کچھ تو دشمن کے لئے طرز جفا رہنے دے
ہے یہ تنہائی میں مجھ سوختہ جاں کی غمخوار ۔۔۔ شمع مرقد کو مری بادِ صبا رہنے دے
دیکھے تیور چڑھے جو قاتل کے ۔۔۔ حوصلے پست ہو گئے دل کے
لے گئی دل اک نظر میں اسکی چشمِ نیم خواب ۔۔۔ مست ہم سمجھے تھے اسکو پر بہت ہشیار ہے

صادق :۔ میر محمد صادق خلف میر سید محمد باشندۂ لکھنؤ۔ مقیم مٹیابرج۔ شاگرد مظفر علی ہنر۔ مضمون آفرینی کے ساتھ زبان کی شیرینی بھی ان کے کلام میں موجود ہے۔ صادق

بھلا دل کوچۂ گیسو میں سرگرداں نہ ہو کیونکر ۔۔۔ یہ وہ راہیں ہیں جنمیں خضر بھی اکثر بھٹکتے ہیں
اُدھر بزم میں جام چلتے رہے ۔۔۔ اِدھر اشک آنکھوں سے ڈھلتے رہے

صادق :۔ سید صادق شاہ خلف حسین شاہ رامپوری۔ شاگرد منیر شکوہ آبادی۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں عمر پچاس برس کی تھی۔ اور رامپور میں ملازم ریاست تھے۔ طبیعت اچھی پائی تھی۔ یہ کلام ہے :۔ صادق

یوں تو تمہیں سب عیش زمانے کے ملیں گے ۔۔۔ پر چاہنے والا کوئی ہمسا نہ ملے گا

میرے پہلو سے جو وہ رشک مسیحا اٹھّا
تھام کر دل کو کئی بار میں بیٹھا اٹھّا

عیش کیا رنج بھی نہیں رہتا
ایک عالم نہیں زمانے کا

صادؔق زبان و دل تو ہیں قبضے میں یار کے
حیران ہوں کہ وصل کی کیونکر دُعا کروں

صادق

صادق:۔ منشی جلال الدّین حیدر۔ باشندۂ جونپور۔ شاگرد حکیم میر مبارک حسین صدؔق جونپوری۔ زبان صاف ہے۔ اور تخیّل پاکیزہ۔ یہ کلام ہے۔

کوبکو خاک اُڑاتی ہے پریشاں ہو کر
بیکسی ہو گئی بیکس مرے مرجانے سے

حشر میں یار نے پہچان کے پوچھا مجھ سے
تم وہی ہو جو پھرا کرتے تھے دیوانے سے

دل کے بہلانے کو دو گھر یہ بنا رکھے ہیں
آئے کعبہ میں جو اُٹھے کبھی بتخانے سے

واعظ کی میکشی تو ہے رندوں سے بھی بڑھی
پڑھتا ہے وعظ میں بھی حدیثیں شراب کی

صالح

صالح:۔ میرزا مصلح الدّین دہلوی۔ خلف میرزا حسین بخش و نبیرۂ بہادر شاہ۔ شاگرد مرزا پیارے رفعت۔ خوش فکر اور موزوں طبع شاعر تھے۔ ایام غدر میں بعمر ۱۲ سال گرفتار ہو کر رنگون بھیجے گئے۔ یہ کلام ہے جو اُن کی شوخی طبع اور روشن خیالی پر دال ہے۔

نکلتی جان تو کیونکر نکلتی
کہ دل تو یار نے اُس کا ہُوا تھا

زندگی کی نہیں صورت نظر آتی اب کی
دردِ دل میں یہ اٹھا ہے کہ خدا خیر کرے

صانع

صانع:۔ میر نظام الدین احمد بلگرامی۔ میرزا رفیع سودا کے یارانِ صادق سے تھے۔ قدرت نے انھیں دردبھرا دل دیا تھا۔ جہاں کوئی حسرت خیز واقع سُنا اور اُن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جلوس شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں مرشدآباد اور کلکتہ میں قیام تھا۔ ان کا فارسی دیوان پُرانے کتب خانوں میں دستیاب ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ریختہ بھی کہتے۔ انتخاب کلام یہ ہے:۔

کیا خدمت سگ لیلیٰ کو دیکھا استخواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے کچھ مجنوں نے صحرا میں نشاں اپنا

ہُوا ہے شوق موہن کو دھڑی ہونٹوں جمانے کا
نہ جانوں کیا سبب یاقوت کے نیلم بنانے کا

قید میں تیری نپٹ دلگیر ہیں صیّاد ہم — خوش گذرتا تھا ہمارا جبکہ تھے آزاد ہم

گل بہ خواب ناز ہیں اور باغباں نازک دماغ — ہائے کیونکر صحنِ گلشن میں کریں فریاد ہم

جلے بھنے ترے جس وقت آہ کرتے ہیں — تو دودِ دل سے جہاں کو سیاہ کرتے ہیں

وہی ہوئے ہیں تب و تابِ جاں سے آگاہ — جو کوئے دل سے گذرگاہ گاہ کرتے ہیں

نہ کوہ کن سے ہوئی بیستوں میں صانع راہ — بڑے وہ مرد ہیں دل میں راہ کرتے ہیں

صائم

صائم:۔ مولوی سید رمضان علی ولد مولوی محسن مرحوم۔ مولوی غلام حسین تخلص حسین کے شاگرد تھے۔ پچاس برس کی عمر میں ۱۲۶۰ھ میں وفات کی ایک شعر ان کا تذکرہ انتخاب یادگار میں ملا وہ ہدیہ ناظرین ہے۔

یہ مانا حضرتِ دل آپ ہیں بڑے طرّار — جو اُن کے سامنے بولیں تو ہم سلام کریں

صبا

صبا۔ میر وزیر علی مرحوم خلف میر بندہ علی لکھنوی و فخر تلامذۂ خواجہ حیدر علی آتش مرحوم لکھنؤ کے متوسط الحال لوگوں میں ان کا شمار تھا۔ ان کے ماموں میر اشرف علی نے ان کو پسر متبنّٰی قرار دیا تھا۔ اسلئے انھیں کی زیر تربیت صبا نے تعلیم حاصل کی۔ ان کے یار باش اور خلیق ہونے کا تذکرہ اکثر پُرانے لوگ کیا کرتے تھے۔ صبح سے شام تک مجمع احباب رہتا تھا۔ حضرت سلطان عالم واجد علیشاہ کی سرکار سے دو سو روپیہ مقرر تھا۔ اور تیس روپیہ نواب محسن الدولہ بہادر نبیرۂ غازی الدین حیدر کے ہاں سے ملتے تھے۔ علاوہ بریں کئی باغ اور کچھ پرامیسری نوٹ بھی ان کی ملک سے تھے۔ جن کا منافع مسٹر جوزف کی معرفت وصول ہوا کرتا تھا۔

تلامذہ آتش میں جتنے شاگرد صبا کے ہیں اتنے کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئے مثلاً شیخ فضل احمد کیفؔ۔ آغا حسن ازلؔ۔ عبد الکریم رضاؔ۔ بقا خلف صباؔ۔ فروغ۔ فوق سہا۔ وغیرہم میں سے اکثر صاحبِ دیوان اور استاد مانے جاتے تھے۔ منشی اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی اور مرزا حاتم علی مہرؔ ان کے بڑے گہرے دوست تھے۔ ۲ رمضان المبارک

۱۲۷۱ھ میں صبا نے گھوڑے سے گر کر انتقال کیا۔ بحر نے یہ تاریخ کہی۔ ؎

بحر از پئے مصرعہ جاں سوز گل سال وصال | چمن ہستی موہوم صبا شد برباد

ایک دیوان (موسوم بہ اسم تاریخی غنچۂ آرزو) اور مثنوی صید (شکارنامہ واجد علیشاہ) یادگار ہیں۔

صبا کی شاعری بحیثیت مجموعی اُس وقت کی غزل گوئی کا اعلےٰ نمونہ ہے۔ یعنی لطف زبان انداز بیان۔ تلاش مضامین۔ رنگینی اور سلاست اُن کے ہاں موجود ہے۔ رعایت لفظی کا نامطبوع استعمال بھی رشک اور امانت سے کم ہے۔ جہاں تشبیہات سے کام لیا ہے۔ وہاں شکوہ الفاظ اور استادانہ زور نے شعر کو پست نہیں ہونے دیا۔ صبا کی بعض بعض غزلیں فصاحت اور متغزلانہ ادا کی روح و رواں ہیں۔ شاید انھیں سے متاثر ہوکر شوق نیموی نے اپنے رسالہ اصلاح میں لکھا ہے کہ "لکھنؤ کے اگلے شعراء میں سے صبا کی شیریں بیانی دلّی والوں سے ملتی جلتی ہے"۔ چھوٹی بحروں میں صبا نے سلاست اور روانی کے دریا بہائے ہیں۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

الفت کعبۂ مقصود نے صورت پکڑی	نقش محراب ہوئی دستِ دعا سے پیدا
اے صبا دیکھ کے جلوہ چمنِ عالم کا	حالت وجد ہے ہر موج ہوا سے پیدا
نہایت جوش پر دریا ہے اپنے طبع موزوں کا	جہاں میں شور ہے طوفانِ آبِ دُرِّ مضموں کا
ملایا خاک میں گردوں نے کس کس نام آور کو	نشاں ملتا نہیں ہے قبرِ جمشید و فریدوں کا
محو ابرو کے لئے خنجرِ فولاد آیا	ذبح کرنا بھی نہ تجھکو مرے جلاد آیا
دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے	بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا
چشمِ موسیٰ ہمہ تن بن گیا میں حیرت سے	دیکھا اک بت کا وہ عالم کہ خدا یاد آیا
حلق زاہد کا جو روزے میں بہت خشک ہوا	دامن تر مرا لے کے نچوڑا کیا کیا
اے زاہد ریائی دیکھی نماز تیری	بنت الکرم ہی ہے تو کیا ثواب ہوگا

اُڑا دی قیدِ مذہب ہم نے دل سے
قفس سے طائرِ ادراک نکلا

لے اُڑا تجھ کو ترا حسنِ شباب
اب تو عالم ہی نرالا ہو گیا

جائے عبرت ہے جہانِ بے ثبات
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا

جب مجھے اپنی حقیقت کھل گئی
جز سے کل قطرہ سے دریا ہو گیا

گھر سے وحشت میں جو میں چاک گریباں نکلا
کوہ فرہاد سے مجنوں سے بیاباں نکلا

اُلفت کوچۂ جاناں نے کیا خانہ خراب
برہمن دیر سے کعبہ سے مسلماں نکلا

خوب رویوں سے دل صفا نہ ہُوا
آئنہ صورت آشنا نہ ہُوا

عجب طرح کے حوادث ہیں بحرِ ہستی میں
ہر اک کا حال یہاں مثلِ نقشِ آب رہا

کمند لے کے وہیں موج ہو گئی موجود
جہاں ذرا سر اُٹھائے ہوئے حباب رہا

واعظ کے میں ضرور ڈرائے سے ڈر گیا
جامِ شراب لائے بھی ساقی کدھر گیا

بلبل کہاں بہار کہاں باغباں کہاں
وہ دن گذر گئے وہ زمانہ گذر گیا

مثلِ حباب بحرِ جہاں میں نہ دم لیا
اِک موج تھا کہ میں اِدھر آیا اُدھر گیا

آمد سُنی جو باغ میں اُس بادہ خوار کی
گُل نے پیالہ سرو نے مینا اُٹھا لیا

روزِ ازل کھلا جو کتب خانۂ بہار
سوسن نے دس ورق کا رسالہ اُٹھا لیا

نزع میں صلح کی باتیں کیسی
ملک الموت سے لڑوائے گا

دل صاف ہُوا آئینہ رو نظر آیا
سب کچھ نظر آیا جو ہمیں تو نظر آیا

حورونکی طرف لاکھ ہو زاہد کی توجہ
کھل جائینگی آنکھیں جو کبھی تو نظر آیا

جو بات ہی سر مذہب و ملت سے جدا ہے
دیکھا جو صبا سب سے الگ تو نظر آیا

اے صبا ان سے ملاقات جو رکھتی تھی تمہیں
حرفِ مطلب کا زباں سے نہ نکالا ہوتا

لبوں تک آہ نہیں فرطِ ضعف سے آتی
بتو خدا سے ڈرو میں کہاں کہاں فریاد

بے تابیِ دل نے زار پا کر
دے دے پٹکا اُٹھا اُٹھا کر

آتے تو دیکھتے لب جاناں کے معجزے
اچھے مسیح جا کے چھپے آسمان پر

ساقی ہے، میکدہ ہے، شب ماہتاب ہے
چھٹکی ہے چاندنی در و دیوار بام پر

کھو چکے قاصد کو خط کر کے انہیں تحریر ہم
رو چکے لکھے کو اپنے خوب اے تقدیر ہم

عشقِ کامل نے دیا ہے حسن کا رتبہ ہمیں
آئینہ میں دیکھتے ہیں یار کی تصویر ہم

فصلِ خزاں چمن میں جو آئی تو اے صبا
روئے لپٹ لپٹ کے بہت باغباں سے ہم

تقریر اختلاف میں کیونکر بڑھے نہیں
ہندو پڑھے نہیں کہ مسلمان پڑھے نہیں

اللہ ری گردشِ زمانہ
ہر روز نئی مصیبتیں ہیں

سرمہ ہوا خاک طور جل کر
یہ حُسن کی سب شرارتیں ہیں

فکرِ کونین کی رہتی نہیں میخواروں میں
غم غلط ہو گیا جب بیٹھ گئے یاروں میں

بہار آئے الٰہی وہی سماں پھر ہو
پھر ایک جا گل و بلبل کو باغباں دیکھیں

شراب سرخ کے ساغر ہوں اور زاہد ہوں
وہ لال اور نشیلی جو انکھڑیاں دیکھیں

قیامت ہے کسی کو پیار کرنا اس زمانے میں
قضا کا سامنا رکھا ہوا ہے دل لگانے میں

اے فلک پتھر پڑیں تجھ پر غضب تو نے کیا
خاک میں کیسی ملا دی کوہکن کی آرزو

صورت کا آشنا نہ ہو معنی کی دید کو
اے خود پسند دیکھ نہ بن بن کے آئینہ

کیونکر نکال کر اسے پہلو سے پھینک دوں
مجبور ہوں میں دل پہ نہیں اختیار کچھ

قضا کی نشانی ہے الفت بتوں کی
وہ جیتا ہے جو ان پہ مرتا نہیں ہے

صبا بیٹھ رہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے
کوئی کام تجھ سے سنورتا نہیں ہے

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

عقدۂ خاطر ہے لب اور ناخن تدبیر ہے
عمر گذری ہے اسی گتھی کو سلجھاتے ہوئے

میکشو اب کی تو رنگ ایسا جمایا چاہیے
واعظ آئیں بھبنوں پر ہولیاں گاتے ہوئے

ہائے اب کیا کیجئے سمجھائیں دل بیتاب کو
ان سے ہم کہتے رہے کہہ جاؤ کچھ جاتے ہوئے

چشمِ پرآب سے ہے نشو و نما ساون کی
نفسِ سرد نے باندھی ہے ہوا ساون کی

گرمیوں میں جو پریشاں ہوئے ہم بادہ پرست
مانگی سر کھول کے ساقی نے دعا ساون کی

حرم کو اس لئے اٹھ کر نہ بت کدے سے گئے
خدا کہے گا کہ جورِ بتاں اٹھا نہ سکے

نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے
جنوں کا جوش ہے فصلِ بہار باقی ہے

کہیں کہیں گل و صوتِ ہزار باقی ہے
ہنوز باغ میں کچھ کچھ بہار باقی ہے

پھنسائیگا مجھے دشتِ جنوں کی کانٹو نہیں
یہ ایک آدھ جو دامن کا تار باقی ہے

تپِ فراق سے بچ جائیں گے تو جانینگے
کچھ اور زندگیِ مستعار باقی ہے

ہزار بار قیامت گذر گئی ہم پر
مگر ہنوز شبِ انتظار باقی ہے

کسی کو دیکھ کے قابو میں دل نہیں رہتا
یہ روگ آج تک اے جانِ زار باقی ہے

جہادِ نفس سے ہے اے صبا تمہیں درپیش
بڑا ہی معرکۂ کارزار باقی ہے

اٹھ اٹھ کے شبِ وصل میں کہتا ہے وہ پرفن
کیسی یہ سحر ہے نہ گجر ہے نہ اذاں ہے

آپ اپنی بے وفائی دیکھئے
ہم سے اور ایسی برائی دیکھئے

آمد آمد موسمِ گل کی ہوئی
پھر طبیعت گدگدائی دیکھئے

داغ چمکا چلی نسیمِ بہار
یہ ہوا میں چراغ کس کا ہے

خدا کا قہر بتوں کا عتاب رہتا ہے
اس ایک جان پہ کیا کیا عذاب رہتا ہے

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے
امتحاں ہیں ایک مشتِ خاک کے

آدمی دعویٰ انا الحق کا کرے
ولولے دیکھو تو مشتِ خاک کے

توڑ زاہد رشتۂ تسبیح کو
کھول دے پر طائرِ ادراک کے

جامۂ نیلی فلک پہنے ہوئے
سوگ میں ہے کس گریباں چاک کے

خاکساروں سے نہ کر پہلو تہی
ایک دن جانا ہے نیچے خاک کے

ہو گیا بے چین تو اچھا ہوا
اور سن نالے دلِ غمگین کے

میخانۂ عالم میں غنیمت ہے مرا دم
اتنا بھی کوئی رندِ مے آشام نہیں ہے

حالِ دل کہیئے تو کس طنز سے وہ کہتے ہیں
تم سلامت رہو اُلفت کے جتانیوالے

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانیوالے

دل لگانا عذاب ہوتا ہے
آدمی کیا خراب ہوتا ہے

ہونی ہوتی ہے جب کہ بربادی
عشق خانہ خراب ہوتا ہے

مے پرستوں کے دن جو پھرتے ہیں
روز دورِ شراب ہوتا ہے

ہائے کیا بھول گئے یار عدم میں جاکر
کیا تماشہ ہے کسی نے نہ کیا یاد مجھے

بات رکھ لی دلِ ناکام نے مرتے مرتے
تالبِ گور زباں پہ نہ شکایت آئی

آسئے نہ آئے دم کا کسے اعتبار ہے
تا پائے یار زندگیٔ مستعار ہے

جو حال دیکھتا ہے وہ کہنا پیامبر
آئیں نہ آئیں اسکا انہیں اختیار ہے

صبا

صبا: جناب منشی چند بہاری لعل صاحب کالیستھ ماتھر۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۸۵ء میں تاریخ ولادت ہے۔ ان کے بزرگواروں کا وطن اوّل نارنول اور بعد میں کوٹ پوتلی رہا۔ اب عرصہ سوا سو سال سے مستقل سکونت ریاست جے پور (راجپوتانہ) میں ہے۔ ان کے بزرگ عہد سلطنت مغلیہ میں معزز عہدوں پر ممتاز رہے۔ شہنشاہ جہانگیر کے نائب وزیر اعظم رائے مکند جی آپ کے بزرگوں میں تھے۔ علاوہ ملازمت شاہی کے ان کے بزرگوں کی قانونگوئی پرگنہ کوٹ پوتلی بھی مدت سے چلی آتی ہے۔ ان کے بزرگوں کے شاہی رسوخ و ملازمت کیوجہ سے مہاراجہ جے پور سے ہمیشہ تعلق رہا۔ مہاراجہ سوائی جے سنگھ جی دوئم کے زمانہ میں جبکہ سلطنت مغلیہ کی حالت زوال پذیر تھی ان کے بزرگ دہلی سے مہاراجہ صاحب موصوف کے ہمراہ جے پور آئے اور کچھ مدت کاروبار ریاست میں شریک ہوکر کوٹ پوتلی چلے گئے مگر مہاراجہ جگت سنگھ جی کے زمانہ میں ضرورت محسوس ہونے پر ان کے بزرگوں کو یاد فرمایا گیا۔ اس وقت سے ان کے خاندان کو مستقل طور پر ریاست سے

وابستگی ہے اور اسکے ممبر ریاست کی معزز ذمہ دارانہ خدمات پر مامور رہے ہیں۔ انکے پردادا منشی نند کشور جی کو معقول جائداد عنایت کیگئی۔ مہاراجہ سوائی مادھو سنگھ جی آنجہانی کے مراحم خسروانہ خاص طور پر ان کے بزرگوں پر مبذول رہی اور اکثر ریاست کے اہم و پیچیدہ معاملات میں ان کا مشورہ کارآمد ثابت ہُوا۔ یہ خاندان ہمیشہ سے علم دوست مشہور ہے صبا صاحب کے والد بزرگوار منشی گوبند نرائن صاحب فارسی کے جیّد عالم تھے اُن کی تصنیف انشاء گوبند نرائن فارسی طبع ہو کر راجپوتانہ میں خاصی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ خود منشی چند بہاری لعل صاحب صبا جس خاندان کے چشم و چراغ ہیں ویسا ہی قدرت سے دل و دماغ بھی لے کر آئے ہیں۔ آپ نہایت حلیم الطبع۔ بیدار مغز روشن خیال۔ خلیق اور متواضع ہیں آپ کی تعلیم و تربیت اس سے بہتر ہوئی جیسی عموماً امیرزادوں کو نصیب ہوتی ہے۔ آپ اپنی اوقات فرصت میں علمی مشاغل میں مشغول رہ کر اس کمی کو اپنے مشہور زماں اُستاد میرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی جیسے ذیعلم بزرگ کی سرپرستی میں پورا کرتے رہے۔ میرزا صاحب مرحوم اپنے شاگردوں میں آپ کو نہایت عزیز سمجھتے تھے اور خاص عنایت توجہ فرماتے تھے۔ ۱۹۲۹ء کے آل انڈیا کایستھ کانفرنس دہلی کے مشاعرہ میں آپ کی غزل سب سے بہتر رہنے کیوجہ میں پہلا انعام طلائی تمغہ آپ نے حاصل کیا۔ بعد وفات میرزا مائل اُن کے جملہ قدیم و جدید تلامذہ نے بالاتفاق منشی صاحب ہی کو میرزا صاحب کی وفات کے آٹھویں روز یعنی ۹ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ایک بزم منعقد کر کے دستار جانشینی میرزا صاحب کے سب سے پُرانے شاگرد مولوی منظور احمد صاحب کوثر اور ناظم الملک سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی نے اپنے ہاتھوں سے منشی صاحب کے سر پہ باندھ دی۔ یہ جانشینی دہلی میں بھی تسلیم کی گئی۔ اس تقریب پر لکھنؤ سے حضرت ریاض مرحوم نے مبارکباد لکھی مرزا مائل راقم کے مہربان دوستوں میں تھے۔ اور میرے نزدیک وہ اپنے وقت

ہیں پُرانی چال کی غزل کے بہترین شاعر اور اُستاد تھے۔ وُہی رنگ وہی حسن ادا۔ وہی سہل ممتنع کا چسکا۔ وہی فصاحت مضامین کی آمد اور اسلوب کی چستی ضیا صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ فصیح الملک داغ کی رحلت کے بعد یہ جانشینی کے قضیئے شروع ہوئے۔ جن کی طرف راقم نے کبھی توجہ نہ کی۔ لیکن ضیا صاحب کی جانشینی مایل کے فیصلہ سے راقم کو خوشی حاصل ہوئی۔ کیونکہ وہ اس امتیاز کے اہل ہیں۔ اب انتخاب کلام ملاحظہ ہو

جو دم بھر کے لئے جوشِ شباب آیا تو کیا آیا
چھلکتا سامنے جامِ شراب آیا تو کیا آیا

ہُوا اُس سے نہ خشک اپنا ذرا سا دامنِ تر بھی
سوا نیزے پہ یارب آفتاب آتا تو کیا آتا

عمر بھر جوش مرے دیدۂ گریاں میں رہا
ہیں تو دریائے محبت کے ہی طوفاں میں رہا

بعد مرنے کے کھُلا حال بڑی چیز تھے شیخ
شور ماتم کا بہت جامۂ رنداں میں رہا

قدرتی ہو گئی اوسکو رگِ گل سے نسبت
فصلِ گل میں جو کوئی تارِ گریباں میں رہا

یہ دیر و حرم کیا جہاں تو رہے گا
ہمیں تو وہاں سر جھکانا پڑے گا

یہی ہے جو تنہا نشینی ہیں لذت
تری یاد کو بھی بھُلانا پڑے گا

نہ آئیں وہ دلمیں مگر نام بنکر
زباں پہ تو عاشق کی آنا پڑے گا

کام دنیا میں کسی کا بھی نہ چلتے دیکھا
رنگ دُنیا کا کئی بار بدلتے دیکھا

شیخ صاحب تمہیں ایمان سے کہد و تم نے
میکدے سے کوئی ناکام نکلتے دیکھا

سنگ دل ایک نہ دیکھا تو ترا دل ہم نے
ورنہ آہوں سے تو پتھر کو پگلتے دیکھا

جب بہار آئی ہے واعظ کے مکاں پر ہم نے
پارسائی کے جنازے کو نکلتے دیکھا

نہ رہا کوئی زمانہ کا بدلنے والا
سب کو ہمراہ زمانہ کے بدلتے دیکھا

نہ دیا شیخ کو ساقی نے چھلکتا ساغر
ایک چلو میں ہی جب کام نکلتے دیکھا

نہ کھُلا پر کھُلا راز کسی پر تیرا
ہوش والوں کو کبھی ہاتھ ہی ملتے دیکھا

خدا کی خدائی بھی اس دل پہ قرباں
جو نورِ محبت سے معمور نکلا

وہ ہوں کشتۂ لن ترانی کہ میری — جہاں قبر کھودی وہاں طور نکلا

یہی مے تھی پیتے ہیں جسکو صبا ہم
تنک ظرف بیچارہ منصور نکلا

لذت نہ جور میں ہے نہ بیداد میں مزا — جب سے مشیر آپ کا چرخ کہن ہوا
وہ نگاہیں کیا پھریں ہم سے زمانہ پھر گیا — آہ جیسی چیز کا اُلٹا اثر ہونے لگا
اب وہ پوچھیں یا نہ پوچھیں کچھ گلہ ان سے نہیں — آپ اپنے حال سے میں بے خبر ہونے لگا
پست ہو جاتی ہے ہمت کام پھر بنتا نہیں — ناامیدی کا جہاں دل میں گذر ہونے لگا
اس حجاب آمیز شوخی کی ادا ہی اور تھی — وصل کا اقرار جب منہ پھیر کر ہونے لگا

اس تخلّص کے سبب خلق خدا کہنے لگی
اس کے کوچہ میں صبا کا بھی گذر ہونے لگا

ترے عشاق ان لوگوں پہ ہنستے ہیں جو کہتے ہیں — کہ نالہ کھینچنے سے حشر برپا ہو نہیں سکتا
کدورت سے ہی شیخ و برہمن کی سب یہ جھگڑے ہیں — اگر دل صاف ہو پھر کوئی جھگڑا ہو نہیں سکتا
ذرا سا بھی تکبّر جس کے دل میں ہو گیا پیدا — کسی فن کو کرے اس میں وہ پورا ہو نہیں سکتا
جہاں دل ایک ہو جاتے ہیں آنکھیں چار ہوتے ہی — وہاں پردہ کرے کوئی تو پردہ ہو نہیں سکتا
یہیں تک ہیں ستم آرائیاں ساری ستمگر کی — پھر ایسا کر نہیں سکتا پھر ایسا ہو نہیں سکتا
مگر میری تمنّا کی ابھی ہے زندگی باقی — جو وہ کہتے نہیں مجھ سے کہ ایسا ہو نہیں سکتا
لبوں تک آتے آتے ہی جو بے تاثیر ہو جائے — وہ نالہ تو کسی درد آشنا کا ہو نہیں سکتا
لگی رہتی ہیں آنکھیں مصحف رخسار لیلیٰ پر — ترا اے قیس اب مکتب میں پڑھنا ہو نہیں سکتا
چلا آیا دکھانے کو جو جلوہ طور تک اپنا — وہ کیا دل میں ہمارے جلوہ آرا ہو نہیں سکتا
جو میرا ہے وہ اُن کا ہے جو اُن کا ہے وہ میرا ہے — مقام عشق میں اپنا پرایا ہو نہیں سکتا
یہ ایسا راز ہے جسکو فقط عاشق سمجھتے ہیں — جو اُن کا ہو نہیں سکتا خدا کا ہو نہیں سکتا

وہ دنیا تھی کہ چلتا تھا زمانہ تیرے کہنے پر
یہ محشر ہے یہاں کوئی کسی کا ہو نہیں سکتا

یقیں کیسا مرا تو لے صبا ایمان ہے اس پر
سخنداں حضرت مایل سا پیدا ہو نہیں سکتا

کچھ نہ کچھ دم سے ترے اے شب ہجراں ہوگا
زندگی کا نہیں تو موت کا ساماں ہوگا

ہم وہ وحشی ہیں کہ جنت میں نہ ٹھہرینگے کبھی
اپنے ڈھب کا نہ اگر کوئی بیاباں ہوگا

گر یہی رنگ تصور کا رہے گا اپنے
دیکھنا خانۂ دل کوچۂ جاناں ہوگا

کچھ تو پڑھئے کہ صبا آئے ہیں سنکر سب لوگ
جانشیں حضرت مایل کا غزلخواں ہوگا

ہم نے کثرت میں بھی وحدت کو تری دیکھ لیا
چشم بینا سے کہاں جا کے تو پنہاں ہوگا

کعبہ کیا شیخ کی مے خانے میں عزت ہوگی
کچھ بھی پاس اُسکے جو سرمایۂ ایماں ہوگا

خود ہی پردہ ہے صبا آپ کا شوق دیدار
جب اُٹھا دوگے لئے تم وہ نمایاں ہوگا

تری تیغ نگاہ ناز کا ہر وار ہے قاتل
نگاہ باوفا کو تو نظر آتا ہے احساں سا

اب اُس کا ذکر ہی کیا ہے اب اُسکا پوچھنا ہی کیا
تمہارا عاشق ناشاد پھرتا ہے پریشاں سا

جناب شیخ کی نسبت صبا نے خوب فرمایا
نہیں انسانیت لیکن نظر آتا ہے انساں سا

نہیں ہوں بوالہوس ڈر جاؤں میں جو ایسی باتوں سے
جفا پہ کر جفا لے امتحاں پر امتحاں میرا

نہ خود تشریف لاتے ہیں نہ مجھکو ہی بلاتے ہیں
در دولت سے اُن کے دو قدم پر ہے مکاں میرا

اگر وہ مہرباں ہے تو مجھے پروا نہیں اسکی
مخالف کل کے ہوتے آج ہو جائے جہاں میرا

بپا کرتی ہے وہ فتنے کہ اکدن جا بجا ہو کر
زمیں کوئے بتاں آسماں پر آسماں ہو کر

مزا ملنے کا جب آتا کہ رہتا لطف ہما کچھ دن
وہ میرا میہماں ہو کر میں اُس کا میزباں ہو کر

سمجھے لے جو ہے دنیا میں تیرا راز داں ہو کر
جئے بھی بے نشاں ہو کر مرے بھی بے نشاں ہو کر

وہ آئے بھی تو کیا آئے نصیبِ دشمناں ہو کر
بہار آئی مرے گھر میں مگر شکلِ خزاں ہو کر

صبا کہہ دوں تو روحِ حضرتِ منصور شرمائے
بہت دشوار ہے جینا کسی کا رازداں ہو کر

یہی مقام ہیں دونوں صبا کے ملنے کے
درِ صنم کدہ یا آستانِ بادہ فروش

رہ گیا اب تو زبانوں پہ بیانِ اخلاص
مٹ گیا مٹ گیا دنیا سے نشانِ اخلاص

اگلے لوگوں کی نشانی ہے اسے رہنے دے
بے مروت نہ مٹا نام و نشانِ اخلاص

وفائیں نہیں آئیں گی یاد کب تک
یونہیں ہو گی دیکھیں گے بیداد کب تک

بُت کیا خدا بھی اُن پہ تو کرتا کرم نہیں
جو لوگ راہِ عشق میں ثابت قدم نہیں

بت خانہ تو بت خانہ ہے اے شیخ سمجھ رکھ
کعبہ کو نہ بُت خانہ کی تصویر سے بدلوں

تجھے کب ہم اے فتنہ گر دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی ذوقِ نظر دیکھتے ہیں

لوگ باقی ہیں ابھی اگلے زمانے والے
کچھ قدیمی ابھی دستورِ نظر آتے ہیں

اور کس بات میں مختار ہمیں سمجھا ہے
جاں دیتے ہیں جو مجبور نظر آتے ہیں

اپنی وحشت کا جہاں ذکر ملا دیتا ہوں
جان پڑ جاتی ہے کچھ قیس کے افسانہ میں

مثلِ منصور کے کس طرح بہک اٹھوں گا
عکس ساقی کا پڑا ہے میرے پیمانہ میں

ہوش پایا بھی تو پایا ترے دیوانوں میں
عقل دیکھی بھی تو دیکھی ترے مستانوں میں

دخترِ رز کو کبھی منہ نہ لگانے والا
ایک ہی ہوں نگہِ مست کے مستانوں میں

سب ترے حُسن کے نیرنگ ہیں کہنے کو کہیں
شمع نے آگ لگا رکھی ہے پروانوں میں

اس سے کیا بحث مدارات ہوئی یا نہ ہوئی
ہم تو اپنے کو سمجھتے رہے مہمانوں میں

دیکھ کر روزِ جزا عفو و کرم کے تیور
تا پشیماں بھی تو آ بیٹھے پشیمانوں میں

گر نہ ہو ہمت تو پھر آسان بھی دشوار ہے
ہو اگر ہمت تو پھر دشوار بھی مشکل نہیں

یوں تو ہر سینے میں دل ہے کوئی بھی بیدل نہیں
اہلِ دل وہ ہے جو اُس کی یاد سے غافل نہیں

رحم کرنا اے خدا ان واعظوں کے حال پہ
شمع بھی میری طرح کیونکر نہ روئے باربار
واعظ اسی کے پینے سے کرتا ہے منع تو
ہو یا نہ ہو قبول مگر مانگے جائیں گے
منہ سے نکالدوں تو ابھی وہ برس پڑے
ہم حاصل حیات سمجھتے ہیں وہ نفس
تصور میں اُسے کرتے ہیں سجدہ
تجاہل گر نہیں ہے پھر یہ کیا ہے
کہتے ہیں اپنی موت کا جو خواستگار ہو
نسخہ شراب ناب کا لا دیجئے صبا
انسان وہ بلا ہے خدا جانے کیا کرے
جنوں میں بھی مآل اندیشیاں میری ذرا دیکھو
کیونکر وہ بنا لیتے ہیں تیر اپنی نظر کو
ہر روز اُٹھاتے ہیں صبوحی کے لئے وہ
پینے والے ہر زمانے کے وہاں جب جمع ہوں
سنتے ہیں واعظوں سے گنہگار اور کچھ
یہ آفت میں آفت بپا ہو گئی
ترا عشق عشق خدا ہو گیا
یہ جادو خوب چلتا ہے عمل یہ کام آتا ہے
انہیں دیکھا ہی غوطے کھاتے بحر عشق میں تیرے
ادھر اسکو بنا ڈالا اُدھر اُس کو مٹا ڈالا

یہ وہ بندے ہیں تری رحمت کے جو قائل نہیں
حیف ہے بزم جہاں میں حضرت مائل نہیں
اِک چیز ہے جو پینے کی رنج و ملال میں
اِک لطف آرہا ہے دعائے وصال میں
اِک بات ایسی آئی ہے میرے خیال میں
گذرے جو اُسکی یاد میں اُسکے خیال میں
نماز عاشقاں کیونکر قضا ہو
کہ پوچھے وہ مجھی سے تم صبا ہو
کچھ ایسے شخص کا ہمیں کیا اعتبار ہو
پیر مغاں کے تم تو بڑے یار غار ہو
کچھ بھی جو زندگی پہ اُسے اعتبار ہو
خدا کو سونپ آیا ہوں در و دیوار زنداں کو
جو شرم سے بیٹھے ہیں جھکائے ہوئے سر کو
اللہ سلامت رکھے مرغان سحر کو
حشر کے بازار میں مے کی دکاں کیونکر نہ ہو
کہتی ہے شان رحمت غفار اور کچھ
شرارت میں پیدا حیا ہو گئی
تری یاد یاد خدا ہو گئی
زباں پر میری ہر دم جو تمہارا نام آتا ہے
جنہیں آغاز سے پہلے نظر انجام آتا ہے
تجھے کچھ اور بھی اے گردش ایام آتا ہے

پھر پھر کے اپنے آپ ہی قول وقرار سے
وہ خود ہی گر گئے نظرِ اعتبار سے

توبہ ہزار مرتبہ ٹوٹے گی دیکھنا
امیدوارِ رحمتِ پروردگار سے

پینے نہ پینے کی تو ہمیں کچھ خبر نہیں
آتے تو ہیں صبا بھی نظر بادہ خوار سے

یہ کہہ کے اسکو خاک میں گلچیں ملا گیا
بلبل کو تا بہ حشر مبارک چمن رہے

ہم جا کے کوئے یار میں رہتے ہیں اسطرح
جیسے وطن سے دور غریب الوطن رہے

یہ اک گناہ شباب میں ہم سے بھی ہو گیا
واعظ کے کہنے سننے سے ساغر شکن رہے

یہ التجا ہے ساقی کوثر سے اے صبا
میخانۂ سخن میں شراب کہن رہے

نظم اور نثر جسکی بنے رہنمائے خلق
دنیا میں یادگار اسی کا سخن رہے

وہ آدمی ہے جس کو رہے دردِ قوم کا
وہ دل ہے جسمیں الفتِ خاکِ وطن رہے

ذرا اُن سے کوئی پوچھے تمہارا کیا بگڑتا ہے
دُعائیں کر رہے ہو آہ بے تاثیر ہو جائے

میخانے میں تو نام بھی لیتا نہیں کوئی
مسجد میں تذکرے ہیں غم روزگار کے

گنتی نہ ہو سکی ستم وجورِ یار کی
اور دن قریب آ گئے روزِ شمار کے

مگر ان میں کسی کو باعمل بھی آپ نے دیکھا
بہت کرتے ہیں یوں تو اے صبا تقریر ہمدردی

بارِ میخانہ ہے یاری سے غرض ہے اوسکی
شیخ کے فعل سے مطلب نہ سروکار مجھے

دل سے نکلی آہ خالی جا نہیں سکتی کبھی
اس کو دنیا مانتی ہے یہ خدائی تیر ہے

اسکے یہ معنی ہوئے رحمت کے ہم قائل نہیں
واعظو توبہ کا کرنا تو بڑی تقصیر ہے

اب سمجھ لو کہ گذرتی ہے ہماری کیونکر
زندگی موت کو بھی ساتھ لگا لائی ہے

کون ہوں اور میں کس واسطے آیا ہوں یہاں
آدمی کا یہ سمجھ لینا ہی دانائی ہے

ہے امید وفا اس سے دل دیوانہ کو میرے
ملاتا ہے صبا کا رنگ جو خون شہیداں سے

شراب ناب کے اک جام پر ایمان دیدیگا
نہ تھی امید اے زاہد یہ تجھ جیسے مسلماں سے

محبت کا مزہ جبتک نہیں ملتا نہیں ملتا
نہ ہو وابستگی جبتک کسی غارت گر جاں سے

جہاں کا رنگ کیا دیکھوں کہ میں نے دیکھ رکھا ہے
بہت کچھ ملتا جلتا ہے میرے خواب پریشاں سے

بھول جانے کے لئے کم نہیں دونوں عالم
یاد کیوں اسطے کافی ہے تیرا نام مجھے

یہ مانا تیر اس کا دشمن جان دشمن دل ہے
مگر پھر بھی کلیجہ سے لگا رکھنے کے قابل ہے

وہی ساماں محفل ہے وہی سب اہل محفل ہیں
مگر آنے ہی تیرے اور ہی کچھ رنگ محفل ہے

صبا۔ منشی سید صابر حسین مرحوم خلف محمد احتشام الدین مرحوم سہسوانی ۱۲۵۳ھ میں پیدا ہوئے بھوپال میں ناظم ضلع مشرق تھے۔ عرصہ تک ریاست میں ان کی سکونت رہی۔ عربی فارسی سے بخوبی ماہر تھے۔ علم عروض اور فن بدائع میں اچھا دخل تھا اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں مولوی نجف علیخاں اور اردو میں مولوی ایوب علیخاں گلشن اور شیخ علی بخش بیمار سے تلمذ تھا۔ تاریخ گوئی میں بہت ملکہ تھا۔ فارسی کا کلام بھی زبردست تھا۔ نواب کلب علیخاں والی رامپور کی مدح میں ایک مثنوی شوکت خسروی سکندر نامہ کے وزن پر لکھی تھی۔ جس کے صلہ میں خاطر خواہ قدر ہوئی۔ ۱۳۱۳ھ میں وفات پائی۔ انتخاب کلام اردو ملاحظہ ہو۔

کہیں ہنگامہ محشر کو نہ کر دیں برہم
وہ بکھیرے ہوئے گیسوئے دراز آتے ہیں

یہ تو سچ بات ہے تم وعدہ خلافوں میں نہیں
پھر یہ کیوں کہتے ہو ہم جھوٹ سے باز آتے ہیں

شمعیں پروانے کریں شوق سے زینت پہ ہجوم
سیکھنے سے کہیں یہ سوز و گداز آتے ہیں

آپ کیوں تیغ بکف جاتے ہیں دشمن کی طرف
سر ہتھیلی پہ لئے اہل نیاز آتے ہیں

بل کی لینے نہیں سرکشی بھی تمہارے آگے
جھک کے پابوس کو گیسوئے دراز آتے ہیں

مشکل درد اٹھتے ہیں گر پڑتے ہیں آنسو کی طرح
تیرے کوچہ میں جو ارباب نیاز آتے ہیں

داد خواہی کون محشر میں کرے	ہے مزہ سب کو تری بیداد کا

صبا

صبا۔ لالہ کانجی مل فیروز آباد کے متوطن اور لکھنؤ میں سکونت رکھتے تھے۔ مصحفیؔ کے شاگرد اور شاعر موزوں طبع تھے، جوانی میں انتقال کیا۔ کلام یہ ہے:۔

افسوس وہ آرام عدم میں بھی نہ پایا	جس کے لئے دُنیا سے سفر ہم نے کیا تھا
مجھے آتا ہے تجھ پہ رحم اس قاتل کے کوچے میں	لئے جاتا ہے نامہ آج تو اے نامہ بر کس کا
صباؔ ہم نے تو ہرگز کچھ نہ دیکھا جذب الفت میں	غلط یہ بات کہتے ہیں کہ دل کو راہ ہے دل سے

صبا:۔ منشی عبد الرحیم۔ جناب داغؔ مرحوم کے عزیز شاگرد تھے۔ ریاست رتلام میں ملازم تھے اور وہیں سے عرصہ تک گلدستہ "گلشن داغؔ" نکالتے رہے جس میں تلامذۂ داغؔ کا منتخب کلام شائع ہوتا تھا۔ گلدستہ حسن و عشق کی شاعری کا زبردست آرگن تھا۔ اس رسالہ کا مقصد یہ تھا کہ مالوہ کی سرزمین میں اُردو شاعری کو ترقی ہو۔ اور نقادانِ سخن داغؔ کی شاعری پر گہری نظر ڈالیں۔ حضرت داغؔ نے اس کی توسیع اشاعت میں اپنے تمام شاگردوں کو ہدایتیں کی تھیں۔ اس گلدستہ میں اشعار کا انتخاب کیا جاتا اور ذوق سلیم و شاعرانہ جذبات کا لحاظ رہتا۔ مگر چند روز میں ملک کی ناقدردانی سے یہ رسالہ بند ہوگیا۔ عرصہ سے صباؔ صاحب بھی گمنامی کی حالت میں ہیں رسالوں وغیرہ میں کلام بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔

صباؔ کے کلام میں راز و نیاز کی تفسیر اور سوز و گداز کی تصویر ہوتی ہے۔ بطور نمونہ کچھ اشعار لکھے جاتے ہیں۔

ہاں بجا نالۂ بسمل کی حقیقت کیا ہے	آج کیوں آپ چلے آئے کھلے سر باہر
دل تو دل مجھ کو بھی اپنا ہی تصور کیجے	آپ دل کیلئے طعنہ مجھے کیا دیتے ہیں
ہائے وہ پوچھ کے اغماض سے حالت دل کی	اور بیمار کو بیمار بنا دیتے ہیں
حسرت و یاس و غم و رنج و الم سے میرے	دل یہ کہتا ہے سنور جائیگی تربت اچھی

صبا

صبا:- سردار خدا بخش لکھنوی تلمیذ حضرت خادم زیادہ حال نہ معلوم ہو سکا۔ صرف دو شعر دستیاب ہوئے وہ نذر ناظرین ہیں۔

ہم نہیں کوچۂ دلدار سے جانے والے	حورِ جنّت بھی اگر آئے بلانے کیلئے
سوئے گل دیکھتے ہیں باغ میں وہ ہنس ہنسکر	بجلیاں برقِ تبسّم سے گرانے کے لئے

صبا:- منشی محمد مظفر حسین خلف مولوی یوسف علی باشندہ گوپامئو ضلع ہردوئی۔ اپنے والد ماجد اور مولوی احسن بلگرامی سے تلمذ رکھتے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آدمی ذی علم اور صاحب استعداد تھے۔ تذکرۂ روز روشن ان کی تالیفات سے ہے۔ ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں آپ کا انتقال حیدر آباد میں ہوا۔ مرحوم وکیل تھے اور ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کے بھائی مولوی عبدالواسع عثمانیہ یونیورسٹی میں دینیات کے پروفیسر ہیں۔ جناب صبا کی طبیعت میں روانی تھی۔ شستہ اور صاف شعر کہتے تھے۔ یہ کلام ہے۔

آنکھ کی شوخی بھی چھپتی ہے چھپائے سے کہیں	تاڑ لیتے ہیں صبا جنوں کے انداز آشنا
تنہائی بھی ہے رات بھی ہے آؤ مل بھی جاؤ	کس کی ادا کہاں کے کرشمے کدھر کے ناز
کیا غمزے کر رہے ہیں شبِ وصل وہ صبا	کر لینگے جیسے آج ہی تو عمر بھر کے ناز
سرشار ہوئے اس کے تصوّر سے دو عالم	کیا نشہ ہے اس کی نگہ ہوش ربا میں
شراب ناب بھی ہے یار مہ لقا بھی ہے	کہو تو شیخ کہ جنّت میں یہ مزہ بھی ہے
بیان حوروں کا کرتا ہے شیخ مسجد میں	حریص کچھ ادب خانۂ خدا بھی ہے
عجب صفائی مشرب ہے واہ کیا کہنا	کہ رند بھی ہے صبا اور پارسا بھی ہے
دل و قرار و سکوں نذر کر چکے پہلے	اب اور کیا نگہِ ناز یار باقی ہے
لٹے ہیں باغ میں کچھ آشیانِ مرغ چمن	بچا کھچا سا نشانِ بہار باقی ہے

صبا

صبا:- راجہ شنکر ناتھ بہادر خلف مرزا راجہ رام ناتھ بہادر دہلوی مسعادت یار خاں رنگین

کے شاگرد تھے۔ سررشتۂ نظارت دہلی میں پیشکار تھے۔ اکثر اپنے مکان پر مشاعرہ منعقد فرماتے تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

کیا پوچھتے ہو جور و ستم مجھ سے یار کا	دیکھو نہ حال میرے دل بیقرار کا
دل جب اسکی نگہ مست کا مخمور ہوا	سر خوشِ کیفیتِ بادۂ انگور ہوا
ہوں ہیں صدقے ترے بہانے کے	روز ڈھب یاد ہیں نہ آنے کے

صبا

صبا:۔ حکیم شکر اللہ صاحب ساکن بڑا گاؤں۔ بمبئی کے مشاعروں میں کچھ عرصہ قبل شریک ہوا کرتے تھے۔ سادگی اور زبان کا لحاظ رکھتے ہیں۔ مضمون آفرینی کی طرف طبیعت مائل ہے۔ یہ کلام ہے:۔

ضبط ہو نالہ نہ جس سے اور نہ آنسو تھم سکے	عاشقوں میں وہ صبا بدنام رسوا کیوں نہ ہو
آج ارمان نہ نکلے تو بڑی مشکل ہے	ہم کبھی ہیں یار بھی ہے گوشۂ تنہائی بھی

صبا:۔ محمود علیخاں۔ عمر تخمیناً چوبیس پچیس سال ہے۔ جناب شاد عظیم آبادی سے تلمذ۔ طبیعت شاعری کیطرف مائل ہے۔ گلشن حیات میں جو اشعار ملے وہ ہدیہ ناظرین ہیں۔

بینا ہے بزم میں نہ کوئی ہوشیار ہے	کس سے حجاب پھر تجھے اے چشم یار ہے
دامن میں دھجیاں نہ گریباں میں تار ہے	جوشِ جنوں ہے آمدِ فصلِ بہار ہے
لڑکوں کا کھیل ہے کہ بنا اور بگڑ گیا	کیا بے ثبات ہستئ ناپائدار ہے
فرقت میں دیکھتا ہوں جو دیوار و در کی سمت	ہر ہر جگہ کھنچی ہوئی تصویر یار ہے

صبا

صبا:۔ منشی گوبند لال پسر منشی گوکل چند لکھنؤ کے متوطن تھے۔ سنہ ۱۲۹۰ھ میں عمر ۷۰ سال تھی۔ سرکار رامپور میں ملازم تھے۔ اردو فارسی اور عربی کے ماہر تھے۔ اور بقول امیر احمد مینائی مرحومؒ معانی۔ بیان۔ عروض قافیہ۔ معما۔ حساب۔ جبر و مقابلہ۔ جغرافیہ۔ تواریخ مساحت۔ فلاحت میں دستگاہ۔ نقاشی مصوری و خط نستعلیق و ناگری و انگریزی سے آگاہ'' فارسی۔ عربی۔ اردو ہر سہ زبان میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کلام زیادہ ہے۔

تذکرہ انتخاب یادگار سے دو شعر انتخاب کر کے نذر ناظرین ہیں۔

گرمیاں وہ کر کے غیروں سے جلاتے ہیں مجھے	ہیں مسلماں جلتے جی ہندو کا مردہ ہو گیا
ذکر خال و خط بھی سوئے صاف جاناں میں نہیں	زاغ و طوطی کی حکایت اس گلستاں میں نہیں

صبا

صبا:۔ مہتہ عجب چند شرما ولد مہتہ سوداگر مل ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ وطن دھرالی ضلع جہلم پنجاب ہے۔ ذات کے موہیال برہمن، بچپن کا زمانہ بلوچستان میں گذرا جہاں آپ کے والد گرداور قانونگو تھے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اسکے بعد مشن ہائی سکول ڈوال ضلع جہلم میں داخل ہوئے۔ ابھی درجہ ششم ہی میں تھے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماموں کفیل ہوئے۔ آپ نے انٹرنس پاس کیا۔ اس کے بعد بہ تلاش روزگار ریجا پہنچے۔ ٹیچرز ٹریننگ امتحان پاس کیا اور کئی اسکولوں میں معلمی کا کام کرتے رہے۔ اب بھی اے۔ ڈی مسلم اسکول مانڈلے میں ٹیچر ہیں۔

شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے ہے۔ پنجاب میں مشق کا موقع نہ مل سکا جب برہما گئے تو جناب عاشق امروہوی سے تلمذ اختیار کیا اور باقاعدہ مشق کرنے لگے علاوہ نظم کے نثر بھی لکھتے ہیں۔ آپ کے مضامین مختلف رسائل میں زیادہ تر نیرنگستان دہلی شائع ہوتے ہیں۔ کلام فراہم شدہ کا انتخاب ملاحظہ ہو:۔

ایک دل تھا وہ بھی کیا جانے کہاں جاتا رہا	ماجرائے ہجر کا افسانہ خواں جاتا رہا
لذت آزار غم سے جب میں واقف ہو گیا	سوز دل سے وہ جو اٹھتا تھا دھواں جاتا رہا
مصلحت نے درس خاموشی دیا ایسا ہمیں	تھا زبان حال میں بھی جو بیاں جاتا رہا
موسم گل اور خزاں دونوں برابر ہیں صبا	لٹ گیا میرا گلستاں آشیاں جاتا رہا
اس طرف ہو جو گذر شمع جلاتے جانا	ٹوٹی تربت پہ مری آپ کا احساں ہو گا
تجھے اے شمع رہ ہم حاصل محفل سمجھتے ہیں	ترے نقش قدم کو کائنات دل سمجھتے ہیں
مری غفلت پہ قرباں اہل غفلت کی یہ ہشیاری	میں ہوں محو خیال یار وہ غافل سمجھتے ہیں

گلوں کو دیکھ کر افسردنی وحشت ہوئی کیا کیا
مرے دل نے تسلّی بخش سمجھا تھا گلستاں کو

بہت کچھ پھوٹ کر روئے ہیں مجھ پر پاؤں کے چھالے
لگا کر دشت میں سینے سے ہر خار بیاباں کو

خون کا پیاسا نظر آتا ہے وہ تیر نظر
کاش ہو جاتا وہ اک دریا جو قطرہ دلمیں ہے

آہ کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
دردِ دل دردِ سر نہ ہو جائے

لاکھ ارماں ہیں اپنے پہلو میں
زندگی مختصر نہ ہو جائے

آئینہ لے کے آج بیٹھے ہیں
اُن کو اپنی خبر نہ ہو جائے

نہیں ہے یاد کہ تھا آشیاں کہاں اپنا
زمانہ ہو گیا نکلے ہوئے چمن سے مجھے

کسقدر میدانِ ہستی جلد ہو جاتا ہے طے
توسنِ عمرِ رواں کو ہر نفس مہمیز ہے

کیا ملے گا آشیاں برباد کر کے اے صبا
چار تنکوں کے لئے کیوں برق طوفاں خیز ہے

صبح

صبح - منشی شنکر پرشاد کایستھ سریواستو ساکن قصبہ بلگرام ضلع ہردوئی شاگرد جناب قدر بلگرامی۔ ۱۸۷۲ء میں اردو مڈل اسکول سانڈی میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ علمی استعداد اچھی تھی۔ منشی حفیظ اللہ خاں حفیظ آپ کے تلمیذ رشید ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

تجھے دیکھ لے جو کہیں ذرا ہے یہ آدمی کی مجال کیا
تری بارگاہ میں اے خدا نہیں دخل کچھ بھی گماں کا

مرے مرنے کی جو خبر سنی تو یہ کہتے آئے مزار پر
کہ صبح کیا ہی جوان تھا مجھے غم ہے ایسے جوان کا

ہونے دو شور و فغاں ہونے دو
راز پوشیدہ عیاں ہونے دو

صبر

صبر - منشی محمد رضا شاگرد شیخ عبدالرؤف شعور (شاگرد مصحفی)، والد کا نام منشی محمد حسین تھا۔ وطن کاکوری تھا۔ حضرت مولانا شاہ تراب علی قلندر کے مرید تھے۔ اپنے وقت میں اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ ۱۲۹۵ھ میں سیتاپور میں انتقال کیا۔

کلام میں سادگی اور رنگین بیانی دونوں اپنی اپنی جگہ موزوں ہیں۔ کہیں کہیں شوخی کی جھلک بھی ہے۔ خال خال تشبیہات ہیں۔ نازک اور عام فہم استعارات طبع کو گراں نہیں گذرتے۔

تلامذہ بہت تھے۔ چند کے نام یہ ہیں۔
۱۔منشی مقبول احمد محو۔ ۲۔منشی ناظم حسین منتظم ۳۔منشی کاظم حسین غنی۔ ۴۔منشی صفدر حسین بسمل۔ ۵۔منشی مقصود احمد نطق۔ ۶۔حافظ علی عسکری بیدل ۷۔منشی نورالدین کیفی ۸۔خان بہادر منشی تاج الدین جذب وغیرہم۔ تین دیوان یادگار چھوڑے۔ ان کے مطبوعہ دیوان کا انتخاب حضرت نطق نے کیا تھا۔ اور باغ صبر اس کا تاریخی نام رکھا تھا۔ کلام ملاحظہ ہو۔

عہد شباب میں یہ تمہارا خرام ناز
ہے موسم بہار میں چلنا نسیم کا

لوں نام اپنی آہ کا یا اُس کے ناز کا
غمّاز تیسرا انھیں راز و نیاز کا

نازک دماغیاں وہی دیوانہ پن میں ہیں
سر پر پڑا جو سایہ تو سنگ گراں گرا

زخمی تیغ جو ہوتا تو مقرّر جیتا
خنجر ناز کا مارا ہوا کیونکر جیتا

شکستہ خاطری میں آشناؤں سے کنارہ ہے
میں وہ کشتی ہوں جو ٹوٹی پڑی رہتی ہے ساحل پر

ان کا ممنون عنایت دل سے ہوں
گو اجل کے ساتھ آئے آئے تو

بادہ خواری سے جو برسات میں چاہی توبہ
بادل اس زور سے کڑکا کہ الٰہی توبہ

سانس لینی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تپش دل کبھی ایسی تو نہ تھی

دن چڑھے تک سونے کی پوچھی جو وجہ
چونک اُٹھے پہلے وہ پھر شرما گئے

دل دیا تھا انھیں دلدار سمجھ کر میں نے
یہ نہ جانا تھا کہ وہ جان کے خواہاں ہونگے

رات بھر کا یہ بکھیڑا ہے ہمارا تیرا
صبح تو ہوگی نہ ہم اے شب ہجراں ہونگے

صبر کو ڈھونڈھنے آئے ہو یہاں صبر کہاں
جاؤ دیکھو اسی کوچے میں غزلخواں ہونگے

خیر ہو کس سے خفا ہو آج کیسا ہے مزاج
زلف کیوں بگڑی ہے کیوں بگڑے ہیں تیور بولئے

شکل پر مردنی برستی ہے
زندگی تجھ کو موت ہنستی ہے

صبر کیوں مر رہے ہو جینے پر
کیا ہو تم۔ کیا تمہاری ہستی ہے

صبر۔ میر اسد صبر مرحوم شاگرد شیخ امام بخش ناسخ۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاق شاعر تھے صبر

خط و کاکل کے مضامین پر ذہن خوب دوڑتا تھا۔ پرانے خیالات کو نئی بندش میں صاف کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

آفتوں پر آفتیں آئیں یہاں بالائے سر
یار نے باندھا اگر جوڑا وہاں بالائے سر

فرقتِ دلدار میں ہم سے اٹھا جاتا نہیں
بارِ غم ہے یا کوئی کوہِ گراں بالائے سر

عالمِ مستی میں لاؤں اپنے گھر تک شوق سے
خم کے خم رکھدے اگر پیرِ مغاں بالائے سر

آج کر لو منعمو تم جتنی چاہو سرکشی
پاؤں رکھ کر کل چلے گا اک جہاں بالائے سر

صبر۔ حافظ امام الدین صاحب خوش نویسی میں طاق اور سپہ گری سے ماہر تھے فنِ سخن میں نواب عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی سے تلمذ تھا۔ عربی فارسی میں قابل تھے اُردو فارسی دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے اودھ اخبار مطبوعہ ۱۸۷۹ء میں کلام ان کا شائع ہوا تھا۔ اس کا انتخاب یہ ہے:۔

وہ نظروں میں ایسے سمائے ہوئے ہیں
جدھر دیکھو جلوہ دکھائے ہوئے ہیں

نہیں رُخ پہ گیسو یہ آئے ہوئے ہیں
یہ کالے ہیں جو من پہ چھپائے ہوئے ہیں

نکیرین سونے دو ہم کو لحد میں
شبِ ہجر کے ہم جگائے ہوئے ہیں

لکھیں مژدہ وصل وہ خط میں کیونکر
رقیبوں کی پٹی پڑھائے ہوئے ہیں

کروں ترکِ الفت کو اے صبر کیسے
ستم ہے وہ دل میں سمائے ہوئے ہیں

اے دل نہ کر تو عشق کبھی زلف و خال سے
کالا کر ان کا منہ گذران کے خیال سے

بے کھٹکے اب تو ملتے ہیں ہر لحظہ ہم سے وہ
جب سے رسائی ہوگئی اُن کے خیال سے

اے دل عبث یقیں ہے تجھے انکے عہد پر
خالی نہیں ہے بات کوئی ان کی چال سے

جو آشنائے بحرِ حقیقت ہیں ان سے پوچھ
ساحل کو آگہی نہ ہو دریا کے حال سے

اٹکا ہے دل ضرور تمہارا کسی سے صبر
دو چار دن سے پھرتے ہو آشفتہ حال سے

تلامذہ بہت تھے۔ چند کے نام یہ ہیں۔

۱۔ منشی مقبول احمد محو۔ ۲۔ منشی ناظم حسین منتظم ۳۔ منشی کاظم حسین غنی۔ ۴۔ منشی صفدر حسین بسمل۔ ۵۔ منشی مقصود احمد نطق۔ ۶۔ حافظ علی عسکری بیدل ۷۔ منشی نورالدین کیفی ۸۔ خان بہادر منشی تاج الدین جذب وغیرہم۔ تین دیوان یادگار چھوڑے۔ ان کے مطبوعہ دیوان کا انتخاب حضرت نطق نے کیا تھا۔ اور باغ صبر اس کا تاریخی نام رکھا تھا۔ کلام ملاحظہ ہو۔

عہد شباب میں یہ تمہارا خرام ناز
ہے موسم بہار میں چلنا نسیم کا

لوں نام اپنی آہ کا یا اُس کے ناز کا
غماز تیسرا نہیں راز و نیاز کا

نازک دماغیاں وہی دیوانہ پن میں ہیں
سر پر پڑا جو سایہ تو سنگ گراں گرا

زخمی تیغ جو ہوتا تو مقرر جیتا
خنجر ناز کا مارا ہوا کیونکر جیتا

شکستہ خاطری میں آشناؤں سے کنارہ ہے
میں وہ کشتی ہوں جو ٹوٹی پڑی رہتی ہے ساحل پر

ان کا ممنون عنایت دل سے ہوں
گو اجل کے ساتھ آئے آئے تو

بادہ خواری سے جو برسات میں چاہی توبہ
بادل اس زور سے کڑکا کہ الٰہی توبہ

سانس لینی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تپش دل کبھی ایسی تو نہ تھی

دن چڑھے تک سونے کی پوچھی جو وجہ
چونک اُٹھے پہلے وہ پھر شرما گئے

دل دیا تھا انھیں دلدار سمجھ کر میں نے
یہ نہ جانا تھا کہ وہ جان کے خواہاں ہونگے

رات بھر کا یہ بکھیڑا ہے ہمارا تیرا
صبح تو ہوگی نہ ہم اے شب ہجراں ہونگے

صبرؔ کو ڈھونڈھنے آئے ہو یہاں صبر کہاں
جاؤ دیکھو اسی کوچہ میں غزلخواں ہونگے

خیر ہو کس سے خفا ہو آج کیسا ہے مزاج
زلف کیوں بگڑی ہے کیوں بگڑے ہیں تیور بولئے

شکل پر مردنی برستی ہے
زندگی تجھ کو موت ہنستی ہے

صبرؔ کیوں مر رہے ہو جینے پر
کیا ہو تم۔ کیا تمہاری ہستی ہے

صبرؔ۔ میر اسد مرحوم شاگرد شیخ امام بخش ناسخ۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاق شاعر تھے

صبر

خط و کاکل کے مضامین پر ذہن خوب دوڑتا تھا۔ پرانے خیالات کو نئی بندش میں صاف کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

آفتوں پر آفتیں آئیں یہاں بالائے سر — یار نے باندھا اگر جوڑا وہاں بالائے سر
فرقتِ دلدار میں ہم سے اٹھا جاتا نہیں — بارِ غم ہے یا کوئی کوہِ گراں بالائے سر
عالمِ مستی میں لاؤں اپنے گھر تک شوق سے — خم کے خم رکھدے اگر پیرِ مغاں بالائے سر
آج کر لو منعمو تم جتنی چاہو سرکشی — پاؤں رکھ کر کل چلے گا اک جہاں بالائے سر

صبر۔ حافظ امام الدین صاحب خوش نویسی میں طاق اور سپہ گری سے ماہر تھے فنِ سخن میں نواب عبد العزیز خاں عزیز بریلوی سے تلمذ تھا۔ عربی فارسی میں قابل تھے اُردو فارسی دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے اودھ اخبار مطبوعہ ۱۸۷۹ء میں کلام ان کا شائع ہوا تھا۔ اس کا انتخاب یہ ہے:۔

وہ نظروں میں ایسے سمائے ہوئے ہیں — جدھر دیکھو جلوہ دکھائے ہوئے ہیں
نہیں رخ پہ گیسو یہ آئے ہوئے ہیں — یہ کالے ہیں جو من پہ چھپائے ہوئے ہیں
نکیرین سونے دو ہم کو لحد میں — شبِ ہجر کے ہم جگائے ہوئے ہیں
لکھیں مژدۂ وصل وہ خط میں کیونکر — رقیبوں کی پٹی پڑھائے ہوئے ہیں
کروں ترکِ الفت کو اے صبر کیسے — ستم ہے وہ دل میں سمائے ہوئے ہیں

اے دل نہ کر تو عشق کبھی زلف و خال سے — کالا کر ان کا منہ گذر ان کے خیال سے
بے کھٹکے اب تو ملتے ہیں ہر لحظہ ہم سے وہ — جب سے رسائی ہو گئی اُن کے خیال سے
اے دل عبث یقیں ہے تجھے انکے عہد پر — خالی نہیں ہے بات کوئی ان کی چال سے
جو آشنائے بحرِ حقیقت ہیں ان سے پوچھ — ساحل کو آگہی نہ ہو دریا کے حال سے

اٹکا ہے دل ضرور تمہارا کسی سے صبر
دو چار دن سے پھرتے ہو آشفتہ حال سے

صبر:- اجودھیا پرشاد کایستھ دہلوی منشی بسنت سنگھ نشاط، شاہ نصیر و حکیم مومن خاں مومن سے تلمذ تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

زیست کم حسرت بہت کس کس کا شکوہ کیجئے	طالع خوابیدہ کا یا دیدۂ بیدار کا
ہمیں گماں کہ وہ آئے ہمارے قابو میں	انہیں یقین کہ مرے ہاتھ اک شکار آیا
دل لگانے کو بتاتا ہے تو مشکل ناصح	تیرے نزدیک چھڑانا مگر آساں ہوگا
بدنامیاں ہیں باعث نام آوری یہاں	ہم جانتے تھے عشق میں کچھ عز و شاں نہیں

صبر:- جناب سید رضی بلگرامی۔ خیالات میں نفاست اور زبان میں سلاست ہے شوخ طبع شاعر ہیں۔ انتخاب یہ ہے:-

کیا لطف اس کو بادہ اطہر کا آئے گا	اے شیخ جی شراب کبھی جس نے پی نہ ہو
غلماں و حور کے لئے جنت میں کون جائے	اس گھر میں لطف کیا ہے جہاں آدمی نہ ہو
ہنستا ہے سر جھکائے ہوئے کس ادا کے ساتھ	ظالم کی شوخیاں بھی ہیں شرم و حیا کے ساتھ
جاتے ہیں آج کوچۂ قاتل میں سر بکف	اب ہے ہمارے ساتھ قضا ہم قضا کے ساتھ

صبر:- سیتا رام شاگرد جناب امیر اللہ تسلیم نواب مرزا محمد تقی خاں بہادر متخلص افسر کے دیوان تھے۔ مولد و مسکن لکھنؤ تھا۔ رعایت لفظی کے دلدادہ تھے۔ اپنے وقت کے مذاق کے مطابق شعر اچھا کہتے تھے:-

دست رنگیں سے جو سلجھاتے ہیں اکثر گیسو	خون عشاق کا کرتے ہیں سراسر گیسو
کی تری زلف کی تقلید بہت سنبل نے	پر بنائے نہ بنے بال برابر گیسو
ایک دل لینے کو دونوں نے کمر باندھی ہے	ضد پہ گر کاکل پیچاں ہیں تو ہٹ پر گیسو

صبر:- پنڈت کشن ناتھ صاحب عرف ہنڈو لکھنوی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ہمعصر تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مگر فارسی کلام اردو سے زیادہ ہے۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ پنڈت

رتن ناتھ صاحب جناب صبر کے ایک فارسی قطعہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔
"بارک اللہ سچ کہئیگا خاص فصحائے خطۂ پاک شیراز کا کلام معلوم ہوتا ہے یا نہیں"۔
چند اشعار اردو ہدیہ ناظرین ہیں۔

گل میں اس عارض گلرنگ کی ہے بو پیدا
چشم نرگس میں ہے اس آنکھ کا جادو پیدا

وہ مرغ نالہ کش ہوں کہ جب میں ہوا اسیر
صیّاد بازوؤں کی صدا پر پھڑک گیا

مژگاں کی نیزیاں دم خنجر سے کم نہیں
ابروئے یار تیغ دو پیکر سے کم نہیں

دل خون ہو چکا ہے زیادہ نہ چھیڑیئے
ایک ایک بات آپکی نشتر سے کم نہیں

صبوحی

صبوحی:۔ لطف علی صاحب تلمیذ حضرت میکش تھانوی۔ زبان کے لذّت چش ہیں سیدھے سادے شعر کہتے ہیں:۔

سنتے ہی دل سے مٹے برسوں کے شکوے اور گلے
ہائے کیا جادو بھرا تھا یار کی تقریر میں

راز دل ظاہر کسی صورت سے ہم نے کر دیا
دل کا مطلب کہدیا بہکی ہوئی تقریر میں

صبور:۔ کنور گوپال سہائے ولد راجہ جیالال صاحب گلشن کایستھ سریواستو متوطن لکھنؤ سال ولادت ۱۸۲۱ء شاگرد خواجہ حیدر علی آتش۔ عہد شاہی میں بخشی فوج تھے انگریزی عملداری میں نائب تحصیلدار تھے، آخر عمر میں ریاست گوپال پور کے نائب مقرر ہوئے۔ فارسی کے اچھے نثار تھے۔ ۱۹۰۱ء میں رحلت فرمائی نمونہ کلام اردو ملاحظہ ہو

جب نہ اثبات دہن ٹھہرا یہی ثابت ہوا
بات جو ہے یار کی وہ غیر کی آواز ہے

مال دنیائے دنی کی میں نہیں رکھتا ہوس
بندیاں روز ازل سے باب حرص آز ہے

رازق مطلق کو عسرت میں نہ بھولے آدمی
بند ہے گر ایک در تو دوسرا در باز ہے

صبور

صبور:۔ منشی عبدالجلیل خاں صاحب۔ پہلے جلال تخلّص کرتے تھے کلام صاف ہوتا ہے

مولوی بھی ہوئے صوفی بھی بنے پھر بھی صبور
دید بازی نہ گئی دید کا لپکا نہ گیا

طور سینا ہے یہی عرش معلےٰ ہے یہی
آ چلا آمرے دل میں کہ تری جا ہے یہی

جب ذرا ہوش ہُوا کہہ اُٹھے یا حق یا حق
اب دُعا سے بھی ہُوں مجبور کہ وہ کہتے ہیں
ہم تصوّر سے ہی بہلائیں گے دل
ہنس کے قاتل کا یہ کہنا ہی لئے دیتا ہے قتل
کفن کہتے ہیں جسکو خلعت دربارِ قاتل ہے
توبہ نے رند مے آشام سے
حسرت دیدار باقی ہی رہی

بادہ خواراں حقیقت کا طریقہ ہے یہی
ہونٹ ہلتے ہوئے پائے تو شکایت ہوگی
ہاں تغافل تری عادت ہی سہی
کھیلتے ہیں جاں پر جانبار کیونکر دیکھئے
شہید ناز ہوں کُنج لحد آرام منزل ہے
باز آ ناصح خیال خام سے
سوئیں گے کیا قبر میں آرام سے

صبیح :۔ مرزا وارث علی لکھنوی تلمیذ حضرت عشق مرحوم۔ رنگین طبع و خوش گفتار تھے۔ زیادہ حال معلوم نہ ہوسکا ۔ مندرجہ ذیل اشعار ان کے ہیں :۔

سیر منظور جو ہے میرے تڑپنے کی انہیں
جفا و ظلم سے حاصل ہُوا کیا
محبت میری اپنے جی سے پوچھو
گذرنی تھی جو کچھ گذری وہ دل پر
غش آیا بھرتے بھرتے سرد آہیں
آپ تشریف لئے جاتے ہیں گھر بسم اللہ

پوچھتے ہیں دل بیتاب تمہارا ٹھہرا
غریبوں کے ستانے سے ملا کیا
اٹھائے ہیں تمہارے ظلم کیا کیا
بھلا کہنے سے اسکے فائدہ کیا
ہمیں نیند آگئی ٹھنڈی ہوا میں
ہم بھی دنیا سے کوئی دم میں سفر کرتے ہیں

صبیح :۔ مولوی حکیم سید فخر الدین احمد صاحب سندیلوی شاگرد جناب وسیم حکیم انوار حسین صاحب خیر آبادی کے برادر عمزاد ہیں ، عالی خیال اور شیریں مقال ہیں :۔

صیاد گو اسیر ہے کُنج قفس میں یہ
کمبخت ایک گھونٹ کبھی پی کے دیکھ تو
نہ دشمنوں کا بُرا حال ہو کہیں سُنکر
کام کیا شیخ کا کچھ رات رہے مسجد میں

بلبل کا دل پھنسا ہے رگ گل کی جال میں
زاہد بڑا مزہ ہے مے پر زلال میں
خدا کے واسطے سنئے نہ داستاں میری
ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آئے ہیں میخانے سے

حالِ دل اس سے سنایا نہیں تجھکو ظالم | نیند اُڑ جائے گی تیری مرے افسانے سے
اِک آگ سی لگی ہے گلستاں میں کیا یہ پھول | سینچے گئے ہیں خونِ دلِ عندلیب سے
کس کس کا کوئی خون کرے کچھ شمار ہے | دل میں کہاں سے آکے یہ ارماں بھر گئے
دل مضطر ہی پر بیٹھے ہیں آ کے | ترے تیرِ نظر بھی ہیں بلا کے
ہم اُٹھے بھی تو یوں محفل سے اُٹھے | انہیں لے آئے آنکھوں میں بٹھا کے

صحرائی

صحرائی:۔ لالہ بلدیو سہائے متوطن کوئٹہ بلوچستان۔ عمر تخمیناً ۳۰ سال۔ کئی رسالوں کے مدیر اعزازی رہ چکے ہیں۔ خود ایک رسالہ نوشیرواں کوئٹہ سے نکالا تھا۔ جو اب بند ہوگیا۔ نئے طرز کے شعرا میں ان کا شمار ہے۔ کلام میں زور ہے اور توجہ سے کہتے ہیں:۔

چرخ پر پھیلا ہوا ہے ایک عالم نور کا | ہے گماں ہر ایک تارے پر چراغِ طور کا
لیلیٰ شب نے بکھیرے ہیں زلف میں موتی نئے | ہر خمِ نظارہ بن جاتا ہے گھونگھٹ حور کا
عکس سے تاروں کے آئینہ ہیں موجیں بحر کی | قطرہ قطرہ پر ہے دھوکا ساغرِ بلور کا
جب چُنی تاروں کی افشاں لعبتانِ چرخ نے | اور ہی کچھ ہوگیا تھا رُخ شبِ دیجور کا
کی مدارتِ نظر شمعیں جلا دیں دور تک | یاسمیں کی چرخ پر سیجیں بچھا دیں دور تک

ستارہ صبح

ستارہ صبح دامنِ صبح میں پڑا جھلملا رہا ہے | اسے فلک پر کوئی فرشتہ پیامِ رخصت سنا رہا ہے
بکھیر جس کو کہکشاں نے تجلیِ شب بنا دیا تھا | ستارہ صبح میں سمٹ کر وہ رنگِ محفل سما رہا ہے
فلک کا وہ برق وش مغنی جسے نمودِ کیف کہئے | کھڑا ہوا مرکزِ سکوں پہ سحر کے کچھ گیت گا رہا ہے

صدر

صدر:۔ منشی لچھمن پرشاد صاحب ولد منشی نوبت رائے متخلص بہ مناسب۔ کالیستھ سکسینہ تھے اور بازار کھالہ شہر لکھنؤ میں سکونت تھی۔ مورثِ اعلیٰ راجہ مہانند والیٔ ریاست سورکھ ضلع فرخ آباد تھے جو اب صرف ایک بڑا قصبہ ہے اسی سے جناب صدر کا

خاندانی لقب سورکھووال ہے۔ ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے اور فطری ذہانت کی وجہ سے اُردو اور فارسی میں بہت جلد مہارت پیدا کر لی۔ علوم ریاضی کی بھی باقاعدہ تحصیل کی۔ عربی میں مُلّا جامی تک استعداد بہم پہنچائی۔

صدر صاحب کے نانا منشی دُرگا پرشاد زمانہ شاہی میں نامی نثار تھے۔ ان کے والد ماجد منشی لال چند صاحب تخلص اُنس صاحب دیوان فارسی اور ایک انشا کے مصنّف تھے۔ صدر صاحب کو اُردو میں جناب خیراتی لال صاحب شگفتہ لکھنوی سے تلمذ تھا اور فارسی میں حضرت سنجر ایرانی مرحوم سے۔ ان کے انتقال کے بعد خواجہ عزیز الدین عزیز سے مشورہ کرتے رہے۔ عرصۂ دراز تک خود اپنے مکان پر مشاعرے کرتے رہے جن میں نامی اساتذہ شریک ہوتے تھے۔

پیرانہ سالی میں ایک جوان صاحبزادے کی موت نے کمر توڑ دی۔ بہت دل گرفتہ اور مغموم رہتے تھے۔ ایک مختصر رسالہ بھی اپنے بیٹے کی یادگار کے طور پر تصنیف کیا تھا کچھ عرصہ کے لئے بجائے لکھنؤ کے دہلی میں قیام اختیار کر لیا تھا۔ یہاں آپ کو شعر و سخن کی دو چار صحبتوں میں شرکت کا بھی اتفاق ہوا۔ اور آپ کے فارسی کلام پر بالخصوص بہت داد ملی۔ آپ ایک باوضع خوش اخلاق اور منکسر المزاج بزرگ تھے۔ فنِ تاریخ گوئی میں ایسا ملکہ تھا کہ قریب قریب برجستہ گوئی کی نوبت تھی۔ آپ کی کئی نظمیں ایسی ہیں جنہیں ہر مصرعہ میں تاریخ ہے۔ آپ نے دربار دہلی میں ایک قصیدہ بھیجا تھا۔ جس کے صلے میں ایک تمغہ اور سند عطا ہوئی۔

آپ صاحب تصانیف کثیرہ تھے جن میں سے دیوان غزلیات اُردو فارسی و مجموعۂ مسدسات و مخمسات اور قطعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ تصنیفات مذکورہ صدر کے آپ نے ایک رسالہ منظوم صنعت مہملہ میں تصنیف فرمایا تھا۔ اس کا موضوع سداما ہے۔ یہ رسالہ چھپ گیا ہے۔ شروع میں چند شعر فارسی کے

ہیں باقی اشعار اُردو۔ افسوس ہے کہ ناموافقت زمانہ کیوجہ سے آپ کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ ہی رہا۔ آخرکار ۱۹۳۲ء میں دسمبر کے مہینے میں راہی ملک بقا ہوئے۔ کلام ان کے داماد جناب بشیر پرشاد صاحب منوّر لکھنوی نے روانہ فرمایا ہے۔ اس کا انتخاب نذرِ ناظرین ہے:۔

از رسالہ سداما

سداما اسم اک مرد دل آگاہ — ہوا دورِ سوم کا کامل آگاہ
دل آرام گروہِ اوّل دہر — ملک کردار صالح اکمل دہر
ملا اک دہر کا دردِ دل اس کو — سرور و مہر کامل حاصل اس کو
دل اس کا لاطمع گو اک گدا وہ — مگر دردِ دل اس کا لا دوا وہ
کہ ہمسر کا سوال دام و درہم — ہوا اس کو دم صمصام ہر دم
عدو وہ ہر طرح حرص و ہوا کا — رہا معکوس کاسہ اس گدا کا
سوال مدعا اک عار اس کو — سدا ہر کا کرم درکار اس کو
مآل کار ہمسر کا کڑھا دل — کہا دکھ دور ہوں او مرد کامل
اگر سر گرم راہ دوار کا ہو — کہ حاصل دل کا سارا مدعا ہو
اگر ہو مرحلہ اس راہ کا سر — سرورِ روح حاصل ہو سراسر
گدا محو صلاح کار ہو کر — کلام آرا ہوا اس طرح رو کر
کہ سردار دو عالم وہ گدا ہم — ملک کا ہو گدا کس طرح ہمدم

انتخاب غزلیات

میخانۂ جہاں میں وہ بادہ نوش تھا — زیرِ لحد بھی نشۂ صہبا کا جوش تھا

گلکاریاں تھیں دزدِ حنا کی نظر فریب — دستِ صنم تھا یا سبد گلفروش تھا

وہ روِ خلق تھا میں جہاں میں کہ بعد مرگ — احباب کو جنازہ مرا بار دوش تھا

باتوں پہ کان روئے منور پہ تھی نظر — میں ان کی بزم میں ہمہ تن چشم و گوش تھا

بہار آئی تو آئے ہمصفیر و مجھ کو کیا مژدہ — قفس سے میں اگر نکلا بھی تو بے بال و پر نکلا

عدم سے آئے جائینگے عدم کو — ہماری ابتدا و انتہا کیا
ہمیں اپنے مقدر سے ہے شکوہ — تمہاری بے وفائی کا گلہ کیا
بہار آئی گلستاں میں تو آئے — اسیرانِ قفس کو اے صبا کیا

ثباتِ دہر ہماری نظر میں خاک نہیں — کہ اس مکان کے دیوار و در میں خاک نہیں

ازل سے حصے میں ہیں خاک و باد و آتش و آب — کچھ اور ان کے سوا میرے گھر میں خاک نہیں

کسی کے شعر کو اچھا برا کہیں کیا ہم — کہ امتیاز ہی عیب و ہنر میں خاک نہیں

ہمراز بے خودی ہے ہمدرد بے کسی ہے — غربت میں بھی وہی ہے جو رنگ ہے وطن میں

نقصان فکر اس سے کچھ اے ہمنفس نہیں — قائل مری سخن کی اگر سو میں دس نہیں

باغِ جہاں میں طائر بے بال و پر ہوں میں — صید زبوں ستم کش دام و قفس نہیں

ہر گھڑی وردِ زباں جس کو ترا نام نہیں — نام لینے کے بھی قابل وہ بد انجام نہیں

طرفہ ہے جلوہ گہِ یار کا عالم کہ جہاں — دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں

دل کے خوش کرنے کو میں کچھ کبھی کہہ لیتا ہوں — صدر اس فن سے مجھے کچھ ہوس نام نہیں

جہاں گردش میں جام بادۂ گلفام آتا ہے — ہمیں جمشید کا عبرت سے یاد انجام آتا ہے

جو کچھ چاہے خلش پیدا کرے تیرِ نظر تیرا — ہمیں بھی دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام آتا ہے

قطعہ سراپا تاریخ ولادت فرزند بخانہ منشی بشن نرائن خلف منشی پراگ نرائن صاحب رائے بہادر مالک اودھ اخبار لکھنؤ:۔

سمت ۱۹۷۲ — سنہ ۱۹۱۵

بشاشتِ دل منشی پراگ نرائن — یہ مژدہ غیب کا ہے سر بسر مبارک ہو

صدر

صدر۔ نواب صدر محل صاحبہ صدرؔ۔ جانِ عالم واجد علی شاہ والئے اودھ کی بیگمات سے تھیں۔ ۱۲۸۸ھ میں ان کا ایک دیوان "بادشاہ نامہ" کے نام سے شائع ہُوا۔ جس کی ہر غزل میں بادشاہ کی محبت کا بیان ہے۔ اور ان سے تعشق کا اظہار کیا ہے شیریں زبان۔ خوش بیان اور اپنے شوہر کی فریفتہ شیفتہ تھیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے

نکیلی چتونیں بانکی ادائیں قتل کرتی ہیں
زمانہ سے نرالا بانکپن ہے جانِ عالم کا

کلامِ گل فشاں سنکر عنادل بول اُٹھتے ہیں
خدا رکھے عجب رنگیں سخن ہے جانِ عالم کا

سرمہ بنا کے رکھتی ہیں پریاں وہاں کی خاک
پڑتا ہے جس جگہ پہ قدم بادشاہ کا

جمال و حسن پر شاہد ہے تسخیر سلیمانی
نظر آتا ہے پریوں پر بھی قابو میرے اختر کا

مشاطہ ناز کرتی ہے ان کے بناؤ پر
زیبائشِ عروس ہے یا بادشا کی زیب

پھیلی ہوئی ہے روشنی حسن دور دور
روشن چراغِ محفل خوباں ہے شہریار

بزمِ عالم میں ہے گھر گھر شہ دوراں کا فروغ
مہر و مہ کی ہے برابر شہ دوراں کا فروغ

حسرت و آرزوئے وصل اور مصیبت فراق
سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ

نسیم صبح ہنگامہ نہ کرنا خندۂ گل کا
رگِ گل سے بھی نازک ہے طبیعت میرے اختر کی

صدر

صدر:۔ نواب میر صدر دین حسین خاں۔ رئیس بڑودہ ملک گجرات۔ قدیم وطن مراد آباد ہے۔ آپ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نواب وجہ الدین حسین بڑودہ کے رئیس جاگیردار تھے۔ ان کے بزرگ بانیٔ ریاست بڑودہ کے لشکر میں شجاعت اور دلاوری کے باعث نامور تھے، آپ نے مذہب اسلام کے متعلق جو رسالے لکھے ہیں۔ وہ عام مسلمانوں کی معلومات کا ذریعہ ہیں۔ گجراتی اور انگریزی زبانوں میں آپ کی کئی تصنیفات کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ آپ نے ۱۹۰۱ء سے ایک کتب خانہ قائم کیا ہے، جس میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں جمع کی ہیں۔ جن سب کی زبان اُردو ہے، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے اس کتب خانے کی بابت یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے" آپ کا کتب خانہ دیکھکر معلوم ہُوا

کہ اردو زبان میں اسقدر علوم و فنون کی کتابیں ہیں"۔

آپ ایک نہایت پاکیزہ خیال۔ شریف طینت انسان ہیں اشعار میں اخلاقی مضامین کو خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ حسن و عشق کے خیالات سے دور رہتے ہیں۔

شکر ہے فکر دو عالم سے رہائی بخشی
پیچ قسمت کا خیال خم گیسو نہ ہوا

پہنچائے گی فنا سوئے دارالبقا مجھے
چھوڑوں گا گر خودی تو ملے گا خدا مجھے

کون آتا ہے کہ گلشن میں ہر اک گل شاد ہے
بلبلوں میں کس کے آنے کی مبارکباد ہے

چاند دو ٹکڑے برابر اک اشارہ سے ہوا
یہ تری معجز نما انگشت کا ایجاد ہے

صدیق

صدیق ۔ منشی محمد صدیق حسن دہلوی۔ تاریخ ولادت ۶ فروری ۱۸۹۲ء سکونت دہلی بازار لعلچاہ گلی میر جملہ کچھ عرصہ تک عربک ہائی کالج دہلی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا عبدالغنی صاحب مرحوم سابق صدر مدرس مسجد فتحپوری سے فارسی پڑھی۔ اب آپ ایک فرم میں محاسب ہیں۔ اوائل عمر سے شاعری کا جنون سر پر سوار تھا۔ اسی کے زیر اثر تعلیم ناتمام رہی۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب راسخ مرحوم کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ آپ اب قومی نظمیں کہتے ہیں جو ملکی جرائد میں شائع ہوتی ہیں۔ آپ کا نسب حضرت سعد بن وقاص رحمتہ اللہ علیہ (جن کا شمار عشرہ مبشرات میں ہے) سے ہے۔ آپ کے پردادا شیخ رحیم اللہ اور دادا شیخ کریم اللہ عہد مغلیہ میں شہزادوں کو فنِ تیراندازی کی مشق کرایا کرتے تھے۔ آپ کے والد منشی محمد ابراہیم صاحب طبابت کرتے تھے۔ اور نقاشی میں بھی خوب دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں نواب سلطان دولہا مرحوم کے عہد بھوپال میں ممتاز تھے۔ ابھی تقرر کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا۔ کہ نواب صاحب موصوف دنیا کو خیرباد کہہ گئے۔ اور ایک کثیر جماعت کے ساتھ آپ کا نام بھی فہرست برخاست میں آگیا۔ ان کی طبیعت کو شعرگوئی سے مناسبت ضرور ہے۔ لیکن طبیعت پر زور ڈالنا پسند نہیں کرتے۔ قدامت پرستی اور رسم پروری مزاج پر حاوی معلوم ہوتی ہے۔ زبان

صاف اور بیان پر قدرت ہے۔ بول چال اور زبان کا چسکا بھی موجود ہے۔ صرف غزلیں دفتر میں پہنچیں جن کا انتخاب ہدیۂ قارئین کرام ہے۔

نرالے گل کھلائے ہیں جنوں نے جوشِ وحشت میں
تماشہ کوئی دیکھے تو ہمارے چاکِ داماں کا

کیا کس سنگدل نے قید مجھ وحشی کو زنداں میں
بنا طوقِ گلو ہر حلقۂ زنجیر پتھر کا

تیری صورت پہ مر مٹا دیکھا
جان سے اپنی میں گیا دیکھا

تیغِ ابرو کا لے لیا بوسہ
میرا دل میرا حوصلہ دیکھا

لے کے دل پہلو سے رخصت ان کا پیکاں ہوگیا
ہائے دم بھر میں بھرا گھر میرا ویراں ہوگیا

زاہد شراب پی کہ ہے موسم بہار کا
سایہ ہے سر پہ رحمتِ پروردگار کا

کسی کی مست آنکھیں دیکھکر سرشار ہو جانا
ہمیں آتا ہے زاہد بے پیئے میخوار ہو جانا

موت کے پردے میں پنہاں تھے رموزِ بیخودی
جان لے کر مجکو محوِ حسنِ جاناں کردیا

میں خمارِ بےخودی سے مست عرفاں ہوگیا
اِک نظر میں تُو نے کیا اے چشمِ جاناں کردیا

گوہرِ مضمون سے اے صدیق پائی آبرو
فیضِ راسخ نے مجھے اتنا سخنداں کردیا

ہاتھوں اُچھل گیا مرے سینہ میں دل مرا
جب عرضِ مُدعا پہ کوئی مسکرا دیا

اہلِ تقویٰ بھی ہیں محشر میں گنہگار بھی ہیں
دیکھنا یہ ہے کہ کس پہ ترا احسان ہوگا

چھپ نہیں سکتا چھپائے سے کبھی داغِ جگر
یہ وہ شعلہ ہے دبائے سے نمایاں ہوگیا

متاعِ زندگی تھے چند قطرے خونِ بسمل کے
یقیں اس کو جب آیا اس نے جب دل چیر کر دیکھا

سرِ مقتل اُدھر خنجر ہتھیلی پہ اِدھر سر تھا
نیاز و نازِ حسن و عشق کا پلہ برابر تھا

اُگلتی تھی زمیں بھی گنجِ قاروں موسمِ گل میں
کہ جس غنچہ کو دیکھا اپنی مٹھی میں لئے زر تھا

بولے وہ سن کے قصۂ یوسف کو ناز سے
وہی تھا جس کا مصر میں نیلام ہوگیا

کِیا رخصت شبابِ زندگی کا دَورِ پیری نے
چھلکنے کے لئے اب عمر کا پیمانہ آ پہنچا

جس طرف دیکھئے ہوتا ہے نظارہ ان کا
بُت کدہ ان کا حرم ان کا کلیسا اُن کا

دل حسینانِ جہاں پر جب مرا مائل نہ تھا
مجھکو آزارِ محبت کا مزہ حاصل نہ تھا

میں نے مانا اس کا ملنا تھا مجھے دشوار تر
لیکن اپنی جان کھو دینا تو کچھ مشکل نہ تھا

جس سے کچھ تسکین ہوتی تشنہ کامِ عشق کو
اتنا پانی بھی ترے خنجر میں کیا قاتل نہ تھا

الگ بیٹھے ہوئے یوں بے چھری وہ ذبح کرتے ہیں
کھنچے رہتے ہیں ہم سی بزم میں تلوار کی صورت

ہم بھی دل کھول کے کچھ خاطرِ مہماں کر لیں
پار سینہ کے ذرا تیرِ نظر جانے دو

اِک در جو ہوا بند تو وا ہو گئے سَو در
روزی مری کرتا نہیں وہ رزق رساں بند

توڑے ہیں یہ گن گن کے ستم ہائے فلک نے
چن چن کے ستمگر نے کئے آج جواں بند

ہر لمحہ ہے صیاد اسیروں پہ نیا ظلم
اور اس پہ یہ تاکید رہے شور و فغاں بند

بارآور ہو الٰہی اب نہالِ اتحاد
دیکھ لیں ہم اپنی آنکھوں سی کمالِ اتحاد

ہندو و مسلم کا مثلِ آئینہ ہو صاف دل
خواب و بیداری میں بھی رکھیں خیالِ اتحاد

ذرہ ذرہ سرزمینِ ہند کا ہو مُستنیر
نور افشاں ہو جہاں میں وہ جمالِ اتحاد

جلتا ہوں تابِ حسنِ رُخِ یار دیکھ کر
مشعل بنا ہوں جلوۂ دیدار دیکھ کر

قفس میں ہوں نہیں معلوم گذری کیا نشیمن پر
سُنا ہے کوند کر بجلی گری ہے صحنِ گلشن پر

ظلم اتنا تو ذرا بانیٔ بیداد نہ کر
بند فریاد سے پہلے لبِ فریاد نہ کر

نہیں منظور رہائی نہ رہا کر لیکن
بے پر و بال قفس میں مجھے صیاد نہ کر

کوئی اُٹھا بھی ہے بیمار تمہارا ہو کر
جاؤ بھی نام ڈبویا ہے مسیحا ہو کر

اُمنگیں لے اُڑینگی اِک نہ اِکدن خود بخود ان کو
دبیگا شرم سے اٹھتی جوانی کا اثر کب تک

اب گلے کس سے ملیں سوختہ تن عید کے دن
آج ہیں ہم سے جدا اہلِ وطن عید کے دن

گھر وہ صحرا ہے کہ جس گھر میں تو آباد نہیں
دل وہ پتھر ہے کہ جس دل میں تری یاد نہیں

مجھ سے گنوا نہ گناہوں کو مرے اے واعظ
وسعتِ دامنِ رحمت تجھے کیا یاد نہیں

تارِ زنار میں تسبیح پروئی میں نے
تفرقہ شیخ و برہمن کا یہ منظور نہیں

گم ہو کے میں تو آپ سے دم بھر میں مل گیا
اے خضر آپ کھوئے رہے عمر بھر کہاں

دلّی میں لوٹ زاہد حسنِ بہارِ جنّت
حوروں سی بھی حسین تر پریاں ہیں چاوڑی میں

کس شان سے کیا ہے ساقی نے خیر مقدم
چھڑکاؤ کر دیا ہے مئے کا گلی گلی میں

تسخیر کر لئے دل محفل میں اہلِ فن کے
لطف سخن یہ دیکھا صدیق دہلوی میں

یہ رنگ لائی شہیدوں کی خاک بعد فنا
زمیں سے بنکے اُڑی ہے گلال ہولی میں

عدو ہے میں بھی ہوں صدیق بزم میں اسکی
گلے گی دیکھئے اب کس کی دال ہولی میں

نہیں ہیں پیشِ نظر اب وہ حسن کے جلوے
کہاں ہے پہلی سی اب وہ بہار ہولی میں

سناؤں تمہیں دل کا میں مدعا کیا
کہوں کیا میں تم سے کہ کیا چاہتا ہوں

ستم کی ادائیں ہو شانِ کرم بھی
جفا کرنے والے وفا چاہتا ہوں

انداز ہیں نرالے اس شوخ کی نظر میں
آنکھوں سے آکے اتری برچھی مرے جگر میں

کیوں ناوکِ بیداد نے منہ پھیر لیا ہے
باقی ابھی کچھ خون کے قطرے ہیں جگر میں

اللہ اللہ عجب شان ہے شانِ اُردو
ہے زبانوں میں زباں ایک زبانِ اُردو

دبکے رہتی ہے کسی سے نہ رہیگی ہرگز
ہاتھ بھر کی ہے خدا رکھے زبانِ اُردو

میری فطرت نے دیا ہے مجکو پیغامِ حیات
ہر رگِ تن دے رہی ہے درس آزادی مجھے

نگاہِ ناز تو نے اے بتِ بے پیر کیا بدلی
زمانہ پھر گیا مجھ سے زمانہ کی ہوا بدلی

مجھے کیا انقلابِ آسماں کا اعتبار آئے
نہ میں بدلا نہ وہ بدلے نہ کچھ طرزِ جفا بدلی

اے قضا تجھ کو تو آنا ہی ہے لیکن شبِ غم
اگر آ جائے تو مشکل مری آساں ہو جائے

مری آنکھوں میں مگر یار کی صورت بدل جائے
یہ پتلی بن کے گویا نور کے سانچے میں ڈھل جائے

باتوں باتوں میں لگا لاؤں گا اپنے ہمراہ
راستے میں جو کہیں مل گئے آتے جاتے

کچھ اس طرح شباب کی دنیا گذر گئی
معلوم ہی نہیں کدھر آئی کدھر گئی

زمانہ سے نہیں مطلب ہمیں تو تم سے مطلب ہے
اگر برگشتہ ہوتا ہو تو ہو سارا جہاں ہم سے

دختِ رز نے تجھے زاہد کبھی چھونے نہ دیا
لگائے عیب اوروں کی بہت کچھ عمر بھر میں نے
کشاکش دو طرف ہے دیکھئے کیسے بنے ان سے
مَے سے توبہ کریں ہم یہ کبھی ممکن ہی نہیں
اِک نظر ابرو چڑھا کر جانبِ نخچیر بھی
کھولدیں جوشِ جوانی نے اُتر کر آنکھیں

اس سے بڑھکر بھی کوئی صاحب عصمت دیکھی
گناہوں پر کبھی اپنے نہ کی ہرگز نظر میں نے
وہ کہتی ہیں یہ پیکاں ہی ہیں کہتا ہوں مرا دل ہے
ہم سے اسے زاہد نادان رہا جاتا ہے
تیر بھی چلتے رہیں پھرتی رہے شمشیر بھی
عہدِ پیری سے ملی خواب کی تعبیر مجھے

صدیق

صدیق :- منشی محمد صدیق حسن دہلوی خلف شیخ محمد ابراہیم دہلوی۔ شاگرد حضرت راسخ دہلوی۔ ان کے پردادا شیخ رحیم اللہ صاحب اکبر شاہ ثانی کے ہاں تیر اندازوں کے زمرے میں ملازم تھے، ان کے دادا کریم اللہ آرزو بھی عمدہ قدر انداز تھے، اور شاہزادوں کو اس فن کی تعلیم دیتے تھے، شاعر بھی تھے۔ اور اس فن میں شاہ نصیر دہلوی سے تلمذ تھا۔ مومن ذوق۔ غالب کے مشاعروں میں شرکت کر چکے تھے۔

صدیق صاحب چھ سات سال کی عمر سے موزوں طبع واقع ہوئے ہیں۔ معمولی تعلیم کے بعد صدر بازار دہلی میں کسی سوداگر کی ملازمت میں رہے، انہیں دنوں میں مولانا راسخ دہلوی کے سرچشمۂ سخن سے سیراب ہوکر تلمذ اختیار کیا۔ ذہین اور طباع آدمی ہیں۔ چند ہی روز میں مشّاق ہو گئے۔ زبان اور مضمون دونوں میں طبیعت کی جولانی دکھاتے ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے :-

دکھایا معجزہ یہ سخت جانی نے دمِ کشتن
شرارت ہے نہ شوخی ہے نہ اندازِ تکلّم ہے
سوالِ وصل پر تقدیر سے چُپ لگ گئی ایسی
وہ تردامن ہوں میں ناصح کہ جب دامن نچوڑوں گا
وہ بیٹھے ہیں پسِ پردہ مگر شوخی سے کہتے ہیں

بنا میرا تنِ لاغر تہِ شمشیر پتھر کا
مرے گھر بن کے آیا ہے بتِ بے پیر پتھر کا
بنا بیٹھا رہا وہ بت دمِ تقریر پتھر کا
کریں گے زاہدانِ خشک آ آ کر وضو برسوں
کسی کی حسرتِ دل ہوں کسی کی میں تمنّا ہوں

مجھے آنکھیں دکھائیں پہلے پھر ابرو پہ بل ڈالا	لگا کر تیر یاد آیا انہیں شمشیر کا پہلو
نیا محشر اُٹھا لائی نئے فتنے جگا لائی	تری رفتار کیا آئی کہ پیغامِ قضا لائی
بس اب گلشن سے میرا آب و دانہ اُٹھ گیا یارب	قفس میں کھینچ لائے ہیں مجھے صیاد کے ٹکڑے

صدیقی

صدیقی:۔ مولوی منظور احمد صاحب خلف شیخ شمس الدین خلف مولوی رحیم بخش صدیقی امروہوی ۱۳۱۴؁ھ میں پیدا ہوئے اور منظور حسن تاریخی نام رکھا گیا۔ دس سال تک اپنے شہر کے پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹری کی خدمات انجام دیکر ۱۹۲۷؁ء ۱۳۴۶؁ھ میں کراچی چلے گئے۔ اُس وقت سے اسکول بورڈ کراچی میں ملازم ہیں۔ آپ غزلیات میں افسر اور نظمیات میں صدیقی تخلص کرتے ہیں۔ حضرت مضطر خیرآبادی کی شاگردی اختیار کی۔ ثانیاً منشی احمد علی صاحب شوق کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ آپ کی تصنیفات میں دیوانِ دوم برقِ تجلیات۔ مجموعۂ رباعیات۔ مجموعہ کلام ۱۹۲۴؁ء لغایت ۱۹۲۹؁ء اور چند درسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

دیوانِ اوّل نوشتۂ بے مثال۔ مجموعہ نظمیات تذکرہ شعرائے امروہہ اور متعدد رسائل متعلقۂ شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی بھی ان کی تالیف سے بتائی جاتی ہیں۔ آجکل ایک تذکرہ جس کا تاریخی نام فروغِ وطن ہے۔ ترتیب دے رہے ہیں۔ اس تذکرہ میں صرف اُن حضرات کا ذکر ہے جنہوں نے بلا واسطہ یا بالواسطہ شیخ مصحفی مرحوم سے فیض پایا ہے یا ان کے سلسلے میں ہیں۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد پچاس کے قریب ہے جن میں سے کئی صاحب دیوان ہیں۔ آپ کا کلام اکثر رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ دو نظمیں نذرِ ناظرین ہیں۔

خیالِ یار

اے خیالِ یار میری زندگانی تجھ سے ہے	دل کو حاصل چارۂ دردِ نہانی تجھ سے ہے

متفق ہے تو تو عیش و کامرانی ہے مجھے
متحد ہے تو تو لطف جاودانی ہے مجھے

ہے عنایت پر تری دار و مدار زندگی
تیرے دم سے چل رہا ہے کاروبار زندگی

کر دیا بے فکر ایسا خدشۂ ایام سے
مل گئی فرصت زمانے کے غم و آلام سے

بوالہوس ہونگے غم فرقت سے رنجور و حزیں
مجھ کو اپنی بے کسی و بے بسی کا غم نہیں

چاہئے کیا اور اے تسکین جانِ مبتلا
آگیا تو مہرباں ہو کر تو سب کچھ مل گیا

ہجر صدیقی کو مثل وصل عشرت خیز ہے
دور رہ کر بھی سرورِ جامِ الفت تیز ہے

شمع

مجھ کو اے شمع فروزاں فکر ہے اس بات کی
واقعہ کیا ہے کہ سر سے پاؤں تک تو آگ ہے

دیکھتا ہوں جب تجھے تاریکیوں میں رات کی
میں سمجھتا ہوں کہ تجھکو بھی کسی سے لاگ ہے

جاگ کر کاٹی ہیں تو نے سینکڑوں شبہائے تار
کی ہے اک انداز پر اختر شماری عمر بھر

میں نے دیکھا ہے ہمیشہ بے سکون و بیقرار
گریۂ بے فاصلہ رکھا ہے جاری عمر بھر

تشنۂ تشریح کامل ہے یہ مضمونِ ادق
واقعات خاص کا حامل ہے افسانہ تیرا

اس سکوت برمحل میں ہیں نہاں لاکھوں سبق
جذب رکھتا ہے بہت اندازِ مستانہ تیرا

دیکھ کر حسن عمل اے پیکر فانی ترا
جی میں آتا ہے کہ پروانے کی صورت جان دوں

مشعلِ راہ فنا ہے جسم نورانی ترا
کاش میں بھی سوز پنہاں کی بدولت جان دوں

مرحبا یہ قوتِ صبر و تحمل مرحبا
تو نہ مجبور جفائے عالم فانی ہوئی

جوش ٹھنڈا کر سکا کس دن ستم گلگیر کا
جس قدر کاٹا تجھے تو اور نورانی ہوئی

صریر

صریر۔ مولوی منشی محمد احمد صاحب خلف اکبر حضرت امیر مینائی مرحوم پہلے تخلص قمر تھا۔ پھر محو ہوا۔ اب صریر تخلص کرتے ہیں۔ عرصہ تک ریاست رامپور میں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔ کئی برس سے ہز ہائینس نواب صاحب والی رامپور کی حضوری

یں ہیں۔ اور فنِ سخن گوئی میں نواب صاحب موصوف کے اُستاد ہیں۔ عربی۔ فارسی اور اردو کی استعداد معقول ہے۔ علمِ عروض و معانی و بیان سے واقف ہیں۔ لوگ اُستادزادہ ہونے کی حیثیت سے ان کا ادب و لحاظ کرتے ہیں۔ اور یہ رامپور کی ہر جماعت میں ہردلعزیز ہیں۔ طبیعت عالی۔ خیالات برتر۔ بندش زوردار ہوتی ہے۔ کلام ملاحظہ ہو:-

لب گلرنگ پہ اک لطف دکھاتی ہے مسی
یہ دھواں آگ سے اُٹھ اُٹھ کے پریشاں نہ ہوا

فیضِ کامل سے ہو کیا جوہرِ ناقابل کو
عکس انساں سے کبھی آئینہ انساں نہ ہوا

غیر کی ضد سے ملا آپ وہ کافر مجھ سے
شکر صد شکر کہ تدبیر کا احساں نہ ہوا

بتکدے میں بھی کئے ہم نے خدا کو سجدے
لطف یہ ہے کہ جدا کفر میں ایماں نہ ہوا

رک گیا ہاتھ دمِ ذبح مرے قاتل کا
رحم بھی بن کے مری جان کو جلاد آیا

غضب آیا جو گریبانِ سحر چاک ہوا
چھٹ گیا ہاتھ سے دامن شبِ تنہائی کا

اپنے حیراں سے نہ منہ پھیر کہ سایہ کی طرح
آئینہ ہے قدِ آدم تری یکتائی کا

میں وہ بیکس ہوں کہ فرقت میں مری پاس اجل
آئی ہے اوڑھ کے برقعِ شبِ تنہائی کا

صورت پرست وہ ہے میں معنی پرست ہوں
بلبل کو رنگ مجھکو ہے پھولوں کی بو پسند

سکندر رہے تقدیر کا آئینہ بھی
ہوئے جس سے وہ بے حجاب اوّل اوّل

سایہ میں اس بلند قامت کے
سو رہے فتنے سب قیامت کے

صریر

صریر:- پنڈت گنگا رام خلف اصغر پنڈت دیبی سنگھ۔ کنج پورہ ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۹۸ھ میں ۳۱ برس کی عمر تھی۔ روپڑ میں اپیل نویسی کرتے تھے۔ مرزا یوسف علی خاں عزیز مرحوم سے تلمذ تھا۔ بعض قدیمی بیاضوں میں ان کا نام گنگا بشن نظر سے گذرا ہے۔ بلند پایہ شاعر تھے۔ شعر میں ہمیشہ کوئی بات پیدا کرتے تھے یہ کلام ہے

پوچھتے ہیں وہ کر کے مجھے قتل کس لئے
اوّل نتیجہ سوچے نہ انجام کار کا

کر اب تو چاک گریباں مرا جنوں	لوں گا حساب روز جزا تار تار کا
ایک دل غمخوار تھا سو اس کو سودا ہو گیا	حیف ناداں عاشقِ زلفِ چلیپا ہو گیا
تُو نے چھیڑا مجھے بُرا ہی کیا	خیر جو کچھ کیا بھلا ہی کیا
شب عدو بزم میں جلا ہی کیا	یار ساغر ہمیں دیا ہی کیا

صریر

صریر:- محمد عبدالکریم صاحب شاگرد جناب کلیم بنگلوری۔ طبیعت موزوں اور شعر کے مناسب ہے۔ کلام یہ ہے:-

ہمیشہ آئینہ رہتا ہے ان کے پیش نظر	مجھے نہ رشک ہو کیوں طالع سکندر پر
ہُوا نہ وصل میسّر کبھی بتوں کا مجھے	یہ کیسے پڑ گئے پتھر مرے مقدّر پر
صریر آپ کی توبہ کا اعتبار کسے	ضرور ٹوٹے گی اک دن یہ حوضِ کوثر پر

صغیر

صغیر:- میاں چھوٹے خاں عرف چھٹّن خلف محمود خاں لکھنوی مقیم رامپور۔ سید افضل علی افضل خلف کوچک منشی مظفر علی صاحب اسیر سے شعر میں تلمّذ تھا۔ شاعری کے علاوہ فنِ نقاشی میں ابتدا ہی سے خاص شوق تھا۔ جناب امیر احمد صاحب امیر اپنے تذکرہ انتخاب یادگار میں تحریر فرماتے ہیں۔ "ذہن ایسا مناسب ہے کہ کسی سے تلمّذ نہیں اور تصویر ایسی کھینچتا ہے، کہ نقاش آفریں کہتے ہیں"۔

مندرجہ ذیل اشعار ابتدائی زمانہ کے ہیں۔ جو عمر کے لحاظ سے بہت اچھے ہیں۔

ترا جلوہ کہاں ہم نے نہ اے رشکِ قمر پایا	یہاں دیکھا وہاں دیکھا اُدھر پایا اِدھر پایا
کبھی برچھی کا پھل پایا کبھی تلوار کا ہم نے	محبّت کا شجر بو کر یہ قاتل سے ثمر پایا
بزم میں اللہ ری دُزدیدہ نگاہی یار کی	جس کو دیکھو کہہ رہا ہے وہ مرا دل کیا ہُوا
پیشتر رہتے تھے کعبہ میں بھی اصنام اے صغیر	اس صنم کا ہے اگر مسکن مرا دل کیا ہُوا
جو وہ چاہے تو ہوں دشمن گواہ اسکی خدائی کے	کیے طاقِ حرم پر وعظ ہر تصویر تھیٹر کی

صغیر

صغیر:- شاہ نجم الدین دہلوی پسر شاہ نصیر الدین نصیر۔ سجّادہ نشین درگاہ صدر جہاں

دہلی۔ غدر تک دیہاتِ درگاہ پر قابض رہے۔ بعد غدر بعوض جاگیر سرکار نے ایک ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر دی۔ پھر ۱۸۶۵ء میں صرف ایک موضع جاگیر میں مقرر ہوا۔ پہلے اپنے والد ماجد کے ہمراہ بہت سے شہروں مثل حیدرآباد۔ لکھنؤ عظیم آباد کی سیر کی۔ بعد اُن کی وفات کے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ فنِ شعر سے شوق نہ تھا۔ اپنے والد کے شاگردِ رشید قطب الدین مشیر کے اصرار سے کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے۔ اور اُس میں اصلاح بھی انہیں سے لیتے تھے۔ مگر جو کچھ کہتے شگفتگی و تازگی لئے ہوتا۔ اندازِ بیان دلکش اور اسلوب چست ہوتا۔ ۷۵ برس کی عمر پا کر ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا۔ مجموعہ کلام جو نظر سے گذرا اُس میں سے اشعار ذیل منتخب ہوئے۔

تصورِ جیب سے شب دن رات گیسوئے پریشاں کا
گماں صبحِ وطن پر کیوں نہ ہو شامِ غریباں کا

ہے وحشت کی یہ حالت اور کوہ کی وہ صورت
کہتا ہے جنوں رستے مشکل مرے دونوں ہیں

فرقت کو میں کیا سمجھوں اور وصل کو کیا جانوں
میں بحرِ محبت ہوں ساحل مرے دونوں ہیں

آنکھ و نگاہ ہیں مرے جلوہ اس پردہ نشیں کا ہے
معمورہ یک لیلے محمل مرے دونوں ہیں

صغیر اُس بت کو دل دنیا سمجھ کر
کرو گے کیا اگر اس نے دغا کی

خورشیدِ قیامت غمِ جاناں میں قمر ہے
شامِ شبِ فرقت مجھے محشر کی سحر ہے

دوں اسمیں جگہ کیوں نہ صغیر اپنے بتوں کو
کچھ اسمیں اجارہ نہیں اللہ کا گھر ہے

طلسماتِ جہاں میں خودنما کا کارخانہ ہے
خدائی کر رہے ہیں بت خدا کا کارخانہ ہے

صغیر

صغیر:۔ شاہ غلام حیدر صاحب مرحوم لکھنوی ابن شیخ وصومن صدیقی شاگرد میر علی اوسط رشک مرحوم۔ ۱۳۰۳ء میں ستر برس کی عمر تھی۔ اور دھاروپور ضلع پرتاب گڈھ میں قیام تھا۔ ان کی تصنیفات سے ایک دیوان اور آئینۂ اختر موجود ہے۔ مذاق سخن میں اپنے اُستاد کے قدم بقدم ہیں۔ رعایت لفظی اور تشبیہات استعارہ بالکنایہ اور محاورات کو ان کی شاعری کا خاص معیار سمجھنا چاہیئے۔ تخیل میں بھی

ان کا طائرِ خیال اپنے اُستاد کے برابر پرواز کرتا ہے۔ علاوہ غزل کے مرثیے بھی کہے ہیں۔ اس سے زیادہ حالات نہ معلوم ہو سکے۔ یہ کلام ہے۔

نہ ہوتا کبھی چاک سینہ گلوں کا
جو باغوں میں شورِ عنادل نہ ہوتا

شبِ وصل شرمائے وہ اس قدر
پسینے سے چاہِ ذقن بھر گیا

لکھوں خط اُس پری کو تو دو چیزیں چاہئیں
پر کا قلم ہو اور ہو کاغذ پتنگ کا

بعد مرنے بھی نہ چھوڑا گردشِ گردوں نے ساتھ
چاک بنتا ہے زمانے میں ہماری خاک کا

کیا فیض سینہ قلب کو ہوا اہلِ صفا سے
ظلمت کدہ آئینہ سے روشن نہیں ہوتا

قالب بے روح کو وہ بے قراری اب نہیں
جان شاید اُس پری رو پر فدا تھی میں نہ تھا

بیوفائی کا گلہ سن سن کے کہتا ہے وہ شوخ
جب ازل کے روز تقسیم وفا تھی میں نہ تھا

اے صغیر اُن کے جو پہلو سے کبھی اٹھتا ہوں
تو انگوٹھے سے دبا لیتے ہیں دامن میرا

صبحِ امید نہ آئی نہ گئی شامِ الم
وصل کا روز نصیب اے شبِ ہجراں نہ ہوا

سرکشی صحبتِ ہم جنس میں کب بانٹی گئی
جھک گیا شیشۂ مے سامنے جب جام آیا

اسیرِ کنجِ قفس آج تک نہیں چھوٹے
خزاں چمن سے گئی موسمِ بہار آیا

عاشق ہوئے خراب ہوئے غم نے کھو دیا
بیٹھے بٹھائے ہاتھ سے دل ہم نے کھو دیا

کب تک نہ رہینگی تفرقہ پردازیاں تری
اے چرخ دو دلوں کو ملانا ضرور تھا

چکھائے ہیں مزے دریا کو اشکِ گرم نے کیا کیا
حبابوں کی جگہ ہیں آبلے لیہائے ساحل پر

طوقِ وحشت مری گردن میں اسی سال پڑا
جس برس یار نے منت کی بڑھائی زنجیر

وہ جو پٹ کھولکے جھانکے تو لٹک آئی زلف
اپنے دروازہ میں اک اور لگا لی زنجیر

بھوک میں زخمِ جگر کی اشتہا
پیاس میں ہے آبِ خنجر کی ہوس

مر گیا ہوں گورے گورے رنگ پر
قبر میں ہے سنگِ مرمر کی ہوس

دل دے چکے تھے آپکو اب مر کے جان دی
وہ ابتدائے عشق تھی یہ انتہائے عشق

ذبح کر ڈالئے یا کیجئے تدبیرِ وصال
مجھ کو تڑپائیگا صورتِ بسمل کب تک

جب یہ کہتا ہوں غمِ ہجر سے مرجاؤں گا
پوچھتا ہے وہ بتِ حور شمائل کب تک

میرے ساقی نے پیالے سب کو بھر بھر کے دئے
میں نے جب مانگا تو بولا ہاتھ ابھی خالی نہیں

سانچونکی صورت ہیں چھلّے اور گوری انگلیاں
شمعیں ہیں پر آدمی کی ہاتھ کی ڈھالی نہیں

گھلایا ہے غمِ فرقت نے ایسا ناتوانی میں
کہ بہر غرق ہم قطرے کو بھی دریا سمجھتے ہیں

بالائے بام زلف جو دیکھی غضب ہوا
سر پہ بلا فلک سے ہو نازل تو کیا کروں

بے سبب منظور لاشے کو نہیں گز بھر زمیں
دل میں ہے ملکِ عدم کی جا کے پیمائش کریں

سناتے وہ نہیں چھاگل کی بھی صدا آکر
ہزار تشنۂ دیدار پیاس پیاس کریں

زخمی تیغِ نظر مجروحِ خنجر کے نہیں
گھاؤ ہیں سینے کے اندر جسم پر چرکے نہیں

چکنے چکنے گورے گورے جسم ہیں دل سخت ہیں
کون کہتا ہے کہ یہ بت سنگِ مرمر کے نہیں

ایسی دیکھی نہ سنی صحبتِ مستانہ کہیں
شیشۂ مے کہیں۔ ساقی کہیں پیمانہ کہیں

میرے مذہب کا نہ پوچھو حال کچھ ای زاہدو
مسجدو نہیں پارسا ہوں رندِ میخانو نہیں ہوں

لختِ دل پر صفتِ حسنِ رُخِ یار لکھوں
چاہیئے سورۂ یوسف اسی سیپارے میں

دل میں غم سینے میں ارمان رہا کرتے ہیں
ان رفیقوں میں ہم اے جان رہا کرتے ہیں

کوئی بھولے سے نہ ہو کوچۂ گیسو میں مقیم
کیا کہیں کیسے پریشان رہا کرتے ہیں

کام آتے نہیں وحشت میں حواسِ خمسہ
ہم جماعت میں پریشان رہا کرتے ہیں۔

کسی سے کام نہیں تم سے کام رکھتے ہیں
بلا سے لوگ اگر ہم کو نام رکھتے ہیں

وہ مشتِ پر ہوں کہ صیّاد و باغباں مجھ سی
دلوں میں اپنے گرہ مثل دام رکھتے ہیں

ضعف میں طاقتِ رفتار کہاں
ہم کہاں کوچۂ دلدار کہاں

محرم سے ہاتھ اُٹھا کے یہ سمجھاتی ہیں مجھے
ہوتا ہے دستِ موج سے خطرہ حباب کو

تُم ایک بوسے کے لئے انکار کر گئے
ہم سے جو مانگو جان تو صاحب نہیں نہ ہو

زندگی بھر نہیں اس کوچہ سے جانے والے
جھک کے بیٹھے ہیں ترے ناز اٹھانیوالے

عاشق سوختہ جاں دور کھڑا جلتا ہے
پاس بیٹھے ہیں وہاں آگ لگانیوالے

کون کہتا ہے کہ جلتا ہے فقط پروانہ
آپ بھی جلتے ہیں عاشق کے جلانیوالے

تواضع جو کرے تعظیم اُس کی چاہئے کرنی
صراحی جھک کے ملتی ہے تو اُٹھ کر جام ملتا ہے

زندگی دشت نوردی سے ہے مانندِ حباب
ہمہ تن آبلے ہیں پاؤں میں چھالے کیسے

دیکھ لینے سے بھی محروم پھرے جاتے ہیں
وہ توجہ وہ تواضع وہ مدارات گئی

سرد آہیں۔ نہ دم سرد۔ نہ چشم نمناک
اب وہ جاڑے گئے گرمی گئی برسات گئی

فصل بہار توبہ شکن سر پہ آگئی
تقوی کو نذر پیر خرابات کیجئے

صبح فراق بادہ پرستی میں شام ہو
دن کو سیاہ کاریوں سے رات کیجئے

قاضی اگر ہیں آپ تو ہم ہیں شراب خوار
جو جی میں آئے قبلہ حاجات کیجئے

کرلیں گے توبہ پیتے ہیں شعبان میں شراب
کیا ہوش ہیں ہم رمضاں تک نہ آئیں گے

قاضی و محتسب و شیخ بھی متوالے ہیں
آج کیا پیر خرابات کی بن آئی ہے

صفتِ اسپ

دُلدُل ہے سر سے پاؤں تک اسپ پری شیم
رفتار میں ہے کبک تو آہو میانِ رم

نقشِ ہلال نعل سے ظاہر ہے یک قلم
ماہی ہے پشت روئے زمیں سے ہے قدم قدم

فیروزہ عکس رنگ سے ہر شے ہے زمین پر
جمتا ہے اسکی سایہ سے سبزہ زمین پہ

اس باد پا کے وصف ہیں بیحد و بے حساب
طاؤس ہے جمال میں اُڑنے میں ہے عقاب

نظروں میں مثل نور ہے آنکھوں میں مثلِ خواب
گا ہے ہلال نعل ہوا اور گہہ رکاب

شاہانہ دبدبہ ہے نمودار آپ سے
ڈنکے کی چوٹ گرد ہے گھوڑوں کی ٹاپ سے

صفتِ تیغ

تمر تو ضیائے تیغ کا نزدیک و دور تھا
وہ تھی چمک کہ کوہ ہر اک کوہ طور تھا
دشتِ ستم میں وادیٔ ایمن کا نور تھا
ارض و سما میں قبضۂ تیغِ حضور تھا
سایہ زمیں پہ لوٹتا تھا اس کی شان پر
ضو تھی برنگِ قوسِ قزح آسمان پر

بجلی تھی ذوالفقار صفِ کارزار میں
کشتوں کے ڈھیر کرتی تھی ایک ایک وار میں
گاہے جو سو میں تھی تو کبھی تھی ہزار میں
ہل چل سی پڑ گئی سپہ نابکار کی
ترکش سے تنگ تنگ دہن تھا میان کا
چھپنے کو ڈھونڈتے تھے وہ گوشہ کمان کا

جب خود پر پڑی تو گلے تک اُتر گئی
گردن سے تا بہ سینہ گئی تا کمر گئی
دو کر چلی کمر کو تو وہ زین پر گئی
وہ زین سے زمیں پہ بالشت بھر گئی
نکلی زمین سے تو یہ غل بر محل ہوا
گاوِ زمیں کی شاخ سے پیدا یہ پھل ہوا

صفتِ گیسو

آئی جو رن میں نکہت گیسوئے پرشکن
میدانِ کارزار ہوا وادیِ ختن
سب وصف طولِ زلف میں کوتاہ ہے سخن
سنبل جو ہے یہ زلف تو چہرہ ہے یہ چمن
یا بین ہر دو زلف نہاں روئے شاہ ہے
پھیلے ہیں ہاتھ شب کے ہم آغوش ماہ ہے

صغیر **صغیر**:- منشی محمد اصغر حسین گورکھ پوری۔ خیال بند ہیں۔ مضمون آفریں ہیں۔ مگر ادائے بیان سادہ ہے۔ زیادہ حال نہ معلوم ہو سکا:۔

ہم پر ستم ہوا تو عدو پہ کرم ہوا
او بانیِ ستم یہ ستم پر ستم ہوا
جز شوق کون عشق کی منزل میں تھا رفیق
جز مرگ کون رہبرِ راہِ عدم ہوا
ہم جھومتے چلے سوئے میخانہ اے صغیر
ظاہر جو آسمان پہ ابرِ کرم ہوا

روئیں گے کبھی یہ زخمِ دل بھی	ہنس لیں یہ مجھے رُلا رُلا کر
ہم دیکھ چکے جو دیکھنا تھا	چھپتے ہیں عبث وہ منہ دکھا کر
مٹاتے ہو تو کیوں داغِ دل کو	یہی شاید چراغ آرزو ہو
کیا جانیں خضر چاشنیِ موت کی لذّت	مرنے کا مزہ عشق میں پوچھے کوئی ہم سے
بدنام رہے دہر میں سب چاہنے والے	کچھ عشق و محبّت کا ہوُا نام تو ہم سے
قدم جب دبستاں میں مجنوں نے رکھا	کہا عشق نے پہلی منزل یہی ہے
چھپے لاکھ محشر کے مجمع میں کوئی	لہو خود پکارے گا قاتل یہی ہے
جہاں صورت شمع جلتے ہیں عاشق	خبردار اے دل وہ محفل یہی ہے
بنکے زاہد وہی مسجد میں پڑے رہتے ہیں	جو نکالے گئے ساقی ترے میخانے سے

صغیر

صغیر:۔ پنڈت شیام منوہر ناتھ صاحب کول خلف پنڈت بیجناتھ صاحب کول لکھنوی آپ شروع ہی سے نہایت ذہین و بردبار ہیں۔ ابتدائی تعلیم سینٹنل سکول لکھنؤ میں پائی ۱۸۹۵ء میں بعمر ۱۵ سال انٹرنس پاس کیا۔ اور تمام الہ آباد یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ ۱۹۰۱ء میں انگلش لٹریچر میں ایم۔ اے اوّل درجہ میں پاس کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ لکھنؤ میں انگلش لٹریچر کے پروفیسر رہے۔ جولائی ۱۹۰۴ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ وکالت کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں منصف ہوئے۔ آج کل (۱۹۳۰ء) ایڈیشنل سشن جج ضلع اناؤ ہیں۔

شعرگوئی کا شوق ۱۲ برس کی عمر سے ہوُا۔ اردو۔ فارسی کے دیوان بکثرت زیر مطالعہ رہے ہیں۔ خواجہ وزیر لکھنوی کا رنگ خاص طور پر مرغوب طبع ہوُا۔ حالانکہ شعرگوئی کو کبھی مایہ ناز نہیں سمجھا۔ مگر کلام میں جذبات کی فراوانی اور حسن ادا موجود ہے انتخاب کلام ملاحظہ ہو:۔

نہیں یارا مرے غم کے رقم کا	کلیجہ چاک ہوتا ہے قلم کا

تغافل بھی ہے ظالم کا قیامت
یہ دل مشتاق ہے مشقِ ستم کا

صغیر خستہ جاں سے پوچھئے حال
شروع عشق میں ضبطِ الم کا

رُک گیا نالۂ شب آہِ سحر بند ہوئی
سوگیا جاگنے والا شبِ تنہائی کا

عکس صورت کا تری خوب اُتارا لیکن
آئینہ دل میں ہے قائل تری یکتائی کا

راز زخموں سے کھلا مشقِ ستم کا ان کی
لبِ خاموش پہ الزام ہے گویائی کا

زخمی تیغ ادا سے پوچھئے اسکے مزے
جو خلش کرتی ہے پیدا جنبش ابروئے دست

مجھے پیارا ہے پیری میں بھی دل گو اب ہی ویرانہ
یہ وہ گھر ہے رہی جسمیں کسی کی آرزو برسوں

اسی کا سجدہ کچھ مقبول ہے محرابِ ابرو میں
کری پہلے جو آبِ تیغ قاتل سے وضو برسوں

نہ چھوٹا جامۂ ہستی سے داغِ معصیت اپنا
بہت اشکِ ندامت نے عبث کی شست و شو برسوں

دلیل پختہ مغزی ہے یہ سودائی پری رو میں
کہ تصویر خیالی سے رہی ہے گفتگو برسوں

جنوں میں خود فراموشی سی پایا تھی طلب جسکی
تھکائے عقل نے کیا کیا نہ پائی جستجو برسوں

قیامت ایک ہنگامہ ہے اسکو اس سے کیا نسبت
کہ برپا سینکڑوں فتنے تری محفل میں ہیں بیٹھے

علوئے فکر کا ادنےٰ سا دیکھئے اعجاز
کہ آسمان پہ پہنچا دیا زمینوں کو

لڑی جو آنکھ دل زار چور چور ہوا
ذرا سی ٹھیس قیامت ہے آبگینوں کو

نگاہِ شوخ کا ہے شکوۂ ستم پہ جواب
یہی رہی ہے رہیگی یہی ادا میری

چھیڑو نہیں ہوائے آرزو کے جسم خاکی ہے
خدا جانے کہاں یہ کشتی بحرِ فنا ٹھہرے

قدم رکھتے ہی گلشن میں شگوفے کھل گئے صد ہا
خدا جانے لگائے آگ کیا کیا گر صبا ٹھہرے

شب و روز

پچھلا پہر ہے رات کا ہے خوشنما سماں
ہونے لگے ہیں صبح کے آثار کچھ عیاں

آتی ہے تن میں تازہ نسیم سحر سے جاں
تڑکے کی چاندنی کی لطافت ہو کیا بیاں

یوں سقفِ آسماں میں ہیں تارے جڑے ہوئے
موتی ہیں جیسے فرش پہ بکھرے پڑے ہوئے
زرّیں ہے پرتوِ شہِ خاور سے روئے شرق
وہ تاب ہے کہ ابر میں جا کے چھپی ہے برق
موجوں میں بحرِ نور کی عالم ہوا ہے غرق
رکھا ادب سے زیرِ قدم آسماں نے فرق
پھر خلق خوابِ مرگ سے آئی حیات میں
پھونکی گئی ہے روح نئی کائنات میں

صفا

صفا :- سید ذوالفقار علی خاں شرفائے لکھنؤ میں تھے، فنِ سخن میں حضرت میر تقی میر سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ زمانہ کی گردش نے لکھنؤ سے بنگالہ پہنچایا۔ وہاں کی شاعرانہ صحبتوں میں اپنا رنگ خوب جمایا۔ امرا و رؤسا کی مدح میں قصائد پڑھے اور موردِ انعام ہوئے۔ بنگالہ سے چینا پٹن میں آئے وہاں بھی لوگوں کے دلوں پر اپنی قابلیت کے نقش بٹھائے۔ میر ابوالقاسم میر عالم مدار المہام کے زمانے میں حیدرآباد پہنچے۔ جب اربابِ دکن پر ان کے فضل و کمال کا حال روشن ہوا۔ تو سب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مہاراجہ چندو لال کی سرکار میں بڑی قدر ہوئی۔ پانچ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ مرتے دم تک مہاراجہ کی رفاقت میں بسر کی۔ اردو۔ فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، کلیات میں چند مثنویات بھی شامل ہیں جنہیں مثنوی چھومنتر خاص طور پر قابلِ دید ہے۔ کلام ملاحظہ ہو:-

پیرِ نابالغ اگر ہو کے جیا مرد تو کیا
اُس کو یکساں ہے جو انمرد کہ بڈھا ہونا
رتبۂ فکر تو اب عقل سے گذرا ہے صفاؔ
ایک زنجیر کا باقی ہے بکھیڑا ہونا
میں جا کے کیا کروں گلزار جی نہیں لگتا
بغیر تیرے کہیں یار جی نہیں لگتا
خدا کے واسطے منہ بند رکھیو اے ہمدم
ہمارا ذکر کچھ اس کے حضور مت کیجو
سنبھل کے ٹانکیو ٹک زخمِ دل کو او جرّاح
یہ حکم ہے کہ رفو دور۔ دور مت کیجو
صفاؔ جو چاہیو کیجو معاف ہے لیکن
گلہ کسی کا کسی کے حضور مت کیجو
آہ کس سے کہوں ان آنکھوں کی نادانی کو
گھر کتیئں آگ لگا دوڑتے ہیں پانی کو

حسن گفتار نے طوطی کو قفس میں ڈالا	بھاڑ میں ڈالئے کیا ایسی زباں دانی کو
کھینچا اک نالہ ہیں صیاد کو سوئے گلشن	مرحبا مرغِ چمن تیری غزل خوانی کو
ہنسی آتی ہے صفا روئے کس کس غم کو	دل کی نادانی کو یا غم کی فراوانی کو
غنچہ و گل سے غرض کیا مرغ حسرت زا دکو	آنکھ جو کھولی تو دیکھا صورت صیاد کو
ایک نالہ کر دکھاؤں چرخ کج بنیاد کو	کیا کروں یاری نہیں دیتا جگر فریاد کو
خال سیہ نہیں ہے اس ابرو کی خم تلے	سید ھے ہلال تھے ہمیں طاق حرم تلے

صفا ۔ پیران شاہ صفا دہلوی خلف رتن شاہ مرحوم شاگرد حضرت خاقانی ہند ذوق مغفور۔ مہاراجہ شیو دان سنگھ والی الور کے پاس ملازم رہے، اسکے بعد جے پور میں نواب احمد علی خاں رونق خلف نواب ٹونک کے پاس ملازم رہے۔ بڑے پر گو تھے بہت حاضر طبیعت پائی تھی۔ ستر ستر، اسی۔ اسی شعر کی غزلیں کہتے۔ دہلی میں آکر ۱۸۹۰ء سے قبل انتقال کیا۔ کلام یہ ہے:۔

خیال مہ لقا ہے اور میں ہوں	دل حسرت زدہ ہے اور میں ہوں
نہ لائی بوئے زلف اسکی یہانتک	صبا دامن ترا ہے اور میں ہوں
مُوا جس دامن صحرا میں مجنوں	وہی دشت بلا ہے اور میں ہوں
صفا واں دیکھئے پہنچوں گا کیونکر	یہ بخت نارسا ہے اور میں ہوں
میں نے بوسہ طلب کیا تو کہا	یہ خرابی ہے منہ لگانے میں
چپ رہیئے خدا کے لئے اے حضرتِ ناصح	اس وقت خدا جانے مرا دھیان کدھر ہے
رنج و غم گھٹ جائیں گر دو چار دن کی بات ہے	یہ بھی دن کٹ جائینگے دو چار دن کی بات ہے
مرا دل ہے جس پہ شیفتہ مجھی جس کی حسرت دید ہے	بت مہ لقا ہے وہ خوش ادا کہ نہ دیدہ ہے نہ شنیدہ ہے

صفا ۔ رائے منولال ولد رائے پورنچند کالیستھ سکسینہ۔ لکھنؤ وطن تھا اور وہیں اخبار نویس شاہی۔ اور مہاراجہ جھاؤلال (نائب نواب آصف الدولہ بہادر) کے

داماد تھے بعض تذکرہ نویس انہیں منشی منڈولال زار اور بعض مصحفی کا شاگرد لکھتے ہیں مگر بیشتر اس بات پر متفق ہیں کہ انہیں میر تقی میر سے تلمذ تھا۔ صاحب دیوان گذرے ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر ان کا ضرب المثل ہو گیا ہے۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری ہیں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری ہیں

کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو:۔

سامنے تیرے جو ہو حور و پری کا منہ کیا
کیا چلے آگے ترے کبک دری کا منہ کیا

کیا ہنسی آتی ہے مجھکو حضرت انسان پہ
فعل بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پہ

صفا صفا۔ مولوی عبدالحی مرحوم بدایونی وکیل بلاری ضلع مراد آباد۔ آپ شیخ عبداللہ مکّی کی اولاد سے تھے۔ یہ خاندان ۱۱۶۸ھ سے بدایوں میں آباد ہے۔ صفا مرحوم کو فن شعر میں حضرت مولانا دلدار علی مذاق بدایونی شاگرد حضرت ذوقؔ مرحوم سے تلمذ تھا۔ شعر کے حسن و قبح پر کھنے میں خداداد قابلیت پائی تھی۔ اخبار نویسی کے ابتدائی دور میں اُردو اخبار سید الاخبار دہلی۔ لارنس گزٹ میرٹھ کے واقعہ نگار تھے، زبان اردو کی ترقی کے بارے میں بھی زبردست مضامین لکھے کئی کتابیں آپ کی تصنیف سے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک "تذکرہ شمیم سخن" بھی ہے۔ اس کے پہلے حصہ میں شعرائے ذکور اور دوسرے حصے میں شاعرہ عورات کا حال درج ہے، کلام میں اپنے اُستاد کا تتبع کرتے ہیں:۔

نہ لگی آنکھ صبح تک میری
کس کے آنے کا انتظار رہا

کیا قیامت زا تری رفتار ہے
جب چلا تو حشر برپا ہو گیا

ذبح ہو کر پائی عمر جاوداں
مجھ کو قاتل بھی مسیحا ہو گیا

روئے جاناں کی چمک گر دیکھ پائے آفتاب
حشر تک پھر منہ نہ دنیا میں دکھائے آفتاب

رفتار تیری دیکھی ہے گلشن میں صبحدم
چلتی ہے اس ادا سے نسیم سحر کہاں

صورت وہ پیاری پیاری ادائیں وہ دلربا
اس شکل اور ادا کے ہیں شمس و قمر کہاں

ہم وہ بیہوش ہیں پی جائیں ابھی خم کے خم
دیکھ لیں کچھ بھی جو ساقی کا اشارا ہوتے
کیا صاف دل سے حرف محبت مٹا دیا
کورا ورق جو بھیجا ہے بدلے جواب کے
پہلی شب وصال ہے نیچی نگاہ ہے
پردے چھٹے ہوئے ہیں حیا و حجاب کے

صفا

صفا:۔ مولوی محمد عبدالواسع صاحب تلمیذ حضرت امیر مینائی لکھنوی۔ سیدھے سادے شعر کہتے ہیں:۔

مے پیکے بیحجاب جو وہ ہوں تو میں کہوں
اب کیا ہوئی وہ شرم وہ انکار کیا ہؤا
یہ مشکل کیجئے آسان ابرو کے اشارے سے
ہمارے قتل کو کیوں آپ خنجر مول لیتے ہیں
تیرے دیوانوں کا سودا بھی کیا پُرلطف سودا ہے
جسے وہ شوق سے سر اپنا دیکر مول لیتے ہیں
دکھا کر چشم میگوں ساقیا ہوش و خرد لیلے
نہ ہم ہیں جام کے گاہک نہ ساغر مول لیتے ہیں
خوشی سے مرنے والے جاکے سو رہتے ہیں مرقد میں
عجب گھر ہے یہ جس کو جان دیکر مول لیتے ہیں
کبھی شہرہ تھا بازار جنوں میں قیس و وامق کا
پر اب وہ بھی یہ سودا مجھ سے آکر مول لیتے ہیں

صفا

صفا:۔ مولوی عبدالحق صاحب رامپوری۔ شاگرد حضرت جلال لکھنوی مرید شہید مرحوم کہنہ مشق پختہ مغز شاعر تھے۔ داغ۔ امیر۔ جلال کے مشاعرے دیکھے تھے۔ رامپور کی گذشتہ شاعرانہ صحبتوں میں شریک رہے، روزمرہ زیادہ لکھتے مگر کہیں کہیں نازک خیالی کی بھی مثالیں نظر آتی ہیں۔ عرصہ دراز تک سماعت سے محروم رہکر کچھ عرصہ ہؤا اسّی برس سے زیادہ عمر پاکر انتقال کیا۔ نعتیہ اشعار خوب کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سات بیاضوں میں کلام کو جمع کیا ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو:۔

ان بتوں سے فیض ہم اے برہمن پائینگے کیا
خود نہیں ملتے خدا سے پھر یہ ملوائینگے کیا
اپنے کشتہ سے یہ کہتا ہے وہ سفاک جہاں
تیر کیوں دل میں ٹھہرتے جو نہ ارماں ہوتا
شاید یہی اک دیکھنے والوں میں ہے تیرے
آئینہ نے کیا دیدۂ حیراں نہیں دیکھا
مچھلی جو اس کے کان کے بالے کی آئی یاد
تڑپا کیا میں ماہیِ بے آب کی طرح

سر بکف مجمع عشاق ہے حاضر در پر | یہ تماشا بھی ذرا گھر سے نکل کر دیکھو
بھیج دو کاٹ کے سر بھی اسے دل کہتا ہے | عشق میں کام یہ مشکل ہے مگر کر دیکھو
دکھاتے ہیں دل کو دوا کرنے والے | بناتے ہیں باتیں دعا کرنے والے
سناتے ہیں جو طور پر لن ترانی | وہی چشم و دل میں ہیں جا کرنیوالے
تھی انانیت حجاب جلوۂ دیدار دوست | پردہ یہ اٹھتا تو موسیٰ روئے جاناں دیکھتے
یارب نگہ شوق میں اتنا اثر آئے | وہ پردہ نشیں پردہ سے باہر اگر آئے
نہ کراہی دردِ فرقت الہی بیدردی سے خون اس کا | کہ دلمیں وصل کی حسرت بڑے نازونکی پالی ہے
خاطر بلبل ناشاد نہ توڑ او گلچین | چار دن پھولوں کو شاخوں میں لگا رہنے دے
خیر کعبہ میں صنم رہنے نہ پائے نہ سہی | میرے دل میں تو کسی بت کو خدا رہنے دے

صفا

صفا:- میرزا سعید الدین دہلوی عرف میرزا نتھے شاگرد و برادر میرزا رحیم الدین وحید نوجوان شاعر ہیں۔ محاورہ بندی اور لطف زبان کے مالک ہیں۔ افسوس کہ زیادہ اشعار دستیاب نہ ہوئے۔

پوچھتے ہیں کہ کہاں رہتے ہو اور جانتے ہیں | کہ بجز دشت ٹھکانا نہیں دیوانوں کا
گھر میں بیٹھے ہیں اور اتنا نہیں کہتی منہ سے | کون ٹکراتا ہے دیوار سے سر دیکھو تو
اے صفا تو اسے غنیمت جان | جو گھڑی لٹ گئی مصیبت کی
مانا کہ وہ بے رنج ہے اور راحت جاں ہے | کچھ ہو یہ صفا جی کا لگانا ہی زیاں ہے

صفدر

صفدر:- سید فرزند حیدر۔ خلف میر امیر حیدر فرخ آبادی تلمیذ میر علی اوسط رشک و اسمٰعیل حسین منیر۔ بڑے عاشق مزاج شوخ طبع ذہین شعر گوئی میں منہمک۔ اور سرکار نواب کلب علیخاں میں بزمرۂ شعرا منسلک تھے۔ بہت مشاق اور عالی خیال سخنور تھے زبان پیاری لکھتے تھے۔ روزمرہ صاف اور شستہ تھا۔ انتخاب کلام نذر ناظرین ہے

کہیں کیا ہجر میں جیتے جو اے صفدر گذرتی ہیں | اجل کا سامنا ہے نزع کا عالم ہے مرتے ہیں

یہ مدعا ہے نہ ہو کوئی مدعا یا رب
یہ آرزو ہے۔ نہ ہو کوئی آرزو مجکو

منہ دیکھنے کی اے جانِ محبت نہیں اچھی
رہنے دو تم اپنی یہ عنایت نہیں اچھی

وہ دیکھ کے کہتے ہیں خرابہ مرے دل کا
اُجڑی ہوئی بستی میں سکونت نہیں اچھی

دل کیلئے جوہر ہے بڑا دل کی صفائی
آئینہ خاطر میں کدورت نہیں اچھی

صفدر:- عالیجناب نواب صفدر علیخاں بہادر۔ خلف الرشید نواب محمد سعید خاں بہادر مغفور والی ریاست رامپور۔ تربیت یافتہ ظلّ عاطفت برادر خود نواب یوسف علیخاں بہادر ناظم مبرور۔ عالم شباب میں شعر وسخن کا شوق ہوا۔ حضرت امیر مینائی سے استفادہ کیا تھوڑے ہی عرصہ میں مرتبۂ کمال حاصل کر لیا۔ عاشقانہ کلام نہایت پاکیزہ پُر لطف اور شیریں ہے خصوصًا معاملہ بندی کے اشعار قابل قدر اور نمکین ہیں۔ آپ نے فنِ مصوری نقاشی میں بھی اچھی مہارت حاصل کی تھی۔ فنِ معمّا میں آپ کی ایک کتاب "ارژنگ صفدر" شائع ہو چکی ہے، نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد کئی سال تک کونسل ریجنسی رامپور کے پریزیڈنٹ رہے ہیں۔ کلیات میں ہر صنف نظم موجود ہے، نعتیہ قصائد بھی خوب خوب لکھے ہیں آپ کا کوئی شعر لطف سے خالی نہیں ہوتا۔ نہایت شوخ اور چلبلی طبیعت پائی ہے کثرت مشق کا یہ عالم تھا۔ کہ معمولی مضامین کو بھی آسمان پر پہونچا دیا ہے۔ آپ کا کلام تغزّل کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

کسی سے نہ جب تک سروکار تھا
بڑے چین سے یہ دلِ زار تھا

گرہ کھلتے ہی زلف پر پیچ کی
جو آزاد تھا وہ گرفتار تھا

ہو گیا دل بھی انہیں کی جانب
یہ بھی کمبخت ہمارا نہ ہوا

کلیجہ پکڑ کر ابھی بیٹھ جاتے
سُنا ہی نہیں تم نے نالہ کسی کا

قصد تو روز قیامت تھا بہت فریاد کا
پیار لیکن آگیا منہ دیکھکر جلّاد کا

ایک میرے قتل نے دو بوجھ رکھے دو طرف
تیرے سر پر خوں میرے سر پہ احسان رہ گیا

ہلال و بدر دونوں ہیں تری تصویر کی خاکے
یہ صورت ہے لڑکپن کی وہ نقشہ ہے جوانی کا

آپ ہی بسمل کیا تیغ نگاہِ ناز سے
آپ ہی کہتا ہے وہ یہ کیا ہوا کیونکر ہوا

اُمنگ پر آ کے محو زینت کبھی جو وہ گلعذار ہوگا
پسینگے مہندی یہ دل گلو نگی چمن میں خون بہار ہوگا

نہ کھینچو تلوار کیا ہے حاجت ہمارا دل ہے شہید ابرو
یہ آپ ہو جائیگا تصدق یہ آپ تم پر نثار ہوگا

پیو اچھپا کر کبھی جو پی لی تو فائدہ کیا ہے اس سے قاضی
نہ میکدے میں جگہ ملیگی نہ میکشوں میں شمار ہوگا

یہی ہیں چالیں اگر تمہاری تو دیکھنا مر مٹینگے ہم بھی
جہاں پڑیگا قدم تمہارا وہیں ہمارا مزار ہوگا

یہ رات بھر کی ہیں ساری جلسے جہاں ہوئی صبح پھر تو صفدر
نہ شیشہ ہوگا نہ جام ہوگا نہ شمع ہوگی نہ یار ہوگا

سفر میں آ کر کبھی ان آنکھوں نے روئے اہل وطن نہ دیکھا
قفس میں ایسے ہوئے مقید کہ خواب میں بھی چمن نہ دیکھا

چل اے تیغ گردن پہ دم لیکے میری
ذرا دیکھ لینے دے قاتل کی صورت

عزیز احباب سب روتے ہیں صفدر میری بالیں پر
بدن سے روح جاتی ہے کہ ہوتی ہے دلھن رخصت

ہیں نے کہا جواں سے کہ شب کو یہیں رہو
آنکھیں جھکا کے بولے کہ کس اعتبار پر

حوصلے سے حوصلے نکلے ولولے سے ولولے
آج وہ سب مٹ گئے گور غریباں دیکھکر

آنکھ جب بسملوں کی اُونچی ہو
سر گرے کٹ کے پائے قاتل پر

اور اک تیر تاک کر مارا
رحم آیا انہیں جو بسمل پر

صفدر بتوں کی چاہ سے مانع نہیں کوئی
دل دو۔ مگر کسی کے ذرا دل کو دیکھ کر

کبھی بوسہ مانگا دہن کا تو بولے
چلو تم نہیں منہ لگانے کے قابل

جی بھر کے کریں گے دل کا ماتم
چھوٹی سی لحد بنائیں گے ہم

نسریں میں تم ہو بیلے میں تم یاسمن میں تم
حقا برنگ بو ہو ہر اک پیرہن میں تم

مسجد میں میکدے میں کلیسا میں دیر میں
دیکھا تو تھے چراغ ہر اک انجمن میں تم

کسی کی یاد نے بخشا ہے ایسا ذوق خاموشی
کہ بت بنکر رہے ہیں ہم خدا کے روبرو برسوں

بہت آشنا ہیں زمانے میں لیکن
کوئی دوست درد آشنا چاہتا ہوں

ہے صبحِ شبِ وصل بھی کس لطف کی صحبت
پھر ہاتھ نہ آئے گا جو لینا ہے تو لے لو

نہیں آرام اس کو ایکدم مثلِ دلِ عاشق
چھِڑکا یا مے سے اک عالم کو ساقی تو نے محفل میں

جاتا ہے کوئی سوئے حرم کوئی سوئے دیر
اُٹھ اُٹھ کے درِ دل ہی تجھی چھیڑنے سے کام

میں نے کہا کہ تم نے مَیِ غیر کو دی تھی کس طرح
کم سن ہیں آئینہ ابھی پیشِ نظر نہیں

شرم آنکھ میں ہی آنکھ ہے پنہاں نقاب میں
کہلائیں مست توبہ بھی ہم رند اگر کریں

ہیں آوارہ وہ سودائی ہیں سرگرداں وہ دیوانہ
صفدر زباں سے رازِ محبت عیاں نہ ہو

شکوؤں کا کچھ جواب نہ جب ان سے بن پڑا
وہ تیغِ ناز ہو یارب رواں آہستہ آہستہ

جگہ ہی اسکی دلمیں جان من اور دلمیں حسرت ہے
وہ میرے پہلو سے گھر سدھارے اِدھر کی دنیا اُدھر ہوئی ہے

گذر گئی جب شبِ جوانی تو کیا رہا لطف شعر خوانی
چمن میں بلبل چہک رہی ہیں شگوفہ و گل مہک رہے ہیں

بہت سی کی ہم نے سیرِ عالم بس اب ارادہ ہے یہ مصمم
دل ہمارا مستِ عشقِ نرگسِ مستانہ ہے

دِل تو پہلو میں وقتِ خواب نہ تھا

ہم چھیڑ پہ آمادہ وہ شرمائے ہوئے ہیں
ابتک دلِ بیتاب کو ٹھیرائے ہوئے ہیں

نگاہِ ناز بھی کیا ہے تمہارے بیقرار و نمیں
ادھر بھی ایک ساغر ہم بھی ہیں امیدوار و نمیں

پھرتے ہیں ڈھونڈتے تجھے انساں کہاں کہاں
کیا جانے تو کہ بیٹھے ہیں ہم کس خیال میں

اس نے منگا کے جامِ زہر مجھ کو پلا دیا کہ یوں
کیا لیں مری خبر انہیں اپنی خبر نہیں

رہتا ہے اب حجاب بھی اُن کا حجاب میں
قاضی پیئیں شراب تو ان پر گماں نہ ہو

نہ کچھ دل کی خبر مجھ کو نہ کچھ میری خبر دل کو
دل آشنائے درد ہو لب پر فغاں نہ ہو

گردن میں میری ڈال دئے مسکرا کے ہاتھ
مزے لے لے کے تڑپے نیمجاں آہستہ آہستہ

نکالو میرے پہلو سے سناں آہستہ آہستہ
قیامت آئی ہے یا الٰہی یہ آج کیسی سحر ہوئی ہے

زبان ہے اپنی بند صفدر خموش شمعِ سحر ہوئی ہے
سرور میں ہم بہک رہے ہیں نہ ہاتھ خم سے جدا کرینگے

گلی میں اُس بت کی بیٹھ کر ہم ہمیشہ یادِ خدا کرینگے
کیا غرض ساقی سے ہے کیا حاجتِ پیمانہ ہے

پھر تڑپ کر جگا دیا کس نے

ہر چمن میں پھرے بہ رنگ نسیم / لالہ رویوں کی جستجو نہ گئی

جو ہم سے دل کو لیا ہے تم نے تو اُس کو رہنے دو پاس اپنے / غریب اچھا ہی یا بُرا ہے مطیع فرماں تو آپ کا ہے

غضب کی چیز ہے یہ حسن ۔ انسان لاکھ بچتا ہے / مگر دل کھنچ ہی جاتا ہے طبیعت آ ہی جاتی ہے

یہ سو سو بار اُٹھتا کیوں ہے صفدر ماجرا کیا ہے / خفا ہے دلربا کی طرح شاید درد بھی دل سے

یہی راہ و روش اپنی ہی رہی وحشت کے عالم میں / بیاباں میں کبھی پہنچے کبھی گلزار میں آئے

نہیں پروا ہمارا سر جو کٹ جائے تو کٹ جائے / تھکے بازو نہ قاتل کا نہ بل تلوار میں آئے

جو بعد مدت کے آ گئے ہو نہ جاؤ جلدی ذرا تو ٹھہرو / ابھی تو نظر سے دیکھ لینے کی آرزو بھی نہیں گئی ہے

یوں زیر قدم نہ دل کو پیسو / پس جائے نہ آرزو تمہاری

قطعہ

تب لطف زندگی ہو جب ابر ہو چمن ہو / پیش نظر ہو ساقی ۔ پہلو میں گلبدن ہو

لبریز بادہ شیشے ۔ دور شراب گلگوں / معشوق نوجواں ہو ۔ جام مے کہن ہو

مجمع مصاحبوں کا یاران بے تکلف / جن سے کہ ربط باطن مانند روح و تن ہو

مذکور حسن لیلے ۔ تصویر ناز شیریں / گہہ داستان مجنوں گہہ ذکر کوہکن ہو

بزم طرب مہیا جلسہ پری رخوں کا / آغوش میں وہ دلبر جو جان انجمن ہو

گہہ رخ ہو اسکے رخ پر گہ لب ہوں اسکے لب پر / آب بقا نصیب کام و لب و دہن ہو

طوق کمر کسی دم یہ دست شوق اپنا / طوق گلو کسی دم وہ زلف پر شکن ہو

ہنگام وصل جاناں ایسا ہو ربط باہم / وہ روح میں بدن ہوں میں روح وہ بدن ہو

صفدر یہ عیش مجھکو ہر روز ہو میسر / کیونکر ادائے شکر الطاف ذوالمنن ہو

صفدر :۔ منشی صفدر بیگ ۔ ساکن کرنال ۔ مقیم شاہجہان آباد ۔ شاعر ذی استعداد تذکرۂ گلستان سخن کی ترتیب کے وقت دہلی میں رہتے تھے ۔ کلام میں درد ہے ۔ صفدر

مضامین غم سے لگاؤ ہے :۔

پلاتے مے نہ عدو کو نہ مجھکو رشک آتا
جگر نہ سینہ میں جلتا نہ دل تپاں ہوتا

یہ دل کی آگ دکھائیگی رنگ کیا صفدر
کہ میرے سینے کے باہر نہیں دھواں ہوتا

اس طرح سمجھا مجھے ناصح کہ دل سمجھے مرا
پند کرنا اور ہے اور سر پھرانا اور ہے

صفدر

صفدر :۔ سید صفدر نواب مرحوم۔ خلف سید مہدی نواب و دختر زادۂ نواب سید لطف علی خاں مرحوم سی۔ آئی۔ ای۔ محلہ گذری عظیم آباد میں رہتے تھے، حضرت شاد عظیم آبادی سے تلمذ تھا۔ خلیق و منکسر المزاج تھے۔ بعض پریشانیوں اور افکار سے تنگ آکر حالت اضطرار میں ایک کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے اوپر ایک طپنچہ سر کرلیا اور فوراً جان بحق تسلیم ہوئے۔ چند شعر اور مندرجہ بالا حالات گلشن حیات سے اخذ کر کے ہدیہ ناظرین کئے گئے ہیں :۔

تجھے لازم ہے میرا ساتھ دے اے بیخودی میری
کسی پہ راز کھل جائے نہ راز دل چھپانے کا

ستانے میں کوئی حسرت نہ رہ جائے مٹانے کی
مٹانے میں کوئی پہلو نہ رہ جائے ستانے کا

کچھ ایسی بیخودی اب ہے کہ آپ اپنے کو بھولا ہوں
مٹانا سا مٹانا ہے ٹھکانا ہے مٹانے کا

جزائے خیر دے اللہ تجھ کو میری تنہائی
سرا تو نے چھپا رکھا شب غم کے فسانے کا

صفدری

صفدری :۔ میر صادق علی خلف میر قمر الدین سونی پتی۔ شاگرد میر نظام الدین ممنون خاندانی شاعر تھے، غدر سے پہلے مقتول ہوئے۔ یہ اشعار نذر ناظرین ہیں :۔

ہاتھ مت رکھو دل پر آتش و پر تسکین پر
نہ پھپھولے کہیں پڑ جائیں کف سیمیں پر

شاید نسیم مصر کا آتا ہے قافلہ
خوشبو کی اک لپٹ سی ہے بیت الحزن کے پاس

نہیں معلوم دلمیں صفدری کے درد کیسا ہے
کہ ہر دم ہاتھ سینے پہ وہ بے تابانہ رکھتے ہیں

آنکھ اپنی یہ کس کے در دنداں پہ پڑی ہے
جو اشک مسلسل ہے وہ موتی کی لڑی ہے

صفی :۔ میر مومن حسین امروہہ ضلع مراد آباد تلمیذ ذکی مراد آبادی۔ زباں کا چسکا تھا۔ اوسط درجہ

کی لفظی صناعی سے کلام کو سجاتے تھے۔ کبھی مضمون آفرینی کی طرف بھی مائل ہوتے تھے
ایک دیوان ان سے یادگار ہے۔ انتخاب یہ ہے:۔

جلتا ہوں میں تصوّر دندانِ یار میں
موتی پرو دئیے ہیں رگِ جاں کے تار میں

مرتا ہے کون کون سا دیوانہ دیکھئے
کِس کِس کے پھول ہوتے ہیں اِکی بہار میں

کرو گے ستم مہرباں کیسے کیسے
سُنیں تو ذرا ہم بھی ہاں کیسے کیسے

نمک جب چھڑکتا ہے زخموں پہ قاتل
مزے لیتے ہیں نیمجاں کیسے کیسے

بچاتا ہے جو سب کو دختِ رز سے
ضرور آنکھ اس پہ قاضی کی پڑی ہے

رہیئے آنکھوں میں اگر ایسا ہی پردا ہم سے ہے
سات پردوں میں نہ کیوں چھپئے جو چھپنا ہم سے ہے

پیو رند وادب کیا شیخ جی کا
یہی اُن کی بھی کیفیت کبھی تھی

یہ کیا تم نے کہا صاحب کہاں ہیں دل کہاں تیرا
جہاں دل ہو وہیں تم ہو جہاں تم ہو وہیں دل ہے

یہ کیا ہے لال لال ان آنسوؤں میں
کہیں ٹکڑے نہ ہوں میرے جگر کے

تلخ کامی مری دنیا کو مزہ دیتی ہے
موت بھی تو مجھے جلنے کی دعا دیتی ہے

میٹھی گرم اچھی طرح دزدِ حنائی کر لی
اب کسے حسن کی سرکار سزا دیتی ہے

صفی:۔ منشی کوڑے سنگھ خلف لالہ مہر سنگھ زمیندار موضع رسولپور ضلع میرٹھ تلمیذ ذکی دہلوی و شوکت میرٹھی۔ ذوقِ شاعری کے ساتھ ہی طبیعت تصوف کیطرف مائل تھی۔ اور صوفی شاہ نجم الدین سے عقیدت رکھتے تھے۔ جیسا کہ ایک مقطع سے ظاہر ہے

بفیضِ حضرتِ مرشد کہ کہئے نجم دین انکو
صفی طینت میں تیری پارسائی ہوتی جاتی ہے

دیوان ان کی وفات کے بعد چھپا۔

مندرجۂ بالا حالات اور مندرجہ ذیل اشعار تذکرۂ ہندو شعرا مصنفہ خواجہ عشرت لکھنوی سے اخذ کر کے ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں:۔

طلسم جلوۂ کن آئینہ ہے خود نمائی کا
تصوّر دل میں غیر از ذات لائیں ہم کہاں اپنا

عدم آغاز عالم ہے فنا انجام دوراں ہے
مثال خواب حائل ہے یہ قصہ درمیاں اپنا

چمن کے رنگ تغیّر کا ہے نظر سے خطاب
وہ گُل ہے کونسا جس کو غم خزاں نہوا

عبرت پذیر گردشِ دوراں سے ہو صفی
جائے بہار صاف نمود خزاں ہے اب

اگر چشم حق بیں سے ہم دیکھتے ہیں
تو دل ہی میں دیر و حرم دیکھتے ہیں

صفی:۔ سید علی نقی نام۔ پدر بزرگوار کا نام مولانا سید فضل حسین صاحب جو آخری تاجدار اودھ کے بھائی شاہزادہ سلیمان قدر بہادر مرحوم کے معتمد تھے۔ وطن مبارک لکھنؤ۔ زیدی سادات سے ہیں۔ مورث کے مختصر حالات خود جناب صفی کی اس نظم سے ظاہر ہونگے :۔

عیسیٰ بن زید حضرت شہزادہ حسین
ہیں دونوں زید ابن علی کے یہ نور عین

شہزادہ حسین کا ذوالدمعہ ہے لقب
منسوب انہیں سے غزنویوں کا حسب نسب

غزنی سے آئے شاہ مبارک جو سوئے ہند
خاک قدم سے اُنکے بڑھی آبروئے ہند

دہلی میں اُنکا نام ونشاں برقرار ہے
بالائے حوض شمسی ابھی تک مزار ہے

پنگوڑیوں کے مورث اعلیٰ بڑے ولی
اولاد میں انہیں کے ہیں سید جلال بھی

شاخیں جدا جدا ہیں مگر ایک ہے چمن
اجداد کا ہمارے بھی پنگوڑ تھا وطن

جاٹوں کی تیغ ظلم سے جب خون میں نہائے
چھوڑا وطن بزرگ ہمارے اودھ میں آئے

دل سے قریب گو کہ بظاہر بعید ہیں
ہم بھی چراغ مشہد زید الشہید ہیں

حضرت صفی کی ولادت ۳ر جنوری ۱۸۶۲ء مطابق یکم رجب ۱۲۷۸ھ کو لکھنؤ میں ہوئی پانچویں سال مکتب نشینی ہوئی۔ مولوی نجم الدین کاکوروی سے فارسی اور شیخ حافظ علی بلہردی اور سید علی میاں صاحب کامل کے والد ماجد مولوی احمد علی صاحب محمد آبادی سے درسیات فارسی و عربی کی تکمیل کی۔ اور اپنے عزیز حکیم سید باقر حسین مرحوم سے فن طب کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد امین آباد ہائی سکول اور کیننگ کالجیئیٹ سکول

لکھنؤ میں انٹرنس تک انگریزی پڑھی۔ اور لال سکول اور برانچ سکول متعلقہ کیننگ کالج لکھنؤ میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ پھر اودھ کے محکمہ دیوانی میں مستقل ملازمت کا سلسلہ جون ۱۸۸۳ء سے شروع ہوا۔ اور سلطان پور۔ رائے بریلی اور لکھنؤ میں مختلف عہدوں پر رہ کر عدالت خفیفہ کی پیشکاری تک پہنچکر ۱۹۲۲ء میں سرکاری ملازمت سے پنشن حاصل کی۔

آپ فطرتی شاعر اور موزوں طبع ہیں۔ لڑکپن ہی سے آپ کے کھیل میں بھی شاعری کی جھلک نظر آتی تھی۔ چنانچہ پہلا شعر جو آپ نے سات آٹھ سال کی عمر میں کہا آپ کے قادر الکلام شاعر ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ وہ یہ ہے:۔

خواب میں صورت دکھانا کیا ضرور
سوتی قسمت یوں جگانا کیا ضرور

بارہ سال کی عمر کا ایک شعر یہ ہے:۔

زہے خوش قسمتی اپنی کہاں میں اس کے قابل تھا
وہ آکر اپنے ہاتھوں سے کریں سامان مٹی کا

اوّل اوّل یہ کرتے کہ اپنے سکول کے طلبہ کو غزلیں دیکر مشاعروں میں بھیجتے اور تاکید سے ہدایت کرتے کہ بتانا۔ مشاعرے میں کس کس شعر پر داد ملی۔ اس سے اپنے اشعار کی حیثیت کا موازنہ کر کے دوسری دفعہ بہتر کہنے کوشش کرتے۔ اس طرح خود اپنی طبع سخن سنج کو اپنا استاد بنا کر فائدہ اٹھاتے۔ آپ نے شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔

سب سے پہلے شاہزادہ سلیمان قدر کے داروغہ اچھے صاحب کے ہاں مشاعرے میں شریک ہو کر آپ نے غزل پڑھی جس کی خوب دھوم ہوئی۔ پھر لکھنؤ کے محلہ پاٹانالہ میں اپنے عزیز حکیم باقر حسین کے مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے رہے۔ جہاں

جناب خضر شاگرد مسیحا مرحوم بھی شرکت کرتے اور داد سخن دیتے تھے۔ ملازمت کی وجہ سے اکثر لکھنؤ سے باہر رہنا ہوتا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں جب آپ رائے بریلی آئے تو شاہزادہ باسدیو سنگھ صاحب کے ہاں مشاعروں میں اکثر غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ اسی ایک موقعہ کا آپ کا یہ شعر بہت مشہور ہے:۔

بزم ساقی میں ذرا ہشیار بیٹھیں آج مست	
کل یہیں پہلو سے میرے شیشۂ دل اُٹھ گیا	

۱۸۸۹ء میں آپ لمبی چھٹی لے کر لکھنؤ آئے اس زمانے میں محلہ نرہی کے نواب سید اصغر حسین فاخر مرحوم کے ہاں اعلےٰ پیمانے پر مشاعرہ ہوا کرتا تھا حضرات مشتاق۔ ماہر۔ شبیر علیخاں رسا۔ جلال مرحوم۔ کامل۔ لڈن صاحب۔ خورشید زندہ تھے اور شریک مشاعرہ ہوا کرتے تھے۔ صفی صاحب نے ان صحبتوں میں خوب خوب غزلیں پڑھیں۔ مولانا صفی علاوہ خوشگوار اور نغز گفتار شاعر ہونے کے فن عروض میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ ہر صنف میں آپ کا کلام پایا جاتا ہے خصوصیت کے ساتھ قومی نظم میں آپ کے شاعرانہ تخیل۔ حسنِ ترتیب اور تزئین جذبات کی نظیریں اور کہیں کم پائی جاتی ہیں۔

مولانا صفی ہمیشہ سے ایک آزاد مسلک۔ نیک مزاج۔ خلیق۔ گوشہ نشین اور منصف مزاج ہیں۔ ملی تعصب اور تنگ نظری سے آپ کی طبیعت کو دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس خودسری اور بلند آہنگی کے دور میں ہر خوش مذاق ہندو ہو یا مسلمان۔ شیعہ ہو یا سُنی آپ کی شخصیت کی عزت اور آپ کے کلام کی قدر کرتا ہے۔ آپکی مثنوی تنظیم الحیات پر یو۔ پی کی ہندوستانی اکاڈمی نے بہ حیثیت اعلےٰ نمونۂ شاعری کے پانچسو روپیہ کی رقم بطور صلہ کے مرحمت کی۔ قومی نظموں کے اعتراف میں پبلک نے لسان القوم

کا لقب اور کئی بار طلائی طمغے پیش کئے۔ لکھنؤ کی مشہور انجمن بہار ادب کے آپ صدر ہیں۔ آپ کے احباب اور مداحوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مؤلف تذکرہ ہذا سے آپ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ راقم کے ساتھ بھی مشفقانہ برتاؤ ہے۔ اخلاص اور منکسر المزاجی آپ کے شعار کا جوہر ہے۔ باوجود کہنہ سالی کے آپ کی آواز میں ایک خاص کشش اور قوت ہے۔ مشاعروں میں پڑھنے کا ڈھنگ خاص ہے۔ ایک خاص لحن میں پڑھتے ہیں۔ جو ترنم اور تحت اللفظ کے بین بین ہے۔ آجکل غزل کیطرف کم توجہ ہے۔

صاحب شعر الہند لکھتے ہیں: "بالآخر لکھنؤ بھی اسی رنگ سے متاثر ہوا اور وہاں کے شعرا میں چند لوگوں نے اس رنگ میں سخن گستری شروع کی چنانچہ عزیز لکھنوی جو اس گروہ کے پیشرو ہیں کہتے ہیں ؎

کہتے ہیں ریختہ کو جو اس طرز پر عزیز
کچھ لوگ اور شہر میں ہیں اک ہمیں نہیں

لیکن ان لوگوں میں عام طور پر عزیز لکھنوی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اور ان کا کلام اوّل سے آخر تک دلی کے رنگ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔"

"فٹ نوٹ۔ غالباً ثاقب۔ صفی اور محشر کی طرف اشارہ ہے"[ع۱]۔ ادبی تحقیق میں مولانا عبدالسلام مؤلف شعر الہند کو بہت سے دھوکے ہوئے ہیں۔ یہ ان میں سے ایک ہے۔ غالباً رسالہ معیار سے ان کو یہ دھوکا ہوا۔ راقم کی تحقیق میں طرز مذکورہ صدر اور نئے طرز میں لکھنؤ کا جہاں تک تعلق ہے حضرت صفی کے سر اجتہاد کا سہرا ہے۔ پہل ان کی طبع وقاد سے ہوئی۔ عزیز مرحوم پہلے انہی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ پھر الگ ہوگئے اور یہ صفی صاحب کی صلح پسندی اور ادبی رواداری ہے۔ کہ ان کی زبان اور قلم سے کبھی ایک لفظ نہیں نکلا جو اس برگشتگی کی طرف اشارہ کرتا۔ مختصر یہ کہ دہلی کے رنگ یا نئے طرز سخن کا

ع۱ شعر الہند جلد ۱ - صفحہ ۳۸۴ ۔

تعارف لکھنؤ سے انہیں کی ذات مبارک سے ہوا۔ عزیز نظم بہت کم کہتے تھے۔ استاد متروک کے طرز میں ان کی غزلیں بیشک ہیں۔ اور خوب ہیں۔ اگر صفی صاحب ابتدا نہ کرتے جو سرور جہاں آبادی نادر کاکوروی اور چکبست لکھنوی کی رنگ آمیزیوں کے لئے اُردو شاعری کو جانے کب تک انتظار کرنا پڑتا۔

آپ کا یہ احسان کہ آپ نے نئی شاعری کو جو ایک طبقہ شعراء کے ہاتھوں ملیّات کے طوفان میں ڈوبی جا رہی تھی۔ بچا لیا اور اسے ایک نیا یعنی قومی رنگ بخشا۔ جو ہر طرح سے مستحسن ہے۔ آپ مذاقِ حال کے موافق شاعرانہ تخیل اور جذبات کو طرزِ جدید میں نظم کرنے میں ممتاز ملکہ رکھتے ہیں۔

صفی صاحب کی قومی نظموں میں لختِ جگر جیسی معرکۃ الآرا قومی نظم سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے مثل اور شعراء کے محض قوم کا مرثیہ اور عروج و زوال اور پند و نصائح یا اسی قسم کی باتوں سے نظم کو مرتب نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس میں بھی ایک نئی بات کی ہے کہ مقامی جغرافیہ اور تاریخ کو بقدرِ ضرورت اس طرح شاعرانہ انداز سے بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر نقشہ کھینچنا خیال کی وسعت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ واقعات کو شاعرانہ انداز کا جامہ پہنا کر دل پسند بنانے کی صنعت گری کا جوہر آپ کی قومی نظموں کے خصوصیات سے ہے۔ آپ کی نظموں میں جدید الفاظ اور ترکیبیں بھی بنتی ہیں۔ محاورات اور ضرب المثل کا استعمال تشبیہ و استعارہ کی ندرت اور مسائل علمیہ زمانہ حاضر کے تاریخی واقعات اور رسم و رواج کا جا بجا موزوں اور برمحل تصرف کلام کی زینت اور لطف شاعری کو دوبالا کرتا ہے۔ یوں تو مولانا صفی کے بیشمار معتقد اور شاگرد ہیں لیکن چند تلامذہ ایسے گزرے ہیں۔ جن کا پایہ اُردو شاعری میں مسلّم ہے۔ چنانچہ مرزا مولوی محمد ہادی عزیز مرحوم جو اُردو فارسی میں آپ سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ سید صغیر حسین صغیر لکھنوی مرحوم۔ بابو جوالا پرشاد بی۔ اے برق مرحوم جج خفیفہ لکھنؤ۔ مرزا علی محمد ارم مرحوم۔ سید جعفر حسین

بہار مرحوم۔ ذکی جالیسی مرحوم (زیادہ تر فارسی ہیں) وغیرہ اور حضرات امیر۔ لطیف وحشی۔ کاشفی۔ نواب نادر صاحب۔ منجھلے حضور رئیس مرشد آباد آپ کے چشمۂ علم سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ یہ ذکر مرحوم تلامذہ کا تھا۔ موجودہ تلامذہ میں مولانا کے چھوٹے بھائی سید مقبول حسین ظریف۔ وصی خلف مولانا صفی۔ مائل۔ رسا۔ قتیل۔ اسد۔ اعظم صدق جالیسی۔ تاج۔ رضی۔ فائز۔ نادر۔ تحسین۔ ندیم۔ حیدر۔ بسمل۔ ناصر۔ طپش۔ وفا۔ سنجی۔ سرشار۔ واقف۔ بیخود۔ سوز۔ نشاط۔ نکہت شیروانیہ۔ وغیرہم کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔

قریبًا تمام اصناف سخن میں آپ کا کلام موجود ہے۔ فارسی کلام کا مجموعہ بھی خاصا ضخیم ہے۔ آپ کی نظمیں ہیں کے قریب متفرق طور پر چھپ چکی ہیں۔ مثنوی تنظیم حیات جس کا ذکر آگے آچکا ہے۔ اور جو ایک ضخیم کتاب ہے۔ ان کے علاوہ ہے۔ مکمل دیوان کی ترتیب ہو رہی ہے۔

آپ اُن بزرگانِ اُردو میں سے ہیں جنکی تعداد روز بہ روز گھٹ رہی ہے آپ کا دم نہ صرف لکھنؤ کے حلقۂ علم و ادب بلکہ عالمِ اُردو میں مغتنمات سے ہے۔ آپ کا کلام اگرچہ کُل ہی انتخاب ہے۔ اسس کا نمونہ قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے :-

غزلیات

دَورِ اوّل سنہ ۱۸۸۰ء تک

سر طور آج بھی برق جمال یار ہو پیدا
صفی زنداں میں ٹکرائے ہوئے سر مدتیں گذریں
وہ چاہے سازِ مطرب یا دلِ ناسازِ عاشق ہو

اگر اُس منزلت کا طالب دیدار ہو پیدا
الٰہی اب تو کوئی رخنۂ دیوار ہو پیدا
جسے پایا تری محفل میں سرگرم فغاں پایا

دور دوم ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۰ء تک

آہیں نہ کرے سوختہ جاں ہو نہیں سکتا
اسپند نہ دے جل کے دھواں ہو نہیں سکتا

ہے چشم تصوّر میں ترے حُسن کی تصویر
تو میری نگاہوں سے نہاں ہو نہیں سکتا

توبہ شکنی کا مجھے الزام گوارا
خاطر شکنِ پیرِ مغاں ہو نہیں سکتا

پیری کی روش اور جوانی کی ادا اور
خم تیر پہ اندازِ کماں ہو نہیں سکتا

سیماب کشتہ میں نہیں رہتی تپش صفیؔ
جب سوزِ غم سے خاک ہوا دل ٹھہر گیا

یہ کسی کو کیا غرض تھی کہ وہ غمگسار ہوتا
ہمیں دل پہ جبر کرنے اگر اختیار ہوتا

تپِ غم کی گرمیوں سے رگِ سنگ تڑق پھٹتی
میرے خونِ دل کا قطرہ جو کہیں شرار ہوتا

کہیں روزِ حشر آتا کہ یہ سیر دیکھ لیتے
کوئی داد خواہ ہوتا کوئی شرمسار ہوتا

مری نعش کے سرہانے وہ صفیؔ یہ کہہ رہے ہیں
اسے نیند یوں نہ آتی اگر انتظار ہوتا

دور سوم ۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۰ء تک

ذرا اے بیخودی رسوا نہ کرنا بزمِ ساقی میں
کہ تھراتے ہوئے ہاتھوں سے ساغر اٹھ نہیں سکتا

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھریاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

دل تہ و بالا جو تھا سودائیانِ زلف کا
گہ زمیں دیکھا کئے گہ آسماں دیکھا کئے

ہم تھے اک آئینۂ عبرت کسی کی بزم میں
مہرباں دیکھا کئے نامہرباں دیکھا کئے

پھوڑے ہیں پھپھولے دلِ شیدا کے کسی نے
توڑے ہیں ثمر نخلِ تمنّا کے کسی نے

ثابت نہ ہوئی جب کوئی تقصیر تو آخر
بے جرم سزا دی مجھے جھنجلا کے کسی نے

تعظیم کو بھی اُٹھ نہ سکا وائے ندامت
شرمندہ کیا وقتِ اخیر آ کے کسی نے

آئے سبھی قاصد بھی نسیمِ سحری بھی
پیغام کسی کا نہ دیا لا کے کسی نے

بس داد مجھے مل گئی اے داورِ محشر
منہ پھیر لیا حشر میں شرما کے کسی نے

تا دفن احباب نے دیا ساتھ ہمارا | پھر بات بھی پوچھی نہ صفی آ کے کسی نے

دورِ چہارم سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک

غیر کی بزم میں درکار ہیں ساغر کے لئے | گردشیں کم نہ پڑیں میرے مقدر کیلئے
رہنے دے اے دلِ سوزاں کہ لگا رکھی ہیں | خون کی چند یہ بوندیں مژۂ تر کے لئے
زندگانی میں جہاں اور بلائیں ہیں صفی | اک بلا فکرِ سخن بھی ہے مرے سر کیلئے

سحر کو جب چمن سے نکہت برباد آتی ہے | مناتے ہیں اسیرانِ قفس خیر آشیانے کی
نظر آیا چمن میں جب کوئی کھلتا ہوا غنچہ | ادا یاد آ گئی ہم کو کسی کے مسکرانے کی
چراغِ نام روشن کر کے رہتے تو کہاں رہتے | صفی ہم سے ہوا ہی ناموافق تھی زمانے کی

بن پڑی چرخِ فتنہ جو تیری | چال چلتے ہیں خوب رو تیری
سنتے ہیں طور جل کے خاک ہوا | حد کی تھی گرم گفتگو تیری
کلکِ قدرت نے نقشِ دل کھینچا | رکھ کے تصویر روبرو تیری
سچے موتی سے کم نہیں ہے صفی | یہ خداداد آبرو تیری

دورِ پنجم سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک

یہ حالت ہے زباں کی شدتِ بیتابیٔ دل سے | سمجھتے ہیں مرے احباب میری بات مشکل سے
نگاہیں جذب کر لیتی ہیں اندازِ محبت کو | یہ بجلی دل پہ گرتی ہے جہاں نکلی کسی دل سے
پلٹ کر عمرِ رفتہ کو صفی آواز دیتا ہوں | نکل آیا ہوں اپنی رو میں اتنی دور منزل سے

ملتفت بھی ہیں تو عرضِ مدعا کیونکر کریں | سوچتے ہیں دل میں آخر ابتدا کیونکر کریں
دست و بازو مضمحل ہیں خشک ہے کام و زباں | ہاتھ اٹھا کر کوئی بتلا دو دعا کیونکر کریں
دشمنیٔ اصلاح سے نفرت تجھے تدبیر سے | اے دلِ بیمار پھر تیری دوا کیونکر کریں

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا | ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا
مرے سر پہ ہے دامنِ گل کا سایہ | کسیکو نہ چھپاں اسکی ہمراز دینا

دلیل گرانباری سنگِ غم ہے
صفیؔ ٹوٹ کر دل کا آواز دینا

دورِ ششم ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک

رہا نغموں سے خالی صحن کس دن اس گلستاں کا
قیامت ڈھا گیا ہر غول مرغانِ خوش الحاں کا

کہیں بہتے ہوئے دریا کا رخ پیچھے پلٹتا ہے
دل شوریدہ کیوں مشتاق ہے عمرِ گریزاں کا

ہنسی آتی ہے حسن و عشق دونوں کی شکایت پے
گلہ یوسف کو دامن کا زلیخا کو گریباں کا

یہ پامالی ہے گویا سرفرازی کا سمجھے خلعت
صفیؔ وہ سبزہ خوابیدہ ہوں گورِ غریباں کا

دل سے دل تک نزع میں کچھ نامہ و پیغام تھا
آمد و رفت نفس کا ورنہ پھر کیا کام تھا

کعبے کا سوز ریائی دیر کا ساز خلوص
سن کے سمجھے کفر کیا تھا اور کیا اسلام تھا

دیکھ لوں دور سے تصویر شباب رفتہ
رخ ادھر بھی کبھی اے عمر گریزاں کرنا

زندگی نام اسی کا ہے اگر غور کریں
مشکلیں پیش جو آئیں انہیں آساں کرنا

گھر میں بیٹھے ہوئے لکھ بھیجنے ہو اک نسخہ
خوب آتا ہے علاج تپ ہجراں کا

دم تعمیر صد افسوس نہ سمجھے یہ صفیؔ
گھر کا آباد ہی کرنا تو ہے ویراں کا

دورِ ہفتم من ابتدائے ۱۹۳۱ء

تو پاؤں جب سے زاہد رکھتا نہیں زمیں پر
تیرا نشاں سجدہ اک داغ ہے جبیں پر

روزِ ازل سے اب تک دلکش حسین مرقع
زیرِ زمیں ہیں جتنے اُتنے نہیں زمیں پر

بنائے ہستی ہی نیستی پر مگر تمہیں کچھ خبر نہیں ہے
یہ گلشن رنگ و بُو ہے کیا شئے اگر فریبِ نظر نہیں ہے

ہے کہنہ مہمان سرائے ہستی مسافران عدم کی بستی
ہزار چاہیں کہ جم کے بیٹھیں اجازت اسکی مگر نہیں ہے

خموش رہنے دو غمزدوں کو کرید کر حالِ دل نہ پوچھو
تمہاری ہی سب عنایتیں ہیں مگر تمہیں کچھ خبر نہیں ہے

اُنہیں کی چوکھٹ سہی یہ مانا روا نہیں ہے بلائے جانا
بفقر عزلت گزیں صفیؔ ہے گدائے دریوزہ گر نہیں

وجہ جمعیت خاطر سر و ساماں نہوا
دل ہوا اور پریشاں جو پریشاں نہوا

زیبِ تن جامۂ صد چاک تو ہو وحشی کے
ہرج ہی کیا نہ ہوا ایک گریباں نہ ہوا

فصلِ گل پھول چڑھانے سرِ تربت آئی
وہ چمن ہوں جو اجڑنے پہ بھی ویران نہ ہوا

ہو ستم سے کوئی نادم تو شکایت بھی سہی
اور بالفرض وہ ظالم جو پشیماں نہ ہوا

سردِ مہری کا زمانے کی وہ کشتہ ہوں صفیؔ
ٹوٹ کر سنگِ لحد بھی شرر افشاں نہ ہوا

انتخاب از قصائد

نغمۂ توحید

جستجو میں تری اے قیدِ تعین سے بری
مہرِ تاباں ہے گرفتارِ پریشاں نظری

اُس فضا میں کہ جو ہے سرحدِ امکان و وجوب
ہم سے پوچھے کوئی ذرات کی آشفتہ سری

کس کی یہ بزم دل افروز ہے یارب کہ جہاں
ماہ و انجم متحیر ہیں بہ این دیدہ وری

دونوں یہ حلقۂ بیرونِ درِ خلوت ہیں۔
دورِ شمسی ہو زمانے ہیں کہ دورِ قمری

خاک سے پاک کیا نسل بنی آدم کو
ابنِ مریم کو دیا معجزۂ بے پدری

ایک جلوے سے ہوئے موسیٰ عمران بیہوش
جب سرِ طور کسی شوخ نے کی عشوہ گری

موجزن ہو کے کسی نہر محبت کا اثر
سنگریزوں کو بناتا ہے عقیقِ شجری

محملِ روحِ رواں ہے دلِ نازک بخدا
کس نے حکمت سے اُتاری ہے یہ شیشے میں پری

پردۂ خاک سے گل چاک گریباں نکلا
حسن کو کس نے سکھائی روشِ جامہ دری

خوابِ راحت میں جو ہے سبزۂ گلشن اُس کا
صبح چلتی ہے دبے پاؤں نسیم سحری

مست آئینہ بکف دیکھ کے اُس محفل میں
ماہِ کامل پہ ہوا قہقہہ زنِ کبکِ دری

کر دیا کس کی کشش نے شبِ اسرے ثابت
قابِ قوسین ہے سرحدِ عروجِ بشری

معتدل ہے وہ کسی گلشنِ وحدت کی بہار
جسمیں گرمی ہے نہ سردی ہے نہ خشکی نہ تری

ہے فضا یائے دو عالم کا نتیجہ توحید
دیدۂ دل میں مگر چاہیئے بالغ نظری

چھوڑ دو حال پہ اپنے اُسے اے متقیو!
رند ہے رند صفیؔ مستِ مئے بیخبری

منقبت میں اکثر مبسوط قصیدے ہیں انمیں سے ایک قصیدے کی تشبیب نمونے کے طور پر یہاں درج ہے

مطلع

پیچ در پیچ ہے شیرازۂ اسباب و علل — رازِ ہستی ہے عجب عقدۂ لاینحل
روح بے جسم کے ناقابلِ ادراکِ عقول — جسم بے روح کے ہم معنی لفظِ مہمل
لاکھ سمجھائیں تناسخ کے عقائد والے — کچھ سمجھ میں مگر آتی نہیں یہ پھیر بدل
ہے تغیر کا اثر مادۂ و صورت تک — کیونکہ اک حال ہے اور ایک ہے انمیں سے محل
روح کیا چیز ہے اس سے نہیں واقف کوئی — نفس کے علم سے یہ بیخبری طرفہ عمل
دیکھیے ساحت افلاک سے تا مرکزِ خاک — تہ بہ تہ پردۂ اسرار ہیں مانند بصل
متحرک نظر آتا ہے اگر غور کریں — ذرہ ذرہ ز سمک تا بہ سماکِ اعزل
مختلف وضع کے ہیں نامتناہی پرزے — جن سے چلتی ہے یہ کُل عالمِ ایجاد کی کل
رشتۂ عقل میں ڈالی ہے تحیر نے گرہ — دہنِ یار کا ہر نکتہ ہے ما قلّ و دلّ
کُن میں گنجائشِ کونین خدا کی قدرت — یہ معمّا نہ ہوا ہے نہ کبھی ہوگا حل
جس طرح آئے تھے دنیا سے یونہیں جائینگے — حالِ ماضی ہے ہمیں آئینۂ مستقبل
یہ فضا کامِ نہنگ و دہنِ اژدر ہے — فلکِ اعلے ہے فلک ارض ہے فلکِ اسفل
پستے ہیں سختیٔ دوران سے دلِ اہلِ جہاں — خشک و تر لقمۂ تر تیز ہیں دندانِ اجل
نشہ اُترا تو بڑھی نزع کی اعضا شکنی — جو سمجھتے تھے کہ میخانہ ہے یہ رنگ محل

رباعیات

تا حدِ نظر جلوہ گہِ یار ہے سب — اک پرتوِ آئینۂ رخسار ہے سب
جو کچھ ہے سوا اُس کے دکھائی دینا — صورت گری وہم غلط کار ہے سب
بے زر کے مذاقِ کامرانی ہے تلخ — پیری ہے تلخ نوجوانی ہے تلخ

سنتے ہیں کہ زندگی ہے قائم بہ امید
یہ بھی جو نہ ہو تو زندگانی ہے تلخ

طفلی بھی ہوئی آہ جوانی بھی تمام
پیری کا بھی ہونا ہے یہی کچھ انجام
مائل سوئے خاک ہے جو قدِ پُر خم
اب ڈھونڈھ رہا ہے اپنی راحت کا مقام

بہتر کوئی شے اس سے زمانے میں نہیں
مثل اس کا خدا کے کارخانے میں نہیں
کیونکر نہ ہو بے نیاز کو عجز پسند
یہ جنسِ نفیس اُس کے خزانے میں نہیں

تقریرِ شباب و عمرِ فانی کیا تھی
یہ بھی نہیں یاد وہ کہانی کیا تھی
غفلت سے کھلی آنکھ تو معلوم ہوا
اک نیند کا جھونکا تھا جوانی کیا تھی

لو سوئے چراغِ صبحگاہی نہ لگا
دل جز طرفِ یادِ الٰہی نہ لگا
پیری کو ندے خضاب سے رنگ شباب
اے شیخ سفیدی میں سیاہی نہ لگا

تحصیل علم کی ضرورت پر بحث اسطرح کی ہے

غور سے سنئے اب یہ میری عرض
علم کا سیکھنا ہے سب پر فرض
سنِ طفلی سے عہد پیری تک
اس کی تحصیل چاہیئے بےشک
پر نہ اسواسطے کہ پڑھ کے فضول
نوکری چاکری میں ہوں مشغول
یا وکالت کا امتحاں دے کر
کریں لوگوں سے اخذ دولت و زر
یا بہ طمعِ حصولِ نذر و نیاز
مولوی بن کے ہم پڑھائیں نماز
یا فنِ شاعری میں نام کریں
صلہ لینے کو مدحِ عام کریں
جو نہ دے کچھ عوض قصیدے کا
ہجو کہکر اُسے کریں رسوا
بلکہ تحصیل علم کا مقصد
یہ سمجھتے ہیں جملہ اہلِ خرد
کہ بڑھے نورِ معرفت دل میں
کر سکیں فرق حق و باطل میں
جو ہیں جاہل اُنہیں بھی علم سکھائیں
بے غرض سب کو راہِ راست دکھائیں
فکر آزادگی رہے ہر دم
دل میں آمادگی رہے ہر دم

عاقبت جو بنا ہے یہ ہے وہ شئے
ہے بلا شک وہ قابلِ تسلیم
کھیت میں ایک مردِ دہقانی
غرض اُسکی یہ ہے کہ غلّہ ہو
اُسی سودے کا سب یہ گھاتا ہے
اَب رہی فکر اِک معیشت کی
مثلاً پیشۂ تجارت سے

دنیوی منفعت بھی ضمناً ہے
کہہ گیا جو بزرجمہر حکیم
جبکہ کرتا ہے تخم افشانی
خیر بھوسا بھی جو ملے اُس کو
اصل کے ساتھ سُود پاتا ہے
بس وُہ ہے سو طرح سے ہو سکتی
دستکاری سے یا زراعت سے

انتخاب از قدِ آب

یہ مثنوی ۱۸۹۳ء میں نظم ہوئی تھی۔ اس میں شراب اور چائے کا مناظرہ ہے۔

کہاں ہے تو اے ساقیِ شوخ و شنگ
ذرا چاہیے پشتِ گرمی تجھے
دل افسردگی سے بہت خستہ ہے
مناسب ہے اب تجکو فکرِ علاج
دوا دے کہ بیمار ہوں تندرست
مبارک رہے تجکو مے ساقیا
وہ جوہر جو ہمرنگِ یاقوت ہے
وہ شربت پلا مجکو اے رشکِ حور
دکھا جلوۂ لعبتِ چین مجھے
نگارِ پری وش ہے جو شعلہ خو

کہ سردی نے اپنا جمایا ہے رنگ
کہ جاڑے سے پالا پڑا ہے مجھے
لہو ہر رگ و پے میں یخ بستہ ہے
پلا جرعۂ آبِ آتش مزاج
طبیعت ہوئی کر جیسے چاق و چست
مجھے چاہیئے اور شے ساقیا
لطافت میں ہمسنگِ یاقوت ہے
جو ہے پاک مثلِ شرابِ طہور
سونگھا نکہتِ زلفِ مشکیں مجھے
اُسے دے کے دم لا مرے پاس تو

ارے کم پلا یا زیادہ پلا
مجھے اس گھڑی چائے سادہ پلا

سُنی اور شیعہ میں باہمی اتحاد لکھنؤ ۱۹۱۰ء

سنی اور شیعہ میں باہم اتحاد قائم کرنے کے لئے لکھنؤ میں ۲۰ مارچ ۱۹۱۰ء کو دونوں فرقوں کے باا ثر اور معزز رہبرانِ قوم نے ایک انجمن اتحاد قائم کی تھی جس کی طرف سے محفل میلاد کی پہلی صحبت بمقام امام باڑہ نواب آصف الدولہ مرحوم ۱۷ اپریل کو اور دوسری صحبت میں بتاریخ ۱۸ اپریل ۱۹۱۰ء مجلس منعقد ہوئی۔ دونوں صحبتوں میں ذیل کی نظمیں پڑھی گئیں۔ جس کا انتخاب یہاں درج ہے۔

وہ موّاج قلزم وہ دریائے اعظم
کہ دونوں کنارے ہیں جس کے دو عالم
زبان زد ہیں جسکے فتوحات پیہم
ہے اسلام ہی بس کریں غور اگر ہم

تشیّع تسنّن ہیں لہریں اُسی کی
سمجھئے انہیں آپ نہریں اُسی کی

انہیں دونوں چشموں سے نکلے ہیں اکثر
وہ شعبے جو ہیں سب ملا کر بہتّر
ہے ان دونوں صیغوں کا اسلام مصدر
ہیں دراصل یہ دونوں شاخیں برابر

کوئی تیغ ان میں ہے کوئی قلم ہے
نشان ہے کوئی اور کوئی علم ہے

خدا ایک ہے جانتے ہیں یہ دونوں
رسول اپنا پہچانتے ہیں یہ دونوں
جو کچھ کعبہ ہے مانتے ہیں یہ دونوں
اُسے قبلہ گردانتے ہیں یہ دونوں

عمل دونوں کا ہے کلام خدا پر
فدا دونوں ہیں عزتِ مصطفےٰ پر

اصولوں میں جب متحد ہیں یقینی
عبث پھر فروعات پر نکتہ چینی
رہیں مل کے باہم سب اخوانِ دینی
مضےٰ ما مضےٰ چاہئے پیش بینی

چلیں گے یہ فرسودہ راہیں کہاں تک
پس پشت آخر نگاہیں کہاں تک

انتخاب از مرقع صبر

دل کے اندر جب اُٹھے جوشِ ہوا کا طوفان
اور ثابت قدم اُس میں رہے نفسِ انسان
قوت صبر ہی ہے یہی اے فلسفہ دان
صبر دنیا میں ہے اک سلسلۂ کوہ گران

دل وہی دل ہے کہ ہو صبر کی قوت جس میں
صبر ہی نفس کا لنگر ہے نہیں شک اس میں

قوتیں جتنی ہیں اُن سب میں یہ قوت ہے قوی
اسکے پنجے میں قوائے غضبی و شہوی
روک دیتا ہے یہی نفس کی مستانہ روی
خون کو باز نہ رکھے جو دمِ تیز دوی

اضطراری حرکات ایسے ہوں پیدا دل سے
کہ سنبھالیں بھی تو سنبھلے وہ ذرا مشکل سے

صبر ہی کی تو یہ تعلیم ہے جاں بازوں کو
خوگر ضبط کریں درد کی آوازوں کو
مل سکے تاکہ نہ موقع کوئی غمازوں کو
لب شیون نہ کرے فاش دلی رازوں کو

تشنۂ لذتِ آبِ دمِ شمشیر رہے
جان سے حسن تو یہ عشق کی تقریر رہے

انتخاب از "آغوشِ مادر"

دل وہ پتھر ہے جسے ماں کی محبت نہ ہوئی
خاک دنیا پہ جو دنیا میں یہ نعمت نہ ہوئی
جب تک اس پردے میں تحریک مشیت نہ ہوئی
پیکر خاکی انساں تری خلقت نہ ہوئی

کس نے اے خاک کے پتلے یہ سب احسان کئے
دکھ سہے تیرے لئے درد سہے تیرے لئے

جب خبر لی کہ تجھے اپنی خبر بھی تو نہ تھی
قائم اک مرکز بینش پہ نظر بھی تو نہ تھی

دوش کو تاب گرانباری سر بھی تو نہ تھی	مثل گردن ترے قابو میں کمر بھی تو نہ تھی

پاؤں کہنے میں کوئی تھا نہ ترا ہاتھ اُسوقت
یہ تو بتلا کہ دیا کس نے ترا ساتھ اُسوقت

دو برس خون چھپا کر تجھے پالا کس نے	مدتوں پیار سے ہاتھوں پہ اُچھالا کس نے
مہد سے گرنے لگا جب تو سنبھالا کس نے	پرورش کی تری جھیلا یہ کسالا کس نے

جب کہ چھوتے بھی نہ تھے اپنے پرائے تجکو
کون پھرتا تھا کلیجے سے لگائے تجکو

تیری اُنگلی جو دُکھی ہو گئی بیتاب وہ ماں	ماہتا آگ تو دل جوہر سیماب وہ ماں
شیر لب پر ترے تلخ اُسکو شکر خواب وہ ماں	ہمہ تن تیرے لئے عالم اسباب وہ ماں

دیکھ کر گود میں صورت تری پیاری پیاری
دودھ کی جنت آغوش میں نہریں جاری

علم ہو عقل ہو یا حسن ہو دولت ہو کہ سن	رشک ان باتوں میں اولاد پہ ہو کیا ممکن
سر پہ ماں باپ کا سایہ ہے وہ نعمت لیکن	اپنی اولاد پہ رشک آتا ہے خود ہوکے مسن

کہ وہ دو مہرۂ محبت کے فرشتے نہ رہے
حرز و بازو تجھے جو ابتک وہ نوشتے نہ رہے

انتخاب از چراغ دیر

یہ گھٹائیں اُٹھی ہیں شیام برن	اب تو ہوں ساقیا ترے درشن
آنسوؤں کا محال ہے تھمنا	بہیں گنگا یہاں پہ ہے جمنا
پنڈلیاں رہ گئی ہیں پتھرا کے	بیٹھے ٹھاکر دوارے متھرا کے
عشق میں تج دیا ہے سب تن من	دل ویران بنا ہے بندرا بن
اُف یہ برسات کی اندھیری رات	قبر کی تیرگی ہے جس سے مات

ہیں ستارے کنول کے پھول تمام
پاٹ جمنا کا چرخ نیلی فام

زلف ساقی کے رُخ پہ لہرائی
آئی بھادوں کی اشٹمی آئی

ہیں شب قدر کے رسوم کہیں
اور جنم اشٹمی کی دھوم کہیں

لبِ دریا کہیں پہ ہے سانجھی
کشتیاں سج کے لائے ہیں مانجھی

مندروں میں چھڑے ہوئے ہیں ساز
مسجدوں میں نماز پڑھے نماز

ہیں سبھی اپنے رنگ میں مست
آ اڑائے سرخوشانِ بادہ پرست

توڑ کر قید سبحہ و زنّار
ہم بھی لیں راہِ گلشنِ بے خار

وہ چمن ہے جو ایک مطلع نور
منزل چندر چور چنداپور

گارڈن پارٹی ہے آج وہاں
جمع عیش و نشاط کے سامان

رند توبہ شکن ڈٹے ہیں کہیں
روزہ داروں کے جمگھٹے ہیں کہیں

انتخاب از بسنت مالنی

ساقی تجھے بسنت کی بھی کچھ خبر نہیں
محنت کشوں کی زردی رُخ پر نظر نہیں

میکش ہیں آفتابِ لبِ بام ساقیا
للہ اس طرف بھی کوئی جام ساقیا

دے جام زرنگار کو گردش ترے نثار
سرسوں جما رہی ہے ہتھیلی پہ جانِ زار

تیرے مریض غم یرقان میں ہیں مبتلا
پکھراج کے کھرل میں ذرا حل تو کر طلا

معجون کہربائے گلنار چاہیے
ہاں بدرقے میں شربتِ دینار چاہیے

جامِ عقیق زرد کو لبریز کر کے دے
کیا دے رہا ہے دیکھ ذرا اور بھر کے دے

بیجا یہ امتیاز ہے اپنے ہیں غیر ہیں
خسّت مجھے پسند نہیں کارِ خیر میں

تو دید بھی طبیب بھی پھر کیا ہے ساقیا
بدلی جو رُت مزاج اب اچھا ہے ساقیا

نسخہ یہ دو ہی جُز کا مگر ہے بڑا مفید
ملکر اسی بسنت میں ہم تم منائیں عید

سہرا

حُسن مستانہ اداؤں کا ترے سر سہرا — زلف دلکش ہے مگر زلف سے بڑھ کر سہرا
بھینی بھینی وہ مہک بُو کا اثر عطر عروس — اُس پہ طرّہ رخِ نوشہ پہ معطر سہرا
دیکھنا سیر کو دامن پہ بچھا جاتا ہے — نگہ ناز کو ہے پھولوں کا بستر سہرا
رکھ لیا ہنس کے جو نوشاہ نے منہ پر رومال — کہہ گیا کان میں کیا چہرے سے ہٹ کر سہرا
چشم بد دُور جوانی ہے بڑے تیوروں پہ — اور سنبھالے ہوئے اس نور کا لنگر سہرا
رُخ سے اُٹھتا نہیں گو آرسی مصحف کا ہے وقت — اللہ اللہ یہ مغرور یہ خود سر سہرا
مہر انور کی شعاعوں سے الجھ پڑتا ہے — زور پر جلوۂ رخسار کے پُر زر سہرا
باندھئے شوق سے اے خان بہادر ہادی — آج فرزند جواں سال کے سر پر سہرا
تازہ گلہائے مضامیں سے جو گوندھا ہے صفی — رنگ اخلاص میں ڈوبا ہے سراسر سہرا

سنہ ۱۹۱۰ء کے اجلاس امروہہ میں یہ نظم پڑھی گئی

ساقیا دامِ محبت کے اسیر آ پہونچے — تیرے ہاتھوں کی لکیروں کے فقیر آ پہونچے
لیکے امروہے میں اِک جمِّ غفیر آ پہونچے — دیکھ مستانِ مے خُمِ غدیر آ پہونچے
ڈورے ڈالے نگہ مست نے میخواروں پر
بیلیں چڑھنے لگیں میخانے کی دیواروں پر

نشۂ دوڑا جو رگ و پے میں ہمارے ساقی — نظر آنے لگے وہ عرش کے تارے ساقی
یہ ادائیں یہ محبت کے اشارے ساقی — میرے پیارے مرے اللہ کے پیارے ساقی
دور دورِ نگہ میکدہ آشام رہے
جبتک آوازہ کوثر ہے ترا نام رہے

عید ہے عید ادھر آنا اُدھر آنا ساقی — ہم فقیروں سے بھی اب ہاتھ ملانا ساقی
تشنہ کاموں کو ذرا خوب چھکانا ساقی — بلکہ کوثر ہی کو پیمانہ بنانا ساقی

ہے اُسی میکدے میں اپنا گذارہ ساقی
کہ جہاں پیر مغاں ایک ہو بارہ ساقی

تین دن تک ترے مہماں رہینگے میخوار
وہ جنوں خیز ترے ساغر گلگوں کی بہار
میزباں دیکھ رہے تیری نگاہِ سرشار
ارے توبہ وہ مرا توبہ شکن جوشِ خمار

زلف اُدھر عارضِ گلرنگ پہ لہرانے لگی
ادھر انگڑائی پہ انگڑائی مجھے آنے لگی

قبلہ رُخ دیکھ وہ گھنگھور گھٹا اٹھی ہے
مے کے قلزم سے شرابور گھٹا اٹھی ہے
باندھ کر آج بڑا زور گھٹا اٹھی ہے
باغ میں ناچتے ہیں مور گھٹا اٹھی ہے

کالی کالی یہ سیہ مست گھٹا متوالی
اودی اودی یہ زبردست گھٹا متوالی

بنارس کی شیعہ کانفرنس (۱۹۱۱ء) کی نظم میں سے

سُن کانفرنس ایک تجھے بات بتائیں
وہ سرور ذی بجاہ تری قوم کا محسن
وہ منعم ذی جود کہ احسان کا جس کے
جان آگئی اس قوم کے افسردہ جسد میں
یہ شیعوں کا اک لختِ جگر پانچ برس کا
دے اپنے مہاراجہ بنارس کو دعائیں
جب آئے تو لازم ہے سر آنکھوں پہ بٹھائیں
تفصیل سے کچھ ذکر کریں وقت جو پائیں
گویا دمِ عیسیٰ تھیں بنارس کی ہوائیں
مچلا تھا کہ سرکار مجھے دیکھنے آئیں

یہ نظم ۱۹۱۲ء کے اجلاس شیعہ کانفرنس میں بمقام پٹنہ پڑھی گئی

قوم کچھ تجھ کو زمانے کی خبر ہے کہ نہیں
دردمندانِ محبت کی نہیں کچھ پروا
ہم نے مانا ترا آغاز بہت اچھا تھا
مضمحل قوت احساس ہوئی جاتی ہے
دل بے حس پہ ترے کوئی اثر ہے کہ نہیں
پاس دل ہے کہ نہیں تیرے جگر ہے کہ نہیں
لیکن انجام پہ بھی اپنے نظر ہے کہ نہیں
چارہ گر کوئی دوا زود اثر ہے کہ نہیں

سارے دنیا کی ترقی کا ہے غیرت پہ مدار — ہم میں قلت اسی عنصر کی اگر ہے کہ نہیں
نیک و بد ہم کو سمجھاتا ہے زمانہ لیکن — کچھ نہیں سوجھتا یہ ضعف بصر ہے کہ نہیں
قوم اے پیکر بے حس ترے پتھر دل میں — قطرۂ خون نہ سہی کوئی شرر ہے کہ نہیں

ہفتخوان اُردو

خوان اوّل

بار آور قلمی نخل کی ڈالی اُردو — مادرِ ہند کے آغوش کی پالی اُردو
اُردوئے شاہجہانی میں ہوئی تو پیدا — نام اسی سے تو ہے اردوئے معلّٰے تیرا
مشترک ہندو و مسلم کا ہے تو سرمایہ — ہند کی کوئی زباں تیری نہیں ہمپایہ
رہروان کے لئے اک مسلکِ ہموار ہے تو — فطرتاً صلح پسند اور ملنسار ہے تو
بڑھ کے تو غیروں کو اپنے میں ملا لیتی ہے — وسعتِ خلق سے پہلو میں جگہ دیتی ہے
جو ملا تجھ سے گیا بھول وہ گھر کا رستہ — واقعہ ہے یہ کوئی راز نہیں سربستہ
شیوۂ خاص ہے یہ عام پسندی تیری — ہمہ گیری نری یہ حوصلہ مندی تیری
ریختۂ السنۂ مختلفہ کا تو ہے — برج بھاشا کا سا انداز وہی خو بو ہے
گردشِ چرخ مبارک وہ گھڑی لائی تھی — مادرِ ہند کے جب پیٹ میں تو آئی تھی
غالباً عہد تھا سلطان شہاب الدین کا — ہند میں آئے جب ایران سے اکثر شعرا
اس قلمرو میں جو رائج تھی زبانِ بھاشا — عجمی کھینچتے رہتے تھے کمان بھاشا
اور اسی طرح سے اکثر شعر لئے وطنی — کرتے تھے فارسی الفاظ میں شکر شکنی
مثلاً چند کہ شاعر وہ اسی دیس کا تھا — اُسکی نظموں میں جھلکتا ہے یہی رنگِ ادا
فارسی لفظوں کا ہندی میں ہے اس طرح ورود — دودھ میں جیسے کہ ہو قند کے ٹکڑے موجود
یہ تھا وہ عہد کہ جب دے کے پتھورا کو شکست — شاہ غوری نے کیا ہند میں خود بندوبست
بعد ازاں دورِ حکومت میں غیاث الدین کے — ہندیت فارسیت دونوں میں یہ پینگ بڑھے

که اسی تازه زباں یعنی اسی ریختے میں | گیت کی ٹھمریوں کی ہونے لگیں تصنیفیں
رفتہ رفتہ یہ ترقی ہوئی حیرت انگیز | طوطیِ ہند نے کی پہلے پہل اسمیں ریز
وہ تغزل تھا یہ انداز دو گونہ دیکھو | دیکھو اُس ریختے کا ہے یہ نمونہ دیکھو

صبح بنارس

ہے لبِ دریائے گنگ ایک بہار آئی ہوئی | کوثر آشاموں کی ہر سو چھاونی چھائی ہوئی
ہر طبیعت حسن کے منظر پہ لہرائی ہوئی | لب پہ اک موجِ تبسم آنکھ شرمائی ہوئی

ڈوب کر کیونکر نکلتے ہیں ستارے دیکھ لو
یہ تماشا آؤ گنگا کے کنارے دیکھ لو

روئے جسپر کاشی خوشنما تعمیر ہے | خطِ قوسی میں سرجدول بھی تحریر ہے
پل ہلالِ عید گنگا صاف جوئے شیر ہے | یا بتوں کے ابروِ پیوستہ کی تصویر ہے

آسماں تھا فتنہ باری میں جو مشہورِ جہاں
سرزمینِ حسن نے کھینچی ہے غمزے کی کماں

ہے حصارِ عافیت کی پشتیاں اس پل کی نیو | سینہ تانے یا ہے مستِ خواب راحت کوئی دیو
پیکر گنگا پہ ہے کیا خوشنما آڑا جینیو | ہے کہیں ہر ہر لب ساحل کہیں پر شیو شیو

سنیاسی سانڈھ رانڈیں گھاٹ پر کی سیڑھیاں
آفت جان دشمن دیں ہیں یہی سب الاماں

ہے ہلالی خط میں آبادی بنارس کی تمام | گھاٹ مندر سب لب دریا بحسن انتظام
ناؤ پر چڑھ کر انہیں دیکھو جو نامی ہیں مقام | ماہرویوں کا ملے گا ہر جگہ پر اژدحام

صدقے اتنی گُل زمین پر سو گلستانوں کی بہار
آگ پانی میں لگاتی ہے چراغاں کی بہار

چشم بد دُور اُف بنارس کیا ہی بانکا شہر ہے | ہر ادا مہوش حسینوں کی یہاں کے قہر ہے

غیرت کشمیر ہے یہ انتخاب دہر سے | ہر گلی کوچے میں جاری حسن کی اک نہر ہے

صاف ہیں شفاف ہیں کتنے یہاں کے بنگلے
رہتے ہیں ہر دم دولہن کی طرح پھولوں سے لدے

وہ دھندلکا صبح کا وہ دور تک گنگا کا پاٹ | وہ کناروں سے نمایاں جابجا پانی کی کاٹ
وہ پریزادوں کے جمگھٹے پرستاں راج گھاٹ | دل بہل جائے جو انساں کی طبیعت ہو اچاٹ

اترے ہیں پانی میں گجر دم روز کا معمول ہے
ہر حسیں نازک بدن گویا کنول کا پھول ہے

دیکھ لو آب رواں میں حسن دلکش کی بہار | صاف سینوں سے جوانی کی امنگیں آشکار
جال پھیلائے ہوئے پانی پہ زلف تابدار | بال کا باندھا چلا آتا ہے جس میں خود شکار

جھوم کر اٹھی جہاں گھنگھور متوالی گھٹا
دیکھنا برسائے گی موتی یہی کالی گھٹا

حسن کا شیوہ اسی پردے میں ٹھنڈی گرمیاں | کوندتی ہیں ابر کے اندر ہی اندر بجلیاں
ضوفشاں سورج سے لیکن ہٹ گیا بادل جہاں | خود کہیگی طاقت نظارہ دے کر امتحاں

جامہ زیبی سے دوبالا شان محبوبی ہوئی
ساریاں قوس قزح کے رنگ میں ڈوبی ہوئی

زعفرانی ہے کسی ماتھے پہ ٹیکا صندلی | دل سے نازک تر لئے ہاتھوں میں اک گنگا جلی
لب پہ یوں موج تبسم جیسے کھلتی ہو کلی | دل جہاں پھسلا لب توبہ سے نکلا یا علی

جب لڑیں باہم نگاہیں کافر و دیندار کی
کان میں آئی صدا ناقوس استغفار کی

تاج الکلام

سبزہ زار آگرہ اے خطۂ مینو سواد | ہر عمارت ہے تری اک جنت ذات العماد

خاصکر وہ تاج فی الواقع جو ہے تاج البلاد — جنّتِ شدّاد بھی جس کی کنیزِ خانہ زاد

دیکھ کر سیر اسکی دنیا سے گذرنا سہل ہے
مقبرہ ایسا جو مل جائے تو مرنا سہل ہے

وہ صفائے بام و در جس پر پھسلتی ہے نظر — وہ لطافت گرد جس کے سامنے آبِ گہر
وہ صباحت زرد جس سے عارضِ شمس و قمر — شیشۂ دل میں سما جائے نزاکت اسقدر

موم پتھر بنگیا اللہ رے گُلکاریاں
پھول ہیں نازک رگیں پتی ہیں نازک دھاریاں

اے زہے صناعیِ صناعِ صنعت آفریں — تاج یا ترشا ہوا مُہرِ سلیماں کا نگیں
منفعل رو کار سے سحرِ پریچشم سرمہ گیں — سنگِ موسیٰ کے حروف اور سنگِ مرمر کی زمیں

نور و ظلمت میں بہم جب خوب گاڑہی چھن گئی
آنکھ کی پُتلی سفیدی میں سیاہی بن گئی

روئے گیتی کیلئے یہ تاج ہے تاجِ شرف — ماہِ کامل میں کلف ہر برج اس کا بے کلف
جوش زن موجِ بہار لالہ و گل ہر طرف — گل بھی غنچے بھی صراحی در بغل ساغر بکف

مستیوں کے زور میں ہشیاریاں بھولی ہوئی
نرگسِ شہلا کی آنکھوں میں شفق پھولی ہوئی

جو بھی ہوں معمار اسکے کسقدر نتھے تازہ کار — کر دیا پتھر کو موتی سے زیادہ آبدار
دونوں جانب جالیوں میں مختلف نقش و نگار — پھر وہ بل کھائی ہوئی بیلوں میں اک جوشِ بہار

مُنہ بندھی کوئی کلی کوئی کلی کھلتی ہوئی
پھول کی ہر پنکھڑی سے پنکھڑی ملتی ہوئی

عروس البلاد بمبئی

بمبئی تو کشورِ ہندوستاں کی ناک ہے — آبروئے مصر تیرے سامنے کیا خاک ہے

سرزمین تیری مقام سجدۂ افلاک ہے
دامن ساحل تمام آلائشوں سے پاک ہے

پُر فضا تیری خلیج آئینۂ بین الیدین
اپنے ساغر میں لئے جوش بہار نشاتین

ہر دو جانب کوہساروں کا تسلسل تا بہ دُور
اپنے سنگین بازوؤں پر تجکو زیبا ہے غرور
اور اُن کے بیچ میں تو صورت بین السطور
روک دیتے ہیں جو طوفانی تموّج کا عبور

دل ہے لبریز محبت آگیا جب جوش میں
لے لیا بحر عرب کو حلقۂ آغوش میں

بمبئی ہندوستان کا صدر دروازہ ہے تو
اپنی آب و تاب سے ہر دم تر و تازہ ہے تو
بلکہ رخسارِ عروسِ ہند کا غازہ ہے تو
ایک رنگارنگ مجموعے کا شیرازہ ہے تو

آکے صحبت میں جو بیٹھا کام کا جی ہو گیا
تیری چوکھٹ جس نے چھو لی نصف حاجی ہو گیا

ہمنشیں جن کو نہیں کچھ خشک و تر میں امتیاز
ہو گا اک نظّارۂ جاہ و جلال بے نیاز
سیر بندرگاہ کر لیں چڑھ کے بالائے جہاز
خود بخود ہونے لگیں گے منکشف قدرت کے راز

بحر میں موجوں کا اُٹھ اُٹھ کے کہیں ڈنڑ پیلنا
سینہ زوری سے جہازوں کو پھر اُن کا ریلنا

دامن ساحل پہ صد ہا رنگ کے نقش و نگار
جنکی پستی اور بلندی یوں دکھاتی ہے بہار
کوٹھیاں کچھ کچھ تلے اوپر منازل خانہ دار
جیسے زینوں پر لگا دیں سج کے گملوں کی بہار

خیر مقدم کو مسرت بڑھتی ہے دل کی طرف
اک نظر ڈالو سمندر سے جو ساحل کی طرف

ماءالحیات

ہنستی ہے ساری دنیا رنگت ہے زعفرانی
پامال اور کیجے اٹھتی ہوئی جوانی

چہرے پہ مُردنی سی چھائی ہوئی ہے دیکھو ہے زیست کی علامت یا موت کی نشانی
وہ ہتھکنڈے تمہارے تمہید خودکشی تھے سرمایۂ بقا کی تم نے نہ قدر جانی
کھودی ہے مدتوں تک ہاتھوں سے قبر اپنی ہو کیوں نہ آشکارا آخر غمِ نہانی
تمیزِ نیک و بد بھی جاتی رہی تھی بالکل کرتا تھا نفسِ سرکش اس طرح حکمرانی
برعکس وضعِ فطرت کیں اختیار راہیں اسلاف کی نصیحت افسوس ہے نہ مانی
حیواں بھی جو نہ کرتے وہ تم نے حرکتیں کیں خمیازہ ہے انہیں کا یہ ضعف و ناتوانی
تخمِ عمل سے اپنے کھیتوں میں زہر بویا کی منزلوں پہ اکثر جا جا کے قلبہ رانی
چل نکلے ایسے قوت آتے ہی ساق پا میں جب ہوش کچھ سنبھالا گلیوں کی خاک چھانی
طفلانہ کوڑیوں میں سیماب ریزیاں کیں بد اصل سیپیوں میں کی مشقِ دُر فشانی
نادانیوں کی حد ہے بھر بھر کے چلّوؤں میں ہاتھوں سے اپنے اُلچا خود آبِ زندگانی
افسردگی کا ساماں پیدا ہوا اُنہیں سے تم جانتے تھے جنکو اسبابِ شادمانی

جذبۂ اسلام

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دینگے مشرق کا سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دینگے
دہارے ہیں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہے بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دینگے
ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ شعلے بھڑک اُٹھینگے جھونکے جو ہوا دینگے
ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن وقت آنے دو وقت آئے پھر تم کو بتا دینگے
فاران پہ گرجے تھے برسے ہیں جہاں بھر میں گھر کر جو کہیں کڑکے پھر ہوش اُڑا دینگے
دنیا کے سمندر میں ہم جزر بھی ہیں مد بھی دیکھو جو ہمیں رو کا طوفان اُٹھا دینگے
مرجھائی ہوئی کھیتی اب ہم ہیں تو کیا ڈر ہے چھینٹے ہمیں رحمت کے پھر نشو و نما دینگے
جڑ ہم نے پکڑ لی ہے کلّے نئے پھوٹینگے گر خاک میں بھی ہم کو اک بار ملا دینگے
ایران ہو یا ٹرکی دونوں کو مٹا دیکھیں کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دینگے

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اُتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دینگے
گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں
یہ صورِ جہاں پھونکا مُردوں کو جلا دینگے

اے جذبۂ اسلامی جس دل میں نہ تو ہوگا
یہ نظمِ صفی پڑھ کر ہم اُس کو سُنا دینگے

ضمیمہ لختِ جگر

نظم کانفرنس دہلی سنہ ۱۹۳۳

دہلی اے دہلیزِ شاہانِ جلالت دستگاہ
اے زمینِ مرتفع اے آسمانِ عزّ و جاہ
ابتدا سے یہ ہوئی گے بار آباد و تباہ
کشورِ ہندوستاں کی آج تک ہے تختگاہ

دفترِ عبرت ہے ایک اک ذرّہ تیری خاک کا
شاہدِ عینی جفائے گردشِ افلاک کا

سُنتے ہیں بدلا ہے تُو نے اپنا چولا سات بار
بیش و کم شکلِ ہلال و بدر حسنِ مستعار
ہر زمانے کے تری تحویل میں نقش و نگار
تیرے آثار الصّنادید انتخابِ روزگار

ہمسرِ کعبہ تجھے سمجھیں اسی قابل ہے تو
نام ہے دِلّی ترا ہندوستان کا دل ہے تو

ہستناپور اوّلاً تھا نام اور اندرپرست
پانڈوؤں کی تھی عملداری اُنھیں کا بندوبست
کوروں کو دی مہابھارت میں اِن ہی نے شکست
بھیم و ارجن کے مقابل حوصلے اُنکے تھے پست

عہدِ نامعلوم کے لیکن ہیں سب یہ واقعات
درج ہیں تاریخ میں جو سنئے اب وہ واقعات

تین صدیاں قبلِ میلادِ مسیحِ خوش سیر
تابعِ قنّوج تھا یہ خطۂ نزہت اثر
دہلو اِک راجہ وہاں گذرا ہے باصد کرّ و فر
نام رکھا اُس نے اس بستی کا اپنے نام پر

تھا جو اندرپت وہ دہلو ہو گیا مشہورِ عام

بن گیا دہلو سے پھر دہلی تغیر پا کے نام

خاص دیواں آہ وہ گل ہو گیا جس کا چراغ
خشک ساون خشک بھادوں خشک ہے مہتاب باغ
ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتا مکینوں کا سراغ
دل میں ہنگامِ نظارہ کیوں نہ پھر پڑ جائیں داغ
رنگ محلوں کی عمارت کا نہیں وہ رنگ اب
دور ہے نزہت چمن سے سینکڑوں فرسنگ اب

ہو کا عالم ہے جہاں تسبیح خانہ تھا کبھی
قصر پر موتی محل کے اوس گویا پڑ گئی
غیر حالت بیٹھکوں کی اور مثمن برج کی
چھائی ہے کیسی اداسی جس طرف دیکھو صفی
آبشاروں میں نہ فواروں میں ویسا جوش ہے
جس کا طوطی بولتا تھا وہ چمن خاموش ہے

سترہ سو سات سے دہلی پر آیا اک زوال
جو قمر تھا رفتہ رفتہ ہو گیا گھٹ کر ہلال
مرگِ عالمگیر نے پیدا کیا وہ اختلال
ضعف آیا سلطنت میں مٹ گیا جاہ و جلال
ہندوؤں کے سرغنہ سردار سکھ اور مرہٹے
بے تحاشا آ کے میدانِ بغاوت میں ڈٹے

عہد میں فرخ سیر کے سیدوں کا زور تھا
بادشاہ آخر انھیں کے ہاتھ سے مارا گیا
تخت دہلی کا انھوں نے روشن اختر کو دیا
روشن اختر نے لقب پایا محمد شاہ کا
یہ بہادر شاہ کا پوتا بڑا نا اہل تھا
غافل و ناعاقبت بیں تھا سراپا جہل تھا

دو وزیر اسکے جو تھے سنجیدہ مدبر ہوشیار
ایک اودھ کا دوسرا ملکِ دکن کا صوبہ دار
شاہ کا برتاؤ ان دونوں سے تھا ناخوشگوار
اسلئے تنگ آکے آخر خود سری کی اختیار
بادشاہِ وقت تھا اس درجہ بے مغز و خرف
ہو گئے یہ خیر خواہِ سلطنت بھی منحرف

قید میں نواب نے نادر سے یہ طے کر لیا
دو کروڑ اُس کو اگر مل جائیں واپس جائیگا
شاہ کی نادانیوں کا یہ مگر انجام تھا
خود بھی ہمراہ نظام الملک اردب میں پھنسا

بادشاہی فوج کو کرنال پر دے کر شکست
داخلِ دہلی ہُوا نادر بقصدِ بندوبست

دہلیِ نو کے علاوہ دیکھنے جائیں جو ہم
ایک سو چوّن ہیں آثار قدیمہ کم سے کم
کچھ مساجد، کچھ مقابر، اور کچھ بیت الصّنم
بیشتر گذرے ہوؤں کے سب ہیں یہ نقشِ قدم

کروٹیں بدلا کرے گا یوں ہی دورِ آسماں
رات دن بنتے بگڑتے ہی رہینگے یہ نشاں

شہرِ دہلی! اے شہنشاہِ بلادِ انڈیا
طرفہ تر ہے تیری تاریخ اور ترا جغرافیا
رنگ چہرے کا ترے ہر سال بدلا ہی کیا
ہر زمانے میں نظر آیا ترا نقشہ نیا

مرکزیّت کا تری ہر چند وہ عالم نہیں
مولدِ اُردو زباں ہے یہ شرف کچھ کم نہیں

شہجہانی دَور کا سکّہ ہے اُردو کی زباں
کس جگہ رائج نہیں دنیا میں یہ نقدِ رواں
تھی یہی ٹکسال اِن سکّوں کی واقف ہے جہاں
فیض پہنچا ہے اسی در سے سبھوں کو بیگماں

اوّلیت جسکو حاصل ہے یہی ہے وہ دیار
خوانِ نعمت کا یہیں کے لکھنؤ ہے زلّہ خوار

وہ یہیں کے نخلِ اُردو کی فقط اک شاخ تھی
سرزمینِ لکھنؤ پر جا کے جو پھولی پھلی
دل لگا کر لکھنؤ والوں نے اسکی داشت کی
نقشِ اوّل کو فضیلت ثانویّت کی ملی

ذائقے میں اسکی شیرینی کو پایا جب دو چند
آیا پیوندی ثمر خود اہلِ دہلی کو پسند

صفیر

صفیر:- شیخ شرف الدین صدیقی۔ بن شیخ معین الدین۔ آپ کو پندرہ سولہ برس کی عمر سے فنِ شاعری کا شوق ہوا۔ اکثر مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے حضرت مولانا شاہ صفیر صاحب لکھنوی کے تلامذہ میں داخل ہوئے۔ آپ کا دیوان موجود ہے۔ جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعر عالی خیال تھے مضمون شگفتہ اور طرزِ بیان اچھا ہے۔ تشبیہ و استعارہ سے بہت کام لیتے ہیں۔ انتخاب کلام درج ذیل کیا جاتا ہے۔۔

کل جنہیں دہر میں دعوائے مسیحائی تھا
آج اُن پر ملک الموت کا قبضہ دیکھا

گرم گریوں ہی رہا بازارِ قتل عاشقاں
مشک سے کافور کا سوداگراں ہو جائیگا

ابتدائے عشق ہے مضطر نہ ہونا اے صفیر
جذبِ دل ایسا نہیں جو رائیگاں ہو جائیگا

دعوٰی آئینہ سے اے یار خود آرائی کا
ڈر ہے کھلجائے نہ پردہ تیری یکتائی کا

ہم یہ سمجھے ہوئی کافور سے فلفل پیدا
یار کے عارض پر نور پہ جب تل نکلا

سودائے زلفِ یار تو رگ رگ میں ہو مرے
فصّاد تو لگائے گا نشتر کہاں کہاں

کروں بیان میں دل کی حکائتیں کس سے
دبائے رہتا ہوں غم کی کتاب پہلو میں

اے جنوں تیرے سبب ہے یہ بزرگی ورنہ
پائے پابوسی نہ مری خارِ بیاباں کرتے

وہ زلفِ رسا تو بہت بڑھ چلی تھی
مگر رہ گئی تا کمر جاتے جاتے

ذرا اپنے چہرے سے آنچل اٹھاؤ
اِدھر دیکھ لو اک نظر جاتے جاتے

سب دلوں میں ہے آرزو تیری
ہر زباں پر ہے گفتگو تیری

بے خطا روٹھ جانا عاشق سے
اے پری یہ بُری ہے خو تیری

جتنا چاہے ستالے جی بھر کے
در سے تیرے اُٹھینگے ہم مر کے

نہیں بھرنے کے زخم دل یہ کبھی
تیغ ابرو کے ہیں لگے چر کے

صفیر

صفیر:- منشی میاں جان دہلوی تلمیذ مومن بعد غدر مہاراجہ پٹیالہ کی سرکار میں بذمرۂ شعرا

ملازم ہوئے۔ ۱۲۹۰ھ میں انتقال کیا۔ شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ کلام میں درد اور اثر ہے۔ زبان شستہ اور صاف ہے۔ یہ اُن کے کلام کا نمونہ ہے۔

کیا خبر تھی کہ اُسی در پہ پڑے گا جا کر	بد دعا دیتے نہ گھر غیر کا ویران ہوتا
نہ تم سے ترکِ جفا اور نہ ہم سے ترکِ وفا	نہ اختیار تمہارا نہ اختیار اپنا
چڑھتے ہیں ہزاروں گل تربت پہ صفیر اپنے	مرنا مرا بلبل کی قسمت میں لکھا ہوتا
مرکر بھی جستجو نہیں جاتی ہے یار کی	مٹی خراب ہے مرے مشتِ غبار کی
ہوا ہو سہو تو پھر خوب یاد کر لیجے	کہ رہ نہ جائے کوئی جور امتحاں کیلئے

صفیر

صفیرؔ۔ منشی نورخاں باشندۂ میرٹھ مقیم دہلی میر حسین تسکینؔ اور مولی بخش قلقؔ شاگردانِ مومنؔ کے فیض تلمذ سے بہرہ یاب تھے۔ عاشقانہ طبیعت اور مسلک آزادانہ رکھتے تھے۔ کلام اچھا ہوتا تھا۔ یہ چار شعر دستیاب ہوئے جو درج ذیل ہیں۔

تیری چالوں سے فتنۂ عالم	روز رہتا ہے روز محشر کا
اپنا خنجر ذرا بچائے گا	دھیان سودائی کو نہیں سر کا
سرگشتہ روز و شب نہ رہے کس طرح مدام	اپنا بھی دودِ آہ ہے یہ آسماں نہیں
کچھ صبحِ ہجر صبحِ قیامت سے کم نہیں	کم صور کی فغاں سے صدائے اذاں نہیں

صفیر

صفیرؔ۔ شیخ امداد حسین صفیرؔ ابن شیخ واحد بخش رئیس فرخ آباد۔ شاگرد امداد علی بحرؔ لکھنوی۔ خوش فکر اور شیریں گفتار ہیں۔ زبان میں صفائی اور بیان میں متانت ہے۔

ہے اُسی میخانے کی درکار اے ساقی شراب	پیتے تھے جس میکدے کی ذوق و صہبائی شراب
رسوا جو اے صفیر ہوئے انتہا کے ہم	چھوڑا بتوں کو ہو گئے بندے خدا کے ہم
بیخود ہیں کیا اطاعت اہلِ وفا کریں	کچھ ہوں تو کام آئیں کسی آشنا کے ہم
الفت کا نام لینگے نہ پھر حشر تک صفیر	اب کی جو بچ رہینگے مصیبت اُٹھا کے ہم
رکھ دیا ہم نے مرقع میں جو نقشا یار کا	آنکھ ہر تصویر کی چشمِ تماشائی ہوئی

کیوں نہ چمکیں میکدے میں موجِ مے کی بجلیاں	رحمت ساقی کی رہتی ہے گھٹا چھائی ہوئی

صفیر:۔ جناب منشی سید فرزند احمد صاحب۔ بزرگوں کا وطن بلگرام تھا۔ مگر یہ خود اپنے ننہال میں بمقام مارہرہ پیدا ہوئے۔ میر سید احمد مغفور کے فرزند اور حضرت سجادہ نشین مارہرہ کے نواسے تھے۔ پندرہ برس کی عمر سے شعرگوئی کا شوق دامنگیر ہوا۔ لکھنؤ جاکر امان علی سحر کے شاگرد ہوئے۔ بعد غدر مرزا دبیر کے ہمراہ پٹنہ گئے اور ایک عرصہ تک ان کے ساتھ رہکر مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی کی مشق کی۔ فارسی میں حضرت غالب دہلوی سے تلمذ تھا۔ عرصہ دراز تک شاہ آباد آرہ میں سکونت گزیں رہے۔ کثیر التصانیف تھے۔ شعرگوئی کا بہت شوق تھا۔ تین دیوان اُردو واسوخت بیس مثنویاں مراثی و سلام۔ قصہ روح افزا۔ ترجمۂ بوستانِ خیال۔ تذکرہ حب وطن اور تذکرہ جلوۂ اختران سے یادگار ہیں۔ اول الذکر میں شعرائے بلگرام کا کلام اور آخر الذکر میں زیادہ تر اپنا اور اپنے اقربا اور احباب کا کلام مندرج کیا تھا۔ ان کے کلام میں سحر کا رنگ اکثر جگہ موجود ہے۔ مگر رعایت لفظی کی قید ان کے ہاں کم ہے۔ زبان اور الفاظ کی تراش خراش وہی ہے۔ جو امان علی سحر کا رنگ ہے۔ جناب صفیر قدر بلگرامی کے رشتہ دار اور بڑے عزیز دوست تھے۔ اودھ اور بہار میں ان کے شاگرد بکثرت تھے۔ ۱۸۹۴ء میں انتقال کیا۔

پاس اُس کی نزاکت نے کیا خوب ہمارا	چھٹتا نہیں اُس شوخ سے مکتوب ہمارا
مزرعِ فکر ہو پامال نہ کیونکر اے شوخ	تیری رفتار کا مضمون ہے چلتا پھرتا
زاہد نہیں ہے رند ونکویاں احتیاجِ حور	سب کچھ بتوں کے پاس ہے اللہ کا دیا
شوخی تو دیکھو فاتحہ پڑھکر مزار پر	کہتے ہیں کس نے خاک میں تجھ کو ملا دیا
دشتِ وحشت میں مقام اپنا ہے گردوں سے بلند	ہر بگولا ایک زینہ ہے ہمارے بام کا
لکھنؤ لٹ گیا۔ دلی ہوئی برباد صفیر	اب بھلا مجمعِ اربابِ ہنر کیا ہوگا

دلبستگی میں ضبط بہت ناگوار تھا
کیوں اے ستم ظریف یہی ہے وفا کا طور
میں اور تمہیں خلق میں بدنام کروں حیف
شباب پر بھی اجل کو نہیں ہے رحم آتا
تھم تھم کے خلش کرتا ہے مژگاں کا تصوّر
راز خلوت کا بیاں کس نے کیا کیا جانیں
قید زنداں میں جو کرتا ہے نہ نکلوں گا کبھی
بھلا تم تو بھلے ہو میں بُرا ہوں
ہماری اُن کی محبّت کا کچھ نہ پوچھئے حال
صفیر اس نے رقیبوں سے باتیں سنوائیں
سب دیکھتے ہیں اور کہیں جاتے نہیں ہم
قابو میں دل نہیں ہے بھلا آپ کس لئے
کیا یاد آگیا انہیں صبح شب وصال
ہم تو سرمہ بھی ہوئے اور نہوا خاک نصیب
تعزیر میں میری نہ کمی کر ستم ایجاد
دید واک بوسہ خوشی سے اپنی
آئے وہ میرے گھر تو رقیبوں کو لے کے ساتھ
اب تو مجھے ہٹا نہ سکیں آسمان بھی
ہر دم صدا یہی ہے ترے داد خواہ کی
دریائے رحم حشر میں اُمڈا تو دیکھنا
بہار میں گل و بلبل سے کیا ہے سرگوشی

اچھا ہوا جو سینے میں ٹکڑے جگر ہوا
عاشق بنا کے پھر نہ کسی دن خبر ہوا
یوں تم پہ کھلے میری زباں ہو نہیں سکتا
پری وشوں کو پہنتے ہوئے کفن دیکھا
رہ رہ کے اُبلتا ہے لہو قلب و جگر کا
ایک میں ایک ہو تم بس کوئی آیا نہ گیا
چارہ گر لکھ دے قبالہ خانۂ زنجیر کا
محبّت جھوٹ میرا چاہنا جھوٹ
رہے یقین کی طرح آئے تھے گماں کیطرح
یہ بات دل میں لگی تیر جانستاں کیطرح
ہیں مردم دیدہ کی طرح خانہ نشیں ہم
تسکین دیتے ہیں مجھے سمجھائے جاتے ہیں
منہ میرا دیکھ دیکھ کے شرمائے جاتے ہیں
کس طرح غیر تری آنکھوں میں گھر کرتے ہیں
وہ آج ہی ہو جائے جو کچھ روز جزا ہو
اچھا تم میری خوشی جانے دو
یارب قبول یوں بھی کسی کی دعا نہ ہو
بیٹھا ہوں میں زمیں پہ ترے نقشِ پا کیساتھ
مارا نظر نے رہ گئی حسرت نگاہ کی
کاغذ کی ناویں بن گئیں فردیں گناہ کی
یہ کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہوتی

کل جو اُٹھتے تھے بٹھانے کیلئے
آج بیٹھے ہیں اٹھانے کے لئے

بس اسکی روز کی بیداریوں سے تنگ آیا
ملے تو مول لوں خواب اُنکے پاسباں کیلئے

صفیر

صفیر:۔ سید قبول عالم شاگرد مقصود عالم صاحب رضوی پھپانوی زیادہ کلام دستیاب نہ ہوا اپنے استاد کی ایک غزل کو تضمین کیا ہے۔ جس کے چند بند درج ذیل ہیں کلام اوسط درجہ کا معلوم ہوتا ہے:۔

گو بظاہر نہ ہو پردے سے ہے دلمیں شریک
موج و گرداب سدا رہتے ہیں ساحل میں شریک

ہر رگِ تن کا لہو خنجرِ قاتل میں شریک۔
دوست وہ ہے کہ رہے دوست کا مشکل میں شریک

مجھ سا فرقت میں نہ ہوئے دلِ ناشاد الگ

حق بجانب تھا رہا دار پہ منصور کا دخل
ظلمتِ شام پہ ہر صبح رہا نور کا دخل

کشورِ چین میں رہا کہتے ہیں فغفور کا دخل
آب و گِل کا نہ یہاں کام نہ مزدور کا دخل

اے جنوں خانۂ وحشی کی ہے بنیاد الگ

گو ہر اک ملک کے ہوتے ہیں سخنور اچھے
قول سب ہیں مرے استاد کے سچّے سچّے

اے صفیرؔ آپ کو بھولیں نہ یہ دعوے میرے
کشورِ ہند میں مقصود ہر اک شاعر سے

میرے استاد میں ہیں وصف خداداد الگ

صمد

صمد:۔ مولوی محمد عبد الصمد خلف مولوی صدیق نواح غازی پور کے رہنے والے تھے۔ مگر خاص غازی پور میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں وکالت کرتے تھے آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ مولانا آسی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ خوش اطوار بزرگ تھے۔

منہ سے کچھ کہنے نہیں دیتی ہے بیتابیِ دل
کیا بتائیں کہ جو پاتے تمہیں ہم کیا کرتے

آجتک اُن کے سوا کچھ نہیں دیکھا پھر بھی
خواہش آنکھونکی یہی ہے انہیں دیکھا کرتے

وہی انصاف کریں اپنے ستم کا دل میں
اے صمدؔ ہم کو تو شرم آتی ہے شکوہ کرتے

صمیم

صمیم - منشی سید علی حسین صاحب۔ خلف سید خادم حسین ساکن بلند شہر شاگرد سید محمد مرتضٰی بیان ویزدانی۔ ذی استعداد ہیں۔ عربی و فارسی میں اچھی قابلیت ہے پہلے ریاست مالیر کوٹلہ میں بحیثیت شاعر دربار ملازم تھے، پھر رامپور چلے گئے۔ نازک مزاجی اور شعرا کی باہمی نوک جھونک نے کہیں نہ رہنے دیا۔ آخر اپنے وطن میں آ گئے ہر صنف سخن میں شعر کہتے ہیں۔ علم عروض میں اچھا دخل ہے۔ وصل، عیش و نشاط کے مضامین زیادہ لکھتے ہیں۔ کہیں کہیں درد اور سوز و گداز بھی ہوتا ہے۔ حسن و عشق کے چونچلوں کو نئے طرز سے ادا کرتے ہیں۔ حضرت یزدانی کی یادگار ہیں۔ اور ان کے شاگردوں میں درجۂ ممتاز رکھتے ہیں۔ صمیم صاحب کا دیوان مطبع منشی ہرشاد میں بمقام بلند شہر ۱۳۲۶ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ کلام کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

چھپ کر کہاں رہیں فلک کینہ جو سے ہم
برابر سے حسینوں کے نکلنا تو قیامت ہے

ہرا سینہ ہے روشن جلوۂ داغ محبت سے
بے ملے غیر سے آخر نہ رہے دیکھ لیا

دم بدم ہے جو یہی ضبط محبت کا گلہ
وہ دل جو لے چلا ہے میرا ہی ہے کلیجہ

میں اور یہ دل تمہیں دوں کیا بات ہے تمہاری
چار سو دشت میں ہیں تا سر زانو کانٹے

نیک صحبت کا اثر کچھ نہ بروں پر ہوگا
لب ساحل ہوں میں شوریدہ سر تقدیر ہنستی ہے

الٰہی آبرو رہ جائے مرے ہاتھ اٹھانے کی
صمیم اس ننگ کی دنیا مجھی کو داد کیا دیگی

ملجائیں خاک ہی میں کہیں آبرو سے ہم
چھپٹ لیتے ہیں یوں بھی دل جو بچکر دور جاتا ہو

لحد میں ساتھ لیکر میں چراغ سوز جاتا ہوں
کیا ہوا شرط جو باندھی بھی قسم کھائی بھی

ایک دن ہو کے رہے گی مری رسوائی بھی
آنکھوں سے دیکھتا ہوں ہاتھ سے جا رہا ہے

لے دیکے اک یہی تو درد آشنا رہا ہے
اب بدلنے نہیں دیتے مجھے پہلو کانٹے

سو برس پھول کے پہلو میں نہ دیں لو کانٹے
حباب آب جو پر موج کی زنجیر ہنستی ہے

دعائیں مانگتا ہوں رو کے میں تقدیر ہنستی ہے
وہ سن سن کر کلام مصحفی و میر ہنستی ہے

صلاح

صلاح:۔ مولوی محمد صلاح نبیرہ محمد افضل الہ آبادی۔ مزیدار اور شوخ طبیعت تھی افسوس ہے کہ زیادہ کلام نہ بہم پہنچ سکا۔ صرف دو شعر قدرت اللہ شوق کے تذکرے سے نقل کئے جاتے ہیں۔ جن سے ان کی جدت طرازی کا اندازہ ہوتا ہے۔

کیا صلاحِ وقت ہے جا میرزا مظہر سے پوچھ مرے اس درد دل کہنے کے صدقے	ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار ترے سُن سُن کے چپ رہنے کے صدقے

صنعت

صنعت:۔ شیخ کریم الدین مرحوم مرادآبادی۔ شاگرد قدرت اللہ شوق و جرأت فن سیاق میں کمال رکھتے تھے۔ علاوہ دیوانِ مخمسات و غزلیات وغیرہ ایک رسالہ ان کا سیاق میں بھی ہے جو نہایت مفید ہے۔ نواب فیض اللہ خاں والیِ رامپور کے جلیس تھے۔ ۷۰ برس کی عمر پاکر ۱۲۶۳ھ میں وفات پائی۔ یہ بات عجائبات سے ہے کہ وفات سے دو ایک روز قبل منشی انوار حسین صاحب تسلیم سے اپنی وفات کی تاریخ کی فرمائش کی اور انہوں نے دو قطعہ تاریخ فی البدیہہ کہکر پیش کئے پھر دو روز کے بعد انتقال فرمایا۔ انوار حسین تسلیم نے ان کی تاریخ وفات میں مصرعۂ ذیل نکالا تھا۔

کہا۔ استاد خمسہ کا موا ہائے

خمسے خوب کہتے تھے۔ معاملہ نگار۔ ادا بند شاعر تھے۔ حسن و عشق کے جذبات کے ادا کرنے میں اپنے اُستاد جرأت کی پیروی کرتے۔ راز و نیاز کی مصوری میں خداداد ملکہ تھا۔ کہیں کہیں صنائع بدائع کی جھلک بھی ان کے ہاں ہے۔ مگر کسی موقعے پر بھی لطف زبان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ اور زبان ایسی شستہ اور فصیح پائی تھی کہ چند متروکات سے قطع نظر آجکل کی زبان سے ملا لیجئے۔

دیر و کعبہ میں ہے جلوہ اُسی ہرجائی کا مجھے یہ سوچ ہے کیونکر اُسے چھوؤں چھیڑوں جان تولی ہے پر ابھی تم کو	تو نہ دیکھے تو یہ نقصان ہے بینائی کا کہ دیکھنے ہی سے بس جس کا رنگ ہو میلا دل کے لینے کا ڈھب نہیں آتا

دم تو کب کا نکل گیا ہوتا
ضعف سے تا بلب نہیں آتا

کچھ تو بتائیے کہ یہ اسرار کیا ہوا
اگلے کرم کدھر گئے وہ پیار کیا ہوا
کل اس طرف وہ ایسی پھبن سے نکل گیا
دیکھے سے اسکو جی مرا سن سے نکل گیا
مجھ سے کیا اُس بت بے پیر نے مُنہ پھیر لیا
میری آہوں سے بھی تاثیر نے مُنہ پھیر لیا
ہے ایک وہ دمبازیہی طور ہے اس کا
ہے قصد کہیں اور تو پیغام کہیں اور
ہم اشک سے دن رات جھڑی کیوں نہ لگائیں
تم کاٹو جو برسات کے ایام کہیں اور
کیونکہ اُس کے ہجر میں جیتے بچینگے غم سی ہم
دم خفا ہم سے ہوا ہی اور خفا ہیں تم سے ہم
مدام شیش محل میں رہے ہے دختر رز
سمجھ نہ رند بھری ہے شراب شیشے میں
حیراں ہوں اشک پوچھو نہیں کاہے سے ای جنوں
دامن نہیں ہے جیب نہیں آستیں نہیں
لے لیا دل اب تو اُس نے آشنائی ہوچکی
ہو گیا سودا وہ پختہ جس کی سائی ہوچکی
خط نکلنے پر لکھی خط میں اُسے میں نے یہ بات
بھیجے اس کا جواب اب تو صفائی ہوچکی
ہر اک کو سیدھی سناتا ہے وہ بت کج فہم
اگر کسی نے بھی بات اُس کی اک ذرا اُلٹی

خمسہ بر قطعہ حضرت اختر

کاندھے پہ شال ہاتھ میں سبحہ رومال تھا
مندیل سر پہ گول تھی پکڑے ہوئے عصا
پاؤں تلک تھے پہنے ہوئے جبّہ ریا
کل شیخ بن کے مجتہد عصر سا قیا
دکھلا کے سبز باغ عذاب و ثواب کا

دیکھا مجھے تو کتنے کنایہ کئے بہ طنز
پھر آپ کو بھی پردہ میں کچھ کہہ اٹھے بہ طنز
سمجھا میں یعنی کہتے ہیں عاصی مجھے بہ طنز
کہنے لگے زراہ تبختر دلے بہ طنز
معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا

سنکر یہ بات شیخ کی مہخوار جو کہ تھے
نادم سے ہوکے دل میں وہ حیران ہوگئے
کچھ بن نہ آئی بات تو خاموش سب ہوئے
میں نے کہا کہ ہم بھی ہیں یہ خوب جانتے

پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

ہر آن کام ہوتا ہے اس عمر میں زبوں | اس واسطے کہ ان دنوں شیطان کے بس میں ہوں
افعالِ بد سے اپنے ہوں ہر چند سرنگوں | گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
لیکن نہ کیجئے مجھے مورد عتاب کا

تو نے برس ہیں فہم تمہارا ہوا درست | کہنا زبان سے آپ کا ہے سب بجا درست
پر اب بھی جانیں آپ کو ہم پارسا درست | تقوٰی ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست
اور تب یقیں آپ کے ہو اجتناب کا

بارش ہو اور ابر بھی چھایا ہو چار سو | پھولا تمام باغ ہو جاری ہو آب جو
کرتا ہو اختلاط کی وہ تم سے گفتگو | مے اور کنج باغ ہو ساقی ہو ماہ رو
اور کوئی واں مخل نہ ہو باعث حجاب کا

اُسوقت اُس نے جام صراحی سے ہو بھرا | پینے سے اُسکے آنکھوں میں آیا ہو جب نشا
مستانہ اختلاط کرے تم سے برملا | گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حیا
یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگ خضاب کا

کھا کر گزک وہ اور سنگھا کر کے اپنا منہ | چتون بدل کے ناز دکھا کر کے اپنا منہ
مستانہ شوخ و شنگ بنا کر کے اپنا منہ | کھینچے[1] اسکو اور منہ سے ملا کر کے اپنا منہ
دے ذائقہ زباں سے دہن کو لعاب کا

اور یہ کہے کہ میں ترا تابع ہوں یوں دئیے | بخشش پہ اسکی ہم نے ہیں لاکھوں گنہ کئے
اب چھوٹنے کا تو نہیں بے جام مے پیئے | منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئے
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا

---

[1] یہ مصرع اصل قطعہ میں یوں تھا۔ ع کھینچے ہنسی سے اپنا ملا کر وہ منہ سے منہ
اسکو اپنی سہولت کے لئے بدلا ہے۔ جس کا ان کو ہرگز حق نہ تھا۔

ممکن نہیں کہ آپ کو عقبےٰ کا دھیان ہو … اسوقت خاطر اسکی سے جو کچھ کہے کرو
بس یہ کہے بن آئے کہ حاضر ہیں جو کہو … اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر خوف آپ کیجئے روزِ حساب کا

اسباب عیش جسکو میسّر ہوں یہ تمام … ایسی جگہ میں باز رہے جو کہ نیک نام
تاثیر ہم پہ کرتا ہے اس شخص کا کلام … اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

خمسہ بر قطعہ قدرت

مال و زر تھا پاس اپنے جس قدر کہ چاہیئے … تھی میسّر تندرستی چین ہر صورت کی تھے
موت کو دل سے بھلا شیطان کے استداد سے … کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
کیا ہے ملکِ روم کیا ہی سرزمیں روس ہے

فوج رکھکر اس طرف کو کیجئے لشکر کشی … لطف ہے مردانگی اور زندگانی کا یہی
تا قیامت نام ہوگا جان بھی گر اس میں دی … گر میسّر ہو تو کس عشرت سے کیجے زندگی
اک طرف آوازِ طبل اک سو صدائے کوس ہے

جو کہ ہو اپنی رعیّت اسکی ہو ہر طرح غور … سرکشوں کو قتل کیجے تا کسی پہ ہو نہ جور
جب کہ ہو ان سے فراغت تب یہ ہو محفل کا طور … صبح سے لے شام تک کیجے مے گلگوں کا دور
شب کے تئیں پھر ماہرولوں سے کنار و بوس ہے

بس یہی ٹھہری کہ ہوجے شاہ روم و روس کے … رکھئے فوج بیقیاس اب قصد واں کا کیجئے
گفتگو آپس میں بیہودہ یہ ہم کرتے جو تھے … سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو جو قیدِ آز کا محبوس ہے

اور لگی کہنے کہ کچھ معلوم ہوتا ہے تجھے … ہیں یہاں شاہ و گدا مدفون اک ہی طور سے
ٹوٹے پھوٹے کتنے پڑے تعویذ بھی ہر قبر کے … مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے

یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

زندگانی میں یہ ہفت اقلیم کا کرتے تھے راج	تھا مشرف تخت انکے پاؤں سے اور سر سے تاج
جو زمیں بوس انکے تھے تھا عرش پر ان کا مزاج	پوچھ تو اب ان سے جا کے حشمت دنیا سے آج

کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے

صنعت

صنعت:۔ جناب مغل خاں۔ عہد قدیم کے سخن سنج تھے۔ صرف مندرجۂ ذیل دو شعر تذکرۂ چمنستان شعرا سے نقل کئے جاتے ہیں۔

سینے میں آہ، دل میں طپش، اشک چشم میں	شہرہ یہ عاشقی کا مرا گھر بہ گھر ہوا
غمزے سے مارتا ہے جلاتا ہے ناز سے	کیا ملک حسن کا صنما تو خدا ہوا

صوفی

صوفی:۔ سید شاہ فرزند علی۔ ان کا اصل نام ابو محمد جلیل الدین ہے۔ مرزا غالب سے تلمذ تھا۔ ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۶ھ میں انتقال کیا۔ صاحب تصانیف کثیر تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔

غرض ہے شمع سے پروانے کو کسی جا ہو	جو دور ہے رہ کعبہ کنشت ہی میں سہی
ہو الغفور ہے سرنامہ پر تو کیا غم ہے	گناہ اپنے خط سرنوشت ہی میں سہی
پائے انفاس سے جاتی ہے عمر	جادۂ راہ عدم تاک میں ہے
تنکے چنواتی ہے طفلی تیری	نیم کی کیل ستم ناک میں ہے

تقوے کی رت بدل گئی رندی کے دن پھرے	شیشہ بغل میں ہاتھ میں اب جام چاہئے
ہر اک کو ہے بہار میں اک شوخ کی تلاش	بلبل کو گل مجھے بت گلفام چاہئے
کل ہم کرینگے عرض کہ رحمت کی نذر کو	ہدیہ گناہ لائے ہیں۔ انعام چاہئے
حاصل ہے مہر سے اشک کا حرماں کہیں جسے	سایہ ہے وہ مرا شب ہجراں کہیں جسے
خوگر ہوں مشکلوں کا امید وصال میں	دشوار مجھ پہ ہے وہی آساں کہیں جسے
ہر اک اشارہ ہے سبب انقلاب دہر	گردش ہی چشم یار کی دوراں کہیں جسے

صوفی بتائے منزلِ جاناں کی راہ کون	اب چپ ہے وہ جرس دلِ نالاں کہیں جسے

صوفی

صوفی :- منشی چنی لال خلف لالہ بلاس رائے کایستھ سکسینہ متوطن قصبہ بلاس پور علاقہ ریاست رامپور۔ تلمیذ مولوی یوسف خاں یوسف۔ آپ ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر سے شاعری کا شوق تھا۔ فارسی عربی جانتے ہیں۔ عرصہ دراز سے کچھ حالات معلوم نہیں اور نہ کلام ہی کہیں طبع ہوتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

لکھا ہے یک قلم جو وصفِ روشن روئے جاناں کا	بجا ہے نام دیوانِ تجلی میرے دیواں کا
طبیعت رات بھر اس فکر میں الجھی رہی لیکن	نہ بندش میں مری مضمون آیا زلفِ پیچاں کا
حسن کیونکر نہ جوانی میں بھلا ہووے دوچند	وقت پر باغ میں آتی ہے بہار آپ سے آپ

صوفی

صوفی :- ابوالمظہر حاجی شرف الدین احمد صدیقی باشندۂ میرٹھ ہندوستان کے مشہور تاجر کتب منشی علاؤالدین کے فرزند ارجمند ہیں۔ ۹ر اپریل ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی سے واقف ہیں۔ اوائل عمر سے شعر و سخن کا ذوق ہے۔ شعر گوئی میں حضرت نوح ناروی سے تلمذ ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

بارہ دری بنا لیا زنداں کو اس طرح	ٹکرایا سر کو جس جگہ وحشی نے در ہوا
وہیں رندوں نے اک دنیا بسا دی	جہاں ساقی نے میخانہ بنایا
کچھ سوچکر چراغِ لحد بھی خموش تھا	داغوں میں دل کے بعد فنا بھی یہ جوش تھا
کہتا تھا پردہ پردہ میں اک اک سے رازِ عشق	اس انجمن میں دیکھنے کو جو خموش تھا
گرتا تھا اٹھکے نشہ میں ساقی کے پاؤں پر	بے ہوش تھا مگر مجھے پھر بھی یہ ہوش تھا
نکلی شرابِ ناب کی بوتل چھپی ہوئی	زاہد کی مصلحت تھی جو وہ خرقہ پوش تھا

صوفی

صوفی :- شیخ محمد عبدالخالق ولد شیخ خدا بخش۔ دہلی وطن آبائی تھا۔ مگر پابندی ملازمت کے باعث رامپور کی سکونت اختیار کی۔ داغ کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ سنہ ۱۲۹۰ھ میں ۲۵ برس کی عمر تھی۔ زبان صاف ہے۔

کیوں غیر کو مقتل میں کیا آپ نے بسمل
کیا ہم کو تڑپانا تہِ خنجر نہیں آتا

نہ وہ کرتے ہیں جاں بخشی نہ ہم کو ذبح کرتے ہیں
الٰہی کیا مصیبت ہے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

سمجھ کر شکر کو شکوہ ہوئے ہیں جان کے دشمن
ستائش جب گلہ ٹھہرے گلہ کیجئے تو کیا ٹھہرے

صوفی

صوفی:۔ منشی احمد خاں خلف محمد زمان خاں۔ مالک مطبع مفید عام آگرہ تھے۔ مولوی غلام امام شہید سے تلمذ تھا۔ عالم شباب میں گوالیار جا کر مہاراجہ سندھیا کے ملازم ہوئے۔ غدر کے کئی سال بعد آگرہ آئے اور مطبع مفید عام جاری کیا۔ ۱۲۹۶ھ ۷۴ سال کی عمر تھی۔ عرصہ ہوا انتقال فرمایا۔ اردو۔ فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور پیرانہ سالی میں بھی زندہ دلی کا دم بھرتے۔ بلقیس۔ فریادِ دل۔ خلجانِ فسونِ مائل۔ نامی مثنویاں ان کی تصنیف سے ہیں۔ مولوی نیاز علی صاحب۔ پریشان بسندیلوی مؤلف تذکرہ شعرِ وسخن کے ایک مشاعرہ کی غزل انتخاب ہو کر درج تذکرہ کی جاتی ہے

برنگ سبزہ جو اُٹھے وہ پامال شتا ٹھہرے
کوئی کیا خاک اس عالم میں آئے اور کیا ٹھہرے

ہمارے جرم وعصیاں ہیں نجوم چرخ سے افزوں
تری رحمت کے گر ہم مستحق ٹھہرے بجا ٹھہرے

گلستان جہاں سے داغِ حسرت لیجئے دل پر
برنگ بوئے گل اک دم یہاں ٹھہرے تو کیا ٹھہرے

خدا کے واسطے صوفی غرور زہد کم کیجئے
بتوں سے دل لگا کر تم تو حضرت پارسا ٹھہرے

صوفی

صوفی:۔ مفتی محمد اسلام اللہ صاحب صدیقی خلف مفتی محمد اکرام اللہ صاحب گوپاموی ثم اکبر آبادی۔ آپ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمت اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے اجداد زمانۂ شاہی میں بہت معزز عہدوں پر ممتاز رہے۔ شیخ وجیہ الدین گوپاموی آپ کے مورثوں میں تھے۔ آپ کے والد مختاری کرتے تھے۔ صوفی صاحب کی ولادت ۱۳۱۱ھ ہجری میں ہوئی۔ فارسی۔ اردو۔ اچھی جانتے تھے۔ ۱۳۳۶ھ ہجری میں مرض طاعون کا نشانہ بن کر انتقال کیا۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

ہے وصو کا ایک عالم کو کہ یہ خونِ شہیداں ہے	شفق بن کر فلک پر رنگ لائی ہے قضا اچھا
وہی چشموں کے سوتوں سے رہا جاری لہو برسوں	جسے دل میں چھپا رکھا تھا مثل آرزو برسوں
فراقِ دلربا میں مدتوں رویا کیا ہوں میں	بہایا ہے انہیں آنکھوں نے یہ خونِ آرزو برسوں
نہ کر برباد ابھی سے دل مرا اے ناشکیبائی	رہیگی میہمان اس میں کسی کی آرزو برسوں
بس اتنی جان لے میری شکستہ خاطری ساقی	جو ٹوٹا گر کے نظروں سے تری وہ شیشۂ دل ہوں
مرا بننا بگڑنا پوچھئے تو اک تماشا ہے	مٹوں تو خاک میخانہ بنوں تو ساغرِ گل ہوں
اس حسنِ چند روزہ پہ اتنا نہ ناز کر	آئینۂ حباب میں صورت فنا کی ہے

صوفی

صوفی :- جناب محمد حیدر صاحب عرف منو نواب منصب دار سرکار نظام تلمیذ جناب میکش۔ صاف اور سادہ کلام ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

دیکھتے کیساتھ ہی دل میں اُتر آتی ہے یہ	بات دنیا سے نرالی ہے تری تصویر میں
دیکھتا ہوں جب اُدھر پھر اسکے ہٹ جاتی ہے آنکھ	ہائے کیا تاثیر ہے اُس چاند سی تصویر میں

صوفی

صوفی :- منشی محمد امتیاز علیخاں لکھنوی ابن منشی فیاض علی ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے شاعری میں مولانا غلام امام شہید سے تلمذ تھا۔ پہلے جمیل تخلص کرتے تھے۔ پھر صوفی تخلص اختیار کیا۔ کلام بیشتر فارسی ہے۔ ۱۸۹۶ء میں بھوپال میں انتقال کیا۔ جہاں آپ وزارت کی خدمات انجام دیتے تھے۔ آپ کی خیرات کے قصے لکھنؤ اور گرد و نواح میں مشہور ہیں آپ کا اردو کلام سوا مندرجہ ذیل دو اشعار کے نہ مل سکا۔

ہمارے درد نے کیا کیا وفا کی	اگر پہلو سے اُٹھا دل میں جا کی
پری کے دستِ پرور نے وفا کی	وہ دیکھو اُڑ چلی سرخی حنا کی

صولت

صولت :- جناب حافظ شیر علی تلمیذ رحمت بنارسی۔ طبیعت شوخ اور چلبلی معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ حالات نہ معلوم ہو سکے صرف دو اشعار ملے۔ جو ہدیہ ناظرین ہیں۔

کیوں نہ ملتا ہمیں تھم تھم کے شہادت کا مزا	تو نے رُک رُک کے جو تلوار لگائی ہوتی

شوخیاں ہائے کہاں وصل کی شب جا کی چھپیں	یہ حیا آج تو آنکھوں میں نہ آئی ہوتی

صولت

صولت۔ منشی پیارے لال ولد منشی مہاراج بہادر صاحب کایستھ سریواستو۔ ۲ نومبر ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی تحصیل اپنے بزرگوں سے کی۔ انگریزی سے بھی بقدر ضرورت واقف ہیں۔ آپ کے بھائی منشی رام نرائن صاحب شجرؔ تخلص کرتے تھے، اور قدر بلگرامی سے تلمذ تھا۔ ۱۹۱۲ء سے صولتؔ صاحب کو بھی شاعری کا شوق ہوا شروع میں اپنا کلام جناب عبداللہ خانصاحب عظمتؔ کو دکھلایا۔ اس کے بعد جناب سید فرزند حسین صاحب ذاخرؔ سے تلمذ اختیار کیا جن کا ۱۹۳۳ء میں انتقال ہوا ہے۔

جناب صولتؔ کو ادب اردو سے بڑی دلچسپی ہے۔ مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے رہتے ہیں۔ رسالہ نظّارہ لکھنؤ میں نائب مدیر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ آپ کو اپنے استاد مرحوم مولانا ذاخرؔ سے بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ انہیں کے انداز کلام یعنی قدیم رنگ تغزّل کے دلدادہ ہیں۔ بندشیں چست اور زبان صاف ہوتی ہے۔ جو مختصر کلام درج تذکرہ ہونے کے لئے روانہ کیا ہے۔ اس کا انتخاب حاضر ہے۔

یہ عالم ہے فنا میں دل کے اجزائے پریشاں کا	بگولے ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہر ذرہ بیاباں کا
حدودِ قید میں بھی لے جنوں حاصل ہے آزادی	سمٹ آیا ہے آنکھوں میں مری نقشہ بیاباں کا
اثر کیسا زمیں پر پڑ رہا ہے شام کا یا رب	بھیانک ہوتا جاتا ہے سماں گورِ غریباں کا
اندھیرا دیکھ کر مر جائیں گے گھٹ گھٹ کے دیوانے	مناسب ہو تو دروازہ کھلا رہنے دو زنداں کا
جنوں کا جوش ہے زنداں میں وحشی تھم نہیں سکتا	نگاہیں کھینچے لاتی ہیں دم وحشت بیاباں کو
صرف زینت اب تو ہیں ان کے لئے شام و سحر	ہاتھ میں شب بھر ہے شانہ اور دن بھر آئینہ
نور خالق دے تو قد پر منحصر رتبہ نہیں	گھٹ کے آئینہ ہو گو ہر بڑھ کے گوہر آئینہ
کسقدر پہنچی ہے صولتؔ ضعف دل کی انتہا	شکل تو دیکھو ذرا اپنی اٹھا کر آئینہ
الجھن سوا نہ کیوں ہو مرے قلب زار کی	ٹھنڈی ہوا چلی ہے چمن سے بہار کی

مضطر ہوں آرزو سے دل بے قرار کی
اے بیخودی یہ راہ نہیں کوئے یار کی

پنہاں کسی کی زلف میں تارا سحر کا ہے
ہوتی نہیں جو صبح شب انتظار کی

پھولوں کی تھی ہوس تو اسیر قفس ہوا
اب دیکھوں کیا دکھائے تمنا بہار کی

تم آئے مرمٹوں کا ستارہ چمک گیا
دامن تک آکے بڑھ گئی عزت غبار کی

تم نے نقاب الٹ کے سر قبر کیا کیا
لو پھیکی پڑ گئی ہے چراغِ مزار کی

صولت

صولت:۔ مالک الدولہ مصاحب حضرت واجد علی شاہ والی اودھ تلمیذ جناب ہنر استعارات اور تشبیہات سے کام لیتے تھے۔ مگر کلام کو بدمزہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

آبرو میں فرق آیا۔ جان دی رسوا ہوئے
صولت اس سے دل لگا کر تم کو حاصل کیا ہوا

بزم پُر نور رکھے آٹھ پہر جام شراب
دن کو خورشید بنے شب کو قمر جام شراب

وہ مجھے تصویر اپنی دے کے یوں سمجھا گئے
ہم نہ آویں جب تلک تم اس سی بہلانا مزاج

ہمیں نے آپ کو انداز معشوقانہ سکھلائے
نہ ترچھی چتون آگے تھی نہ یہ بانکی ادا پہلے

خدا کی شان ہے کہتے ہیں وہ صورت نہ دکھلائے
سحر کو جس کا منہ ہوتا تھا آئینے کی جا پہلے

صہبا

صہبا:۔ چودھری عبدالاحد صاحب سندیلوی مرحوم چودھری واجد علی مرحوم رئیس سندیلہ کے پوتے تھے۔ عین زمانۂ شباب میں بعارضۂ ہیضہ ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔ طبیعت بہت شوخ واقع ہوئی تھی۔ اگر زندہ رہتے تو ضرور مشقِ سخن سے شہرت حاصل کرتے۔ جناب ہاشمی مرحوم سندیلوی کے مشاعرے میں جو غزل پڑھی تھی۔ اس کا انتخاب درج ذیل ہے:۔

خرام ناز سے دل کا یہ حال ہوتا ہے۔
کہ جیسے پھول کوئی پامال ہوتا ہے

خود اس کے حال پہ روتی ہے بیکسی اُسکی
مریض ہجر کا جب غیر حال ہوتا ہے

زمانہ یاد کر اپنے شباب کا واعظ
کب امتیاز حرام و حلال ہوتا ہے

ہم اپنی حالت دل ان سے کیا کہیں صہبا	ذرا سی بات پر اُن کو ملال ہوتا ہے

صہبا

صہبا۔ مکند سہائے خلف اکبر منشی چُنّی لال متوطن صاحب گنج گیا۔ فارسی میں ذی استعداد تھے۔ عربی بھی پڑھی تھی۔ مولوی حکیم سید منیر الدین احمد کیفی مرحوم اور مولوی کاہش جونپوری سے تلمّذ تھا۔ عرصہ ہوا کہ انتقال کر گئے یہ نمونۂ کلام ہے۔

رخ پہ ہلتی ہے تری زلفِ دوتا کیسی کچھ	شام سے سر پہ ہے نازل یہ بلا کیسی کچھ
پان کھاتے تو وہ کچھ اور ہی ساماں کرتے	پانی پانی جگرِ لعلِ بدخشاں کرتے

صہبا

صہبا:۔ علی حسن صاحب مرادآبادی شاگرد حضرت مقتول مرحوم۔ زیادہ حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ ایک غزل کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سنجیدہ اور پاکیزہ خیال کے شاعر ہیں۔۔۔

نئی یہ چھیڑ ہے ہنس ہنس کے مجھ سے کہتے ہیں	ترے ملال سے ہم کو ملال ہوتا ہے
سرِ غرور ہی افتادہ راہ میں ہے تری	کہ آسماں بھی یہاں پائمال ہوتا ہے
سناتا ہے جو کوئی اپنے درد کا قصہ	وہ حرف حرف مرے حسبِ حال ہوتا ہے
جو گرم ہوتی ہے غیروں سے اُنکی بزمِ نشاط	یہاں بھی درد سے غیر اپنا حال ہوتا ہے

صہبائی

صہبائی:۔ خواجہ عبدالسمیع پال۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ خلف مولوی احمد دین صاحب ۲۸ دسمبر ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ ہی میں پائی جس کی تکمیل لاہور میں ہوئی۔ فارسی اردو کی بہت اچھی قابلیت بہم پہنچائی۔ انگریزی میں فلسفہ کی ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ شغل وکالت ہے۔ اپنے وطن سیالکوٹ میں اور کبھی ریاست جموں و کشمیر میں وکالت کرتے ہیں۔ اگر قصبہ سیالکوٹ کا تاج انتخاب ڈاکٹر سر محمد اقبال ہیں تو اس کا طرّۂ امتیاز عبدالسمیع پال ہیں۔ اور یہ عجیب حسن اتفاق کہ دونوں کشمیری الاصل ہیں۔ صہبائی کی جبلّت میں شاعری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کبھی اثر کبھی صہبائی تخلّص کرتے ہیں۔ ادبی حلقوں میں اثر صہبائی کے مشترک نام سے

مشہور ہیں۔ راقم کے مخلص احباب میں ہیں۔ اور کبھی کبھی مشورۂ سخن بھی راقم سے کرتے ہیں۔ رباعیات کا ایک مجموعہ جام صہبائی کے نام سے اور غزلیات اور نظموں کا دیوان خمستان کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتابیں مینیجر آزاد بک ڈپو شہر سیالکوٹ سے مل سکتی ہیں۔ آپ حضرت ابن حزین کے چھوٹے بھائی ہیں جن کا کلام منظوم اکثر رسالوں میں امتیازی جگہ پاتا ہے۔ اثر صہبائی نے طبیعت بہت صالح اور معصوم مگر نہایت ہی دردآشنا پائی ہے۔ تعلّی و تبختر ان سے کوسوں دور ہیں۔ چونکہ مزاج میں سوز درد اور خلوص زہد ہے۔ بلیات اور ہر قسم کے جھگڑوں سے دور رہتے ہیں۔ وہ محض شاعر اور اصلی شاعر ہیں جو اس زمانے میں بہت ہی کم پائے جاتے ہیں۔ وکالت میں دل نہیں لگتا۔ مگر کرنی پڑتی ہے۔

اثر صہبائی ہندوستان میں نئی تانتی کے بہترین شاعروں میں سے ہیں۔ ان کے ہاں شوکت الفاظ کا جادو بہت کم ملے گا۔ بیاں کی برجستگی۔ ادا کی موزونیت۔ تخیّل کی علوئیت۔ اسلوب کی چستی۔ جذبات کی معصوم چہل پہل اور تزکیہ احساسات ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ ان کے کلام میں آمد کا زور ہے۔ آورد اور لفاظی کا نام نہیں۔ زبان ایسی پیاری اور ستھری پائی ہے۔ کہ سبحان اللہ۔ کلام رواں دواں اور سوز و گداز سے بھرا ہوا ہے۔ اکثر شعروں میں ہی نہیں۔ غزلوں میں انداز میر کی چھاؤں پڑتی ہے جذباتی نظمیں شگفتگی اور رقیقہ رسی کی روح رواں ہیں۔ اور اردو کے اکثر رسالے آپ کے کلام سے زینت پاتے ہیں۔ جب سے ان کی رفیقہ حیات نے دائمی جدائی کا داغ دیا۔ ان کا جی بجھ گیا۔ لامحالہ یہ بخار کلام میں پھوٹ نکلتا ہے۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے اور ایسے شاعر نہ ہوتے جیسے کہ ہیں تو عجب نہیں کہ یہ کیفیت مرض کی شکل اختیار کر لیتی۔ خمستان کا وہ حصّہ جس کا عنوان راختکدہ ہے۔ اس کیفیت قلب کی تمثال ہے۔ اسے توفیق ایزدی کہیے کہ اس دل کی ٹھیس نے زمزمۂ میری کو پھر تازہ کر دیا۔ یہ کیفیت خصوصی طور پر غزلوں

کی ہے۔ رباعیوں میں ایک غیر معمولی خوبی یہ ہے۔ کہ شبابیات کے علاوہ فلسفہ کے ایسے باریک اور دقیق نکتے حل کر جاتے ہیں۔ جو قاری کو ذرا گراں نہیں معلوم ہوتے۔ اسلوب کی شگفتگی وہی رہتی ہیں۔ نظموں میں سوز و گداز غزلوں سے کم نہیں۔ ولولہ انگیزی بھی خوب ہے۔ دعا ہے کہ اس عزیز کو عمر و صحت اور فارغ البالی نصیب ہو۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

آمد فصلِ بہاری تو نے یہ کیا کر دیا
پھر کسی کی یاد نے اِک حشر برپا کر دیا

پھر نگاہِ شوق جویائے تماشا ہو گئی
دل کو پھر ذوق تمنا سے شنا سا کر دیا

چومتا پھرتا ہے کیوں اِک اِک کلی کو اے اثر
آمد فصلِ بہاری نے تجھے کیا کر دیا

سرمستیاں عجیب ہیں صہبائے عشق کی
پہلو میں دل ہے یا کوئی ساغر بھرا ہؤا

خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے
ہر ایک دل کو غم جاوداں نہیں ملتا

دیکھ جی بھر کے مگر توڑ نہ مجھ کو گلچیں۔
ہاتھ بھی تو نے لگایا تو بکھر جاؤنگا

کس قدر نظر پرور ہے ریاض ہستی بھی
اِک نگار خانہ ہے نقشہائے زیبا کا

بارہا ہؤا دھوکا مجھ کو اپنی ہستی پہ
نقش غیر فانی کا مظہر تجلّے کا

اللہ رے صہبائی مے نوش کی مستی
کرتا ہے ہر اک گھونٹ پہ سو شکر خدا کا

کعبہ میں ہو یا ہو بتکدے میں
ہر سنگ ہے آستاں کسی کا

گو کوئی کہیں نظر نہ آیا
ہر ذرے پہ ہے گماں کسی کا

گو تاروں پہ ٹکٹکی بندھی ہے
دل کو ہے مگر گماں کسی کا

چوم لیتا ہے بتوں کو بھی کہ صہبائی ہے
اس کو ہر شے میں نظر آتا ہے جلوا تیرا

حرم و دیر میں ہے گونج مرے نغمے کی
کعبہ اپنا ہے صنم اپنا۔ برہمن اپنا

کعبہ و دیر چھان مارا ہے
کوئی اہل نظر نہیں ملتا

کانپ اٹھتا ہے فلک دیکھ کے یہ زندہ دلی
مسکراتا ہے اثر پھونک کے خرمن اپنا

عالم تمام میکدہ حسن بن گیا
رخ بے نقاب دیکھ کے صبح بہار کا

نگاہ شوق کی تھیں بدحواسیاں ورنہ
ہزار بار وہ محفل میں بے نقاب آیا

عجیب لطف سے معمور تھی وہ خاموشی
مری زبان رکی اور انہیں حجاب آیا

نغموں کو سن کے روح مری کیوں اداس ہے
ڈوبا ہوا ہے سوز میں مطرب کا ساز کیا

جن کی نظر مثال ثریا بلند ہے
ان کے لئے تمیز نشیب و فراز کیا

ہم کو فقط ہے ذوق نظر سے غرض اثر
کیا جانیں کیا ہے حسن ازل اور مجاز کیا

رنگ ہو حقیقت کا یا بتان زیبا کا
میں تو اک پجاری ہوں جلوہ ہائے رعنا کا

آندھیاں جوانی کی خوب رنگ لائی ہیں
کیا بھڑک اٹھا شعلہ آتش تمنّا کا

کس قدر نظر پرور ہے ریاض ہستی بھی
اک نگار خانہ ہے نقش ہائے زیبا کا

اک جام بلانوش کو اندھیر ہے اندھیر
جاتا رہا بہکنے سے بھی خوف خدا کا

ہر چند نغمہ ریز رہا ساز ہست و بود
لیکن کھلا نہ راز نوا ہائے ساز کا

اے حسن کیا اسی سے یہ غفلت شعاریاں
ہر سانس جس کا تیر افسانہ طراز تھا

حسن اور حسن بھی ہے فروغ شباب کا
گویا چھلک رہا ہے پیالہ شراب کا

احساس ہو رہا ہے گناہ و ثواب کا
شاید اتر رہا ہے وہ نشّہ شباب کا

ہر چند وقف دید رہا ہوں تمام عمر
لیکن بقدر شوق تماشا نہ ہو سکا

وہ ذوق دید کیا جو نہ سرشار کر سکے
وہ حسن کیا جو قلزم صہبا نہ ہو سکا

اک رند کم سواد ہے مست ازل نہیں
جو بے نیاز ساغر و مینا نہ ہو سکا

سرحد عقل سے پرے رفعت عرش سے بلند
جانے کہاں نکل گیا میں تجھے ڈھونڈتا ہوا

جس حسن کی نقاب ہے رنگینیٔ مجاز
اب کیا کہیں وہ جلوۂ رنگیں ادا ہے کیا

کیا خوب دو جہاں پہ مجھے اختیار ہے
میں سوچتا ہوں دل پہ بھی ہے اختیار کیا

کھل گیا راز بے خودی میرا
اس کی آنکھوں میں ہے حجاب کا رنگ

اب کچھ تو فیصلہ ہو حیات و ممات کا
تنگ آ گئے ہیں روز کے اس امتحاں سے ہم

سجدے کے داغ سے نہ ہوئی آشنا جبیں
یہ خواب ہے کہ حقیقت نہ ہو سکا معلوم

جلوہ ہے کس کے حسن کا چشمِ خیال میں
ڈوب گیا ہے سازِ دل نغمۂ دل گداز میں

چاہے جسے عطا کرے اسکی ہیں سرفرازیاں
جوشِ نمود دیکھئے شوقِ شہود دیکھئے

کیا فسوں ہے تری تمنا میں
مری ہر سانس کو سب نغمۂ محفل سمجھتے ہیں

اب کہاں ابتدائے عشق کے لطف
آؤ آؤ کہ پھر ملیں نہ ملیں

ہے اسی کو فقط ثبات یہاں
تو نے اسے متاعِ گرامی بنا دیا

لطفِ گناہ میں ملا اور نہ مزا ثواب میں
تیرے شباب نے کیا مجھ کو جنوں سے آشنا

آہ یہ دن کہ جانگداز جوششِ اضطراب ہے
جنگل کی چاندنی میں یہ پھول جھومتے ہیں

ہنگامہ ہائے رونقِ دنیا کو کیا کروں
آپ سرکارِ ناز ہی ٹھہرے

میری ہستی بھی اک معما ہے
وہ کاروانِ ناز تو کوسوں نکل گیا

ہر چند جانتا ہوں فریبِ نگاہ ہے

بیگانہ وار گزرے ہر اک آستاں سے ہم
رہی یہ بات کہ کچھ ہے سو وہ بھی کیا معلوم

عالم تمام ڈوب رہا ہے جمال میں
موجِ مئے سرود تھی خندہ جاں نواز میں

ہیں کئی آسماں مری گردِ رہِ نیاز میں
حسن نگاہ بن گیا چشمِ نظارہ باز میں

داغِ حسرت کو بھول جاتا ہوں
مگر اہلِ دل آوازِ شکستِ دل سمجھتے ہیں

اب وہ گلہائے نوبہار کہاں
زندگانی کا اعتبار کہاں

ہم جسے انقلاب کہتے ہیں
رکھا ہی کیا تھا زندگیٔ مستعار میں

عمر تمام کٹ گئی کاوشِ احتساب میں
میرے جنوں نے بھر دیئے رنگ ترے شباب میں

ہائے وہ دور جب کبھی لطف تھا اضطراب میں
یا رقص ہو رہا ہے پریوں کا انجمن میں

ہیں آبدیدہ رنگِ تماشا کو کیا کروں
دل مرا خوگرِ نیاز نہیں

راز ہوں آشنائے راز نہیں
گم شیخ و برہمن ہیں مگر گردِ راہ میں

ہیں پھر بھی مبتلا ہوں فریبِ نگاہ میں

بوئے گیسو جو کبھی حسن کی غمّاز نہ ہو
وادیٔ عشق میں یوں لطف تگ و تاز نہ ہو

روح کیوں مائل پرواز ہے ہنگام سماع
ساز مطرب میں کہیں تیری ہی آواز نہ ہو

زندگی ایک فسانہ ہے سو وہ بھی ایسا
جس کا انجام نہ ہو۔ جس کا کچھ آغاز نہ ہو

رگ رگ میں اک سرور ہے سوز و گداز سے
نغمے نکل رہے ہیں مرے دل کے ساز سے

کیا جانے کیا خزانہ ملا ہے کہ اہل درد
دونوں جہاں سے ہو گئے کچھ بے نیاز سے

نور سحر اسی میں ہے ظلمت شب اسی میں ہے
گردش چشم ہی تری گردش روزگار ہے

وہ رشک صد بہار آئے نہ آئے
ہمیں ہے انتظار آئے نہ آئے

لپٹ کر چوم لے پھولوں کو بلبل
چمن میں پھر بہار آئے نہ آئے

سیلاب تبسم ہے ساقی کی نگاہوں میں
ساغر مرا ساغر ہے صہبا مری صہبا ہے

بیگانۂ وحدت ہے تیری ہی نظر ورنہ
کعبے میں ہے بتخانہ۔ بتخانے میں کعبہ ہے

ہر گام پہ جھک جھک کے کی میں نے جبیں سائی
ہر نقش میں مجھ کو اک تصویر نظر آئی

چمن میں رقص طرب ہے بپا ہے رباب ہے نغمہ نکال مطرب
عبث ہیں یہ کاوشیں تری دل میں پھول کیا ہیں بہار کیا ہے

بے نیازی سے رہے وقف جہنم لیکن
جھک کے توبہ کی ندامت کو گوارا نہ کرے

سر وہی سر ہی نہ ہو جس میں خمار غم دوش
دل وہی دل ہے جو اندیشۂ فردا نہ کرے

جھک جھک کے دیکھتا ہوں میں طوبیٰ کو عرش کو
کچھ اس قدر بلند ملی ہے نظر مجھے

پرواز شوق کی نہ رکے گی نہ رک سکی
گو آسماں نے کر دیا بے بال و پر مجھے

طوف حرم نہ سجدۂ بت خانہ چاہیئے
آزادہ رو کو مسلک رندانہ چاہیئے

بر آسکے نہ یاس ہی اسکو مٹا سکے
ایسی بھی جانگداز تمنّا نہ چاہیئے۔

واعظ کی حد سے بڑھ گئیں ہرزہ سرائیاں
اے مے پرست! نعرۂ مستانہ چاہیئے

تری باتوں سے تو اے شیخ ایسا جی نہیں جلتا
خدا غارت کرے اسکو جو پی پی کر پشیماں ہے

دنیا میں ہزاروں خوشیاں ہیں یہ دنیا عشرت خانہ ہے
اس بزم میں لیکن میرا ہی اک درد بھرا افسانہ ہے

تیرے جانے سے عجب رنگ ہے اے جان بہار
اب گلستاں بھی بیاباں نظر آتا ہے مجھے

موج طوفان خیز میں ہے اضطراب زندگی
اور سکون مرگ ہم آغوشئ ساحل میں ہے

اپنی ہستی ہے مرکز عالم
موقوف آرزو پہ ہے ہنگامۂ حیات

دیدۂ دل بھی وا کرے کوئی
مر جایئے پہ ترک تمنا نہ کیجئے

جب حسن کائنات ہوا ایسا سرور خیز
کیوں آرزوئے ساغر و مینا کرے کوئی

ہر شے سے پھوٹ پھوٹ کے نکلے شعاع حسن
لیکن نگاہِ شوق بھی پیدا کرے کوئی

کچھ شغل زندگی کے لئے بھی تو چاہئے
تقدیر سے اگر نہ لڑے کیا کرے کوئی

آستانے نگاہ سے گذرے
مائل بندگی جبیں نہ ہوئی

لاکھ جلوے رہے نگاہوں میں
کوئی تصویر دلنشیں نہ ہوئی

کعبہ و دیر و میکدہ میں رہے
دل کی تسکین مگر کہیں نہ ہوئی

اچھا ہے میں اسیر فریبِ بہار ہوں
یہ رنگ و بو فریب سہی رنگ و بو تو ہے

سب کی سب باتیں سنیں منہ سے نہ کچھ بولا اثر
دیر تک احباب صہبائی کو سمجھاتے رہے

رباعیات

تیری ہستی کا کچھ یقیں بھی نہیں
دیکھتا ہوں تو ہر جگہ موجود
میرے لب پر مگر نہیں، بھی نہیں
سوچتا ہوں تو پھر کہیں بھی نہیں

ممتاز ہے شان ارجمندی میری
سجدہ بھی کیا تو تیرے در پر یارب
ہے رو کش عرش سربلندی میری
نازاں ہے بہت نیازمندی میری

بیگانہ ہوش ہوں کہ ہشیار ہوں میں
فطرت کی ستم ظریفیاں تو دیکھو
ہوں عالم خواب میں کہ بیدار ہوں میں
مجبور کو وہم ہے کہ مختار ہوں میں

غرقاب سکوت ہوں کہ تقریر کروں
تدبیر بھی کرنے پہ ہوں مجبور اثر
ممکن نہیں سرتابئ تقدیر کروں
تقدیر میں لکھا ہے کہ تدبیر کروں

نظمیں - صبح و شام

سب دشت و جبل حسن سے معمور ہوئے ہیں ذرّات چمن غیرت صد طور ہوئے ہیں
پردے رخ محجوب سے کیا دور ہوئے ہیں اشجار مے نور سے مخمور ہوئے ہیں
قدرت کی صراحی مے وحدت سے بھری ہے

جو نیلے سے آکاش پہ روشن ہیں ستارے کس حسن کے جلوے ہیں یہ بے سوز شرارے
مہتاب کی کرنیں ہیں کہ ہیں نور کے دھارے اندوہ ربا۔ روح فزا ہیں یہ نظارے
کس شاہد محجوب کی یہ جلوہ گری ہے

دل نامراد

صحن چمن کا برگ برگ صفحۂ زرنگار ہے
خامۂ مانیٔ ازل۔ باغ کا خار خار ہے
رنگ ریاض کائنات غیرت صد بہار ہے
اے دل نامراد تو آج بھی بیقرار ہے

ناکام محبت

او تغافل کیش اگر یوں ہی رہیں بے مہریاں ایک دن خاموش پھر میری زباں ہو جائیگی
یہ مری ہستی کہ ہے اک شعلہ زار آرزو ظلمت شہر خموشاں میں نہاں ہو جائیگی
گو مرا پیکر فنا ہو جائے گا لیکن مری سادگی الفت کی زیب داستاں ہو جائیگی

محفل ہستی سے محروم تمنا جاؤں گا
نقش صدق عشق کا لیکن بٹھاتا جاؤں گا

شام کو دنیا کے ہنگاموں سے جب گھبرا کے تو باغ میں پھولوں سے اپنی روح کو بہلائیگی
جب نہ پائیگی کہیں بوئے محبت کا نشاں جب گلستاں کی کلی ہر ایک مرجھا جائیگی

آہ پھر اس وقت اے مست مے پندار حسن
یاد آ آکے مری تجھ کو بہت تڑپائے گی
روح جنّت کے لئے پھر پرفشاں ہوجائیگی
عارضی ہستی تری بھی جاوداں ہوجائیگی

ہونگے پھر فردوس کی پھولونمیں دونوں ہمکنار
خوگر فتنہ نہیں جس سرزمیں کا آسماں
جسکی ہر آواز میں ہے ربط الفت کی گونج
جسکی ہر وادی میں ہیں چشمے محبت کے رواں
پھر وہاں ہونگے ترے لبہائے لعلیں کے ایاغ
جنکی مستی میں ہے تاثیر سرور جاوداں
بے نیاز لطف وجور آسماں ہوجاؤں گا
چند جرعے پی کے کیف جاوداں ہوجاؤں گا

راختکدہ میں سے

اک نالۂ جانستاں نہیں ہے
کب لب پہ مرے فغاں نہیں ہے
ہے دود سیاہ آہ ہستی
سر پر مرے آسماں نہیں ہے
اب کس سے کہیں فسانۂ غم
جب کوئی بھی رازداں نہیں ہے
معمورۂ غم ہے بزم امکاں
کوئی بھی نوشادماں نہیں ہے
وہ دل کہ تھا ایک قصر رنگیں
اب اس کا کہیں نشاں نہیں ہے
آواز شکست دل ہے ہمدم
اب نغمۂ شادماں نہیں ہے
اب خون جگر ہے اور میں ہوں
شوق مے ارغواں نہیں ہے
روداد اثر ہے اک حقیقت
افسانۂ وداستاں نہیں ہے

حریم نازمیں میری نماز ہوجائے
جبیں شوق سراپا نیاز ہوجائے
ہر ایک شے میں درخشاں ہو جلوہ معصوم
مری نگاہ اگر پاک باز ہوجائے
پھر آرزوؤں سے معمور ہوگیا اے حسن
دیار دل پہ پھر اک ترکتاز ہوجائے

یہ میری زیست کا حاصل ہے آپ کا کیا ہے
اگر نگاہ محبّت نواز ہو جائے

کچھ ایسا نغمۂ بیتاب چھیڑ اے مطرب
کہ بیقرار مرے دل کا ساز ہو جائے

وہی ہے رند حقیقت شناس نظر و نہیں
کہ پیر میکدہ سے بے نیاز ہو جائے

تلاش خویش میں گم ہوں یہ کیا قیامت ہے
کہ راز آپ ہی جویائے راز ہو جائے

نہ کٹ سکیگی شب تار زندگانی کی
یہ داستان محبّت دراز ہو جائے

بہشت زیست ہے سوز و گداز عشق اثر
خوشا وہ دل کہ سراپا گداز ہو جائے

ض

ضابط :۔ چودھری محمد اصغر علی صدیقی رئیس کھیڑہ بزرگ۔ بدایوں۔ آپ کے بزرگ شاہی زمانہ میں سرفراز اور دربار میں ممتاز تھے۔ چودھری صاحب ظریف الطبع۔ خوش مزاج۔ اور رؤسائے عصر میں نامور تھے۔ ضلع بدایوں میں خاندان "بارہ گاؤں کے چودھری" صاحبان میں منقسم ہے۔ جس کا بڑا حصّہ موضع تال گاؤں میں آباد ہے آپ کے مورث غزنی سے سلطان محمود کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ ضابط

علوم درسیہ کی تحصیل کے ساتھ ساتھ آپ نے علماء و فضلا کی صحبت اٹھائی تھی۔ اخلاق و تہذیب کے سایہ میں تربیت پائی تھی۔ عالی ہمّت اور باحوصلہ رئیس تھے۔ آپ کو ابتدائے عمر ہی سے شعر و سخن کا شوق تھا۔ فکر رسا اور زبان شستہ تھی۔ آپ کے مکان پر جو مشاعرے منعقد ہوتے ان کا انتظام وسیع پیمانے پر کیا جاتا۔ حضرت اسیر لکھنوی۔ اور منشی اسمٰعیل حسین منیر وغیرہ بھی بدایوں تشریف لیجاتے اپنی دلبستگی ادب کے خیال سے وطن مالوفہ کو چھوڑ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی

۱۸۹۱ء میں بمقام لکھنؤ آپ کا انتقال ہوا اور جنازہ لکھنؤ سے بدایوں لایا گیا۔ دیوان مطبوعہ وکٹوریہ پریس بدایوں آپ کی یادگار ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

بھلا ہو چارہ گر تیرا چھڑک دی ایک دو چٹکی ۔۔۔ مرا زخم جگر تکتا ہے منہ کب سے نمکداں کا
ادائیں سبھی آفتِ جاں ہیں لیکن ۔۔۔ مٹاتا ہے بے ساختہ پن کسی کا
لے گیا سو بار بزم غیر میں ۔۔۔ شوق نے کیا کیا مجھے رسوا کیا
آگیا فقروں میں اک عیّار کے ۔۔۔ ضابطؔ ناداں یہ تو نے کیا کیا
مجھے وہ دیکھتے ہی منہ پہ زلفیں کھول لیتے ہیں ۔۔۔ نئے انداز کا پردہ نکالا ہے یہ چلمن کا
جذب دکھلائیگا کچھ اپنا اثر آپ سے آپ ۔۔۔ کھنچ لیگا ترے پیکاں کو جگر آپ سے آپ
خط کا آغاز ہے کیوں آتشیں رخساروں پر ۔۔۔ سبزہ اُگتے کبھی دیکھا نہیں انگاروں پر
رنگ لائے سر مژگاں مرے اشک خونیں ۔۔۔ پھول کھلتے ہوئے دیکھے ہیں انہیں خاروں پر
دل تڑپتا ہے کسی کی ملگجی پوشاک پر ۔۔۔ سادگی کا نوجوانی میں یہ عالم دیکھکر
مست کی طرح اُٹھا جھوم کے کالا بادل ۔۔۔ میکشو مژدہ کہ وہ جھوم کے آیا بادل
مجبور ہو گئے دل خانہ خراب سے ۔۔۔ کیا جانتے نہ تھے انہیں کچھ پیشتر سے ہم
ٹھنڈا کیا نہ دل نفسِ سرد نے کبھی ۔۔۔ جل جل گئے ہیں سوزشِ زخم جگر سے ہم
زاہد سیاہ کاروں پہ ہنسنا روا نہیں ۔۔۔ دھو ڈالیں گے کتاب عمل چشم تر سے ہم
قصہ ہستی کا ہوا ختم کہ پیری آئی ۔۔۔ رات بھر کی یہ کہانی ہے سحر کچھ بھی نہیں
مشتعل ہوتی گئیں سینے سے روکا جسقدر ۔۔۔ میری آہیں بھی چراغ زیر داماں ہو گئیں
عشق وہ عشق ہے باقی نہ رہے ننگ کا نام ۔۔۔ شوق وہ شوق کہ چھوڑے بھی نہ ناردامن
حسرت و یاس کبھی ہے کبھی امید و رجاء ۔۔۔ مشغلے اپنے ہیں کیا کیا شب تنہائی میں
بہاریں نہ دیکھو نگی کبھی جاتی ہیں نظروں میں ۔۔۔ جنوں کیونکر نہ پلکوں سے چنوں خار مغیلاں کو
اٹھاؤں نہ کیونکر جفائیں تمہاری ۔۔۔ کہ دل میں کھبی ہیں ادائیں تمہاری

زباں پر نہ آیا کبھی حرفِ مطلب — وہ کیا جانیں کیا آرزو تھی کسی کی
کچھ بھی ہو مگر کوچۂ جاناں میں رہینگے — ہم قیس نہیں ہیں جو بیاباں میں رہینگے
واعظ کبھی ڈرائے نہ نشور سے — اس پر حقیقت شب فرقت اگر کھلے

ضابط

ضابط۔ مہر علی دہلوی۔ تیز فکر، خوش وضع جوان تھے۔ صرف و نحو عربی سے خوب واقف تھے۔ تذکرۂ گلستان سخن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۱۲۷۱ھ میں زندہ تھے۔ اور اپنے والد کے ساتھ دہلی میں قیام تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

حشر میں خاک سے سب لوگ تو نکلے لیکن — قبر عاشق سے جو دیکھا تو دھواں سا نکلا
نام کی تو شرم کر ضابط خدا کے واسطے — یہ ترا گریہ تجھے آخر بہالے جائیگا
یوں تو ہر ایک سے وہ خلق سے پیش آتا ہے — ایک ہم ہیں کہ کبھی ہم سے نہ کی پیار کی بات

ضاحک

ضاحک:۔ میر غلام حسین ولد میر عزیز اللہ دہلوی۔ میر حسن صاحب مثنوی بدر منیر کے والد تھے۔ دہلی کی سکونت ترک کرکے فیض آباد میں سکونت اختیار کی۔ بقول صاحب تذکرہ گلزار ابراہیمی ۱۱۹۶ھ میں فیض آباد میں حیات تھے۔ اور وارستگی سے بسر کرتے تھے۔ مرزا رفیع سودا نے ان کی ہجو میں کچھ شعر کہے تھے۔ انہوں نے بھی مرزا سودا کی ہجو کہی۔ جس میں سے کچھ اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

ہجو

سودا کی لغویات کو ضاحک نہ دیکھ رہ — جلدی جلادے اسکی یہ ابیات کرکے تہ
پوچھے اگر وہ کیا مری تقصیر تو یہ کہہ — ایں زادہ زیاد نہ کردست ہیچ گہہ
نمرود ایں عمل کہ تو شداد کردۂ

موزوں خوردسالی میں تیں شعر جو کیا — جاکر فنونِ شاہ میں اصلاح کو دیا
واں جس مغل نے بات کا مضمون پالیا — چشمک زد آں خشونی و گفتہ بیا بیا
من ہم بہ بینمش کہ چہ ارشاد کردۂ

شیرازی تھا نہ باپ ترا اور نہ آملی — وہ خرس گر مغل کوئی ہوگا تو کابلی

گوناگوں شعر کہنے پہ تیری زباں کھلی | ہرگز کسے نہ گویدت آقا علی قلی
زیں گفتگو عبث دل خود شاد کردۂ
کیا دیجئے اصلاح خدائی کو وگرنہ | کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

ضامن

ضامن ۔ حکیم محمد ضامن اکبرآبادی۔ راجہ چندولعل دیوان حیدرآباد کی سرکار میں بزمرۂ شعرا ملازم تھے۔ طب میں بھی دخل رکھتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

ہے آج ہر نفس نفسِ واپسیں مجھے | گر قتل کر کے جائیں تو احسان آپ کا
کون اُٹھ کر گیا کہ ضامن تو | آپ میں اب تلک نہیں آتا
شیوۂ ظلم سے مشہور ہوا عالم میں | قتل سے میرے تجھے اور ہوا کیا حاصل

ضامن

ضامن :۔ سید ضامن علی ضامن چشتی صابری پانی پت۔ ضلع دہلی کے رہنے والے اور باکمال فقیر تھے۔ کلام پاکیزہ اور معرفت سے پُر ہے۔ ۷۵ برس کی عمر میں ۱۲۹۶ھ میں جلال آباد میں انتقال کیا۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔ ان کی صد ہا غزلیں محفلوں میں گائی جاتی تھیں۔

چشم حق بیں سے غور کر دیکھا | یار آیا نظر جدھر دیکھا
کعبہ و دیر و میکدہ مسجد | اُس سے خالی نہ کوئی گھر دیکھا
راز مخفی کو جب کیا ظاہر | سر منصور دار پر دیکھا
اتنا تو روز ظلم نہ کر مجھ فقید پہ | بندے خدا کے ہم بھی تو بندے خدا کے ہیں
کون کہتا ہے کہ عاشق مر چلے | قید سے چھوٹے وہ اپنے گھر چلے
خفتگانِ خاک کے مرقد پہ تم | اے صنم کیا حشر برپا کر چلے ...

ضامن

ضامن :۔ ضامن علی شاگرد مضطر خیرآبادی کچھ زمانہ ہوا کہ اُدیپور میواڑ میں ملازم تھے۔ مذاق شاعری پُرانے رنگ کا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

کیا کروں اپنے ہی دل پر نہیں قابو اپنا | ورنہ ممکن ہے کہ اے شوخ نہ ہو تو اپنا

جب کہ ہو جلوۂ دیدار ہر اک جا ضامن	ہے یہ مشکل کہ نہ ہو تذکرہ ہر سو اپنا

ضامن ۶۵۱ مئی

ضامن:۔ لفٹننٹ سید ضامن علی صاحب ایم۔اے صدر شعبہ اُردو الہ آباد یونیورسٹی آپ راقم کے مہربان ہیں۔ کئی دفعہ الہ آباد میں ملاقات ہوئی۔ تذکرہ کے لئے ہر دفعہ زبانی عرض کیا اور عریضے بھی بھیجے۔ لیکن آپ نے اپنے حالات نہ کلام سے ممنون فرمایا۔ آپ کا مذاق سخن اعلےٰ ہے۔ ویسے خوش خلقی سے ملتے ہیں۔ مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں مگر نہ معلوم اس بے اعتنائی کی کیا وجہ ہوئی۔ ایک غزل گلدستہ ریاض سخن میں دیکھی گئی اس میں سے چند اشعار انتخاب کر کے پیش کئے جاتے ہیں۔

جذب کی تاثیر قابل دیکھنے کے ہے حضور	دل ہے یا ہو آپ کے ناوک کا پیکاں دیکھئے
چشم حق بیں ہو تو کوہ طور کی حاجت ہے کیا	ذرہ ذرہ میں جمال روئے جاناں دیکھئے
ہم نے مانا شکوۂ بیداد سے بدلے گی خو	کس کی آنکھوں سے مگر ان پشیماں دیکھئے
انبساط دل کا باغ دہر میں کیا اعتبار	پھول ہوتے ہی ہوا غنچہ پریشاں دیکھئے
کھپ گئی نظروں میں لے ضامن بہار حسن یار	اب تو کچھ دن تک گلستاں ہی گلستاں دیکھئے

ضبط

ضبط:۔ جناب منشی رام سروپ صاحب خلف چودھری بابو رام صاحب شیدا کائست سری واستو۔ آپ کی عمر اس وقت تخمیناً ۳۸ سال کی ہے۔ اور خزانہ صدر کلکٹری سیتاپور میں ملازم ہیں۔ انگریزی میں انٹرنس پاس کیا ہے اور فارسی کی تعلیم بقدر ضرورت حاصل کی ہے۔ آپ نے اپنا مختصر سا کلام درج تذکرہ ہونے کے لئے روانہ فرمایا ہے۔ اس کا انتخاب درج ذیل ہے۔

وصل سے خوش نہ ہوا ہجر سے نالاں نہ ہوا	میں وہ انسان ہوں کہ مجھ سا کوئی انساں نہ ہوا
آنکھ وہ آنکھ نہیں جس میں نہ ہو دید کا شوق	دل وہ کیا دل ہے کہ جس دل میں تو مہماں نہ ہوا
شیخ کی آنکھ لڑ گئی جلوہ گہ مجاز میں	بت سے لگا چکے ہیں دل کیا لگے جی نماز میں
قاتل سنگ دل نے منہ پھیر لیا جو بعد قتل	حسرت دید نہ گئی چشم شہید ناز میں

حسرت و رنج و درد و غم میرے قدیم مہرباں
آکے ہوئے شریکِ غم میری شبِ دراز میں

عشقِ بتاں میں مر مٹا راہِ خدا بھی پا گیا
رازِ حقیقت آشنا ضبط کھلا مجاز میں

مخمس

پھولی نہیں سماتی خوشی سے ہزار اب
ہے نغمہ زن کہ آئی ہے فصلِ بہار اب
غنچے چٹک کے کہتے ہیں یہ بار بار اب
فیضِ بہار سے گل رنگیں ہیں خار اب
دامانِ کوہ و دشت بھی ہیں لالہ زار اب

باہر ہے نامیہ بھی حدِ اختیار سے
گل کھل رہے ہیں بید کی بھی شاخسار سے
پیہم صدا یہ ہے لبِ شاخِ چنار سے
محروم کوئی شے نہیں فیضِ بہار سے
خاکِ چمن بھی بن گئی مشکِ تتار اب

بادِ صبا کو چین کہاں بے قرار ہے
بلبل کے چہچہے ہیں سریلی ملار ہے
فصلِ بہار دوشِ صبا پر سوار ہے
گلہائے خرّمی کا کھلا لالہ زار ہے
درد و الم ہیں سب مرے دل سے فرار اب

ضبط:- شیخ محمد بخش اجمیری کلرک آڈٹ آفس ریلوے تلمیذ نواب عبداللہ خاں مطلب۔ شعر شاعری کا مذاق قدیمانہ اچھا ہے۔ الفاظ چست۔ بندشیں درست ہوتی ہیں مضمون آفرینی کے لئے جدّ و جہد نہیں کرتے۔ یہ آپ کے اشعار ہیں۔

بے بلائے وہ کسی روز مرے گھر آتے
جب تو اے آہِ رسا میں ترا قائل ہوتا

کس پہ آیا ہے۔ کہاں یہ دلِ شیدا آیا
جو مجھے ڈر تھا وہی سامنے دیکھا آیا

وہ دل ہدفِ ناوکِ بیدادِ فلک ہے
جس دل میں ترے وصل کا ارمان رہا ہو

بزمِ محبوب میں اے حضرتِ دل چپ رہنا
شکر بھی تم جو کرو گے تو شکایت ہوگی

تم نے محشر میں اگر آنکھ اٹھا کر دیکھا
کس کو اللہ سے فریاد کی طاقت ہوگی

کہہ رہے ہیں خواب میں بوسے لئے
یہ نرالے ڈھنگ ہیں الزام کے

ترا مُنہ چوم لوں ناصح ادھر آ	اُسی کا ذکر لب پر ہر گھڑی ہے

ضبط

ضبط: سید حسین شاہ مرحوم شاگرد شیخ قلندر بخش جرأت مرحوم۔ طبع موزوں اور ذہن خداداد تھا۔ "مرات حیدری" انہیں کی تصنیف سے ہے۔ کئی رسالے جن میں رمل اور جفر کے قواعد کو نظم کیا۔ آپ کی زورِ فکر کا نمونہ ہیں نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

چھوٹی سی زلف دیکھ کے کہتے ہیں شانہ میں	پھانسے گی دل پہنچ کے یہ بے پیر دوش پر
عشق اس کی زلف کا مرے کاندھے پہ ہے سوار	پاؤں کے بدلے چاہئے زنجیر دوش پر
افشاں چھڑک کے زلف جو کھولی ہے آپ نے	ہے ابر اور برق کی تصویر دوش پر

ضبط

ضبط: حاجی سید سلطان احمد لکھنوی شاگرد حضرت جلال مرحوم۔ شیریں کلام و خوش بیاں ہیں۔ لکھنؤ کے روزمرہ سے واقف اور زباں داں ہیں۔ فکر رسا کو نئے مضامین کی تلاش رہتی ہے۔ اشعار کی ترکیب دل آویز ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

سب تجھی کو جانتے ہیں اے صنم اپنا خدا	ایک مذہب ہو گیا ہے کافر و دیندار کا
دل مضطر میں ترے تیر کا پیکاں نہ رہا	جا چکا درد وہ جس درد کا درماں نہ رہا
در بدر خاک بسر خلق میں رسوا ہوتا	دل کے ہاتھوں ہی ابھی دیکھئے کیا کیا ہونا
اے دردِ عشق اُف بھی نہ آئے زبان پر	بگڑے نہ بات لاکھ بنے اپنی جان پر
ہم اور آتے ترے کعبہ میں اے شیخ	چلے آئے تجھے بت خانہ سمجھ کر
پڑے ہیں راہ میں کچھ شیشۂ دل	چلو رفتار مستانہ سمجھ کر
کوچہ سے اس کے کوئی سلامت پھرا نہیں	اے دل کدھر چلا ہے ذرا ہوشیار ہو
پوچھنا تم بعد مجھ سے میری حیرت کا سبب	اپنی صورت دیکھ لو پہلے اُٹھا کر آئینہ
کیوں نہ اُنس ان کو ہو مجھ سے مجھے اُلفت اُنکی	دل ہے بیتاب مرا شوخ طبیعت اُن کی
آئے ہیں ساتھ رقیبوں کے عیادت کو مری	جور کے پردہ میں مجھ پر ہے عنایت اُن کی
محبت ترک کی اُس فتنہ گر کی	نہ نکلی پھانس اس پر بھی جگر کی

مال کیا مال ہے دل دیکے تمہیں جان بھی دی
دل بہت کر گئے تھوڑی سی بضاعت والے

نہ آؤ بھید و تصویر ہی تسلّی کو
کوئی تو دل کے بہلنے کا مشغلہ ہو جائے

ضبط

ضبط:۔ سید آغا جان ولد سید روشن علی خاں برادر نواب معتمد الدولہ بہادر لکھنوی آپ کانپور میں پیدا ہوئے۔ مگر لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی اور آخر عمر تک وہیں رہے فنِ شاعری میں میر ہادی علی بیجو لکھنوی سے تلمذ تھا۔ ۱۲۶۹ھ میں زندہ تھے۔ رعایت لفظی کو حسنِ سخن جانتے تھے۔ نمونۂ کلام پیشِ ناظرین ہے:۔

اس گھر میں جز ملال نہ عشرت ہوئی مقیم
وہ کون سی گھڑی تھی ہوئی جب بنائے دل

تجھ کو ہے شغلِ عشق یہاں دم پہ بن گئی
ہم ایسے مشغلے سے ترے باز آئے دل

عاشق ہوا تو ہجر میں تڑپا ئیے اسے
تجویز خوب آپ نے کی ہے سزائے دل

یاد آجاتی ہے ساقی تری چشم مخمور
دیکھتی ہیں جو کبھی ساغر و صہبا آنکھیں

تو سراپا چمن حسن ہے اے رشکِ بہار
رُخ ہے گل سرو ہے قد نرگسِ شہلا آنکھیں

ضبط

ضبط:۔ لالہ بہاری سنگھ شاگرد کریم بخش فرقت شاہجہان پوری تیز طبیعت جوان فکر معلوم ہوتے ہیں۔ دو شعر دستیاب ہوئے۔ جو درج کئے جاتے ہیں۔

بھرے ہیں دید کے ارمان دل میں مدت سے
ادھر بھی ایک نظر اے صنم خدا کے لئے

جو دیکھا دم میں ہزاروں کے دم فنا کرتے
قدم قضا نے ستمگر تری ادا کے لئے

ضبط

ضبط:۔ صاحبزادہ حبیب اللہ خاں۔ آپ ریاست ٹونک کے خوش طبع با وضع رئیس زادوں سے ہیں۔ علم رسمیہ سے واقف اور فارسی علم ادب۔ علم بدیع و عروض میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ فنِ شعر گوئی میں نواب سلیمان خاں صاحب اسد لکھنوی سے تلمذ تھا۔ سید اصغر علی آبرو اور صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشق ٹونکی کے ہم مشاعرہ ہیں آپ کا دیوان "تحفۂ ضبط" المعروف بہ "خونابۂ خیال" جو ۱۳۰۵ھ میں مطبع علوی لکھنوی میں طبع ہو چکا ہے۔ اپنے رنگ میں جذبات عشق کا مرقع اور معاملات

حسن کا دفتر ہے۔ بندش کی شستگی و صفائی زبان دانی کی آئینہ دار ہے۔ کہیں کہیں رعایت لفظی کے جلوے اپنا کرشمہ دکھا جاتے ہیں مگر وہ بیان کی بے تکلفی میں سدِّ راہ نہیں ہوتے خال خال تشبیہات ہیں۔ جن کی آرائش طبع کو ناگوار نہیں معلوم ہوتی۔ نعت بھی خوب کہتے ہیں۔ نعتیہ دیوان موسوم بہ "مرقع فیضؔ" زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

کچھ اور تھی نہ خلقت کونین سے غرض — منظورِ حق کو تیرا ظہورِ جمال تھا
آنے لگے ہیں لختِ جگر آنسوؤں کیساتھ — اب رنگ دیکھنا مژۂ اشکبار کا
دل میکشوں کے کھینچتا ہے سوئے میکدہ — آنا یہ جھوم جھوم کے ابرِ بہار کا
کچھ کچھ تسلیاں بھی مری جان دیجئے — تھم تھم کے حال سنئے دلِ بیقرار کا
ثابت ہؤا یہ عہد شکستہ نہیں ترا — ٹوٹا ہؤا ہے دل کسی امیدوار کا
چار سو عکس فگن ہے رخِ تاباں کس کا — صورتِ آئینہ خورشید ہے حیران کس کا
زلف و روئے یار سے عالم میں کیا نیرنگ ہے — کوئی کافر ہو گیا کوئی مسلماں ہو گیا
واہ رے جذبِ محبت کہ نہ چھوڑا دل نے — مر کے بھی سینۂ بسمل سے نہ پیکاں نکلا
سب جھوٹ ہے اغیار کی باتوں پہ نہ جاؤ — میں اور گلہ آپ کی بیدادگری کا
میں ہوں دیوانۂ الفت تو اپنی فصد لے ناصح — رگِ دل پر نہ ہو گا کارگر نشتر نصیحت کا

چال ایسی چلا وہ محشر میں — داورِ حشر بھی اِدھر نہ ہؤا
بے کسی تجھ پہ رحم آتا ہے — کون پوچھے گا میں اگر نہ ہؤا
یاس منہ دیکھتی ہے قاتل کا — آبِ خنجر سے حلق تر نہ ہؤا

میں نے کہا کہ یاد ہے وعدہ کبھی وصل کا — بولے کہ اس خیال کو دل سے بھلائیں آپ
شباب آتے ہی پامالِ دردِ عشق ہؤا — بہار آئی چمن میں مرے خزاں کی طرح
مہر دل میں ہے جو اُس بانیِ بیداد کی یاد — ہے تسلّی کی تسلّی مجھے اور یاد کی یاد

ہُوں وہ بُلبل کہ رہا ہو کے بھی پابند رہا
آگے اس دیدۂ گریاں کے شبِ فرقت میں
پسِ مُردن خزاں میں بھی نہ چھوٹا باغ بلبل سے
کمال حُسن پر پھولیں نہ یہ گُل رو کہ ضبط اکدن
جان جاتی ہے شبِ غم اے فلک کس یاس سے
رسوا کیا ہے اب تو اس عشق نے یہاں تک
سرِ مجنوں کی دیتا ہوں قسم دستِ جنوں تجھکو
اُٹھو رندو۔ چلو ابر بہاری جھوم کر آیا
دل مضطر کو سنبھالوں کہ جگر کو تھاموں
اثر الفت کے اب کچھ کچھ نمایاں ہوتے جاتے ہیں
چلے وہ ہو کے رخصت تو مرے ہوش و خرد بولے
دل میں ڈھونڈا نہ اُسے دیر و حرم کو دوڑے
آؤ مل جاؤ تم اغیار کی باتوں پہ نہ جاؤ
ہاتھ اک اور بھی بسمل کے لگاتے جاؤ
ہیں دم بخود مسیح بھی اُس کو لگا کے ہاتھ
اے اضطرابِ دل ترا خانہ خراب ہو
دامن تر سے مرے آتشِ دوزخ ہوئی سرد
طرفہ عالم ہے محبت کے پریشانوں کا
کون آیا کہ گئے ہوش ترے اے ساقی
برہم ہوئے تو حسن کی خوبی سوا ہوئی
ناتوانی سی ناتوانی ہے

دل سے اک دم نہ گئی خانۂ صیاد کی یاد
ہم بھی دیکھیں کہ برستی ہیں گھٹائیں کیونکر
ہوائے شوق میں اُڑتے ہیں پر برگِ خزاں ہوکر
اُڑے گا شعلۂ حسنِ رخِ رنگیں دھواں ہو کر
دیکھتی ہیں حسرتیں بیمارِ ہجراں کی طرف
اُٹھنے لگی ہیں ہم پر غیروں کی انگلیاں تک
کفن کا بھی نہ رکھنا تار تک باقی گریباں میں
گلابی پھول سے بھر کر بہائیں صحنِ گلستاں میں
چاہیں دم بھر کسی پہلو شبِ ہجراں میں نہیں
کہ اپنے جور سے وہ خود پشیماں ہوتے جاتے ہیں
ٹھہرو جانے والے ہم بھی تیرے ساتھ چلتے ہیں
کچھ سمجھ بوجھ مگر شیخ و برہمن میں نہیں
دیکھو جو صلح میں ہے بات وہ ان بن میں نہیں
زیست اور موت میں جھگڑا ہے چکاتے جاؤ
تیرے مریضِ غم کی شفا ہے خدا کے ہاتھ
گھبرا گئے وہ سینے کو میرے لگا کے ہاتھ
زاہدِ خشک نہ کام آئی عبادت تیری
جمع دو چار جہاں ہو گئے محفل ہے وہی
ہاتھ سے جام گرا پاؤں سے بوتل ٹوٹی
شوخی سے ناز۔ ناز سے پیدا ادا ہوئی
بات بھی اب تو کی نہیں جاتی

نمک پاشی جو ہو حسنِ ملیح روئے قاتل سے
اٹھے شور قیامت ہر دہانِ زخم بسمل سے

نظر ڈالی یہ کس مستِ ادا نے بزمِ رنداں پر
کہ بیہوشی ہوئی جاتی ہے پہلے دورِ ساغر سے

ضیا

ضیا۔ غلام رسول نام کلام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے نمونہ کلام یہ ہے

بس یہی امید ہے اس طالبِ دیدار کی
ہو ہمیشہ سامنے آنکھوں کے صورت یار کی

غیرتِ مہروہ عارض جو نمایاں ہو جائے
داغِ دل اپنا یقیں ہے مہِ تاباں ہو جائے

ہم کو ہرگز نہ رہے دیر و حرم سے کچھ کام
اپنا مسکن جو کبھی کوچۂ جاناں ہو جائے

ضرغام

ضرغام۔ ابوضیا سید عبدالغفور ولد مولوی نجات علی منصبدار علاقہ جاگیر بالی گاؤں متعلقہ مومن آباد ضلع بیڑ سرکار نظام۔ ۱۳۲۰ھ میں عمر ۲۴ سال تھی۔ عربی فارسی۔ مرہٹی زبانیں بقدرِ ضرورت جانتے ہیں۔ مولوی یعقوب علی اشہر۔ میر عبدالرؤف شوق کے عزیزوں میں ہیں۔ پنج آہنگ ضرغام۔ ضرغام اللغات۔ دولت خانۂ اردو۔ نوائے ضرغام ان کی تصانیف غیر مطبوعہ بتلائی جاتی ہیں۔ فارسی میں مدح کے میدان میں ذہن خوب لڑتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

تری فرقت نے سودائی بنا رکھا ہزاروں کو
ترے عدو نے جانیں پھونک دیں امید کے تن میں

شہِ ملکِ دکن کے دستِ گوہر بار سے ابدل
نہ دریا میں رہے موتی نہ باقی لعل معدن میں

خوشامد کو تری بلبل مبارک باد کہتی ہے
تری تعظیم کو سیدھے کھڑے ہیں سرو گلشن میں

نزالِ نخلِ تمنّا بار و رہو ائما ستا ہا
درِ مقصود ہوں یارب ہمیشہ تیرے دامن میں

ضرغام

ضرغام۔ مرزا بہادر بیگ دہلوی۔ فنِ پہلوانی میں چاق چوبند تھے۔ دنگل کی طرح میدانِ سخن میں بھی ہاتھ پاؤں نکالتے۔ مگر کم مشقی کی وجہ سے رستمانِ معانی کے آگے زور نہ چلتا تذکرہ گلستانِ سخن سے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

کیا پوچھتا ہے ہمدم حالِ شکستگاں کو
جاتے ہیں ہم وہیں کو اٹھتا ہے منہ جہاں کو

خاکِ ضرغام کا کوسوں نہیں لگتا ہے پتہ
تیری شوخی نے کیا کیا اسے برباد نہ پوچھ

ضمیر ضمیر ۔ پیشہ شیخ۔ مداری۔ اکبرآبادی شاہ نظیر اکبرآبادی سے تلمذ تھا اپنے استاد کی طرح سادہ زبانی اور شوخ محاورات عزیز تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

جب تک کہ تو جلوہ گر نہ ہووے
میری شب غم سحر نہ ہووے

افسوس کہ جی سے ہم گذر جائیں
اور تیرا ادھر گذر نہ ہووے

مر جائیں ہم آہ آہ کرتے
پر دل میں ترے اثر نہ ہووے

عاشق ترا اپنی جان کھووے
پر حیف تجھے خبر نہ ہووے

صد حیف ضمیر ہم تو رو دیں
تیری کبھی چشم تر نہ ہووے

وہ ابھی ہی تو گل آرزو۔ وہ ہنوز تازہ بہار ہے
نہ کچھ آئینہ کی خبر اُسے نہ حیا سے کچھ سروکار ہے

ضمیر ضمیر ۔ سید ضمیر قاسم رئیس موضع رکسوارہ ضلع الہ آباد شاگرد سید محمد منتین صاحب منتین الہ آبادی۔ شاعر طبیعت دار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن رنگ جو انہوں نے اختیار کیا ہے نہ عہد حاضر کے مذاق کا آئینہ بردار ہے نہ پہلے کبھی اچھا سمجھا جاتا تھا۔ مراعات لفظی سے شعر میں نوک پلک نکالنا چاہتے ہیں۔ ابھی ماشا اللہ جوان ہیں امید ہے تخیئل سیدھے راستہ پر لے آئے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

جینا بغیر آپ کے دشوار ہو گیا
پیغام مرگ ہجر کا آزار ہو گیا

نظارۂ جمال سے عمر ابد ملی
آب حیات شربت دیدار ہو گیا

پہلو سے گر ہٹے تو مری جان پر بنی
کھنچنا تمہارا پاس سے تلوار ہو گیا

اللہ رے تلوّن تیر نگاہ یار
نشتر کبھی بنا کبھی تلوار ہو گیا

یاں مہر و التفات سے جانبر نہ ہو سکا
ملنا بھی جھک کے آپکا تلوار ہو گیا

ہمنشیں مٹ گئیں سب حسرتیں رفتہ رفتہ
ہائے افسوس یہ دل بھی نہ رہا دل اپنا

گماں برق تجلّی کا ہے عکس روئے روشن پر
ہے دھوکا صبح محشر کا بیاض صبح گردن پر

جو ہیں نا اہل ان سے نفع کی امید بیجا ہے
گل و سبزہ کبھی اُگتا نہیں دیوار آہن پر

سوزش لکھوں جو خط میں دل داغدار کی
نکلیں زبانِ خامہ سے موجیں شرار کی

کی ہے خیالِ ابروئے خمدار میں سحر
خنجر سے میں نے کاٹی ہے شبِ انتظار کی

مے گلرنگ کے پینے میں عذرِ پارسائی ہے
ہماری مفلسی بھی فصلِ گل میں رنگ لائی ہے

ضمیر

ضمیر:۔ محمد مسعود احمد خلف اصغر حضرت امیر احمد امیر مینائی مغفور۔ کلام میں لطافت ہے۔ لطفِ زبان سے کوئی شعر خالی نہیں ہوتا۔ نتائج افکار کو قدیم تلازمہ و ایہام سے محفوظ رکھتے ہیں۔ مضامین میں لذّت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اپنے والد مرحوم کے شاگرد ہیں۔ اُستاد زادہ ہونے کے علاوہ خود بھی ذی استعداد ہیں۔ سخن گوئی کی اٹھان بتا رہی تھی کہ دنیائے شاعری میں ان کا بول بالا ہوگا۔ مگر ملازمت کے بکھیڑوں نے انہیں مشقِ سخن بڑھانے کا موقعہ نہ دیا۔ اور آخر کار شاعری سے دست بردار ہو گئے۔ گذشتہ زمانہ میں جو کچھ کہا ہے۔ اس کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

کھنچکے جان آنکھوں میں آئی دل گیا
دیکھنے کا اُن کے ثمرہ مل گیا

ہم اِس چاٹ پر بیٹھے ہیں زخم کھولے
چھڑک دے نمک مسکرانا کسی کا

نہ سرمہ نہ مستی فقط سادگی تھی
مجھے یاد ہے وہ زمانہ کسی کا

تصوّر کہاں ڈھونڈنے جائے آخر
کہیں ہو بھی اے دل ٹھکانہ کسی کا

ہزاروں کی جانوں کو رونا پڑے گا
ہنسی سمجھے ہو تم رُلانا کسی کا

ہزاروں یقیں باتیں مگر میرے دل کو
رہا یاد اِک بھول جانا کسی کا

یہ کہتے ہوئے جان ہونٹوں پہ آئی
غضب ہے کسی پر دل آنا کسی کا

ضمیر آپ انسان اپنا ہے دشمن
مخالف نہیں ہے زمانہ کسی کا

سمند ناز بھرتا ہے نرارے
اداؤں میں ہرن کی چوکڑی ہے

پیئے دو گھونٹ جس نے پھر نہ سنبھلا
شراب عشق بھی کتنی کڑی ہے

چمن میں فصلِ بہار آئی اور گذری بھی
جگہ ہی ڈھونڈ رہے ہیں ہم آشیاں کیلئے

ضمیر

ضمیر۔ پنڈت گنگا داس کشمیری دہلوی شاگرد شاہ نصیر فصاحت و بلاغت میں اپنی آپ نظیر تھے۔ علم رمل کے ماہر تھے۔ خوش گفتار شاعر تھے۔ زبان اپنے زمانہ کے لحاظ سے شستہ تھی۔ طرز بیان میں شگفتگی تھی۔ چند شعر اور ایک قطعہ جس میں ہولی کی دھوم دھام بیان کی ہے درج کئے جاتے ہیں بادی النظر میں یہ گمان ہوتا ہے کہ بسنت کی محفل ہے۔ مگر اس زمانے میں ولائتی رنگوں کا رواج نہ تھا۔ اور ٹیسو کے پھولوں کے رنگ سے ہولی کھیلی جاتی تھی۔ ایک قطعہ بغیر انتخاب درج کیا جاتا ہے۔ تاکہ واضح ہو کہ اس زمانہ میں ہندوستانی تہذیب کا رنگ کیا تھا۔

میں بتاتا ہوں ضمیر اب کچھ تجھے بھی ہے خیال
چشم خواب آلودہ اس کی فتنہ بیدار ہے

جس کو دیکھا کانپتا ہے وہ شرارت سے تری
برق کو بھی ابر میں ہم تو طپاں دیکھا کئے

لو بگڑ بیٹھے ذراسی بات پہ
تھی نہ یہ امید ہم کو آپ سے

قطعہ

شب کو گیا میں ہولی کی محفل میں اے ضمیر
دلچسپ کیا ہی خوب تھا ہر اک مکان زرد

اس انجمن کی تجھ سے میں تعریف کیا کروں
پہنے لباس بیٹھے تھے سب مہربان زرد

روشن کئے تھے جھاڑ نشیمن کے گرد کل
تھیں زعفرانی سب چھتیں اور سائبان زرد

حوریں نژاد رنڈیاں بیٹھی تھیں صف بہ صف
ہولی کے کنٹھے پہنے ہوئے نوجوان زرد

پشواز چست انکی مرے دل میں کھب گئی
تھا حاشیہ کناری کا اور درمیان زرد

ڈالے سبھی تھے ہار گلوں کے گلوں کے بیچ
سرخوش تھے اپنے حسن میں سب گلرخان زرد

پچکاریوں کی لہروں کی تھی مار ایک سمت
کیسر کے رنگ سے تھے زمین آسمان زرد

رنگوں سے قمقموں کی تھی آپس میں مار دھاڑ
تھا سرخ گر کبھی تو کبھی تھا مکان زرد

اُن سب کے درمیان تھا مسند پہ دلربا
سونے کا آگے رکھے ہوئے پاندان زرد

القصہ اپنے حسن میں ہر ایک شاہِ وقت
یہ دیکھ اس کو ہو گئے سب بدگمان زرد

اس شب سے میری آنکھوں میں یرقان ہوگیا	یاں تک کہ میرے ہوگئے سب استخوان زرد

ضمیر

ضمیر۔ مرثیہ گو نامور میر مظفر حسین ولد میر قادر علی۔ میر خلق کے ہم عصر تھے۔ اور غزل گوئی میں مصحفی سے تلمذ تھا۔ ۱۲۷۲ھ میں انتقال کیا۔ مرثیہ خوب کہتے تھے۔ غزل کی طرف کم توجہ تھی۔ مجموعہ مراثی شائع ہوچکا ہے۔ جو قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔ حضرت دبیر مرثیہ گو آپ کے فخر تلامذہ تھے۔ میر ضمیر کا یادگار کارنامہ صنف مرثیہ کی اصلاح اور ترقی ہے۔ اگرچہ مرزا رفیع السودا نے مرثیہ کو مربع سے مسدس کر دیا تھا۔ لیکن اس کا ارتقا اور رواج میر ضمیر کی طبع وقاد کا شاہکار ہے۔ انہوں نے مرثیہ میں یہ جدتیں پیدا کیں۔ رزمیہ لکھا۔ سراپا ایجاد کیا۔ گھوڑے۔ تلوار اسلحہ جنگ کے الگ الگ اوصاف بیان کئے اور بقول مولانا شبلی مرحوم یہی مضامین آجکل مرثیوں کے مہمات موزوں ہیں اس کے علاوہ واقعہ نگاری کی بنیاد رکھی اور جزئی واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ مولانا موصوف موازنہ انیس و دبیر میں لکھتے ہیں کہ سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں زور اور بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی غلط الفاظ جو مرثیوں کے لئے گویا جائز مان لئے گئے تھے۔ اکثر ترک کر دیئے۔ اور یہ کیا کہ ان سے پہلے مرثئے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے انہوں نے سب سے پہلے تحت اللفظ کو رواج دیا۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے کلام میں جس قدر محاسن ہیں میر ضمیر کے ہاں سب پائے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اُس وقت جو یہ ضرب المثل مشہور تھی کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا دھاڑی مرثیہ خواں"۔ اس کا قطعی بطلان میر ضمیر کی ذات مبارک سے ہؤا۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار یہاں دئے جاتے ہیں۔

جا کے میدان میں کس طرح یہ محبوب لڑے	یہ تو کہیئے کہ غلام آپ کے کچھ خوب لڑے
چیر کر فوج کو اس پار سے اُس پار گئے	میں نے خود دیکھا کہ دریا پہ کئی بار گئے
تھا دیدۂ حیران ہر اک زخم بدن میں	انگشت تاسف تھی زباں سب کے دہن میں
پنہاں زرہ میں ہوتی تھی اس طرح سناں	بجلی چمک کے ہوتی ہے جوں ابر میں نہاں

اس نیزۂ سیاہ سے تھا سب کو بیم جاں — تھا اژدہائے موسیٰ عمران کی وہ زباں
گھوڑا وہ تیز رو ہے کہ ناگاہ ایک بار — اتنا کہا تھا وہم نے ہاں چل تو ساتھ یار
دونوں نے ہم عنانی و سرعت کی اختیار — آخر کہاں وہ اور کہاں وہم ہرزہ کار

کچھ کچھ تو ساتھ ساتھ وہ مقدور بھر گیا
پھر یہ خبر نہیں کہ کہاں تھا کدھر گیا

ضمیر

ضمیر :- مولوی سید محمد ضمیر خلف الصدق میر کفایت علی مرحوم سیتا پوری آپ کے آبا و اجداد اب سے ایک صدی قبل قصبۂ براہی ضلع لکھنؤ سے آکر سیتا پور میں قیام گزین ہوئے۔ حضرت ضمیر سیتا پور میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اور وہیں تمام عمر رہے۔ اپنی وضع کے پکّے اور اپنے آبائی مذہب شیعہ اثنا عشر کے اصولوں کے پابند تھے۔ سنہ ۱۳۴۹ھ میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

تو اسیرانِ قفس ہوں نہ پریشان کیونکر — بھول جائے انہیں وہ دن میں گلستاں کیونکر
ماسوا سے مجھے کیا کام تیری الفت میں — غیر کا دھیان کرے مجھکو پریشان کیونکر
شکل میں حور ہے تو رنگ میں گل وضع میں بت — مجھکو حیرت ہے کہ تجھکو کہوں انساں کیونکر
جانگسل ہجر کا غم روح فزا وعدۂ وصل — زیست کیونکر ہو گراں موت ہو آسان کیونکر
دست وحشت سے ہو کیا موت کی مشکل آساں — چاک ہو جامۂ ہستی کا گریبان کیونکر

ضمیر

ضمیر :- نظیر احمد خاں بنارسی شاگرد صاحب عالم میرزا قادر بخش صابر دہلوی مرحوم تازہ معانی کے جویا۔ نازک خیالی کے دلدادہ تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

اک لطف ہر گھڑی ہے نیا ہجر یار میں — بڑھ جائے طول اور شبِ انتظار کا
کہتے ہیں لوگ جس کو جہاں میں ضمیر برق — افسردہ شعلہ ہے وہ دِل بیقرار کا
آتا ہے درد میں خلشِ خار کا مزہ — زخمِ جگر میں تیر ترا رہ گیا نہ ہو
آئی شکستِ شیشہ کی اُڑتی سی اِک صدا — دِل آپ کی نظر سے کسی کا گرا نہ ہو

رہتا ہے مثل غنچہ کے بستہ دل ضمیر	شاید ترا وہ عقدۂ بند قبا نہ ہو
سینکڑوں سال کی عمر اسمیں گذاری ہیں نے	ہے مقدر کی سیاہی شب فرقت میری
پاؤں میرا نہیں تھمتا در جاناں پہ کبھی	اسقدر زور پہ ہے گردش قسمت میری
اتنی نفرت ہے کہ گھر چھوڑ دیں اپنا وہ ضمیر	کھینچدے کوئی جو دیوار پہ صورت میری
اس کے آنے سے ہوئیں لاکھوں بلائیں نازل	شام ہجراں کو تری زلف کا نقشہ سمجھے
رہگئی ٹوٹ کے اسمیں جو ترے تیر کی نوک	اے ستمگر ہم اُسے دل میں تمنّا سمجھے

ضمیر

ضمیر۔ مولوی ضمیر الحق ولد شیخ نبی بخش ساکن آرہ ضلع شاہ آباد۔ آپ نے مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں عربی کی تعلیم پائی۔ صاحب تذکرۂ یادگار ضیغم نے آپ کا نام ضمیر الدین لکھا ہے۔ جو سہو ہے۔ بقا غازی پوری و شمشاد لکھنوی سے تلمذ تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

دنیا میں کسے بے سروساماں نہیں دیکھا	اس باغ میں کوئی گل خنداں نہیں دیکھا
محشر میں جو یاد آئی مجھے کوئے صنم کی	مرکے بھی سوئے گلشن رضواں نہیں دیکھا
یہ خاک عاشق ناشاد سے ان کو کدورت تھی	کہ پھر فاتحہ دامن اٹھا کر آئے مدفن پہ
اب لامکاں میں پھرتی ہے عالم کو چھانتی	مدّت سے میری آہ تلاش اثر میں ہے

ضمیری

ضمیری۔ میرزا مظہر بنارسی۔ شگفتہ مزاج۔ صوفی مشرب تھے۔ سیّاحی کا شوق تھا۔ روم و شام وغیرہ کی سیر کی تھی اور وہاں کے طریقۂ معاشرت و تمدّن کو نگاہ حسن آفریں سے دیکھا تھا۔ ۱۲۷۱ھ کے قریب کبھی کبھی دِلّی آتے اور یہاں کی ادبی مجالس اور مشاعروں میں شریک ہوتے۔ فارسی اُردو دونوں زبانوں میں فکر کرتے۔ تذکرہ گلستان سخن سے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

ہم نہ کہتے تھے ضمیری بے وفاؤں سے نہ مل	اپنے کاموں کا نتیجہ تجھ کو حاصل ہو گیا
یوں عاشقوں کو تیری کیا کیا نہ جانتے تھے	لیکن تجھے ستمگر ایسا نہ جانتے تھے

ضو

ضو۔ منشی کمال الدین الہ آباد کے قدیم باشندے تھے۔ آخر عمر میں ضعف پیری کے

ہاتھوں جو اس میں خلل آگیا تھا۔ قوّتِ بینائی جاتی رہی تھی۔ کنجِ تنہائی میں زندگی بسر کرتے۔ طبیعت کو شاعری سے لگاؤ تھا۔ مزیدار شعر کہتے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

سینے میں رہی آگ بھڑکتی کی بھڑکتی	اے دیدۂ تر تو تو کسی کام نہ آیا
عشّاقِ تفتہ جاں پہ کبھی اِک نگاہ بھی	اے برق منتظر ہے یہ مشتِ گیاہ بھی
دیکھنا ہے تو دیکھ لو ضوؔ کو	آگے کیا جانیے کہ کیا ہو جائے

ضو

ضو:۔ افضل علی ولد مولوی یاد علی مرحوم۔ قدیم شرفائے بدایوں سے تھے۔ ظہور اللہ خاں نواؔ بدایونی آپ کے اجداد سے تھے۔ لڑکپن سے مضمون نگاری اور شاعری سے دلچسپی تھی۔ فنِ سخن گوئی میں مولوی راشد علی ضیا مرحوم شاگرد حضرت منیرؔ سے تلمذ تھا۔ انگریزی فارسی میں اعلےٰ درجہ کی لیاقت تھی علم مجلسی میں طاق تھے۔ ہمیشہ رؤسائے نامدار کی مصاحبت میں رہے اور اپنی کارگذاری کے صلے میں انعام و اکرام حاصل کئے دو ایک ریاستوں سے ان کا سالانہ مقرّر تھا۔ کئی برس تک اپنے وطن سے سعید الاخبار۔ بدایوں گزٹ۔ نکالتے رہے۔ گلدستہ بدایوں بھی دوبارہ جاری کیا۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار وطن کو خیرباد کہکر لکھنؤ میں رنگ جمایا۔ اور وہاں سے ایک پرچہ ہر روزہ کے نام سے جاری کیا۔ بدقسمتی سے وُہ بھی نہ چلا۔ تو اخبار نویسی کی طرف سے جی کھٹّا ہو گیا۔ انتظام کی قابلیت اچھی تھی۔ اور ہر ایک سوسائٹی میں رسائی حاصل کر لیتے تھے۔ کبھی کسی علاقے کے مینجر رہے کبھی کسی کارخانہ کے مہتمم۔ کبھی انگریزی فیصلہ جات کا ترجمہ کرتے رہے۔ اسی طرح راحت و آرام کے ساتھ لکھنؤ میں دن گذارے۔ میرزا محمد جعفر خلف میرزا دبیر ان سے نہایت محبّت رکھتے اسی بناء پر آپ نے مولانا شبلی کی کتاب موازنۂ انیس و دبیر کے جواب میں ردّ الموازنہ لکھی ہے جس میں اکثر جملے نہایت سخت اور تہذیب سے باہر ہیں۔ چند سال ہوئے۔ کہ انتقال ہو گیا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

تکلف سے نہیں کیا جنکی خلقت حسن آگیں ہو
نہیں ہے شاہد مضمون کبھی محتاج زیور کا

ترا احسان ہو گا اے اجل دم بھر ٹھہر جانا۔
وہ اپنی آنکھ سے بھی دیکھ لیں عاشق کا مرجانا

حسینوں کا یہ اک انداز ہے اسکی شکایت کیا
ذراسی بات ہے اقرار کرنا اور مکر جانا

تری زلفوں میں بھی انداز ہے تیری اداؤں کا
سنورنے میں بگڑ جانا بگڑنے میں سنور جانا

زیست کی صورت کہاں پیدا فروغ یار میں
منہ چھپا اے ضو نقاب جلوۂ رخسار میں

یاد آئے کیا مجھے شیریں زبانی وصل کی
زندگی بھی تلخ ہے اب تو فراق یار میں

حوریں بہشت میں ہوں تو یہ اور بات ہے
معشوق اس جہان میں تو آپ سا نہیں

بیخودوں کو حسن و قبح ذات کی پروا نہیں
زیست میں شہرہ ہو یا بعد فنا تشہیر ہو

ہاں تمہارے دم سے روشن ہو گئی دیوانگی
سچ ہے اے ضو تم چراغ خانۂ زنجیر ہو

ضیا

ضیا: ۔ سید صغیر حسین دہلوی تلمیذ حضرت داغ مرحوم۔ معنی پرداز اور شیریں مقال ہیں۔ مشکل سے مشکل مضمون کو آسان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ ترکیبیں شائستہ اور بندشیں برجستہ ہوتی ہیں۔ خوش اخلاق و ملنسار ہیں۔

کہتے ہیں اسکے رنگ سے نگہت بلائیں گے
لائے ہیں ایک پھول چمن سے گلاب کا

انکار جو کرے وہ بڑا بدنصیب ہے
وہ دست ناز اور وہ ساغر شراب کا

کیا اعتبار عمر دو روزہ کا اے ضیا
پیش نظر ہے بن کے بگڑنا حباب کا

نئی باتیں ہیں کچھ انداز بھی تو اب نرالے ہیں
جواں ہو کر غضب کے تم نے پر پرزے نکالے ہیں

نظر بازوں سے چھپ کر اچھی صورت رہ نہیں سکتی
حسین جتنے جہاں میں ہیں سب اپنے دیکھے بھالے ہیں

جناب شیخ کی قلعی کھلی جب مے کی بو آئی
ہم ان کو جانتے تھے یہ بڑے اللہ والے ہیں

تجھے تو دل لگی سوجھی ہے اپنی جان جاتی ہے
اجل آ بھی یہ کیا بیوقت کے نخرے نکالے ہیں

ہم لاکھ عاجزی کریں لاکھ التجا کریں
وہ ایک مانتے نہیں اب اس کو کیا کریں

بے دیکھے بھالے دل نہ کسی کو دیا کریں۔
اچھے رہیں ضیا جو ہمارا کہا کریں

لے آئی کسی روزنہ اُس ماہ لقا کو
کس کام کی ہے دیکھ لیا آہِ رسا کو

اے ابرِ کرم ہاں اسے گلزار بنا دے
سبزے کی ضرورت ہے مزارِ شہدا کو

اے چرخ جہاں میں نہ رہے تیرا ٹھکانا
تاثیر جو مل جائے غریبوں کی دُعا کو

سمجھے رہے تھے محبّت میں دل لگی ہوگی
خبر نہ تھی کہ قیامت کی بے کلی ہوگی

کوئی پہلو سے اُٹھ کر چل دیا حسرت رہی کیسی
سحر ہوتے ہی جانِ ناتواں پر بن گئی کیسی

لگی کا لطف جب آئے کسی پہ مبتلا تم ہو
ابھی ناداں ہو کیا جانو کہ ہے دل کی لگی کیسی

شباب آتے ہی ہم کو زندگی کے پڑ گئے لالے
بہار آتے ہی یہ دل کی کلی مرجھا گئی کیسی

گلہ نہیں جو وہ ہم کو بھلا نہیں کہتے
یہی غنیمت ہے کہ مُنہ سے بُرا نہیں کہتے

ضیا

ضیا:۔ آغا سخاوت علی بیگ مرحوم خلف میرزا حاتم علی مہر اکبر آبادی آپ کے دادا اصفہانی تھے اور نادرشاہی فوج میں کمانیر ہو کر ہندوستان آئے تھے میرزا مراد علی خاں المخاطب بہ رکن الدولہ جو شجاع الدولہ کے عہد میں نظامت و دیگر عہدوں پر فائز تھے اس خاندان کے قابل فرد تھے۔ ضیا مرحوم غدر سے قبل فنانشل کمشنری صوبۂ اودھ میں ملازم ہوئے۔ اس کے بعد صدر نظامت آگرہ میں پیشکاری کی خدمت کو حسن و خوبی سے انجام دیا۔ ہنگامہ غدر میں اپنی جان پر کھیل کر کئی انگریزی مرد عورتوں اور بچوں کی جانیں بچائیں۔ اکثر پناہ گزینوں کو لکھنؤ سے آگرہ پہنچایا۔ اسی صلے میں سرکار سے خلعت و جاگیر ملی تھی۔ ۱۲۸۵ھ میں میر وزیر علی ضیا مرحوم کی صاحبزادی کے ساتھ لکھنؤ میں عقد ہُوا۔ ملنسار اور خلیق آدمی تھے۔ آپ ضلع ایٹہ میں پہلے سر رشتہ دار کلکٹری پھر تحصیلدار ہو گئے۔ ۱۲۹۶ھ میں انتقال ہو گیا۔ آپ صاحب دیوان تھے۔ مجموعۂ کلام میں ایک غزل میرزا قیصر حسین اکبر آبادی کی آپ کے نام سے درج ہو گئی ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

جہاں تک ناخنِ تدبیر سے عقدہ کشا ٹھہرے
ہمارے سامنے کیا بندشِ بندِ قبا ٹھہرے

ضیا مرحوم پر سرقے کا الزام لگانا نہیں چاہیئے۔ غالباً تدوین کرنے والوں کی غفلت یا عدم واقفیت سے ایسا ہوا۔ اب ان کا کلام ملاحظہ ہو :-

اے جنوں رہ گیا پردہ میرے پیراہن کا
دامنِ وحشت نے بس کام کیا دامن کا

مر گئی بلبلِ ناشاد قفس میں شاید
رنگ بدلا نظر آتا ہے ضیاؔ گلشن کا

اُترا نہ روزِ حشر بھی نشۂ شراب کا
سر پہ ہمارے سایہ رہا آفتاب کا

میرے مرنے کی خبر سُنکر وہ فرمانے لگے
جان سے اپنی گیا ناحق ہمارا کیا گیا

لطف ہے کالے کالے بادل کا
ساقیا کھول کاگ بوتل کا

سر پہ اُس شوخ کے ہے لاکھ بناؤ
اوڑھنا وہ اُلٹ کے آنچل کا

دوشِ بادِ صبا پہ جاتا ہوں
ناتواں ہوں جنازہ ہے ہلکا

غمِ ہجراں ہے ہم نفس میرا
یہی ہمدم ہے روزِ اوّل کا

نالاں ہو تیرا کشتۂ تیرِ نگاہ کیا
جو لے سکے نہ سانس کریگا وہ آہ کیا

آنکھوں کے آگے گردشِ لیل و نہار ہے
دیکھیں دکھائے یار کی چشمِ سیاہ کیا

توڑا زنجیر کو دامن کے اُڑائے ٹکڑے
اے جنوں تجھ سے ہوئے کارِ نمایاں کیا کیا

دیکھنا ہے رُخِ شفاف کو کس حیرت سے
آئینہ ہے تری تصویر کا حیران کیا کیا

قسمیں دے دے کے زہر دیتا ہے
اے ترے پیار نے ہمیں مارا

اُن نشیلی انکھڑیوں کا کُشتۂ نظّارہ ہوں
میرے مرقد پر چڑھانا جام بھر بھر کر شراب

آیا شباب طالبِ دیدار آئے ہیں
یوسف کے ساتھ ساتھ خریدار آئے ہیں۔

قسمت ہی میں جو لکھی ہو افتاد کیا کرے
سر پر گرے پہاڑ تو فریاد کیا کرے

دل میں مرے خیال ترا اے صنم رہے
روشن چراغِ دیر سے شمعِ حرم رہے

دم گھٹ رہا ہے چین نہیں اب کسی طرح
تنگ آگیا ہوں اس دلِ خانہ خراب سے

اپنے کُشتہ کو نہ کر خوابِ عدم سے بیچین
مان او فتنۂ محشر کے جگانے والے

ضیا

ضیا:۔ مولوی محمد راشد علی مرحوم بدایونی اپنے گرد و نواح کے نامی شعرا سے تھے۔ آپ نے علمِ عروض کی تحصیل میر کاظم حسین تنویر شاگرد جناب رشک سے کی تھی۔ مذہباً شیعہ تھے۔ غزل کے علاوہ وہ مرثیہ خوب کہتے۔ جس میں میر نفیس سے استفادہ حاصل کیا۔ منیر شکوہ آبادی کے لائق شاگردوں میں ان کا شمار تھا۔ کئی برس تک شاہجہان پور میں پھر بدایوں میں وکالت کرتے رہے۔ مگر مکروہاتِ دُنیا نے ہمیشہ پریشان رکھا۔ بعض رؤسا کی طرف سے قدر دانی ہوئی۔ تو اس طرح ہوئی کہ ان سے دیوان قصائد وغیرہ اپنے نام سے لکھوائے مگر جو رقم ٹھہرائی گئی وہ مرنے کے بعد ان کے ورثا کو بھی وصول نہ ہوئی۔ اور یہ فردوسی کی آغوشِ لحد میں جا سوئے۔ صنائع بدائع میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے اور علمِ عروض کے ماہر تھے۔ مذہبی مناظرہ کا شوق تھا مگر نہایت وسیع الاخلاق تھے۔ خوش وضع پست قامت خوش تقریر شخص تھے۔ حضرت منیر کو اِن پر فخر تھا۔ ۱۸۹۰ء کے قریب ان کا انتقال ہوا۔ ایک دیوان غیر مطبوعہ اور مراثی کا ذخیرہ چھوڑا جو کچھ کلام دستیاب ہوا اس میں سے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

منتوں پر وہ بگڑتے ہیں کجا بوسۂ لب	پاؤں چھونے نہیں دیتے رُخِ زیبا کیسا
جُھک گئے مجھ سے وہ شرما کے یہ مضموں سمجھ کیا	مصرعہ قامتِ موزوں میں ہے سکتا کیسا
خیالِ روئے صنم قلبِ خاکسار میں ہے	خدا کے نور کا پتلا نہاں غبار میں ہے
ہے تیرے روئے منوّر کا دیکھنے والا	یہ ایک وصف ضیائے سیاہ کار میں ہے

ضیا

ضیا:۔ حکیم احمد علی۔ تلمیذ جناب ثاقب بدایونی۔ عرصہ ہوا جب بمبئی میں قیام تھا کلام میں شوخی اور بے ساختگی ہے۔ چند شعر درج ذیل ہیں:۔

ہم تو سمجھے تھے نامۂ دلدار	وہ بھی تقدیر کا لکھا نکلا
مرنے والوں کو تیرے کیا معلوم	جان نکلی کہ مدعا نکلا۔

جی کی جی میں رہیں تمنّائیں	نہ کبھی جی کا حوصلہ نکلا
اب تو دستِ جنوں کے ہاتھوں سے	دامنِ صبر اے ضیاؔ نکلا۔
جان ہو عاشق بیتاب کی یا دل کچھ ہو	ایک جانے کے لئے ایک ہے آنے کیلئے

ضیا

ضیا:۔ میر ضیاء الدین دہلوی۔ دلّی کی بربادی سے متاثر ہو کر فیض آباد چلے گئے تھے۔ مگر زمانے کی گردشوں نے انہیں وہاں بھی نہ رہنے دیا۔ آخر کار پٹنہ عظیم آباد کی طرف رُخ کیا۔ کچھ دنوں قاسم علی خاں ناظم بنگالہ کی رفاقت میں رہے۔ پھر عظیم آباد میں راجہ شتاب رائے کے فرزند دلبند نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا اور وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ وہیں خلوت گزین ہو گئے۔ اور درویشانہ طریقہ سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ۱۱۹۶ھ میں انتقال کیا۔ اُنہوں نے اپنا دیوان ریختہ مرتب کر لیا تھا۔ قدرت اللہ شوق ان کو میر تقی میر کا شاگرد لکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بعد بڑے لائق شاگرد چھوڑے جن میں میر حسن مصنّف سحر البیان، خصوصیّت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو۔

کل کی رسوائی تجھے کچھ کم نہ تھی اے ننگِ خلق	اسکے کوچہ میں ضیاؔ تو آج پھر جانے لگا
نے دل جلا ہوں آہ نہ میں سینہ تفتہ ہوں	میں داغِ یاس و حسرتِ یارانِ رفتہ ہوں
ضیاؔ رکھ ہاتھ سینے پر خبر دل کی بھی ہو ظالم	کہ آج آنسو تری آنکھوں سے کچھ لوہو آتے ہیں
روویں ہم ہزموں کو کیا اپنے دل تو لگے پھیر ہیں	شمعِ محفل تھے جو کل سو راکھ کے اب ڈھیر ہیں
رسوائیوں کی اپنی مجھے کچھ ہوس نہیں	ناصح پہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں
دل جلے ہے غم سے اور آنسو بہانا منع ہے	لگ رہی ہے آگ گھر میں اور بجھانا منع ہے
گھر کو ہے اسکے بھولا یا راہ پھیر کی ہے	یارب تو خیر کیجو قاصد نے دیر کی ہے
تھوڑی بھی نیک و بد کی گر وہ تمیز رکھتے	کافر ہو پھر جو دل کو اس سے عزیز رکھتے
لے آہ بیچ نکل نہ کہیں دل چھلک پڑے	یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

تیرے ضیا کا حال میں پوچھا تھا شمع سے	اک آہ اس نے کھینچی اور آنسو ڈھلک پڑے
آہستہ پاؤں رکھیو اے لوئے گل زمیں پر	سوتے ہیں اس زمین میں نازک مزاج کتنے
کون سے زخم کا کھلا ٹانکا	آج پھر دل میں درد ہوتا ہے
بھول کر بھی کبھی نہ یاد کیا	ہم ترے جی سے ایسے بھول گئے

ضیا

ضیا:۔ غلام جیلانی تلمیذ امراؤ مرزا انور مرحوم۔ ماہر فن اور صاحب فکر روشن تھے۔ ان کے کلام سے صرف چند اشعار مل سکے۔

واں ناز وہ کہ در تلک آیا نہ جائے گا	یاں ضعف یہ کہ جان سے جایا نہ جائیگا
حال خراب اُن کو سنایا نہ جائے گا	اپنے پہ دشمنوں کو ہنسایا نہ جائے گا
گردن پہ بارِ خون ضیا کیوں اُٹھاتے ہو	نازک ہو بوجھ تم سے اُٹھایا نہ جائے گا

ضیا

ضیا:۔ صاحبزادہ علی محمد خاں خلف صاحبزادہ احمد علی خاں جدِّ امجد نواب ٹونک طبیعت میں موزونی تھی۔ سیدھا سادہ شعر کہتے تھے۔ نمونۂ فکر یہ ہے۔

میرے منہ سے جو تکلم میں نکلتا ہے دھواں	شمع رویوں نے دل زار جلا رکھا ہے
پوچھتا ہوں دل گم گشتہ کا اپنے احوال	کیوں خفا ہوتے ہو کیا تم نے چھپا رکھا ہے
اے ضیا الفت اصنام سے ہم نے صد حیف	دل جو کعبہ تھا وہ بُت خانہ بنا رکھا ہے

ضیا:۔ ضیا محمد ابن مولوی وزیر الدین مرحوم بدایونی۔ آپ کا خاندان سنہ ۱۰۱۰ھ سے بدایوں میں آباد ہے۔ اور عہد شاہی میں سرفراز و ممتاز رہا۔ آپ حضرت عطا کے برادر اصغر اور مولوی عبد الحی صفا مرحوم کے عم زادہ ہیں۔ ابتدائے عمر سے شعر کہنے کا شوق ہے۔ منشی وزیر احمد نیر۔ مفتی اکرام احمد لطف۔ مولوی افضال احمد بسمل مرحوم اور نازش بدایونی کے ہم مشق ہیں۔ علم عروض و فن بدیع سے واقف ہیں۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں حضرت داغ مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لیتے تھے۔ اس زمانہ میں شاعرانہ مباحثات کا شوق تھا۔ منشی بنواری لال شعلہ مرحوم ان کی [illegible] کرتے اور ضیا ان کی

بزم سخن کے زبردست رکن تسلیم کیئے جاتے تھے۔

تم ساجفا شعار تو کوئی حسیں نہیں	دنیا میں اور بھی ہیں اکیلے تمہیں نہیں
ٹھوکر لگا نہ مرقد حرماں نصیب کو	یہ حسرتوں کے ڈھیر ہیں ظالم زمیں نہیں
چھن چھن کے نور آتا ہے باہر نقاب سے	پردہ نشیں کا حسن تو پردہ نشیں نہیں
رہتے ہیں محبت میں یہی روز بکھیڑے	ہاں سے کبھی امید کبھی یاس نہیں سے

ضیا:۔ سید رضا حسین برادر سید ابرار حسین نپاں فتح پوری تلمیذ نسیم بھرتپوری۔ بزرگوں کا وطن رول ضلع متھرا ہے مگر آپ کے دادا فتح پور سیکری میں مقیم رہے آپ خوش فکر جوان طبع شاعر تھے۔ ۲۷ برس کی عمر تھی۔ کہ مرض جگر میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

کرم فرماتے ہیں وہ آزما کر	اجل تو بھی کرم کر امتحاں تک
وفور شوق سے یہ بے خودی تھی	عدو سے کہدیا راز نہاں تک
پورا نہ ہو کسی سے وہ میرا سوال ہے	ممکن نہ ہو کسی سے وہ اُن کا وصال ہے

ضیا:۔ صاحب عالم حافظ میرزا منیر گورگانی۔ خلف الرشید میرزا رحیم الدین حیاؔ دہلوی۔ آپ کے مضامین رنگین اور کلام نمکین ہے۔ قلعہ معلّٰی کی زبان کے سرمایہ دار اور سخنور خوش گفتار ہیں اوائل مشق سخن میں جناب جلال لکھنوی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ اور فن شعر میں ان سے استفادہ کیا۔ زبان پر قادر تھے۔ اس لئے شیوا بیانی میں مشہور ہوئے۔ داغ دہلوی کی شاگردی نے کلام میں چار چاند لگا دئے۔ کتاب تحقیقات ضیا آپ کی تالیف سے ہے۔ جس سے دہلی اور لکھنؤ کا اختلاف اللسان معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے جس شان سے الفاظ کی چھان بین کی ہے اور اس تالیف میں جو عرق ریزی اور جانفشانی کی ہے۔ اس کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں۔ جن کو زبان کی تحقیقات کا شوق ہے۔ شطرنج کھیلنے میں یکتائے روزگار۔ ضیا

ریاست رامپور کے وظیفہ خوار ہیں۔ شیریں زبانی اور سادہ گوئی میں مشہور ہیں سادگی اور متانت دونوں باتوں کا لطف ان کے ہاں موجود ہے۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

یارب یہ تُو نے سینے میں دل ہم کو کیا دیا
گویا ہماری جان کو روگ اِک لگا دیا

تنگ آ گیا ہوں اب تو کہیں مٹ چکے یہ دل
اللہ جانتا ہے کلیجہ جلا دیا

تیرِ نگاہِ یار سے جان آج بچ گئی
کام آ گیا ہمارے کبھی کا لیا دیا

رسوا عدو کے عشق میں ہو گے یہ سوچ لو
آیندہ اختیار ہے ہم نے جتا دیا

زخمِ جگر میں گاہ جلن گہ چبک رہی
کیا کیا خراشِ ناخنِ غم نے مزہ دیا

اسے کہتے ہیں محبت کہ ترے تیر کے ساتھ
دل نکل آیا مگر تیر نکلنے نہ دیا

ہم نہ کہتے تھے نہ جا اے دل کسی کوچے میں تو
خوب اس نے گت بنائی کیوں وہاں پھر جائیگا

جان دیکر نام ہوگا آبرو ہوگی نصیب
آشنائے بحرِ الفت ڈوب کر تر جائے گا

ہم خوشی سے ان کو دے ڈالیں تو اچھی بات ہے
یہ دل اوّل جائیگا سینے سے آخر جائیگا

آ گیا کوچۂ دلدار میں پھرتے پھرتے
کام آخر مری تقدیر کا چکر آیا

آبِ آہن نے دیا ذائقہ آبِ حیات
زیست کا لطف جو آیا نہ خنجر آیا

عشق میں کوئی لڑا چوٹ کسی پر آئی
جنگ آنکھوں میں ہوئی زخم جگر پر آیا

کیا ضبط سے نہ ہوگا صدمہ عیاں ہمارا
کہدے گی چُپ ہماری دردِ نہاں ہمارا

ہم دل کو ڈھونڈتے ہیں تم کیوں بگڑ رہے ہو
تم پر تو کچھ نہیں ہے صاحب گماں ہمارا

جب اُسے لکھتے ہیں خط ہم تو وہ ہو کر واپس
سامنے آتا ہے تقدیر کا لکھا بن کر

جس طرح پھول ہی کانٹوں میں زباں دانتوں میں
بشر اس طرح بُروں میں رہے اچھا بن کر

جنکو وطن سے اُنس ہے اہلِ وطن سے عشق
وہ خار بھی سمجھتے ہیں اپنے وطن کے پھول

مقدر وہ ملا ہے عشق میں ایذا رساں مجھکو
ستم سے گر وہ باز آئیں ستائے آسماں مجھکو

تمہارے تیر کا چوری سے آنا چھپ نہیں سکتا
جہاں بیٹھیگا درد اُٹھ کر بتا دیگا نشاں مجھکو

بڑھی ہیں عشق میں دونوں طرف بیتابیاں دل کی | غضب میں ڈال رکھا ہے وہاں انکو یہاں مجھکو

کیا میخانے کا میخانہ تقسیم اُس نے اوروں پر | یہ کہتا ہی رہا میں مجھکو بھی اے پیر مغاں مجھکو

قہر روز افزوں جفا پیہم رہے | تم نہ چوکو ہم ہیں جب تک دم رہے

دشمن سے کہا حال ضیا تم نے کیا کیا | کہنا تھا تو کہتے کسی غمخوار کے آگے

دل نہیں سینے میں ارمان ہزاروں ہیں تو کیا | خانہ ویران ہے کہنے کو بھری محفل ہے

اک قیامت ابروئے خم دار ہے | دیکھنے کو اتنی سی تلوار ہے

کہتے ہیں کہنے ہی کی باتیں ہیں سب | جان سے جانا بہت دشوار ہے

ضیا:- محمد ضیا خاں بریلوی تلمیذ حضرت خواہاں۔ شعر اچھے کہتے ہیں۔ طبیعت موزوں معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ حالات و کلام دستیاب نہ ہو سکے:- ضیا

دیکھئے ان کا نکھرتا ہے یہ جوبن کس دن | رنگ لاتی ہے بہار رُخ روشن کس دن

دوری یار ستاتی ہے تو روتے ہیں ضیا | تر غم ہجر میں ہوتا نہیں دامن کس دن

ضیا:- سید محمد نصیر خلف میر وزیر نور لکھنوی مرحوم۔ حضرت عارف مرحوم لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

ناکام ابتدا سے ہوں میں تو عشق میں | میرا سفینہ وہ ہے جو ساحل میں رہ گیا

ساقی نہیں اُترتی مرے حلق سے شراب | محروم کیا کوئی تیری محفل میں رہ گیا

مجھ سے تاکید کیا کرتی ہے یہ ہمت عشق | لاکھ ہو درد نہ منت کش درماں ہونا

دل کا پھوڑا دیکھکر اتنا ہوا کیوں بدحواس | گر گیا وہ ہاتھ سے لے چارہ گر نشتر اُٹھا

آپ جسکو روز اٹھواتے تھے اور اٹھتا نہ تھا | آپ کے کوچے سے آخر آج وہ مر کر اُٹھا

چرخ بھی شبنم کے آنسو رات بھر رویا کیا | شمع کو گریاں سر گور غریباں دیکھکر

کس طرح رات ہجر کی گذرے گی دیکھئے | جب شام ہی سے درد ہمارے جگر میں ہے

ضیا:- میرزا عطا بیگ برہانپوری۔ قصبہ بوڈر مضافات دکن میں ۷ شوال ۱۲۴۳ھ ضیا

کو پیدا ہوئے۔ فارسی وعربی تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں میر غلام علی آزاد۔ اور اُردو میں سراج اورنگ آبادی کے شاگرد تھے۔ عرصہ تک نواب میر حامد یار خاں مخاطب بہ ارسلاں جنگ کی مصاحبت میں رہے۔ ۱۱۸۳ھ میں بمقام برہانپور انتقال کیا۔ فارسی اردو دونو زبانوں میں صاحب دیوان تھے۔ نمونہ کلام نذر ناظرین ہے۔

تجھے کیا یاد ہے ساقی وہ عالم بے حجابی کا　　اِدھر تو جام کا ہنسنا اُدھر رونا گلابی کا

کرتا ہے حشر برپا ساقی سے جلد کہنا　　گردن اُٹھا اُٹھا کر شیشے کا دیکھ رہنا

دیکھتے ہی اس کے خط کی شان جی مرجھا گیا　　اس دھوئیں کو دیکھ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا

ادھر تو تم بھوؤں کو تان کر تیوری چڑھاتے ہو　　اِدھر میں دل میں بسم اللہ بسم اللہ کہتا ہوں

ضیا۔ مرزا علی رضا بن مرزا علی قدر مرحوم عظیم آباد (پٹنہ) کے باشندے تھے۔ پہلے مائل عظیم آبادی شاگرد شوق نیموی سے اصلاح لی۔ پھر کچھ عرصہ بعد شوق نیموی سے تلمّذ اختیار کیا۔ وارستہ مزاجی اور آزادہ روی اس قدر بڑھی ہوئی تھی۔ کہ اوائل شباب ہی میں فقیرانہ وضع اختیار کی۔ آخر ۲۱ برس کی عمر میں ۷ محرم ۱۳۱۹ھ کو بعارضہ ہیضہ وفات پائی۔ اِن کا دیوان موسوم بہ "ریاض شباب" شائع ہوگیا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

جب کہا اُن سے کہ دل تم پہ فدا کرتے ہیں　　ہنس کے بولے کہ یُونہیں لوگ کہا کرتے ہیں

عرصۂ حشر میں ہم اور شکایت تیری　　ایسی باتیں بھی کہیں اہلِ وفا کرتے ہیں

میں نے پوچھا کہ ہے کیا شغل تو ہنس کر بولے　　آجکل ہم تیرے مرنے کی دُعا کرتے ہیں

آپکا عاشق آپکا شیدا آپکے مرنے والوں میں　　ہے جو ضیا اک دردرسیدہ اسکو کیوں تڑپاتے ہیں

کچھ اور مزہ آئے تڑپنے میں شبِ غم　　کچھ اور ترقّی پہ اگر دردِ جگر ہو

مٹے خود سینکڑوں کو مٹتے دیکھا وائے نادانی　　یہ ہم ابتک نہ سمجھے کیا تری اُلفت کا حاصل ہے

ضیا

ضیا وضیائی:۔ میر بدر الدین دہلوی۔ علمی دستگاہ معقول تھی۔ مگر شاعری میں کوئی پایہ امتیاز حاصل نہ تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

کعبہ میں اور دیر میں دیکھا نہ ہم نے فرق	پایا ہر ایک نبض میں اِک اضطراب کو
جوش وحشت اس جہاں میں لیکے آیا ہے ہمیں	اب کہاں جائینگے یاں سے ٹھوکریں کھائے ہوئے

ضیا

ضیا:۔ سکندر جہاں بیگم دختر میر امیر علی سابق کوتوال ریاست جاورہ۔ شوخ طبع شاعرہ ہیں۔ علم مجلسی میں فرد ہیں۔ اِن کی چھوٹی بہن حیا تخلص کرتی ہیں۔ ضیا صاحبہ خوش خیال اور زود فکر ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو:۔

دل کا لہو رُلا چکے اشک جگر کھلا چکے	دیکھئے اب کی رنگ لائے دیدۂ اشکبار کیا
بے وفاؤں کو با وفا سمجھا نا	ہائے کمبخت دل نے کیا جانا
ہُوا اک آفت جاں پر فدا دل	نہ دے دشمن کو بھی ایسا خدا دِل
پے عشق ستم آئے کہاں سے	تمہیں تو چاہیئے روز اک نیا دل
ہے کوئی آتش کا پرکالہ ضیا	سینے میں اپنے دلِ سوزاں نہیں
عشق کو دین سمجھتا ہوں وفا مذہب ہے	اے صنم تجھ سے جو پھر جاؤں تو کافر میں ہوں
کیجئے شکوہ بیداد تو کہتا ہے وہ شوخ	مجھ کو پھر آپ نہ چاہیں کہ ستمگر میں ہوں
تا کجا جرم بے حجاب ضیا	کچھ بھی خوف حساب ہے دل میں
یاد میں اس نرگس کیفی کی ہے سرشار دل	داب کر بوتل بغل میں پارسائی ہو چکی

ضیا

ضیا:۔ ڈاکٹر ہربنس چندر صاحب والد کا نام بابو رام کشور ہے۔ وطن قدیم مانک پور ضلع الہ آباد ہے۔ مگر حضرت ضیا کے والد نے دلوا نند پور ضلع رائے بریلی میں سکونت اختیار کی۔ ضیا ۱۹۰۳ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں پائی۔ مگر بی اے اور وکالت کی سندیں الہ آباد میں حاصل کیں۔ اسی اثنا میں حضرت بسمل الہ آبادی سے تلمذ اختیار کیا۔ اب آپ رائے بریلی میں وکالت

کرتے ہیں۔ بے تکلف اور سادگی پسند طبیعت پائی ہے۔ کلام اُردو رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ کلام میں درد بھی ہے اور لطف زبان بھی۔ انتخاب غزلیات ملاحظہ ہو:-

اس طرح میں مبتلائے درد و رنج و غم ہُوا
دیکھتے ہی چارہ گر کا اور کچھ عالم ہُوا

قبر میں بھی مجھکو تڑپایا خیال یار نے
خاک ہو کر بھی نہ آزار محبت کم ہُوا

شام سے تا صبح ہنستے ہی رہے اہل چمن
کون گلشن میں شریک گریۂ شبنم ہُوا

جھک کے ملتے ہیں تہی دستوں سے اہل ظرف و مال
سر صراحی کا ہمیشہ پیش ساغر خم ہُوا

اصل میں جو بات ہے وہ نقل میں ممکن نہیں
آپ کی تصویر سے مجھکو سکوں تا ہم ہُوا

جو کبھی نذر جنون غم جاناں ہوتا
سو گریبانوں میں وہ ایک گریبان ہوتا

زیست کا لطف گیا لطف خلش کے ہمراہ
مجھ کو حسرت ہے کہ دل میں ترا پیکاں ہوتا

ہر طرف پھول مسرت سے کھلے جاتے ہیں
تم نہ آتے تو گلستاں نہ گلستاں ہوتا

نہ نکلی بزم جہاں میں قیام کی صورت
ہمارے بخت میں گردش تھی جام کی صورت

بہار گل میں مجھے کیوں ملے نہ کیف شراب
ہر ایک پھول چمن میں ہے جام کی صورت

نگاہ خاص رہے اپنے جاں نثاروں پر
وہ لطف کیا ہے جو ہو لطف عام کی صورت

وہی ضیاؔ ہے تمہارا غلام یاد کرو
ابھی سے بھول گئے تم غلام کی صورت

ختم کب ہوگا خدا جانے یہ دور مرگ و زیست
منزلیں ہی منزلیں ہیں آخری منزل نہیں

میں ہوں جویائے دُر مقصود بحر عشق میں
تہہ کی جانب ہیں نگاہیں جانب ساحل نہیں

اپنی لغزش یاد کیا وقت نصیحت آ گئی
کیوں زباں میں حضرت واعظ کی لکنت آ گئی

سو سزاؤں پر نہ ہوتا کم مرا ذوق گناہ
اسکی رحمت دیکھ کر لیکن ندامت آ گئی

راہ تسلیم و رضا میں یہ ہوا حاصل مجھے
اپنے دل پر مل گئی اب قدرت کامل مجھے

مطمئن راہ محبت میں ہوں اس امید پر
کھینچ لے گی اپنی جانب خود مری منزل مجھے

ضیغم

ضیغم:۔ مولوی محمد غضنفر مغفور شاگرد مرزا فتح الدولہ محمد رضا برق طبیعت میں روانی ہے۔ زبان کے اشعار زیادہ پائے جاتے ہیں۔

اے پریرو دل مضطر کو کل آئی ہوتی
جلد آؤ جو تم کو آنا ہے
یار ہے باغ ہے لب جو ہے
ترک دنیائے دوں تو کر ضیغم
خار ہر گل نظر آتا ہے ہمیں تیرے بغیر
جب سے پیش نظر وہ صورت ہے
ہجر میں درد کی یہ شدت ہے
دیکھ ہر شے میں اسکی قدرت کو
سامنے تیرے دم نکل جاوے۔

ہاتھ میں میرے اگر تیری کلائی ہوتی
دم کوئی دم میں یاں روانہ ہے
جلد آ ساقیا جو آنا ہے
لوگ بد ہیں برا زمانہ ہے
باغ میں جائیے کیا کس کا نظارہ کیجے
آئینہ کو بھی ایک حیرت ہے
سانس لینا بھی اک قیامت ہے
زاہد اگر تجھے بصیرت ہے
یہی دل میں ہمارے حسرت ہے

ضیغم

ضیغم:۔ حافظ اکرم احمد رامپوری شاگرد و داماد شاہ رؤف احمد رافت آپ کو سیر و سیاحت کا شوق زیادہ تھا۔ علم طب میں اچھی دستگاہ تھی۔ بیشتر کلکتہ اور ڈھاکہ میں قیام رہتا۔ صاحب دیوان تھے۔ سنہ ۱۲۸۹ھ میں قضا کی ۸۵ سال کی عمر پائی۔ اکثر دشوار زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے نمونہ کلام یہ ہے

اپنے سینے میں وہی عشق نہاں ہے کہ جو تھا
آہ و نالہ ہے وہی اور وہی رونا ضیغم
قفس میں بند ہو کر طوطی جاں شاد ہے ایسی
ساقی شفق کو دیکھ کے کتنا ہے ناز سے

کعبہ دل میں وہی ذکر بتاں ہے کہ جو تھا
پر اثر نالہ و فغاں میں کہاں ہے کہ جو تھا
کبھی کو قید ہونے کا ہے غم اس کو رہائی کا
صہبائے سرخ شیشۂ چرخ کہن میں ہے

ضیغم

ضیغم:۔ محمد عبد اللہ خاں خلف محمد صالح خاں لکھنوی اوائل شباب میں لکھنؤ میں رہے۔ وہیں کتب درسیہ پڑھیں آشفتہ خاطری نے زیادہ دنوں وطن میں رہنے

دیا۔ ۱۲۶۵ھ میں قسمت آزمائی کے لئے حیدرآباد پہنچے اور یہاں اُنکی تقدیر کا ستارہ چمکا۔ حسن اتفاق سے صفی اللہ خاں بہادر المخاطب بہ سرشرف الامرا کی صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوگیا۔ سرشرف الامرا کو حکومت انگلشیہ سے تین ہزار روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی دولت آصفیہ سے بھی معقول منصب پاتے تھے۔ کرناٹک کے اعلے رؤسا میں آپ کا شمار تھا۔ حضرت ضیغم ان کے داماد ہونے پر فخر کرتے تھے اور اپنے تذکرۂ شعرا میں تحریر کیا ہے کہ نواب صاحب مرحوم رشتہ میں خالو ہوتے تھے۔

حضرت ضیغم علم عروض اور انشاپردازی سے ماہر تھے۔ انتظامی امور میں اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ فن شعر میں میر عباس حسن ششدر اور نواب نیاز محمد خاں ہوش مرحوم کے شاگرد تھے۔ ایک تذکرہ مسمّی بہ "یادگار ضیغم" آپ کی تالیف ہے۔ آخر عمر حیدرآباد میں فارغ البالی سے گزاری۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

پھر لے چلا ہے کوچۂ قاتل میں کھینچکر	یارب بُرا ہو اس دل خانہ خراب کا
بستر کا تار تار تھا نشتر مرے لئے	کیا پوچھتے ہو حال شب انتظار کا
طول کھنچتے ہیں شب ہجر کا اس کو ضیغم	کہ نظر حشر تک آئے نہ سحر کی صورت
یہی ہے شرط محبت کہ جان تک دیدے	مگر کسی سے کسی کا کوئی گلہ نہ کرے

ط

طالب

طالب:- عاشور بیگ خاں پسر دولت بیگ خاں دہلوی۔ ان کے بزرگ توران سے ہندوستان آئے تھے۔ یہ فن سخن میں میر تقی میر کے شاگرد تھے۔ پُرلطف شعر کہتے۔ معاملہ بندی۔ روزمرّہ۔ صفائی زبان ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ ایک قدیم قلمی تذکرہ سے چند شعر انتخاب کئے جاتے ہیں۔

رہا تجھ کو وہاں خود کام اپنا	ہوا یاں کام لے خود کام اپنا

کہاں ملتا ہے طالب ہم سے وہ شوخ
یونہیں بدنام ہے یہ نام اپنا

رقصِ بسمل ہے طپش ہائے دل
تُو بھی آ دیکھ تماشائے دِل

ایک دم چین نہیں دیتا ہے
کاش سینے سے نکل جائے دل

طالب **طالب**۔ محمد یعقوب ولد قاضی فیض اللہ۔ شاگرد حافظ قطب الدین مشیر دہلوی علومِ رسمیہ سے آگاہ فنونِ ضروریہ سے بہرہ ور تھے۔ بابا سید حبیب اللہ کبرونی خلیفہ سید علی احمد ہمدانی کی اولاد میں تھے۔ ابوظفر بہادر شاہ کے عہد میں آپ کے والد معززین و شرفائے شہر میں سمجھے جاتے تھے۔

آپ کو شہرت اور نام و نمود سے نفرت تھی۔ شاعر بننے کا شوق نہ تھا۔ ملازمت دکن کے زمانہ میں آپ نے اپنا کلام جو ایک بیاض میں جمع کیا تھا۔ اس کو بے پروائی سے تلف کر دیا۔ ایک مختصر اخلاقی مثنوی موسوم بہ "نالۂ دلِ حزیں" طبع ہو چکی ہے۔ جو صوفیانہ رنگ میں ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

گھبرا کے مرے گھر وہ گل اندام نہ آیا
یہ جذبۂ الفت بھی کسی کام نہ آیا

کیونکر دلِ بیتاب کو تسکین ہو طالب
قاصد نہ پھرا وصل کا پیغام نہ آیا

تو مجھکو ستاتی ہے عبث حسرتِ دیدار
روزن بھی ہوا بند وہ دیوار کا اب تو

از مثنوی۔ نالۂ دلِ حزیں"

حالتِ قوم

مجھے رنج رہتا ہے اس بات کا
نفاق اسقدر کیوں ہے پھیلا ہوا

سلامت روی سب نے کیوں چھوڑ دی
مروّت کی سلک آپ ہی توڑ دی

نہ ہے شکرِ نعمت نہ اقرارِ عیش
غذا کی جگہ ہے قلق اور طیش

عبث دل گھلاتے ہیں آلام میں
لگاتے نہیں دل کسی کام میں

پہنچتا ہے گہ ملک پہ بھی اثر
اگر باہم الفت ہو اور اتفاق
ترقی ہو رونق ہو ہر کام میں
ہے ایک نعمت بیکراں اتفاق

تباہی میں پڑ جاتے ہیں گھر کے گھر
ہو معدوم سب کے دلوں سے نفاق
رہے قوم کی قوم آرام میں
وہاں ہیں مزے ہو جہاں اتفاق

طالب

طالب:۔ شاہد علی منصوری نام۔ مورث اعلیٰ نواب منصور علی منصبدار شاہی تھے۔ بزرگوں کا اصلی وطن سیوہارہ ضلع بجنور ہے۔ لیکن آپ کے والد شیخ امجد علی مرحوم نے ترکِ وطن کیا اور امروہہ میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں بمقام امروہہ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر کے اسکولوں میں حاصل کر کے ۱۹۲۷ء علی گڈھ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ چھ سات سال سے شاعری کا شوق ہے۔ اور شیخ منصور احمد صاحب افسر صدیقی امروہوی سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔ جو چند اشعار بھیجے نذر ناظرین ہیں۔ تین سال سے کراچی میں مقیم ہیں۔ اور محکمہ ریلوے میل سروس میں ملازم ہوئے۔

فلک پہ برق زمیں پر ہے باغباں دشمن
چھپاؤں کونسے کونے میں آشیاں اپنا

پیمانِ لطف یار ہے وجہ سکونِ دل
ایسا نہ ہو تو ظلم سہیں کس گمان پر

آخر تمہارے رہنے کا کوئی مکان بھی ہے
آخر تمہیں تلاش کریں کس نشان پر

وفورِ گریۂ غم سے خیالِ ضبطِ پیہم سے
کبھی میں جوشِ دریا ہوں کبھی آغوشِ ساحل ہوں

لنَ ترَانیِ سُنکے بھی ہمّت نہیں ٹوٹی مری
مِرے کانوں کو ابھی تک خواہشِ پیغام ہے

بر سرِ گورِ غریباں کہہ رہی ہے بیکسی
ہستی فانی کا اے طالب یہی انجام ہے

آنکھوں میں اپنی مجھ کو جگہ دو تو خوب ہو
تنگ آ گیا ہوں گردشِ لیل و نہار سے

پردہ رہے جنونِ محبت کا اے خدا
صحرا ہی ڈھانپ لے مجھے گرد و غبار سے

مٹی کے ڈھیر سے نہ دبی آگ عشق کی
شعلے نکل رہے ہیں ہمارے مزار سے

بزمِ امکاں کی ہر اک شے میں ہے جلوہ تیرا
ایک ہی نور سے معمور ہیں سب آئینے

بیہوش تھا میں غفلتِ عہدِ شباب سے
پیری کی صبح دیکھ کے اُٹھا ہوں خواب سے

اے شوقِ دید صبر کر آتے ہیں وہ ابھی
محشر اُلٹ نہ جائے ترے اضطراب سے

اتنا ہی میرے دل کو ہے ملنے کا اشتیاق
جتنا کہ ان کو میری طرف سے حجاب ہے

جلووں نے ہر نگاہ کو تسخیر کر لیا
تم یہ سمجھ رہے ہو کہ رُخ پر نقاب ہے

شمع کے جلنے سے محفل میں یہ عقدہ کُھل گیا
حسن کے پردے میں پنہاں عشق کی تصویر ہے

نظر اُن کی محبت آفریں معلوم ہوتی ہے
یہ ظالم ہے مگر ظالم نہیں معلوم ہوتی ہے

عجب تاثیر رکھتی ہے خلشِ دردِ محبت کی
کہیں ہوتی ہے یہ لیکن کہیں معلوم ہوتی ہے

جس جا خیال کی بھی رسائی نہ ہو سکے
درکار ہے وہاں کے لئے نامہ بر مجھے

پھر اُٹھنا چاہتا ہے حجابِ نگاہِ ناز
پھر اپنی عافیت نہیں آتی نظر مجھے

طالب:- مولوی اللہ داد۔ عرف حافظ شبراتی متوطن رام پور۔ چیچک میں آنکھیں جاتی رہی تھیں مگر چشمِ باطن روشن تھی۔ نابینائی میں کتب درسیہ پر عبور تھا۔ مُلا حسن مرحوم اور قدرت اللہ شوق کے شاگرد تھے۔ زمانۂ قدیم کے اچھے شعرا میں ان کا شمار ہے زبان میں جدت کلام میں کیفیت پائی جاتی ہے۔ لطف زبان روزمرہ۔ محاورہ کی خوبی ان کے ہاں موجود ہے تغزل میں سوز و گداز کا رنگ بھی ہے:-

ہر چند روسیہ میں بے نور بے بصر تھا
لیکن بہ رنگ سرمہ منظور ہر نظر تھا

جائے خوں سُرخیِ گُل تھی اس میں
چیر کر جب دلِ بلبل دیکھا

نہ اُٹھا شورِ قیامت سے میں
منتظر ہوں ترے ٹھکرانے کا

اور اک رسم نئی آج سے ایجاد کریں
تو ہمیں یاد کرے ہم نہ تجھے یاد کریں

دل میں اک بات ہے مدت سے کہوں یا نہ کہوں
وقتِ فرصت ہے یہ اب آپ جو ارشاد کریں

ہم نفس اب تو یہ ٹھہری ہے کہ جتنے ہیں اسیر
پر کتر فصلِ خزاں میں انہیں آزاد کریں

گریہ میں چشم تر سے دن رات چاہتا ہوں	بویا ہے تخمِ الفت برسات چاہتا ہوں
چیرئے سینے کو شق کیجے دل دلگیر کو	یہ ہی دو جاگہ ہیں اور کیا کھا گیا ہیں تیر کو
آؤ عشق بتاں بھی کر دیکھیں	یہ بھی اک طبع آزمائی ہے
سب ہم صفیر اُڑ گئے صیّاد دام سے	پر ہم تھے اور ڈھب کے گرفتار رہ گئے
یہ ہجر کے صدمے وہ ترے وصل کے وعدے	جینے نہیں دیتے مجھے مرنے نہیں دیتے
نفس عیسوی نہ کر ممنون	ہم کو دو دن کی زندگی کے لئے

طالب

طالب:۔ شیخ محمد جان دہلوی خلف شیخ احمد جان ایک پیشہ ور شخص تھے۔ علم سے قطعی بے بہرہ۔ منیر حسن شوق سے مشورہ سخن رکھتے۔ ۳۲ برس کی عمر پاکر ۱۲۸۴ھ میں انتقال کیا۔ یہ نمونۂ کلام ہے:۔

بشر آیا جو آفت میں محبت کے سبب آیا	کسی پر دل اگر آیا حقیقت میں غضب آیا
رقیب اسکو بیٹھے ہیں گھیرے ہوئے	فلک تیری گردش کو کیا ہوگیا
یقیں آئے کیا تو یہ طالب نے کی	خرابِ ازل پارسا ہو گیا
اُٹھاؤں کب تلک صدمہ الٰہی دردِ ہجراں کا	کسی صورت نہیں سامان بنتا وصلِ جاناں کا
دل پہ ہزار زخم ہیں قاتل پڑے ہوئے	تڑپا ہیں گے حشر تک ترے بسمل پڑے ہوئے

طالب:۔ مولوی امام الدین دہلوی لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ فنِ سخن میں شاہ نصیر سے تلمذ تھا۔ مولانا شاہ عبد العزیز کے مرید تھے۔ علمی استعداد کافی تھی۔ شاعری کے رموز و نکات سے پورے واقف علم بدیع و عروض سے ماہر تھے۔ رسالۂ "تقویت الشعراء" انہیں کی تصنیف سے ہے۔ لکھنؤ میں وفات پائی۔ رباعیاں کہنے میں کمال تھا۔ اخلاقی مضامین سادہ پیرایہ میں خوب نظم کئے ہیں۔ دو رباعیاں درج ذیل ہیں:

یارو جو کوئی کسی کو کلپائے گا	یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پائے گا
اِس دارِ مکافات میں سن لے طالب	جو کچھ تو کرے گا آج کل پائے گا

دیگر

گھر پاس نہیں کہ یار پاس آئے مرے　　زر پاس نہیں کہ یار پاس آئے مرے
میں پہلے ہی کرچکا ہوں طالب قرباں　　سر پاس نہیں جو یار پاس آئے مرے

طالب

طالب:- پنڈت الائچی رام باشندہ جلال آباد۔ ضلع امرت سر۔ شاگرد نساخ ان کے باپ کا نام سوبھی رام تھا۔ قوم کے برہمن تھے۔ ۱۸۶۱ء میں باریسال میں قیام تھا۔ ذکی الطبع اور ذہین تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

مجھ پر وہ ظلم یار نہ اغیار نے کیا　　جو کچھ کہ بخت و چرخ ستمگار نے کیا
سختی سے سوم بھلا ہے کہ دے جواب نشتاب　　اجی تم اتنا تو فرماؤ آؤ گے کہ نہیں
بے گناہوں کو قتل کرتے ہو　　روزِ محشر کا تم کو ڈر ہی نہیں
ہم تو مرتے ہیں ایک مدت سے　　واہ جی تم کو کچھ خبر ہی نہیں

طالب

طالب: مولوی طالب الدین خلف مولوی عزیز الدین صادق۔ رئیس بدایوں فنِ شعر میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔ انگریزی۔ فارسی۔ عربی میں کافی لیاقت رکھتے تھے۔ مرزا غالب کے کلام سے دلی محبت تھی۔ کلام میں روانی و سلاست ہے۔ چند شعر بطور نمونہ نذر ناظرین ہیں:-

علاج کرتے ہیں یوں سوزشِ نہانی کا　　وہ آبِ تیغ سے لیتے ہیں کام پانی کا
جلوہ حسن وہ ہر شکل میں دکھلاتا ہے　　کبھی یوسف کبھی شیریں کبھی لیلےٰ ہو کر
ہمیں ہیں دلبروں کی دلربائی دیکھنے والے　　ادا پر مرنے والے کج ادائی دیکھنے والے
لباس ظاہری سے کوئی اچھا ہو نہیں سکتا　　صفائی قلب کی دیکھیں صفائی دیکھنے والے
نظر بازی کبھی کرتے نہیں حورانِ جنت سے　　حسیناں جہاں کی دلربائی دیکھنے والے

صنم سے عشق ہے تم کو نہیں ہو حضرت طالب
بتوں کو دیکھکر شانِ خدائی دیکھنے والے

طالب:۔ محمد قطب الدین احمد خاں ابن غلام رسول خاں رامپوری۔ آپ کا خاندان سلطنت اودھ کے دور میں معزز و ممتاز رہا۔ اور اس کے بعد ریاست ٹونک اور گوالیار میں رسوخ حاصل کیا۔ آپ کی والدہ نواب ضیاالدولہ سعیدالدین احمد خاں کی خواہرزادی ہیں۔ اور حکیم ارشد خاں ابن حکیم مسیحا معالج شاہ عباس صفوی ایران بھی آپ کے نانہالی رشتہ داروں میں تھے۔

آپ ۱۸۵۵ء میں بمقام گوالیار پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اسی ریاست میں اورسیری اور انجینیری کے خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۸۸۹ء میں وکیل دربار گوالیار ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں محکمہ پولیٹکل ایجنسی بھوپال میں اپنے والد بزرگوار کی جگہ حاصل کی۔ کلام میں مزا اور طرز ادا بانکی ہے۔ معمولی مضامین کو زور طبع اور زبان آوری سے نیا رنگ دیتے ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو۔

جلوہ سما رہا ہے جو وحدت کے نور کا
دل صاف آئینہ ہے تجلّی طور کا

جتنی بڑھی شمار میں اتنی ہی گھٹ گئی
اپنا حساب عمر عمل ہے کسور کا

وہ اگر زیب کمر رکھتے ہیں خنجر اپنا
ہم بھی پھرتے ہیں ہتھیلی پہ لئے سر اپنا

ظلم افلاک غم عشق ستم ہائے عدو
دیکھتے ہیں جو دکھاتا ہے مقدّر اپنا

آگئیں یاد جوانی کی ترنگیں ہم کو
فصل گل میں جو کہیں ساغر و مینا دیکھا

خواب کا دیدۂ بیدار میں آنا کیسا۔
لگ گئی آنکھ تو پھر آنکھ لگانا کیسا

نظروں سے وہ غائب ہے تو پہلو سے یہ گم ہے
ہے کس کو پتہ تیری کمر کا مرے دل کا

کچھ ربط بڑھانے میں جھجکتے ہیں وہ طالب
شاید کہ بھروسہ نہیں انکو مرے دل کا

دل زار پھر مبتلا ہے کسی کا
نئے سر سے سودا ہوا ہے کسی کا

اٹھائے تو کوئی جفائیں تمہاری
ہمارے سوا حوصلہ ہے کسی کا

پھر رہا ہوگا انہیں کوچوں میں بھولا بھٹکا
تیرے گیسو کے سوا دل کہیں آیا نہ گیا

کبھی تو وہ ستمگر راہ پر آئیگا اے طالب
کبھی نور راستی پر ہم سے دُور آسماں ہوگا

خندہ و گریہ میں کیوں غم تلف کرتے ہیں
حال کہتے ہی نہیں کچھ گُل و شبنم اپنا

ہم نشیں پھر بھی ہوا یہ ناتوانی کا اثر
درد کا اُٹھنا مرے پہلو سے مشکل ہوگیا

ہوتی نہیں جو ختم شبِ غم کسی طرح
سایہ پڑا ہے کیا مرے روزِ سیاہ کا

پہلا سا ربط ضبط ہی ان سے نہیں رہا
پیغام اور سلام ہے اب گاہ گاہ کا

اک عمر سے ہے پیرِ فلک بس جو سرنگوں
مارا ہوا ہے یہ کسی نیچی نگاہ کا

غضب ہے بزم میں ہم بیٹھیں میہماں کی طرح
نشستِ غیر ہو پہلو میں رازداں کی طرح

ہمارے دل کو ہے بے مہری فلک مطبوع
کہ اسکی بھی ہے روش اپنے مہرباں کی طرح

شباب ہی میں کیا زورِ عشق کے غم نے
بہار آئی چمن میں مرے خزاں کی طرح

مرے پہلو سے کہاں جاتا ہے اُٹھ کر اے درد
اور تڑپے گا دلِ زار اکیلا ہوکر

اب نہ دل ہے مرے سینے میں نہ دل میں ارماں
بہہ گئے آنکھوں سے سب خونِ تمنّا ہوکر

اس مدرسے میں عشق کے آکر وہ لے سبق
جو پہلے یہ سمجھ لے کہ فاضل ہیں گھر سے ہم

یہیں کیوں تمہارے کوچے کے چکّر یہ رات دن
کچھ بدگماں ہیں گردشِ شمس و قمر سے ہم

بوسہ دے کر یہ جتاتے ہو کہ کب کچھ نہ دیا
دینے والے مری جاں اس سے سوا دیتے ہیں

آشوب دہر سے کہیں یارب اماں نہیں
وہ کونسی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں

پیری لبشر کی نادم آخر رفیق ہے
ہے یہ عجب بہار کہ جس کی خزاں نہیں

دکھا کر وہ رُخِ گلگوں خجل کرتے ہیں گلشن کو
دہن سے غنچہ کو۔ عارض سے گُل کو لب سے سوسن کو

کبھی چرچا جو سن لیتے ہیں فصلِ گُل کی آمد کا
نو کرتے ہیں قفس میں یاد ہم اپنے نشیمن کو

ہوں وہ بیمارِ جنوں میرے لئے اے چارہ گر
نوکِ خارِ دشت جائے نشترِ فصّاد ہو

معرکہ میں عشق کے ایدل قدم رکھتا ہے تو
اب اُٹھانی ہی پڑے گی یار جو افتاد ہو

یہ آب و تاب زاہد بھی جو دیکھے تو پھسل جائے
تک کہ دخترِ رز نے خوب ہی رنگت نکالی ہے

کوئی کروٹ نہیں لیتا کوئی پھر کر نہیں آتا
عدم کے جانے والوں نے نئی دنیا نکالی ہے

ہمیں دونوں کا یکساں ہے مزہ فرق اس میں تم کر دو
زبانِ لب سے سمجھا دو یہ بوسا ہے یہ گالی ہے

جس پر ان کی نگاہ ہوتی ہے
اس کی حالت تباہ ہوتی ہے

ذکرِ الفت وہ حُسن کے کہتے ہیں
کہیں یہ رسم و راہ ہوتی ہے

ضعف سے دردِ دل نہیں اُٹھتا
کچھ کسک گاہ گاہ ہوتی ہے

کام کر دیتی ہے ادا اُن کی
ہاں قضا سد براہ ہوتی ہے

کام آتی ہیں عشق میں جانیں
کیا کٹھن اس کی راہ ہوتی ہے

جو آئے وہ تو طبیعت اُبھارتے آئے
چلے تو وہ دلِ عاشق کو گُدگُدا کے چلے

کچھ آنے جانے کا اپنے کھلا نہیں اسرار
کہاں سے چل کے ہم آئے کہاں کو آئے چلے

بدگماں ہوتے ہیں اب تو وہ مری ہر بات پر
روٹھ جاتے ہیں خدا کی شان ہنستے بولتے

صبح کو اے دل جو کچھ گذرے گی دیکھی جائیگی
رات تو کٹ جانے دے ناداں ہنستے بولتے

آدمیت کے یہ معنی ہیں کہ ہنسئے بولئے
ورنہ دُنیا میں ہیں کیا حیواں ہنستے بولتے

کل ہم سے سیکھتے تھے جو الفت کی رسم و راہ
چالیں وہ آج چلتے ہیں قدرت خدا کی ہے

جوبن اُبھار پر ہے جوانی بہار پر
شہرت زمانے میں ترے نشو و نما کی ہے

میں نے جو پوچھا یاد ہیں کچھ ابتداء کے ربط
بولے مرے مزاج میں بھول انتہا کی ہے

اقرار ترے سچے ہیں وعدے ترے پورے
سچ یہ ہے کہ جھوٹے سے خدا کام نہ ڈالے

بسنت کی بھی تجھے کچھ خبر ہے اے بلبل
بہار لائی ہے سامان یہ سب خزاں کیلئے

نظر لگے گی نہ مشقِ ستم بڑھا ظالم
جفائیں رہنے دے باقی کچھ آسماں کیلئے

شیشے کے ساتھ ٹوٹینگے ہم میکشوں کے دل
ڈر محتسب خدا کیلئے اس گناہ سے

کیا کیا ترے ستم کی اٹھاتا ہے لذتیں
پوچھے کوئی مرے دلِ بیداد خواہ سے

آیا ہے اک جہاں ترے نظارہ کیلئے
دیر و حرم سے میکدہ و خانقاہ سے

بیقراری وہ شبِ ہجر کی سُن کر بولے	لطف کیا وصل میں کچھ اس سے سوا رکھا ہے
یہ بُت بھی خود کو خدا جانے کیا سمجھتے ہیں	دو روزہ حسن پہ کتنا غرور ہوتا ہے
ہمارے شیشۂ دل کو سنبھال کر رکھنا	ذرا سی ٹھیس میں یہ چُور چُور ہوتا ہے

طالب

طالب:- پنڈت کشن لال چودھری دہلوی۔ کشمیری پنڈتوں کے علم دوست فرقہ سے تھے۔ مذاقِ سخن نہایت پختہ تھا۔ ضروریات شعری سے پورے واقف اور مشاق شاعر تھے مولوی محمد حسین آزاد اور نواب مرزا ظہیر سے تلمّذ تھا۔ محکمہ تعمیرات وانہار میں اکونٹنٹ تھے۔ کئی رسالے نثر کے مثل گلگیر کشمیر وغیرہ اپنی برادری کے حالات سے متعلق لکھے۔ مذہبی معلومات بھی آپ کی اعلےٰ پایہ کی تھی۔ آخر عمر میں ملتان میں رہتے تھے۔ کئی برس گذرے وہیں اس جہان سے گذر گئے۔ کلام پاکیزہ اور طرز قدیم کے محاسن کا حامل ہے ملاحظہ ہو۔

محفل سے گر عدو کو اٹھایا نہ جائے گا	تو ہم سے بزمِ یار میں جایا نہ جائے گا
میں جاؤں اس جہان سے یا جان تن سے جائے	پر ہائے کوئے دوست سے جایا نہ جائے گا
شکوے کیا کیا کیجیے اس چرخِ کج رفتار کے	اس کی چالوں نے تو یاں صدہا کو برہم کر دیا
اوس ڈالی ہے فلک نے اس چمن پر ہے غلط	اپنے ہی اشکوں سے ہم نے کارِ شبنم کر دیا
دل سے جو مجھ کو عشق ہے اُس بے نیاز کا	مائل نہ عشوہ پر ہوں نہ فائل ہوں ناز کا
طالب اسی کو رہتی ہے اسرار کی خبر	ہے راز دار خود جو ہر اِک دل کے راز کا
گرچہ فاموس کے ہیں پار فضیلت سب کی	جانتے پر نہیں ناموس ہیں اور ننگ میں فرق
ہم نے سَو ڈھنگ زمانے کے بدلتے دیکھے	لیکن آیا نہ یہاں اپنے کبھی ڈھنگ میں فرق
عقبےٰ میں کام ہوگا نہ کچھ رنج و غم کیساتھ	دنیا کے مخمصے یہ یہیں تک ہیں دم کیساتھ
تاہم سدا نہ کیوں کہیں دنیا کو ہم دھوا!	ہستی میں ہم نے پانو رکھے چشمِ نم کیساتھ

طالب

طالب:- سید بشیر محمد تلمیذ حضرت غالب دہلوی۔ کلام معمولی پایہ کا ہے۔ نمونہ نذر ناظرین ہے:۔۔۔

اُس چشم سرمگیں سے ملانی نہ آنکھ تھی
لڑنا پڑا ہے اب تو خدایا قضا کے ساتھ

رنگت نہ ہاتھ پاؤں کی جائے تمام عمر
میرا لہو ملا کے ملو تم حنا کے ساتھ

بچتا کسی طرح سے کوئی شیفتہ نہیں
کیا لاگ ہے اجل کو تیرے مبتلا کے ساتھ

طالبؔ یہاں جو کرنا نہ تھا وہ بھی کر چکے
اب دیکھئے بنیگی وہاں کیا خدا کے ساتھ

طالب: منشی ونایک پرشاد خلف الرشید منشی روشن لال سابق قانون گو تحصیل بنارس۔ کایستھ سری واستو۔ بزرگوں کا وطن قصبۂ اترولہ ضلع گونڈا اودھ ہے۔ ان کے جدِ امجد منشی درگا پرشاد جو ضلع گورکھ پور میں سررشتہ دار عدالت خفیفہ تھے۔ وہاں سے تبدیل ہوکر بنارس میں آرہے تھے۔ انگریزی ہندی۔ اردو۔ فارسی کی تعلیم وہیں پائی۔ پھر بمبئی میں مرہٹی اور گجراتی حاصل کی۔ کالج چھوڑ کر منشی صاحب نے برسوں ملک کے نامور اردو اخبارات میں اخلاقی تمدنی سیاسی زوردار مضامین لکھے۔ انشاء پردازی میں مہذب ظرافت اور شوخی کا رنگ نمایاں تھا۔ جب کسی مضمون کے خلاف قلم اٹھاتے تو فقرہ فقرہ دلوں میں چبھ جاتا۔ بعض مضامین میں تاریخی دلائل کو اس خوبی سے قلمبند کرتے کہ ناظرین کی آنکھوں میں راستی اور صداقت کا نقشہ کھنچ جاتا۔ شاعری میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے ان کے تلامذہ کثرت سے تھے۔ مختاری کا امتحان دے کر الہ آباد ہائی کورٹ سے سند حاصل کی تھی مگر طبیعت کا رجحان شاعرانہ مذاق اور علمی مشاغل کیطرف تھا۔ قانونی جھگڑوں میں دل نہ لگا۔ بنارس سے کلکتے چلے گئے اور دو سال تک ڈاک خانہ کے محکمے میں کام کیا۔ اور اس اثنا میں کئی ڈرامے لکھے۔ یہ فن نہایت گری ہوئی حالت میں تھا۔ اس کی اصلاح کرنے والوں میں آپ کو شرفِ اولیت حاصل ہے۔ آغا حشر اور سید مہدی حسن احسن آپ کے بہت مدت بعد اس میدان میں آئے۔ حضرت طالب کے قلم سے نکلے ہوئے ڈرامے جو عام طور پر مقبول ہیں اور جن کے صلے میں والیانِ ریاست نے انھیں تمغے دیئے تھے۔ آج تک سند میں پیش کئے جاتے ہیں۔ آپ ڈرامے کی تصنیف

طالب

ہیں نہایت احتیاط سے کام لیتے۔ طرزِ معاشرت۔ طریقۂ تمدن۔ خصوصاً سینری کا زیادہ لحاظ رکھا ہے۔ دیکھنے اور پڑھنے سے دل و دماغ پر اچھا اثر ہوتا ہے۔ ظرافت بھی ہے مگر تہذیب کا پہلو لیے ہوئے۔ سوسائٹی کی کمزوریوں کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ ناگوار نہیں معلوم ہوتا۔ بیہودہ خیالات۔ پیچیدہ استعارے۔ مغلق الفاظ کسی مکالمے میں نہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُن میں زبان کی خامیاں نظر نہیں آتیں۔ ٹریجڈی[1] کے حقیقی مقاصد کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ کامیڈی[2] کے جلوہ گاہ میں ان کا قلم خوشی کے پھول برسا دیتا ہے۔ ہر موقعہ پر شرم و حیا کا دامن ہاتھ میں رکھتے ہیں اور گرے ہوئے مذاق سے دُور رہتے ہیں۔ پندرہ بیس ڈرامے مطبوعہ ہیں۔

آپ کو شاعری کا شوق بیس برس کی عمر سے تھا۔ اوّل جناب راسخ دہلوی اس کے بعد جناب داغ سے اصلاح لیتے رہے۔ عاشقانہ غزلوں کے علاوہ بہت سی نظمیں انہوں نے کہیں جو ملک کے رسالوں میں مشتہر ہو کر مقبولِ عام ہوئیں۔ کلام صاف ہے شوکت لفظی سے کلام کی رونق دوبالا کر دیتے ہیں۔ ترکیب کی رعنائی بندش کی زیبائی سہرِ نظم پر چار چاند لگا دیتی ہے۔ زبان سادہ ہے۔ سلیس محاورات نظم کرتے ہیں۔ رعایت لفظی کی بے ضرورت کھپت ان کے ہاں نہیں۔ اسی وجہ سے آورد کے شعر شاذ نظر آتے ہیں۔ غزل میں اخلاقی خیالات کو بھی خوب ادا کرتے ہیں۔ جس طرح پریم چند فسانہ نگاری میں مشہور رہیں۔ اسی طرح ڈراما نویسی میں یہ سحر نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں بمقام بمبئی انتقال کیا۔ جو کچھ کلام فراہم ہو سکا۔ اس کا انتخاب نذرِ ناظرین ہے۔

دیکھئے شوخی کہ خود ہی چھین کر دل لے گئے	اور خود ہی پوچھتے ہیں کیا ترا جاتا رہا
ہزار جان کے دشمن تھے ایک یار نہ تھا	ہزار غم تھے مگر ایک غمگسار نہ تھا
عدم سے بھیجتے احباب کو خبر طالبؔ	ہزار حیف کہ اپنا کچھ اختیار نہ تھا

[1] ٹریجڈی۔ غمناک قصہ۔ [2] کامیڈی۔ مسرت خیز قصہ۔

ہم عندلیب نالاں یہ بوستاں ہمارا
ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

مرنا یہاں ہمارا جینا یہاں ہمارا
ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

وہ بھی گھڑی تھی اپنی وہ بھی تھے دن ہمارے
جب معتقد بنا تھا سارا جہاں ہمارا

یونان میں ہمیں ہم ایران میں ہمیں ہم
چرچا یہاں ہمارا شہرہ وہاں ہمارا

جب آفتابِ غفلت ڈوبا تو دیکھ لینا
چمکیگا پھر ستارہ اے آسماں ہمارا

عاشق کو بد و نیک سُجھائی نہیں دیتا
دیکھا ہے کہ الفت میں دکھائی نہیں دیتا

شہرہ ہے جہاں میں ترے خنجر کے چلن کا
وہ کون ہے جو دادِ صفائی نہیں دیتا

ٹل جاتے ہیں جس وقت ستم پر نہیں سُنتے
ہاں ہاں سے جو روکیں تو وہ کہتے ہیں نہیں اور

آتشِ عشق جلی رہتی ہے ہر دم دل میں
آگ سے ہو نہیں سکتا یہ سمندر باہر

آنکھیں مری نثار ہیں ابروئے یار پر
پُتلی کا ناچ دیکھئے خنجر کی دھار پر

پردہ خود آنکھ کا ہے ہمارے لئے حجاب
ورنہ ترے جمال کا جلوہ کہاں نہیں

اہلِ اسلام اور اہلِ ہنود
خاکِ ہندوستاں ہیں دونوں

کیوں نہ دونوں کا دم غنیمت ہو
جسم ہے ملک جان ہیں دونوں

نام ہی نام رہ گیا ہے اب
اُجڑے گھر کے نشان ہیں دونوں

دل جگر جس میں چاہئے رہئے
آپ ہی کے مکان ہیں دونوں

دارِ فانی سے جا کے داغؔ و امیرؔ
خلد کے مہمان ہیں دونوں

خوش رہیں اب ظہیرؔ اور جلالؔ
شاعرِ خوش بیان ہیں دونوں

کیا بات ہے سفّاک ترے تیرِ نظر کی
کہتا ہوں کہ رکھ لوں اسے دل میں کہ جگر میں

زیرِ زمیں بھی چین ملے کوئی دم ہمیں
امید تجھ سے اتنی بھی اے آسماں نہیں

واعظ ہمیں بہشت کی ایسی پڑی ہے کیا
کچھ میکدہ نہیں کوئی کوئے بتاں نہیں

اندازِ شوخیوں نے نکالے حجاب میں
اپنا سا منہ وہ رہ گئے لیکر نقاب میں

بدمستیوں سے جان پڑی ہے عذاب میں
کیا خاک جی لگے کسی کارِ ثواب میں

آئے گی روزِ حشر مرے منہ سے بوئے گل
پیتا ہوں روز پھول ملا کر گلاب میں

احباب سیر دیکھیں اگر آنکھ کھول کر
دریا میں ہے حباب تو دریا حباب میں

جھکیں منعم تہی دستوں کے آگے تو برا کیا ہے
صراحی جام کے آگے جھکا لیتی ہے گردن کو

لحد سے روزِ محشر بھی نکلنے کا گماں کیوں ہو
مکاں جو مر کے ہاتھ آیا طبیعت پر گراں کیوں ہو

لگا دو آگ عالم میں جلا دو طور کو دم میں
یہ دعوے ہے اگر تم کو تو پردے میں نہاں کیوں ہو

کیونکر ہو اختیار میں اظہار آرزو
لکھوں جو نامہ ان کو تو پوری کتاب ہو

لکھوں جو نامہ عارضِ گلگوں کی یاد میں
خط کا ہر ایک فقرہ گلستاں کا باب ہو

زاہدو کر لو مری پردہ دری
کیا ہوا اللہ تو ستّار ہے

ہمارے خون سے پیچھے مکرنا
چھڑا لو داغ پہلے آستیں سے

یہاں سے دلبری سیکھی ہے تم نے
لگے استادیاں کرنے ہمیں سے

توکل ہو تو ہر مقصود ملجاتا ہے گھر بیٹھے
کہ دستِ موج خود آکر لبِ ساحل سے ملتا ہے

ریش گو چہرہ پہ زاہد کے خدا کا نور ہے
خانۂ دل دیکھیے تو خانۂ دیجور ہے

وسیلہ چاہیئے اجرائے کار سے پہلے
ہوا ہمیشہ چلے گی غبار سے پہلے

طلب کی راہ میں اکثر لگا کے شوق کے پر
پہنچ گیا ہے پیادہ سوار سے پہلے

یہ کارگاہ جہاں عدل کا مقام نہیں
عیاں ہے جبر یہاں اختیار سے پہلے

مر مٹیں تیری طلب میں تو سہی
یار بھی طالب ہیں اپنے نام کے

کاگ اڑے دور چلے سامنے بوتل آئے
میکشو مژدہ! بڑے زور سے بادل آئے

لختِ جگر کہ پارۂ اخگر بغل میں ہے
پہلو میں دل ہے یا کوئی نشتر بغل میں ہے

مسجد میں یہ دعا ہے کہ یارب کھلے نہ بھید
بوتل ہے میری جیب میں ساغر بغل میں ہے

انداز یہ نیا ہے تمہارے ملاپ کا
آئے گلے بھی ملنے تو خنجر بغل میں ہے

ہم نہ باہر ہوئے دم بھر کبھی میخانے سے — کبھی شیشے سے گذر کی کبھی پیمانے سے

توڑ کر توبہ الگ پھینکدو میخانے سے — ہو نہ ایمان شکنی میکشو پیمانے سے

قصۂ ہجر سناؤں تو سناؤں کیونکر — نیند آجاتی ہے اُن کو مرے افسانے سے

طالب اس جنگ کو ہم کیوں نہ مبارک جانیں — صلح اس بُت سے ہوئی بخت کے لڑ جانے سے

کِسی کروٹ کِسی پہلو تو ملے چین مجھے — کاش وہ درد ہی بن کر دل مضطر میں رہے

نام سے عشق کے جلتے ہیں وہ اتنا کہ اگر — ان کا بس ہو تو شرارہ بھی نہ پتھر میں رہے

ہجر کی شب کر گئی اندھیر کیا — صبح محشر میں ہیں جلوے شام کے

رُوسیاہوں میں ہوئے ہم سرخ رُو — کیا کرشمے ہیں مے گلفام کے

خضر سے راہِ میکدہ پوچھیں — آدمی ہیں یہی ٹھکانے کے

طالب طالب :۔ طالب حسین خاں ابن ملا حسین عسکری۔ جوانِ رعنا۔ کشیدہ قامت۔ خوش اخلاق۔ خوش تقریر۔ طبع بلند رکھتے تھے۔ مرشد زادہ میرزا سلیماں شکوہ کے ہاں خاصہ کی دارو غائی پر معمور تھے۔ فن شعر میں سید انشا سے تلمذ تھا۔ کلام میں روانی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ تذکرہ شوق سے اشعار کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

دشت میں نالہ کیا پار جو طالب نے تیرے — ایک شعلہ سا گیا خار مغیلاں سے لپٹ

غیر سے مل کے شعلہ خو ناحق — کیوں جلے کے تئیں جلاتا ہے

مژدہ اے قیس تیری وادی میں — ناقۂ لیلی کا آج آتا ہے۔

آج طالب کا عشق میں تیرے — جلد آ ورنہ جی ہی جاتا ہے۔

طالب طالب :۔ خدا بخش ولد عبداللہ ملتان کے رہنے والے ہیں۔ ۱۲۸۴ھ میں پیدا ہوئے۔ حضرت شوق نیموی و جناب شمشاد سے تلمذ تھا۔ ۱۳۱۰ھ میں دیوان قومی پریس میں طبع ہو چکا ہے۔ طبیعت کو شاعری سے لگاؤ ہے۔ فکر مضمون یاب ہے۔ پہلے تجارت پیشہ تھے۔ اب کرایہ مکانات وجہ معاش ہے نمونہ کلام نذر ناظرین ہے۔

کسی کا دِل نہ ہلا دے تو وُہ فغاں کیسی
کسی کے غم میں نہ تڑپے تو وہ جگر کیسا

دِل مَیں نے سمجھ بُوجھ کے اُسے جان دیا ہے
پھر کہتے ہو تم سا کوئی ناداں نہیں دیکھا

حسرت کبھی رہتی ہے کبھی ان کی تمنّا
کب خانۂ دِل میں کوئی مہماں نہیں دیکھا۔

پوچھو نہ کچھ گدائے محبّت کی مفلسی
جانِ عزیز دی تو میسّر کفن ہُوا۔

کہتے ہیں ابرؤوں سے مجھے قتل کر کے وُہ
ان خنجروں نے وار کیا ہم نے کیا کیا

شکایتِ ستم و جور سے تو در گذرے
اب اور رحم کریں کیا کسی ستمگر پر

نہ ہوگا صاف کبھی مثلِ شیشۂ ساعت
جمی ہے گرد کسی کے دلِ مکدّر پر

ہماری لغزشِ پا کا سنبھالنا دیکھو
گرے بھی ہم تو گرے آستانِ دلبر پر

عرش پیما تھی کبھی اے بت جو تیرے ہجر میں
آج لب تک بھی وہ آہِ نارسا آتی نہیں

لگائی تھی جو وقتِ قتل ٹھوکر اس نے ماتھے پر
شہید ناز کی شاید وہی مہر جبیں نکلی

طالب **طالب**:۔ غلام زین العابدین لاہور کے رہنے والے ہیں۔ سید ناظر حسین ایڈیٹر اخبار ناظم الہند کے شاگرد ہیں۔ رعایت لفظی کیساتھ زبان کو بھی نبھاتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

عدم والے کہاں جاتے ہیں چپکے چپکے پوچھیں تو
بتانے جائیں کیا دستور ہے شہر خموشاں کا

کیا مسلماں ہو کہ ہو طالب بتوں کے رات دن
شرم بھی کچھ تم کو اے مردِ خدا آتی نہیں

ہجر میں ہوش کہاں صبر و تحمّل کس کا
اب تو اپنے بھی نظر آتے ہیں بیگانے سے

ساغرِ مے کو جو گردش ہے زمانے کی طرح
دیکھ آیا ہے تری آنکھ یہ میخانے سے

کِس پری رو کی محبت میں ہے یہ حال اُن کا
کہ نظر آتے ہیں طالب ہمیں دیوانے سے

طالب **طالب**:۔ محمد عبد الرحیم خاں شاہجہان پوری۔ انسپکٹر محکمۂ نمک۔ شاگرد جناب صفدر۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

لکّھا مجھے جو خط تو یہ تازہ ستم ہُوا
دشمن کو بھی مرے وہی مضمون رقم ہُوا

پھرتا نہیں ادھر کا مسافر کوئی کبھی　　کوچہ کسی کا جادۂ راہ عدم ہُوا
"لکھئے جواب نامہ" یہ کوئی قصور تھا　　اتنی سی بات پر سرِ قاصد قلم ہُوا

طالب

طالب:- منشی ٹھاکر پرشاد ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بزرگوں کا وطن مانکپور ضلع پرتاب گڈھ ہے۔ آپ کے دادا منشی ہنومان پرشاد زبان فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ابتدائی درسیات فارسی انھیں سے پڑھیں۔ بعد کو منشی ولایت علیخاں ولایت و محمد عزیز اللہ شاہ عزیزؔ ساکن قصبہ صفی پور ضلع اناؤ سے فارسی کی تکمیل کی۔ آپ کے دوران تحصیل میں آپ کے استاد منشی ولایت علی خاں نے آپ ہی کے لئے پنج رقعۂ ولایت تصنیف فرمایا تھا۔ شعروشاعری کی طرف طبیعت ابتداء ہی سے مائل تھی۔ لیکن انکسار طبع کے باعث (جیسا کہ آپ نے خود اپنے کلام میں تحریر فرمایا ہے۔ کہ "میدانستم کہ کلام شعرائے سابق گویا زبان دیگراں بستہ است") زیادہ مشق سخن نہ فرماتے تھے۔ زمانہ ملازمت محکمۂ وثیقہ فیض آباد میں آپ کے احباب نے آپ کو ایک مشاعرے میں صدر قرار دیا جب سے مشق جاری ہوئی۔ آپ کا کلام سلجھا ہُوا اور متین۔ زبان صاف استعارات پسندیدہ اور زبردستی کے پریشان کن صنائع سے پاک ہے۔ تصوف کا رنگ زیادہ ہے۔ ۱۹۰۴ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ کلام ارمغان خیال کے نام سے ۱۹۳۳ء میں طبع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

حشر کا دن بھی ہے طالب سامنا بھی یار کا　　دیکھئے دکھلائے کیا کیا ولولہ دیدار کا
کیوں نہ مجھ شوریدہ سر چھوڑ دیں ہوش و حواس　　کیا سپاہی ساتھ دیں بگڑے ہوئے سردار کا
دیدہ جاناں سے کیا چشمِ عیادت ہو مجھے　　حال پوچھے گا کوئی بیمار کیا بیمار کا
آسمان بے ستوں سے طرفہ قدرت ہے عیاں　　دیکھتے ہیں چھت پتا چلتا نہیں دیوار کا
ایک دل طالب وہ ہو کس کس مصیبت کا شریک　　درد کا غم کا بلا کا ہجر کے آزار کا
ابر چھایا ہے چمن پر ہے کرم باری کا　　ساقیا جلد پہنچ وقت ہے میخواری کا

تجھ کو یوسف نہیں کہتے میں تو باعث یہ ہے	حوصلہ تا نہ کرے کوئی خریداری کا
مدحتِ زلف میں دھیان آگیا عارض کا مجھے	خواب دیکھا ہے بھری نیند میں ہشیاری کا
اِن حسینوں کا بھی دِل آئے کسی پر طالب	پھل ملے ان کو بھی عاشق کی دل آزاری کا
فرقتِ یار میں کیا مدّنظر ہے دِل کو	آنکھ نے کیوں طرف گورِ غریباں دیکھا
دِل کو پیری میں محبّت کا تری جوش آیا	بیخودی شب کو رہی وقت سحر ہوش آیا
خانۂ چشم سے یوں اشک نکل کر آئے	جس طرح سیپ سے موتی کوئی باہر آئے
ہاتھ خالی ہی رہا دونوں جہاں میں اپنا	نہ لئے جاتے ہیں کچھ ساتھ نہ لے کر آئے
تب تو سیفی کے اثر کا ہو مرے دل کو یقین	اپنی آئی ہوئی جب غیر کے سر پہ آئے
جمگھٹا بادہ کشوں کا ہے یہاں اے واعظ	اس اکھاڑے میں کدھر آپ بھٹک کر آئے
صحن گلشن میں عنادل نے ہوا باندھی ہے	کِس طرح پھولوں کی بُو باغ کے باہر آئے
گُل ہے بلبل سے خفا گُل سے صبا بگڑی ہے	بعد مدّت کے گلستاں کی ہوا بگڑی ہے
نقش برآب ہے یہ نقش و نگارِ دُنیا	خانۂ دہر کی اوّل سے بنا بگڑی ہے
راہ بھولے مرے گھر کی تو گئے غیر کے گھر	ہائے کیسی مری تقدیر خدا بگڑی ہے
خون کرنا اسے منظور ہے خود طالب کا	اس لئے خنجر قاتل سے حنا بگڑی ہے

طالب

طالب :- سید شاہ طالب حسین۔ عرف شاہ درگاہی خلف رضا حسین۔ سیورو جو صوبہ بہار کی نواح میں ایک قصبہ ہے۔ وہاں اُنہوں نے اقامت اختیار کر لی تھی۔ علم رمل سے ماہر۔ ظرافت اور بذلہ سنجی میں فرد تھے۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ مگر طبیعت پر میل نہ آنے دیتے۔ نواب نصیر حسین خاں نے جو مختصر حالات بھیجے تھے وہ درج کئے گئے۔ کلام دستیاب نہ ہوسکا۔ صرف ایک شعر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ضعیفی میں ہوئے ہو کور طالب	تمہیں کیا کام ہے اب دلربا سے

طالب

طالب :- منشی شبیر محمد خاں دہلوی شاگرد عبدالرحمٰن خاں احسان۔ ۴۳ برس کی عمر

پائی۔ طبیعت میں شاعری کی استعداد تھی۔ سلاست زبان کا نمونہ یہ ہے۔

بہرِ عیادت آئیں تو اس وقت آئیں گے — جس وقت مجھ سے لب بھی ہلایا نہ جائیگا
انداز وہ بلا نگہِ پُر فسوں وُہ قہر — اس فتنہ گر سے دل کو بچایا نہ جائیگا
ہر مُوئے تن ہے شعلہ فشاں ہجرِ یار میں — اس آگ کو کسی سے بجھایا نہ جائے گا

طالب

طالب:۔ حافظ محمد حنیف تلمیذ حضرت داغ مرحوم۔ معمولی طبیعت اور اوسط فکر کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ دو شعر بطور نمونہ درج ہیں:۔

کیونکر دل عدو میں سمایا وہ حور وش — دوزخ میں کس طرح سے الٰہی حرم ہوا
وجہ سرور مژدہ وصل صنم ہوا۔ — کچھ دل کی آگ کم ہوئی کچھ درد کم ہوا

طالب

طالب:۔ مولوی محمد ریاض الدین شاگرد حضرت غالب مرحوم۔ ان کے تفصیلی حالات نہ معلوم ہو سکے۔ صرف دو شعر دستیاب ہوئے۔ جو درج ذیل ہیں۔

کیا اور وصف زاہد مے کش کا کیجئے — بد عہد اس قدر ہے کہ توبہ شکن ہوا
طالب پس فنا نہ ہوا کوئی پردہ پوش — میرا لباس عمر بھی آخر کفن ہوا

طالب:۔ حافظ الہ بخش تلمیذ حضرت رسا۔ کبھی صوفیانہ لباس پہن کر حال قال کی محفلوں میں نظر آتے۔ کبھی شاعری کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے۔ مدتوں عربی مدارس میں طالب علمی کی۔ ۱۹۰۸ء میں جب صاحبزادہ شبیر علی خاں دلّی میں اقامت گزیں تھے تو یہ بزرگوار بھی ان کی مصاحبت میں تھے۔ شکل وصورت کے علاوہ آواز بھی عجیب وغریب تھی۔ جب غزل پڑھتے تو ان کے ہاتھ صف مشاعرہ سے گز گز بھر باہر ہو جاتے۔ عرصہ دراز سے کچھ حال نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کیا شغل ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ظلم اچھا نہیں ہوتا ہے کسی پر دیکھو — اپنے طالب کو نہ تم آنکھ بدل کر دیکھو
دردِ فرقت سے کسی طرح نہ ہوگی صحت — اپنے بیمار کی تم آپ دوا کر دیکھو
وُہ دِن بھی یاد ہیں تو۔ اُٹھا تھا خود بٹھانے — محفل سے آج اپنی مجھکو اٹھا رہا ہے۔

تجھ کو بتاؤں کیا میں کیوں شکل آئینہ ہوں	یہ حسن تیرا مجھکو حیران بنا رہا ہے

طالب

طالب:۔ منشی طالب علی خاں قصبہ بھگانہ علاقہ ٹنما ریاست جے پور کے باشندے ہیں۔ اجمیر میں کئی سال تک پولیس میں ملازم رہے۔ اردو فارسی سے بخوبی واقف ہیں۔ علم معانی وعروض میں دخل رکھتے ہیں۔ حضرت قتیل بھرتپوری سے تلمذ ہے۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہوئے۔ کلام یہ ہے۔

پوچھو نہ کچھ حیات کا عرصہ ہے مختصر	میری شب فراق کا قصہ دراز ہے
قسمت رسا ہوئی تو کسی روز دیکھنا	وہ آستاں ہے اور جبین نیاز ہے
آنکھیں کریں گی پردہ دری یہ خبر نہ تھی	میں جانتا تھا عشق مرے دل کا راز ہے
دامن اٹھا کے چلتا ہے وہ بت مزار سے	اللہ میری خاک سے بھی احتراز ہے
جلتے ہیں اور جل نہیں چکتے فراق میں	ہم دل جلوں کے دل میں بھی کیا سوز وساز ہے
دل لیکے پوچھتے ہیں کہ دیتے ہو یا نہیں۔	یہ بھی ادا ہے غمزہ ہے عشوہ ہے ناز ہے
طالب تو نکلا ایک ہی رند خراب حال	ہم تو سمجھتے تھے کہ بڑا پاکباز ہے۔
خودی کھو دے جو انسان واقف اسرار ہو جائے	محیط عشق میں ڈوبے تو بیڑا پار ہو جائے
قیامت تک بھی اسکو جام صحت مل نہیں سکتا	جو ان بیمار آنکھوں کا کوئی بیمار ہو جائے
ترے عشاق کو ظل ہما سے سخت نفرت ہے	نصیب انکو تو تیرا سایۂ دیوار ہو جائے
کس کس کو اس نے پھونکا کیا کیا چمن اجاڑے	یہ عشق فی الحقیقت دنیا میں اک بلا ہے
طالب رہ طلب میں پھیلا نہ پاؤں اتنے	ان بیوفاؤں سے بھی ممکن کہیں وفا ہے
دل کا سودا ہے کہیں پھیر بدل ہوتا ہے	فائدہ ناصح ناداں مرے سمجھانے سے

طالب

طالب:۔ نواب میرزا سعید الدین احمد خاں معروف بہ نواب احمد سعید خاں دہلوی۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر درخشاں جاگیردار لوہارو کے خلف دوم وجانشین اور بزرگان سلف کی عمدہ یادگار تھے۔ علوم مشرقیہ میں درجہ کمال رکھتے۔ زبان انگریزی

میں بھی فی الجملہ مہارت حاصل تھی۔ ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت علی کرم اللہ وجہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے محمد بن حنیفہ کی اولاد سے ہیں۔ چنانچہ ایک مرثیہ کی ٹیپ میں فرماتے ہیں۔ ؎

المختصر کہ خادم شاہِ نجف ہیں ہم	مشکلکشا ہیں جنکے سلف وہ خلف ہیں ہم

خواجہ احمد بصریؒ اور شاہ ولایت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ آپ کے اجداد امجاد تھے۔ آپ کے نانا قدرت اللہ بیگ خاں فیروز کے والد قاسم جان معہ اپنے برادر خورد عالم جان اور عارف جان کے ہندوستان آئے۔ عارف جان نواب احمد بخش کے والد اِن کے حقیقی جدِّ بزرگوار تھے۔ نواب قاسم جان مرحوم نے شاہ عالم روشن اختر شاہ دہلی کی خدمت اختیار کی اور حسنِ خدمات کے صلے میں جاگیر اور نواب شرف الدولہ سہراب جنگ بہادر کا خطاب حاصل کیا۔ نواب احمد بخش خاں کو گورنمنٹ انگریزی، نے ادائے خدمات کے صلے میں نواب فخر الدولہ "رستم جنگ" کا خطاب اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست عطا فرمائی تھی۔

حسب رسم قدیم روسا آپ کی تعلیم و تربیت اپنے مکان پر ہوئی۔ بہت جلد فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۸۷۹ء میں سر رابرٹ ایجرٹن لفٹنٹ گورنر پنجاب نے آپ کو سرکاری ملازمت میں منتخب کیا۔ آٹھ دس سال تک اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے عہدے پر ممتاز رہے بعد وفات والد بزرگوار ملازمت ترک کر کے خانہ نشین ہوئے۔ اور محاصل ریاست لوہارو سے وظیفہ مقرر ہوا۔ اپ رؤسائے شہر میں نہایت عزّت و وقعت سے دیکھے جاتے تھے۔ ملازمت کے بعد میونسپل کمشنر بھی ہو گئے تھے۔ مہمان نوازی عالی حوصلگی اور خوش خلقی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ اطراف ہندوستان کی سیر و سیاحت سے تجربہ حاصل کیا تھا۔ اور تاریخ کی طرح علم جغرافیہ پر بھی عبور حاصل تھا۔

اوائل سن تمیز سے شعر گوئی کا شوق ہوا۔ شروع شروع میں چند غزلیں حضرت غالب

کی نظر کیمیا اثر سے گذریں۔ جب حضرت غالب کا انتقال ہوگیا تو اپنے برادر بزرگوار نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے اصلاح لینے لگے۔ پھر اپنے والد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی صلاح سے میر مہدی مجروح کو کلام دکھایا۔ بلیغ اور بلند شعر کہتے۔ سوقیانہ الفاظ اور عامیانہ مضامین سے ہمیشہ احتراز کرتے عاشقانہ شاعری میں نسایت اور بزدلی کے خیالات جو شامل ہوگئے ہیں۔ ان سے آپ بچتے رہے۔ رعایت لفظی اور بے محل استعاروں کی قید سے کلام آزاد ہے۔ شاعری جو ورثہ پدری ہیں ان کو ملی اس کو یوں بیان کرتے ہیں۔ ؎

حضرت نیر کا سکہ ہے جہاں میں چل رہا	ہے سخن کی مملکت طالب یہاں جاگیر میں

مرزا غالب اور ان کے تلامذہ سے نسبت تلمذ رکھنے کی وجہ سے آپ بھی ذرہ غبار اور برق اضطراب جیسی ترکیبوں کا استعمال کرتے ہیں۔ مگر آمد بیساختہ پن اور بے تکلفی میں فرق نہیں آنے پاتا۔ دیکھو اس شعر کا انداز بیان کتنا پر لطف ہے۔

یہاں تو وہی کی وہی سوجھتی ہے	زمانہ کو کیونکر نئی سوجھتی ہے۔

حسن محاورہ اور خوبی بندش ذوق زبان کے اعتبار سے یہ شعر قابل قدر ہے تخئیل کا انداز ملاحظہ فرمائیے ؎

تم آج شمع انجمن غیر کیا ہوئے	یاں بجھ گیا چراغ ہی بزم خیال کا

مصرعہ ثانی کی بلاغت پر سخن فہم حضرات غور فرمائیں۔ کہ بزم خیال کا چراغ کس طریقہ سے بجھایا ہے۔

مولانا شوکت میرٹھی نے جہاں تنقید کے پردے میں دنیا بھر پر اعتراض کئے ہیں۔ وہاں نواب صاحب مرحوم پر بھی عنایت فرمائی تھی۔ آپ کی جانبداری میں مولانا راسخ اور ان کے شاگردوں نے ایسے دھواں دھار مضامین نکالے کہ مولانا کا سفینۂ تجدید غرقاب ہونے کے قریب ہوگیا۔ وہ میرٹھ سے دلی تشریف لائے اور صلح کرکے ان مضامین کا

سلسلہ بند کرایا۔

مؤلف تذکرہ کے والد مرحوم اور نواب مغفور سے بچپن سے یارانہ تھا۔ اور اسی وجہ سے مؤلف پر بزرگانہ شفقت فرماتے اور درخواست پر اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے۔ اور غزل پڑھتے۔ علم دوست اور قدر دانِ کمال تھے۔ کئی قلمی دیوان مؤلف کے کتب خانہ سے لے کر نقل کرائے۔ اور ضروری حالات کا اضافہ وصحت کی۔ مؤلف کے ساتھ آپ کی بزرگانہ شفقت کی ایک ادنےٰ مثال وہ تقریظ ہے۔ جو اس تذکرہ کی جلد سوم میں درج ہے۔ آخر عمر میں نواب ضیاالدّین احمد خاں مرحوم کا فارسی دیوان بھی آپ نے طبع کرایا تھا۔ حضرت طالب کا مجموعۂ کلام ایک دیوان سے زاید تھا۔ افسوس ہے کہ اب اس کے شائع ہونے کی امید نہیں۔ زندہ دلی۔ حق پسندی اور نیک نیتی آپ کی طینت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ممتاز والیانِ ملک رامپور۔ جاورہ مالیر کوٹلہ سے برادرانہ اور دوستانہ تعلق تھے۔ ظرافت وبذلہ سنجی بات بات سے پیدا ہوتی۔ شعر خوانی کی طرز ایسی لاجواب تھی کہ ہر شعر پر حاضرین سے خراجِ تحسین وصول کرتی تھی۔ افسوس ہے کہ آپ کی ذات جو دہلی کی قدیم صحبتوں کی جھلملاتی ہوئی شمع تھی بیچارہ فنا نے یکم ستمبر ۱۹۲۵ء کو خاموش کر دیا۔ آخر عمر میں ورم پا کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ مگر اس پر بھی شگفتہ مزاجی میں فرق نہ آیا تھا۔ انتخاب کلام درج ذیل ہے۔

یاں طائرِ جاں سینکڑوں پھنستے ہیں خود آ کر
دلکش ہے عجب دام تری زلفِ دوتا کا

طالب مرے مرقد پہ نہ کیوں آ کے وہ روئے
کشتہ ہوں دمِ خنجرِ تسلیم و رضا کا

کسی نے اس سے یوں پوچھا کہ کس کے ساتھ جاتے ہو
تو بولے ہے جنازہ ایک بیچارے مسلماں کا

شور ہے عالم میں برپا نالہ و فریاد کا
بول بالا ہو رہا ہے کس ستم ایجاد کا

رہروانِ جادۂ الفت سے کہہ دو دوستو
وہ چلے اس راہ جو رکھتا ہو دل فولاد کا

تھا جو بسمل واقفِ آداب۔ وقتِ فسح بھی
دست دامن تک نہ آلودہ کیا جلاد کا

فصلِ گل میں رکھ دیا میرا قفس گلزار میں
کیا ستم آمیز احساں مجھ پہ ہے صیّاد کا

دیکھنا حدّتِ رگ و پے میں ہمارے عشق کی
آبِ نشتر ہو کے پانی بہہ گیا فصّاد کا

کیوں نہ ہو مستغرق بحرِ محبّت دم بخود
بھول جانا آپ کو ثمرہ ہے اس کی یاد کا

تند بادِ قہر نے کشتی کو توڑا پر یہاں
زمزمہ لب پر وہی ہے ہر چہ بادا باد کا

اُس سے ستم کی وجہ کوئی پوچھتا نہیں
پُرساں ہے اک زمانہ ہمارے ہی حال کا

طالب کی لو خبر کہ وہ بیمارِ ناتواں
دُنیا میں کوئی دم کے لئے میہماں ہے اب

تیر ترکش میں رہے ہیں چند ہی قاتل کے پاس
اور یاں فوجیں پڑی ہیں حسرتوں کی دل کے پاس

بوالہوس اور امتحاں میں جائے یوں پورا اُتر
میں نہ مانوں گا کیا ہے ممتحن نے مِل کے پاس

محتسب نے خوب پی پیرِ مغاں کے ہاتھ سے
راہ پر آیا جو پہنچا مرشدِ کامل کے پاس

خون بنکر سب غذائے سوزِ الفت ہو گئے
ایک بھی پیکاں نہیں ہے آپ کا اب دل کے پاس

دیکھنا مہلت نہ دینا اتنی ذوقِ انفعال
عرضِ حال اپنا کریں کچھ داورِ محشر سے ہم

ساقیا ہے بزمِ آخر دور بھی ہے آخرین
دیکھنا محروم رہ جائیں نہ اک ساغر سے ہم

اس کے در سے اُٹھے اُٹھائے ہوئے
ناتوانی ذرا سنبھال ہمیں

چپّہ چپّہ پہ جہاں شورِ قیامت دیکھو
اس کے کوچے میں چلا ہوں میری شامت دیکھو

الٹا جو رُخ سے بزم میں اس نے نقاب کو
شوخی نے کچھ بڑھا دیا لطفِ حجاب کو

میری شبِ فراق ملا داورِ جزا
کرنا اگر دو چند ہے روزِ حساب کو

اگر ہے سب کی نظروں سے نہاں تُو
تو کیوں ہے ذرّہ ذرّہ میں عیاں تُو

متاعِ صبر میں گھاٹا نہیں ہے
ضرر تُو نفع تُو سود و زیاں تُو

تری حمد و ثنا ہے حصر تجھ پر
نظامِ نطق تُو حسنِ بیاں تُو

مہ و خورشید میں سب تیرے جویا
نہیں معلوم رہتا ہے کہاں تُو

ترا جلوہ ہے ہر شے سے نمایاں
عیاں ہونے پہ اتنا ہے نہاں تُو

عدم کی راہ ہو مجھ پر بھی آساں
کہ واماندوں کا ہے منزل رساں تو

کھلے دیتی ہے طالب خوشنوائی
کہ ہے اِک بُلبل باغِ جناں تو

رہ گیا ارماں شہادت کا بھی باقی سر کے ساتھ
دل شہیدِ ناز کا ٹوٹا تیرے خنجر کے ساتھ

اپنے بیگانے ہوئے سب لطف ساقی دیکھکر
پھر گیا ہم سے زمانہ گردش ساغر کیساتھ

نیّر رخشاں کا سایہ سر پہ کافی ہے ترے
کیا تعلق تجھ کو طالب ہر سخن گستر کے ساتھ

بلبل کو ہزاروں میں اگر نوحہ گری دی
عشاق میں طالب کو بس آشفتہ سرِی دِی

کچھ بھید سے خالی نہیں ساقی کا اشارہ
ساغر کے جو ہمراہ صراحی بھی بھری دی

گرم آہ کا ممنون ہوں سرد آہ کا مشکور
ہونٹوں کو کیا خشک تو آنکھوں کو تری دی

ہوئی یہ دوستی عنقا کہ ہے عجب آتا
اگر کسی کو کوئی اپنا یار کہتا ہے۔

زباں پہ فخر ہے دلّی کی اب بھی طالبؔ کو
زمانہ گو اسے اُجڑا دیار کہتا ہے

مگر چل گیا وار تیر نگہ کا
خلش دل میں ہے اور پیکاں نہیں ہے

جئے اس کی امید پر ہم مسیحا
کوئی آپ کا ہم پہ احساں نہیں ہے

ترے ساتھ تھے دل میں ارمان سارے
نہیں جب سے تو کوئی ارماں نہیں ہے

لگا نیمچہ اور قاتل کہ طالبؔ
ابھی نیم بسمل ہے بے جاں نہیں ہے

یہ ادنےٰ سی واں شانِ صورت گری ہے
کہ مٹّی کے قالب میں ڈھالی پری ہے

مرے زخم پر اور چھڑکیں نمک وُہ
بڑی یہ بھی اِن کی کرم گستری ہے

نہیں اس میں گنجائشِ کینِ دشمن
وُہ دل جس میں تیری محبّت بھری ہے

مرِی جنس الفت ہے انمول منعم
یہ چاندی سے سونے سے سب سے کھری ہے

نہیں فکر کچھ ہم جو بیٹھے ہیں خالی
صراحی تو مے کی لبالب بھری ہے

دُوں نکلنے نہ تنِ زار سے جاں کو دمِ نزع
گر یقیں مجھکو یہ ہو جائے کہ تو آتا ہے

دِل جگر چاک ہوئے دشنۂ غم سے شاید
سانس کے ساتھ جو سینے سے لہو آتا ہے

یہاں تو وہی کی وہی سوجھتی ہے　　زمانہ کو کیونکر نئی سوجھتی ہے
بتانا یہ نکتہ نہ غیروں کو ہرگز　　کہ یاں رنج میں بھی خوشی سوجھتی ہے
قیامت کے وعدوں پہ تم جی رہے ہو　　تمہیں زاہد و دور کی سوجھتی ہے
یہاں حال پر ہے ہنسی اپنے آتی　　وہ سمجھے کہ اس کو خوشی سوجھتی ہے
ہیں دلفریب نقش و نگار جہاں ولے　　کیا اس کا اعتبار ہے جو مستعار ہے
فسانے چند باقی ہیں جہاں میں سوز الفت کے　　نہ اب فرہاد و شیریں ہے نہ اب مجنوں و لیلےٰ ہے
نفی ماسوا کر دی مرے حسن تصوّر نے　　کھنچا ہے جب یہ نقشہ تب کہیں اس بت کو کھینچا ہے

طالب　**طالب**:۔ منشی طالب حسین خاں بریلوی۔ تلمیذ حضرت قیصر پختہ گو شاعر ہیں۔ کلام یہ ہے

سینکڑوں مصرعۂ پیچیدہ چلے آتے ہیں　　وصفِ گیسو میں مجھے ہے ید طولیٰ کیسا
دم گلگشت دکھا کر قد بالا اپنا　　سرو گلشن کو کیا یار نے سیدھا کیسا
کہتا ہے آفتاب قیامت جسے جہاں　　اک داغ ہے جو سینے میں میرے نہاں ہے اب
اس درجہ ان کو میری طرف سے ہے بدظنی　　اوروں کے بھی قصور کا مجھ پر گمان ہے اب
طالب کہیں چھپائے سے چھپتا ہے رازِ عشق　　آتے ہیں خود بخود نظر اک مبتلا سے آپ
دخترِ رز کو دیکھ کر تقویٰ سلامت رہ سکے　　شیخ صاحب آپکے ہے یہ تو فرمانے کی بات
رہا پاس جفا ان کو رہا پاس وفا ہم کو　　بھی ان بن رہی انکے ہمارے درمیاں برسوں
اللہ ری سیاہی و طول شب فراق　　انداز سب وہی ہیں جو ہیں زلف یار میں

طالب　**طالب**:۔ محمد امانت حسین خان۔ ۱۸۸۴ء میں منصرم سرشتہ سروئری گورکھپور تھے کلام میں شوخی ہے۔ زیادہ کلام اور حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ دو شعر نذر ناظرین ہیں

دیکھیں یہ ہم نے دل کی لگاوٹ کی شوخیاں　　نفرت کریں جو ہم سے کرے ان کو پیار دل
طالب نثار حسرت دیدار ہو چکا　　رکھتے تھے اپنے پاس جو اک غمگسار دل

طالب　**طالب**:۔ محمد امام الدین چوپڑہ ضلع خاندیس تلمیذ حضرت شمشاد لکھنوی۔ کلام معمولی

ہے۔ شوکت الفاظ اور قدیم مضامین کی طرف طبیعت رجوع ہے۔

ازل سے میں ہوں عاشق حسن روئے شاہِ خوباں کا
سوئے حورِ جناں مائل مرا دل ہو نہیں سکتا

اگر ہر نکتہ پیرا سو زبانیں اپنی گھِس ڈالے
تمہارے خالِ رخ کا وصف اک تل ہو نہیں سکتا

طالب

طالب:۔ محمد عنایت اللہ خاں رامپوری۔ نہ بندشوں میں تراش خراش ہے۔ نہ مضامین میں جدّت معمولی شاعر ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

رواں ہر بگولے کے پیچھے ہے مجنوں
سمجھتا ہے لیلیٰ کا محمل یہی ہے

کروں دخترِ رز سے کیونکر نہ باتیں
مِرے مُنہ لگانے کے قابل یہی ہے

بنے گا وہ کوچہ بھی گنجِ شہیداں
اگر تیزیِ تیغِ قاتل یہی ہے

سمجھتی ہے ان کی ادا خوب طالب
اشاروں سے مرتا ہے جو دل یہی ہے

طالب

طالب:۔ مولوی محمد عسکری لکھنوی تلمیذ حضرت جلیس مرحوم۔ آپ نے جناب جلیس کے بعد پیارے صاحب رشید مرحوم سے بھی اصلاح لی ہے۔ طبیعت کو شعر سے مناسبت ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہے:۔

دیکھ کر اس کی طرف طالب مرا دم رک گیا
مسکرایا وہ مرے دل کا عجب عالم ہوا

اپنے محبوب سے جاتا ہے پہلے آخر
بات اتنی تو محبّت کی ہے پروانے میں

دل شکستہ ہوں نہ ٹوٹیں کہیں شیشے ساقی
میرا آنا نہیں اچھا ترے میخانے میں

حسن اور عشق کا طے ہو گیا قصّہ دمِ صبح
نہ ہے اب شمع نہ دم ہے کسی پروانے میں

حسرت و درد و غم و اندوہ مہماں ہو گئے
خیر کچھ دل کے بہل جانے سے ساماں ہو گئے

گلے عشّاق کے کٹتے ہیں آنکھوں کے اشارے سے
وہ خود مجرم نہیں لیکن نظر قاتل کی قاتل ہے

طالب

طالب:۔ پنڈت نند لال کشمیری ولد پنڈت ٹھاکر کول صاحب۔ آپ کے والد بزرگوار کشمیر کے رؤسائے جلیل القدر اور زمینداروں کے طبقہ کے معزّز فرد ہیں۔ جو سنسکرت زبان کے ماہر اور عالم ہیں۔

طالب ۱۸۹۹ء میں بمقام سری نگر (کشمیر) پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم کشمیر میں ہوئی۔ انگریزی۔ فارسی میں اعلیٰ سندیں حاصل کیں۔ ایم اے اور منشی فاضل کی ڈگریاں لیں۔ اردو میں ادیب فاضل کی سند حاصل کی۔ اس وقت آپ کشمیر گورنمنٹ کے ایس۔ پی کالج میں فارسی و اُردو کے پروفیسر ہیں۔

آپ کو لڑکپن سے شاعری کا شوق ہے۔ فنِ سخن گوئی میں راقم سے تلمّذ ہے۔ آپ دورِ جدید کے حالات سے واقف ہیں۔ اور دُنیائے ادب کے مشہور انشا پرداز اور شاعر ہیں۔ ملک کے رسائل و اخبارات میں آپ کے مضامین اور نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کا کلام رشحات التخیل کے نام سے نظامی پریس بدایوں سے بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب۔ بی۔ اے معتمد انجمن ترقی اُردو کی رائے ہے کہ "آپ نے وادی کشمیر میں رہ کر اُردو زبان پر ایسی قدرت حاصل کر لی ہے کہ بیان میں صفائی اور گداز ہے۔ جو آپ کی ذہانت اور فراست کی دلیل ہے"

مرتب تذکرہ ہذا نے ان کے دیوان کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "وادیٔ کشمیر میں رہ کر آپ ایسی صاف ستھری اردو لکھتے ہیں۔ طالب کے کلام میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وُہ ہر طرز میں اپنا رنگ جما لیتے ہیں۔ اپنے وقت میں وہ ضرور صاحب طرز مانے جائیں گے۔ احساسات قلبی کی تصویر کھینچنے میں کمال کا درجہ حاصل ہے۔ یہی حال حقائق نگاری کا ہے۔ مناظرِ قدرت کا نقشہ خوب کھینچتے ہیں"۔ کلام یہ ہے۔

عاشق نے دل دیا تو یہ کس کا قصور تھا
پی کر شراب حسن نشے میں وہ چور تھا

مجھ کو تو ناز عجز تھا قاتل کے سامنے
اس کو متاع حسن پہ فخر و غرور تھا

کیا کہیں تم سے کہ کیا سمجھے ہیں ہم رازِ حیات
آنے جانے کا اسے ایک بہانا جانا

قائل جنت و دوزخ نہ ہو کوئی تو نہ ہو
فکر عقبیٰ دل دانا کا تقاضا جانا

وا ہوئی خواب میں بھی چشم بصیرت جو کبھی
ہم نے دُنیا کو دو رنگی کا تماشا جانا

ہے پیٹ پالنا تو نکالو کوئی مشین
جگہ قبوں میں غمِ دلدار کو کیونکر نہ سینے میں
دلمیں ہیں افکار زیرِ خاک بھی
نہ غربی بن سکا ہاں شرقیت اپنی گنوا بیٹھا
زبانِ حال سے ظاہر ہے میری خانہ بربادی
وُہ عاشق ہوں کہ وحشت میں بھی یادِ یار باقی ہے
واہ وا آئی ہے کیا اب کی گلستاں میں بہار
ہر کوئی محوِ تماشائے جمالِ یار ہے
غنچۂ سربستہ کہنے کو ہے اپنا حالِ دل
جس کو رفیق سمجھے تھے نشتر سے کم نہیں
بچپن کا اِک رفیق تھا اب وُہ بھی چھُٹ گیا
دِل میں کھُب جاتا ہوں رستہ پا کے راہِ گوش کا
دم رگِ بسمل میں ہوں اور خنجرِ قاتل میں آب
یا تو طالب ہے جنوں یا عہدِ طفلی کا سماں
زخمِ جگر کی تشنگی اے ہمنشیں نہ پوچھ
ہے اضطراب شوقِ نقابِ رخِ امید
طولِ شبِ فراق کا چمکا ستارہ کیا
اصلاح اچھے اچھوں کو مل جاتی ہے یہاں
مِری فریاد کی ظالم خوشی سے داد دیتا ہے
بیں ہُوا طالب تو رسوائے زمانہ ہو گیا
یہ خمیازہ نہیں ضبط و حیا کا گر تو پھر کیا ہے

اب شعر و شاعری کا زمانہ نہیں رہا
جو گھر میں صدر کی جا ہو وہی مسکن ہے مہماں کا
موت بھی جینا ہمارا ہو گیا
تتبع سے بھلا ہندوستاں کے ہاتھ کیا آیا
ہوں لبریزِ فغاں حیرت میں گویا بے زباں ہو کر
خودی میں بےخبر اور بیخودی میں باخبر ہو کر
باغ میں جنگل میں کالج میں دبستاں میں بہار
ناچتی پھرتی صبا ہے اور گاتی ہے بہار
راز کلیوں کی چٹک سے کہہ سناتی ہے بہار
پہلو میں ایک خار ہے میرے بجائے دِل
دِل میرا آشنا ہے نہ میں آشنائے دِل۔
بنکے اِک مضمون کبھی اخبار کے کالم میں ہوں
شورِ بلبل۔ بوئے گل۔ اور قطرۂ شبنم میں ہوں
اِس دو رنگی کے اثر سے میں عجب عالم میں ہوں
ہر شورِ نالہ شورِ نمکداں سے کم نہیں
تارِ نگاہ پردۂ مژگاں سے کم نہیں
داغِ جگر بھی شمعِ شبستاں سے کم نہیں
بزمِ مشاعرہ بھی دبستاں سے کم نہیں
صدائے سوز ہے یا سازِ مضمر ہے مرثیوں میں
وہ ہُوا مطلوب تو بڑھ چڑھ گیا تو قبر میں
مِری میت پہ وُہ اب بن کے ماتم دار بیٹھے ہیں

ٹوٹ جائے میری پستی سے بلندی کا غرور
اس زمیں پر سایہ افگن آسماں کوئی نہ ہو

جلوہ حسنِ ازل تصویرِ حیرت کر مجھے
لب پہ حسن و عشق کی پھر داستاں کوئی نہ ہو

تاکہ میراں کا افسانہ نہ طشت از بام ہو
چھیڑ خانی سے انھیں آخر عداوت ہو گئی

کہو بلبل سے آکر سیکھ لے طرزِ فغاں کوئی
کہ آیا ہے عدم سے کہنہ مشق نوحہ خواں کوئی

لطف جفائے یار کا نقشہ نہ کھینچ سکا
کس کام کی ہماری یہ طبع لطیف ہے

دیکھا جو وقت نزع کہا دے رہے ہیں دم
طالب بہانہ ساز بھی ہے اور ظریف ہے

ایک تنکا تک نہ چھوڑا ہستی موہوم کا
اس چمن سے آشیاں ہم دوش پر لیکر گئے

سورج کی پہلی کرن

ہے جلوہ ریز سوئے زمین آسمان سے
شمع سپہر ارض جہاں گرد آفتاب
تصویر آب و تاب

ہے موج زر نگار شبِ ماہتاب میں
یا لطف خیز جزر و مدِ دورِ اضطراب
تفسیرِ انقلاب

یہ جام چرخ سے مے احمر چھلک گئی
یا جوہر بلور کا ہے حسنِ بے نظیر
ہم رنگ زمہریر

انگڑائی ہے نشے میں یہ مست شباب کی
یا محو رقص نغمہ ہے ارماں کی نفیر
مفہوم دلپذیر

ترچھی نگہ کسی کی ہے یہ ناز آفریں
یا اک تموج دل رنگیں کا انتشار
بے تاب و بیقرار

تصویر زندگی کی جھلک کی نمود ہے
یا جادۂ سکونِ محبت کا اقتدار
سو بار جلوہ بار

ہے شعلۂ ازل کا یہ اک رنگ سوز و ساز
یا حور نور عالمِ رقص و سرور میں

لرزاں چمک دمک ہے دُرِ تابدار کی	یا غرق تار کاہکشاں بحر نور میں نازاں غرور میں
نقش و نگار قدرتِ حق کا ظہور ہے	یا نور پاش تابش افشاں مہ جبیں ضو کے وفور میں
پیغام زیست مُردہ دلوں کا کہوں اسے	یا عشوہ تبسم محبوب نازنین خوش رنگ و دلنشیں اِک مظہر جبیں

طالب:۔ بابو منوہر لال کپور بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی خلف الصدق لالہ بالمکند صاحب کھتری پیدائش ۱۲ مئی ۱۹۰۰ء آباؤ اجداد پشاور سے آکر چکوال (پنجاب) میں مقیم ہوئے۔ طالب صاحب چکوال میں وکالت کرتے ہیں شعر و سخن کا اچھا مذاق ہے۔ اکثر رسائل میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے حُبِ وطن کے جذبات بھی کلام سے مترشح ہیں اچھی طبیعت پائی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

تماشا گاہ عالم کی حقیقت یہ سمجھتا ہوں	کہ اِک بے رنگ خاکہ ہے مرے خوابِ پریشاں کا
قیامت واسطے سرمایہ داروں کے بپا ہوگی	یہی ڈر ہے ٹھکانا ان غریبوں کا کہاں ہوگا
خدا کی سرزمیں تنگ آئیگی سرمایہ داروں پہ	زمیں کا ذرہ ذرہ انکے حق میں آسماں ہوگا
علامہ بن گیا کوئی مولانا بن گیا۔	کوئی ادب کی شمع کا پروانہ بن گیا
قادر کلام کوئی۔ کوئی قادر زبان	دو معتقد ملے جسے وہ کیا نہ بن گیا
مرنا مشکل ہے بہت مرنے سے جینا مشکل	یہ وہ بادہ ہے کہ پینے سے نہ پینا مشکل
جینے مرنے کا وہ دھندا ہے کہ طالب جس کو	کم نظر کہتا ہے آسان تو بینا مشکل
حسن کو پردوں میں بھی تھا بے نقابی کا جنوں	مغربی تہذیب نے پردے کی کردیں دھجیاں
وطن کے واسطے جو مر مٹے گا	رہے گا تا ابد زندہ جہاں میں

حیاتِ جاوداں مرتی ہے جس پر — اسے وہ موت ملتی ہے جہاں میں

زندگانی کا اعتبار نہیں — ہائے یہ نشہ پائیدار نہیں

رحمتوں کا نہیں ہے تیری حساب — غفلتوں کا مری شمار نہیں

ہم پہ تو کھلتا نہیں رازِ جہاں اس کے سوا — ہم اسیرِ آرزو ہیں یہ جہاں آرزو

جو تم آؤ تو آئے جان میں جان — کہ تم ہی راحتِ جانِ حزیں ہو

زباں پر مہرِ خاموشی گلے پر ہاتھ ظالم کا — رہینِ پنجۂ فولادِ استبداد ہوں میں بھی

توڑے ہیں آسمان کے تارے خیال نے — گلشن تصوّرات کا باغ و بہار ہے

اب ارادہ ہے کہ چھوڑیں شیوۂ تسلیم کو — دم زدن میں توڑ دیں حلقے کڑی زنجیر کے

خوگرِ آزار دردِ قوم ہو کر دیکھ لے — لذّتِ زخمِ جگر تیری دوا ہو جائے گی

رشک کھائیگی تری پستی پہ رفعت دیکھنا — تیری پستی جب حقیقت آشنا ہو جائے گی

شعلۂ حُبِّ وطن سے لے فروغِ زندگی — اور ہی کچھ تیری ہستی کی فضا ہو جائے گی

طالع

طالع:- میر شمس الدین ۱۱۷۵ھ سے قبل عالمِ شباب میں راہی ملکِ بقا ہوئے تذکرہ چمنستان شعرا سے یہ چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے

جفائے یار کو ہم التفاتِ یار کہتے ہیں — شفا و عافیت اپنی کو ہم آزار کہتے ہیں

زبس معمور ہے سینہ گلوں سے داغِ الفت کے — شگافِ دل کو اپنے ہم درِ گلزار کہتے ہیں

عرصہ میں ہے اے زاہد اس دور میں پیمانہ — مسجد کے تئیں جاویں کیوں چھوڑ کے میخانہ

آباد کر اے طالع تو چل کے بیاباں کو — مرنے سے تئیں مجنوں کے ویران ہے ویرانہ

نجا ناصح کی باتوں پر وہ تیرا درد کیا جانے — وہی کر تو ارے دل جس میں کچھ اپنا بھلا جانے

طاہر

طاہر:- میر طاہر علی رضوی فرخ آبادی تلمیذ منشی امداد حسین صغیر۔ ان کے بزرگ نیشاپور سے آئے اور نواب وزیر الملک کے زیرِ توسل قصبہ موہان میں آباد ہوئے ان کے خاندان کا اعزاز اور شرافت مسلّم ہے۔ میر طاہر ۱۸۴۰ء میں کانپور میں پیدا ہوئے

اگرچہ والد کا سایہ صغیر سنی ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے ابتدا سے شاعری کا شوق تھا۔ جو اچھے شعرا اور ادیبوں کے فیض صحبت سے پختہ ہو گیا۔ کلام کا رنگ متغزلانہ اور دلاویز ہے۔ کلام میں سوز اور اثر دونوں پائے جاتے ہیں۔ زبان کی گھلاوٹ۔ اسلوب کا سلجھاؤ اور روزمرہ کی برجستگی ان کے کلام کے خاص اوصاف ہیں۔ ایک دیوان طبع ہوا تھا جو اب نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ ایک اور دیوان ان سے یادگار ہے۔ کلکٹری کی پیشکاری سے پنشن پائی۔ ۲۰ جولائی ۱۹۱۱ء کو ۸۱ سال کی عمر میں انتقال۔ انتخاب اشعار یہ ہے:۔

یہاں انکار کرتے ہو ہمارے خونِ ناحق سے
قیامت میں بھی پیش داورِ محشر مکر جانا

ابھی تک کیوں رگڑتا ایڑیاں کیوں نیم جاں رہتا
مرے امکاں میں ہوتا اگر بے موت مر جانا

عدم کو جائینگے یا خاک ابھی چھانیں گے صحرا کی
تمہارے در سے اُٹھ کر دیکھئے ہو گا کدھر جانا

دل عشق سے خالی ہو تو بہتر نہیں ہوتا
پتھر ہے جس آئینہ میں جوہر نہیں ہوتا

کوئے حبیب میں نہ چشم رقیب میں
آخر کہیں پتہ بھی ہے میرے غبار کا

ابر رحمت کے لئے روز دعا کرتا ہوں
روز میخانے میں بچھتا ہے مصلےٰ میرا

اے پیرِ مغاں ہائے یہ بادل یہ ہوائیں
اور آج ہی خالی رہے پیمانہ ہمارا

دشمن نے مجھے کوچۂ جاناں سے نکالا
کانٹا تو نہ تھا میں کہ گلستاں سے نکالا

دوست منہ تکتے ہیں ناصح مجھے سمجھاتے ہیں
کوئی ہامی نہیں بھرتا کہ انہیں لائیں گے

غیروں سے اشاروں میں ہوا کرتی ہیں باتیں
یہ بات نئی سیکھی ہے آنکھوں نے دہن سے

جو میرے نالوں نے ناقوس کے اُڑائے ڈھنگ
کہا بتوں نے کہ منہ چاہئے فغاں کے لئے

دل افگاروں کے منہ پر چارہ گر گو یہ نہ کہتا تھا
جو ڈوبے اس طرح دل میں وہ پیکاں کم نکلتا ہے

مشکل عشق میں لازم ہے تحمّل طاہر
بات بگڑی ہوئی بنتی نہیں گھبرانے سے

دل سے دل کو راہ ہوتی ہے غلط ہے یہ مثل
ہم نے جس سے کی محبت اس کو نفرت ہو گئی

چوٹ کھائی ہے کچھ ایسی دل شیدائی نے
سانس کیساتھ کلیجے میں کسک ہوتی ہے

کیا جی لگا کے وعظ کی محفل میں بادہ خوار
تعریف سن رہے ہیں شراب طہور کی

اے برہمن دیر سے جاؤں کہاں
بندگی بیچارگی مشہور ہے

دل کی روداد کوئی کیا جانے
اس کو میں جانوں یا خدا جانے

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا
اسکو چھٹی نہ ملے جسکو سبق یاد رہے

چھیڑ ہم سے ستم ایجاد کئے جائیں گے
جبتک ہاں لینے کو فریاد کئے جائینگے

بزم دلدار میں سنتا ہوں یہ پروانے سے
کہ لگی دل کی بجھا کرتی ہے جل جانے سے

رند اٹھتے ہیں تو کہتی ہے قدم کی لغزش
ہوش میں آؤ کہاں جاتے ہو میخانے سے

سینہ ہے چاک دیکھ کے پیکاں نکال لو
حجت عبث کہ دل میں نہیں ہے جگر میں ہے

طاہر۔ حکیم شیخ محمد طاہر عرف ننھے صاحب تلمیذ حضرت عزیز لکھنوی۔ آپ رنگین فکر اور نازک خیال ہیں۔ زبان شیریں ہے۔ شعر میں برجستگی اور سادگی کی شان ہے۔ محاورات سے زبان میں خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو:۔

ایکدن بھی ذبح ہونے کی نہ نکلی آرزو۔
یوں تو کہنے کے لئے ہر بات پر خنجر اٹھا

دل کے ٹکڑے ساتھ چھینٹیں کفن پر خون کی
قبر سے کشتہ تمہارا یوں سر محشر اٹھا

چند آنسو بہہ گئے دو چار آہیں کھینچ لیں
جب کبھی فرقت میں زانو سے ہمارا سر اٹھا

غریب دلکے ہزاروں ہی ہو گئے ٹکڑے
کچھ اس طرح شب فرقت اسے فشار رہا

قوت ضبط محبت میں دکھاتے جاؤ۔
جس قدر صدمے اٹھیں تم سر اٹھاتے جاؤ

کھینچتے تو ہو مرے سینے سے تم اپنا تیر
زندگی کی کوئی تدبیر بتاتے جاؤ

خاک ہو کر یونہی اکسیر یہ ہو جائیگا
تم اسی طرح مرے دل کو جلاتے جاؤ

کلیجہ پھٹ گیا میرا کچھ ایسا درد اٹھا ہے
زباں پر اب کسی کا نام بے تابانہ آتا ہے

لحد میں رکھ کے ہم کو سب نے دل سے یوں بھلایا ہے
یگانہ کوئی آتا ہے نہ اب بیگانہ آتا ہے

مری وحشت کا اور دیوانگی کا پوچھنا ہی کیا
جب اس نے مسکرا کر کہدیا دیوانہ آتا ہے

طاہر۔ منشی خیراتی لال۔ مالک خیر خواہ اودھ۔ پختہ گو۔ خیال آفریں شاعر ہیں۔ بندش کی نفاست اور معنی کی خوبیوں سے ماہر ہیں۔ مگر کلام تعقید لفظی و معنوی سے پاک نہیں ہے نمونہ فکر یہ ہے ۔

اب تک وہاں غنچہ گلوں سے نہ وا ہوا
منقار بلبلوں کی کھلی بھی تو کیا ہوا

وصف دہاں یار میں طاہر نہ ہو خموش
گویا زباں منہ میں نہیں ہے تو کیا ہوا

کس کا یہ روئے کتابی یاد آیا بزم میں
چشم حیرت حلقہ زن ہے حلقۂ زنجیر پر

طاہر

طاہر۔ مولوی ابو طاہر صاحب رامپوری تلمیذ حضرت جلیل ان کا زیادہ حال دستیاب نہ ہوا۔ شاعر رنگین مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ طبیعت میں روانی ہے۔ بہت پُر لطف کلام ہوتا ہے۔ زبان کی صفائی کی طرف طبیعت زیادہ متوجہ ہے۔ شعر عاشقانہ رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو۔

کیا کہا یہ کہ تجھے دیکھ کے جی بھر آیا
جائیے جائیے بس بس مجھے باور آیا

میں بھی دنیا میں عجب بیخود و مضطر آیا
اب ہے یہ سوچ کہ کیا کام تھا کیونکر آیا

نگہ تیز پڑی غیر پہ اللہ اللہ
خیر ہے آج یہ غصہ تمہیں کس پر آیا

تم تو ایسے ہی ہو وعدے پہ ضرور آؤ گے
رہنے دو قسمیں نہ کھاؤ مجھے باور آیا

نیم جاں خوب تڑپنے کا مزہ لوٹیں گے
دست نازک میں اگر یار کے خنجر آیا

عشق کے رونے کچھ کچھ اثر ان پر بھی کیا
حال طاہر جو سنا سنتے ہی جی بھر آیا

طاہر

طاہر۔ میر محمد رضا لکھنوی شاگرد جناب فاخر لکھنوی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

بنا کے آئینہ کھوئی ہر اک کی یکتائی
رہیگا حشر تک الزام یہ سکندر پر

زمیں دبائے گی کیا اپنے بوجھ سے مجھ کو
رہا ہے بار فلک عمر بھر میرے سر پر

فسانہ رہگیا عالم میں باقی کہنے سننے کو
نہ مجنوں ہے جہاں میں اب نہ لیلےٰ ہے نہ محمل ہے

عدم کے جانیوالوں کی ہے کثرت ہر جگہ طاہر | نہ ہوگی حشر تک ویراں یہ وہ آباد منزل ہے

طاہر

طاہر:۔ میرزا طاہر بیگ صاحب ساکن مراد آباد تلمیذ حضرت افضل لکھنوی خوش فکر سخن سنج اور ظریف الطبع شاعر ہیں۔ اوائل عمر سے شعر و سخن کا شوق ہے۔ ہر قسم کے مضامین سادہ زبان میں نظم کرنے کی قدرت ہے سوسائٹی کی خرابیوں پر شاعرانہ انداز سے نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اکثر قصّوں اور واقعوں کو نظم کا جامہ پہناتے ہیں۔ اور ان میں نظیر اکبر آبادی کے طرز کا لحاظ رکھتے ہیں۔ جن کو عام حضرات نہایت شوق سے خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ تصانیف ذریعہ معاش ہیں۔ دیگر اصناف سخن کے علاوہ غزل بھی خوب کہتے ہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

قیامت ڈھا گیا مجھ پر ادا سے دیکھنا اُن کا
نظر ایسی لڑی دل ٹوٹ کر بے اختیار آیا

دل لیا ہٹ کر کے اور توڑا کھلونے کی طرح
کیا ترا عہد جوانی بھی لڑکپن ہو گیا

مجھ سے کب بیٹھا گیا پہلو سے جب دلبر اُٹھا
دردِ دل کیسا تھ میں بھی ہائے دل کہکر اُٹھا

یہ کہہ کے وہ قاصد کو بنا دیتے ہیں جھوٹا
زندہ کبھی مرنے کی خبر کہہ نہیں سکتا

کِس کو چھیڑیں کس پہ بگڑیں کسکو دیں اب گالیاں
میرے مرنے سے بتوں کا مشغلہ جاتا رہا

ہائے اِک کم سن کے ہاتھوں لٹ گیا عہد شباب
دل دکھا میری جوانی پر نہ چرخِ پیر کا

چننے تنکے پھر اور در رہا اک پاؤں میں چکّر
نہ بیٹھا چین سے دم بھر بُرا ہو دردِ ہجراں کا

دیکھتا ہوں جب کسی کے چلبلے پن کیطرف
شوق کہتا ہے بڑھادے ہاتھ گردن کیطرف

گھٹا بنکر برس پڑتی ہیں آنکھیں ہجرِ جاناں میں
کبھی ساون کی جھڑیاں ہیں کبھی بھادوں جھکے ہیں

کام کوشش سے اگر لیں تو بنے کام ضرور
فلسفہ کہتا ہے کیا دفترِ امکاں میں نہیں

جب کہا نوک پلک حسن میں کیا ہوتی ہے
ناز شوخی سے پکارا کہ ادا ہوتی ہے

خدا کو یاد کرنے آج کیوں بیٹھے ہو مسجد میں
نکالا کس لئے طاہر بتوں نے تم کو مندر سے

طاہر:۔ لالہ چندو لال ابن منشی رام پرشاد طاہر شاگرد مرزا صابر۔ گوالیار کے رہنے والے تھے طبیعت میں موزونی ہے مگر معمولی فکر و خیال کے شاعر معلوم ہوتے ہیں نمونہ کلام یہ ہے:۔

یہ کہتے شب غم بسر ہو گئی	سحر ہو گئی اب سحر ہو گئی
کہاں ہم کہاں وہ ملاقات ہو	یہ قسمت سے لے نامہ بر ہو گئی
تمام عمر رلایا ہے خاک میں مجھ کو	غضب ہے اس پہ جو دل میں ترے غبار رہے
کوئی نہ ہم سا ملے گا کہ اس ستم پر بھی	ہزار جان سے یوں آپ پر نثار رہے
مدام ان سے رکھو پاک الفت لے طاہر	کہ عمر بھر یونہیں اخلاص اور پیار رہے

طاہر:۔ پنڈت شنکر دیال۔ ساکن گورکھپور۔ حالات کچھ معلوم نہ ہو سکے مندرجہ ذیل اشعار سے شوخی طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

ہمارے دل میں یوں ارمان ہیں بند	کہ بو جس طرح رہتی ہے کلی میں
پری رویوں میں بھی ہے کتنی شوخی	اڑایا کرتے ہیں مجھ کو ہنسی میں
گھٹا جس دم اٹھی چپکے سے پی لی	بہت اچھی ہے عادت شیخ جی میں

طاہر:۔ سید جمیل احمد صاحب ساکن گلاوٹی ضلع بلند شہر۔ شاگرد حضرت اطہر ہاپوڑی ۱۳۰۳ھ میں ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے نانا حاجی میر احمد حسین برادر حقیقی حکیم سید محمد حسین صاحب متخلص بہ شفقت کے ہاتھوں تعلیم و تربیت پائی۔ کلام مجید ختم کرنے کے بعد عربی۔ فارسی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ۱۳۱۵ھ میں شعر و شاعری کی طرف رجحان ہوا۔ مولوی سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی کے شرف تلمذ سے فیض یاب ہوئے۔ آپ میرٹھ کے مشاعروں میں شریک رہے ہیں۔ حضرت بیان و یزدانی کا فیض صحبت اٹھا چکے ہیں۔ اور طاہر انھیں کا دیا ہوا تخلص ہے۔ ۱۹۰۳ء سے ریاست جودھ پور میں ملازم ہیں۔ شعر میں مضامین لطیف ہوتے ہیں۔ زبان بھی شستہ

اور سادہ ہے۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

ناتوانی نے در یار سے رکھا محروم
حوصلہ پست ہوا آج توانائی کا۔

زلف برہم کو وہاں آپ سنوارا کیجے
حال ابتر ہے یہاں آپ کے سودائی کا

آج دنیا سے گیا طاہر خستہ سن لو
آپ نے حال نہ پوچھا کبھی شیدائی کا

دیکھتے دیکھتے احباب اٹھے ہیں طاہر
ایک دن یونہیں ہمیں بھی ہے فنا ہو جانا

کسی کو دیکھ کے دل ہم زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے
سکھایا عشق نے یوں جان سے بیزار ہو جانا

مدت سے جسم پر سر شوریدہ تھا گراں
میں قتل ہو کے آج سبکسار ہو گیا

ہوتا ہے کون کس کا مصیبت کے دن شریک
لو دل بھی اب اسی کا طرفدار ہو گیا

ستم ایجاد نے کیسا نرالا ڈھب نکالا ہے
جفا کرنا جفا کے ساتھ پھر عذر جفا کرنا

شب وصل وہ روٹھ جانا کسی کا
وہ منت سے پھر دل منانا کسی کا

وہ رک رک کے فریاد کرنا ہمارا
وہ رہ رہ کے ہم کو جلانا کسی کا

نمک پاش تھا زخم دل پر ہمارے
دم ذبح وہ مسکرانا کسی کا

دے رہے ہیں اب تسلی عاشق بیتاب کو
ہاتھ رکھتے ہیں وہ دل پر دل کو تڑپانے کے بعد

ہے خیال حور جنت زندگی میں دلفریب
خاک میں مل جائینگے ہم خاک ہو جانے کے بعد

یہ کیسا ہے پھول اسمیں خوشبو نہیں ہے
وہ کہتے ہیں چٹکی سے دل کو مسل کر

طاہر میں مصر و ہند کو آزاد دیکھ لوں
اللہ سے دعا ہے یہی صبح و شام روز

میرا ماتم اور میرے سامنے
میرے آگے فاتحہ خوانی مری

اقرار وصل تھا کہ شکایت رقیب کی
کچھ کہتے کہتے ہم سے وہ خاموش ہو گئے

سر حرف جور تا نہ وہ بیرحم پھر ہوا
سرگرم آہ پھر لب خاموش ہو گئے

کہنا کسی کا ناز سے آکر یہ قبر پر
حوروں سے اب تو آپ ہم آغوش ہو گئے

پوچھتے پھرتے ہیں سب سے عاشق مضطر کا حال
مژدہ اے دل اب تو کچھ نالے رسا ہونے لگے

خرام ناز میں بھی تیرے اک عالم نکلتا ہے ۔ کوئی پامال ہوتا ہے کسی کا دم نکلتا ہے
یہ چپکے چپکے آہیں سرد بھرنا کس لئے طاہر ۔ بتاؤ تو یہ کس پردہ نشین پر دم نکلتا ہے
طاہر اسوقت میں توبہ کی بھی اچھی سوجھی ۔ یار پہلو میں ہے گھنگھور گھٹا کیسی ہے
کیسی کرم نما ہے طرز ستم بھی ان کی ۔ وہ شکوے کر رہے ہیں اغیار کے مجھے سے
مایوسیاں ہیں ان کی عبرت فزائے عالم ۔ بیٹھے ہیں ہاتھ دھو کر جو اپنی زندگی سے

طاہر

طاہر:- عیسو میاں صاحب۔ حسین میاں کے بیٹے ہیں۔ ریاست بڑودہ میں ملازم ہیں سیدھا سادہ شعر کہتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

سخت جانی نے مری جان بچائی ورنہ ۔ صدمۂ ہجر نے تو مار ہی ڈالا ہوتا
صدمۂ ہجر سے ہوتی نہ یہ حالت طاہر ۔ تم نے گر دل کو ذرا اپنے سنبھالا ہوتا
کچھ مجھے عذر نہیں چاہیں ابھی وہ لے لیں ۔ دل جگر ہے جو مرے پاس وہ مال ان کا ہے

طاہر

طاہر:- میرزا طاہر بخش ساکن محلہ شوالہ شہر بنارس۔ اردو فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ عربی سے بقدر ضرورت واقف ہیں۔ انگریزی میں انٹرنس تک تعلیم پائی ہے۔ چالیس سال سے کچھ اوپر عمر ہوگی۔ میرزا محمد فائز بنارسی کے ارشد تلامذہ سے ہیں مضمون آفرینی اور فصاحت ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ چند غزلیں روانہ کی تھیں ان کا انتخاب نذر ناظرین ہے

اک جام مے سے جم کا بڑا نام ہو گیا ۔ ظاہر ہے لفظ جم جو بڑھا جام ہو گیا
وارفتگان عشق کی ہستی شرار تھی ۔ آغاز ہی میں زیست کا انجام ہو گیا
شہیدان نگہ کا خوں بہا جنت سے آیا ہے ۔ چڑھانے کے لئے لائی ہیں حوریں پھول مدفن پہ
دل نالاں کے ٹکڑے ساتھ دود آہ کے نکلے ۔ ترنم خیز گویا بلبلیں ہیں شاخ سوسن پر
خریداری میں جنکی قیمت کونین ہے قاصر ۔ تماشا ہے وہ بکنے کو سر بازار بیٹھے ہیں
رخسار و خط سے شان نئی آشکار ہے ۔ گویا حلب تمام زمرد نگار ہے
اے چرخ دلبری کے درخشندہ آفتاب ۔ ہر ذرہ اپنی خاک کا تجھ پہ نثار ہے

خدا حافظ ہے اچھا جاؤ لیکن دیکھتے جاؤ | کسی ناشاد کا کن حسرتوں سے دم نکلتا ہے

عالم میں ہیں بہار کے ساماں نئے نئے | جلوے دکھا رہے ہیں گلستاں نئے نئے

عاشق کی حسرتوں کا نہ پوچھو حساب کچھ | دل میں ہیں وصلِ یار کے ارماں نئے نئے

دکھاتی ہے جلوے محبت کسی کی | نگاہوں میں پھرتی ہے صورت کسی کی

وہ آتے ہیں منہ پھیر کے قتل کرنے | گلے مل کے روئی ہے حسرت کسی کی

نظر کی تیغ میں طرفہ ادا نکلتی ہے | شہید ناز کے دل سے دعا نکلتی ہے

عجب نصیب ہے الفت کے دردمندوں کا | کہ ڈھونڈھتی ہوئی ان کو بلا نکلتی ہے

تصدق اس ادا کے پوچھتے ہیں مجھ سے وہ ہنس کر | کسی پر دل جو آجاتا ہے کیا معلوم ہوتا ہے

زمانہ دیکھ کر محو تماشا ہو ہی جاتا ہے | خدا جب حسن دیتا ہے تو شیدا ہو ہی جاتا ہے

قسم کھائی تمہارے سر کی اتنی کی خطا ہم نے | ملال اس کا نہ رکھو دل میں ایسا ہو ہی جاتا ہے

کوئی ناکام دل کے ضبط سے گو کام لیتا ہے | مگر اے جان اظہار تمنا ہو ہی جاتا ہے

کہا یہ شمع نے رو رو کے اہلِ محفل سے | بہت قریب سحر آئی بزم فانی کی

بگڑے ہیں دم سرد سے بیٹھے ہیں خفا سے | کچھ خبر ہے اب آپ تو اڑتے ہیں ہوا سے

طاہر

طاہر:- سید طاہر پیر حسینی چشتی قادری۔ آپ کرنول کے مشائخ میں ممتاز ہیں۔ آپ کے والد سید محبوب پیر دفتر مدار المہام بیگم بلی میں میر منشی تھے۔ علوم صوری و معنوی میں دستگاہ رکھتے ہیں۔ علوم قیافہ مسائل تصوف سے واقف ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں کرنول میں تعلیم پائی ہے۔ اس کے بعد کوبل کونٹلہ میں اپنے چچا سے تکمیل تعلیم کی۔ شاعری میں حضرت نیساں سے تلمذ ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

پھولوں کے رنگ میں ہے جلوہ نما الٰہی | غنچوں کی بو میں ہم نے دیکھا ہے نور تیرا

جہاں میں سمندر۔ سمندر سے قطرہ | وجود خدا یوں خدا ہو رہا ہے

کہاں سے لغزش دنیا میں وہ پھنسے طاہر | کہ جس کے پلّے پہ ربِّ غفور ہوتا ہے۔

طبیب

طبیب:- لالہ بابو لال تلمیذ صادق اکبر آبادی ۱۸۹۲ء میں بمقام آگرہ طالبعلمی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ابتدائی مشق کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

افشاں چنا کئے میں رہا انتظار میں
تارے ہی گنتے رات کٹی ہجر یار میں

بعد فنا بھی دل نہیں رہتا قرار میں
بجلی تڑپ رہی ہے ہمارے مزار میں

مٹی یہ آج اپنی ٹھکانے سے لگ گئی
لاشہ ہمارا دفن ہوا کوئے یار میں

طپاں

طپاں:- سید سلطان علی بریلوی۔ شاگرد حضرت خواہاں۔ مضمون آفریں اور خوش بیان ہیں۔ بندشوں میں صفائی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

نوح کا طوفان ہے اس چشم کے گریہ کا ذکر
برق عالم سوز ہے اس دل کے افسانے کی بات

آپ کو اے حضرت واعظ پڑی ہے خوب چاٹ
جبّہ و دستار سے ہے مے کے بیعانے کی بات

زخم جگر پہ مرہم کافور کی جگہ
لیتے ہیں عکس عارض رشک قمر سے ہم

مرمر کے ہاتھ آئی شب وصل کی گھڑی
کیونکر نہ چاہیں موت کو پہلے سحر سے ہم

تھمنے جو اپنے پاؤں تقاضائے عشق سے
کرتے طواف کوچۂ جاناں کا سر سے ہم

طپش

طپش:- منشی اوماں شنکر فرخ آبادی ولد منشی شیو پرشاد دیوان نواب صاحب فرخ آباد۔ آپ بھی اپنے والد کی طرح عرصے تک سرکار انگریزی کے ملازم رہے پیشکاری اور قانون گوئی کی خدمات انجام دینے کے بعد ریاست رامپور میں برسر ملازمت قیام رہا۔ آپ کا مذاق سخن تصوف کی جانب زیادہ مائل تھا۔ عاشقانہ پیرایہ میں حقیقت اور معرفت کے مضامین نظم کرتے۔ الفاظ کی متانت اور زبان کی صفائی قابل آفرین ہے کلام میں شروع سے آخر تک ایک رنگ ہے۔ علم عروض کے ماہر تھے حضرت طالب حسین مجیب کے شاگرد تھے۔ ہز ہائی نس والیٔ رامپور آپ کی باریک نظری اور معنی رسی سے نہایت خوش ہوتے اور قدردانی فرماتے۔ افسوس ہے کہ آپ اپنا دیوان مرتب نہ کرسکے اور تقریباً پچاس ساٹھ برس کی عمر پاکر ۱۹۰۸ء میں انتقال کیا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے

ہے غضب آئینۂ دل کا مکدّر ہونا
حوصلہ بندہ بھی رکھتا ہے خدا ہونے کا

اُٹھایا لطف کیا ہم نے دو روزہ زندگانی کا
سرشکِ خوں سے آنکھو نہیں تو دل بھی خوں گرفتہ ہے
کبھی چوٹی جو اس رشکِ قمر کی آئی ایڑی تک

خاکِ پا تیری جو آنکھوں میں لگائی ہم نے
دل کو آئی ہے خوشگوار بسنت
تیری رنگیں ادائیاں ہیں غضب

چشمِ رحمت مجھے دزدیدہ نظر سے دیکھے
اسے منظور ہے پردہ طلب ہے دید کی مجھکو
وُہی ہے رشتۂ الفت جسے زنّار کہتے ہیں
نورِ وحدت کی یہ خواہش ہوئی یکتا ہو کر
دیکھنا تھی اسے نیرنگیِ قدرت اپنی
پہلو میں ہے کبھی دلبر کی زلف میں

دو جہاں سے جب نکل جاتے ہیں ہم
کام کچھ آتا نہیں آب سرشک
ملگیا جب سے کسی کے دل سے دل
جب فنا ہوتے ہیں پاتے ہیں بقا
ہے ہوا سر میں در دلدار کی
خاک ہونا ہے ہماری آرزو
ہر جگہ قصّے ہیں حسن و عشق کے

چاہیئے اہلِ صفا صاحب جوہر ہونا
جوشِ قطرہ کا یہ کہنا ہے سمندر ہونا

اِدھر آیا اُدھر جاتا رہا عالم جوانی کا
وُہ ساغر ہے یہ شیشہ ہے شرابِ ارغوانی کا
زمیں پر ہو گیا عالم بلائے آسمانی کا

سرمۂ دیدۂ اربابِ نظر دیکھ لیا
ہو رہی ہے گلے کا ہار بسنت
تیری صورت پہ ہے نثار بسنت

چھپ کے بیٹھا ہوں گناہوں سے پشیماں ہو کر
نظر دونوں کی ہے دونوں طرف سے ایک چلمن پر
کہیں تسبیح زاہد میں کہیں دوش برہمن پر
کہیں ظاہر ہوں کہیں صورت زیبا ہو کر
جلوہ فرما ہوا گوکل میں کنھیا ہو کر
وہ ابتدائے دل ہے یہ ہے انتہائے دل

یار کے دل میں جگہ پاتے ہیں ہم
آتشِ دل سے جلے جاتے ہیں ہم
اپنی خاطر میں کسے لاتے ہیں ہم
جب بگڑ جاتے ہیں بن جاتے ہیں ہم
عرش پر دیکھو اُڑے جاتے ہیں ہم
پاؤں سے تیرے لپٹ جاتے ہیں ہم
وہ ہمارے ان کے کہلاتے ہیں ہم

شہیدوں پر بھی یہ اپنے کبھی سیدھی نہیں چلتی
غضب کی کج ادائی ہے تری شمشیر براں میں

ہمیشہ یاد ہے دلمیں کسی نورِ تجلے کی
چراغِ طور روشن رکھتے ہیں اپنے شبستاں میں

ہیں لطف زندگی کے شراب و کباب میں
توبہ بھی اِک عذاب ہے عہدِ شباب میں

پستی میں بلندی کی تاثیر نظر آئی
خورشید کی ذرّوں میں تنویر نظر آئی

خیال خام پہنچے کس طرح عشق حقیقی تک
یہ وہ سودا ہے جو سر دیکے بھی مشکل سے ملتا ہے

بہا دیتی ہے پھر بادِ مخالف بحرِ ہستی میں
میرا بیڑا جو بہہ بہہ کر لبِ ساحل سے ملتا ہے

زمانے میں دردآشنا دل یہی ہے
دکھا لو۔ دکھلانے کے قابل یہی ہے

دُلھن بنکے نکلی ہے شمشیرِ قاتل
گلے سے لگانے کے قابل یہی ہے

میرے سامنے غیر سے میٹھی باتیں
مِری جان کو زہرِ قاتل یہی ہے

آوازِ دردناک ہے دلکش صدا بھی ہے
اس بزم میں کہیں طپش بینوا بھی ہے

تم مانتے نہیں ہو تو آئینہ دیکھ لو
تم سا تمہارے آگے کوئی دوسرا بھی ہے

دو جہاں میں مجھے اندھیر نظر آئے گا
مُنہ چھپا مجھ سے نہ او چاند سی صورت والے

جن کو دنیا سے ہے مطلب نہ غرض عقبےٰ سے
وہی دارین میں ہیں عیش و فراغت والے

ہوگئیں منزلِ مقصود کی لاکھوں راہیں
پھیر میں پڑ گئے ہشمت و دولت والے

ناز دکھلاتی ہے وہ ابروئے خمدار مجھے
اپنے قبضے میں کریگی یہی تلوار مجھے

جب ازل میں ہوئی تقسیم بنامِ عاشق
باغ بلبل کو ملا کوچۂ دلدار مجھے

بلندی میں زیادہ کون قصرِ دل سے ملتا ہے
یہی پستی میں رہ کر عرش کی منزل سے ملتا ہے

کمال عشق میں پھر جستجو باقی نہیں رہتی
جو ہے معشوق خود وہ عاشق کامل سے ملتا ہے

طپش

طپش :- مرزا محمد اسماعیل عرف مرزا جان فرزند مرزا یوسف بیگ دہلوی یہ سید جلال بخاریؒ کی اولاد سے تھے۔ مولد خاص دہلی۔ مگر لکھنؤ میں مرزا جہاں دارشاہ بہادر کی سرکار میں عرصہ تک رہے بعد ازاں شہر ڈھاکہ میں رہ کر مدّت تک نواب شمس الدّولہ

بہادر کی رفاقت کی سنسکرت زبان سے بھی واقف تھے۔ خواجہ میر درد سے شرف تلمّذ حاصل تھا۔ شعر بہت پاکیزہ کہتے تھے۔ قطعات لکھنے میں خاصہ ملکہ تھا۔

صاحب سخن شعرا یعنی حضرت نسّاخ کا بیان ہے کہ ان کی غزلوں کے کچھ مسودے انہیں کے قلم سے لکھے ہوئے ملے جن میں ان کا تخلّص طاء مہملہ سے لکھا تھا۔ یہاں بھی تائے فوقانی سے نہیں لکھا گیا۔ کلام ملاحظہ ہو:—

خاک میں دل کو ملا کہتے ہو قیمت کیا دوں
چیز اگر لیتے ہیں تو پہلے چکا لیتے ہیں

کھٹکتا ہے جو کانٹا سا دل افگار پہلو میں
خدا دشمن کے دشمن کو نہ دے آزار پہلو میں

جبھی اے ہمنشیں کچھ بادہ نوشی کی ہے کیفیت
کہ ساغر ہاتھ میں ہو ساقی سرشار پہلو میں

قطعہ

بدخواہ نے کل ایک جواں سے یہ جا کہا
وارفتہ کچھ طپش فقط اک تم ہی پر نہیں

ملتا ہے ہر کسی سے ہر اک سے ہے اس کو راہ
وہ کونسا ہے دل کہ جہاں اس کا گھر نہیں

بولا کہ دیکھنے میں تو ایسا نہیں ہے وہ
باقی کسی کے دل کی کسی کو خبر نہیں

ہم غمزدوں کے دل میں ہوائے چمن کہاں
دل ہی نہ ہو تو خواہش سرو سمن کہاں

چرچے شبِ وصال کے یارب وہ کیا ہوئے
مینا کہاں وہ جام کہاں انجمن کہاں

ہاتھ سے میرے کس طرح اے غیر
دامن اس کا جدا کرے گا تو

فرض میں نے کیا کہ یوں بھی ہوا
کشش دل کو کیا کرے گا تو

کہتے تھے ہم طپش دل اس کو نہ دے
اور جو دے گا برا کرے گا تو

تو نے کہنے پہ کچھ عمل نہ کیا
ہم بھی اب دیکھیں کیا کرے گا تو

آزمایا ہم نے یاروں کو سدا ہر رنگ میں
کیا کوئی لیوے جہاں میں دوستی کے نام کو

گلفشانی کی توقع کیا کہ میری قبر پر
پھولوں کے دن بھی نہ لائے اس بت گلفام کو

طپش اب پیٹتا ہے دل کو اپنے
بہا اس جنس کی کے بوسے پر ہے

ہوئے ہیں خوبرو کتنے خریدار
کوئی دو بوسہ دیتے ہیں کوئی چار
سو یہ ہے عرض خدمت میں تمہارے
تو اب اس سے بھی کچھ بڑھیئے زیادہ
ہر طرف آج ہے بسنت کی دھوم
کتنے گلرو جو ہیں بسنتی پوش
کہتے ہیں مجھ سے آنکر ہنس ہنس
ہو مبارک تمہیں جنون طپش

شناسائی میں جن جن کو نظر ہے
دلے اس کا ارادہ بیشتر ہے
کہ ایسا آپ کو منظور گر ہے
یہ چرخ نیلگوں نیلام گھر ہے۔
سیر میں ہے ہر اک تماشائی
جی میں کھٹکے ہے جن کی رعنائی
دیکھ کر میری ناشکیبائی۔
پھر نئی رُت نئی بہار آئی۔

کس کیطرف سے آج طپش تجھ کو یاس ہے
سچ کہہ ہمارے سر کی قسم کیوں اُداس ہے
ہم خوش ہوئے سو راخونکے پڑنے سے جگر میں
اب نے کی طرح شوق سے فریاد کرینگے

طپش :- میر بدر علی اکبر آبادی شاگرد امیر خلف حضرت نظیر اکبر آبادی۔ محاربات ہند۔ اور خزینۃ القواعد ان سے یادگار ہیں۔ کلام جو فراہم ہو سکا۔ انتخاب یہ ہے :-

لاکھوں جی جاتے ہیں اور سینکڑوں جی جاتے ہیں
سیر کو جب وہ نکلتا ہے ستمگر باہر
یار نے سن کے مرے نالے تجاہل سے کہا
کوئی تو روتا ہے واللہ مقرر باہر
بے اثر ہوتی نہیں سنتے ہیں آہ عاشقاں
پھر یہ کیا ہے آہ کا اپنی اثر ہوتا نہیں
بعد مُردن قبر پہ آیا مری وہ شکر ہے
نخل الفت سچ کہا ہے بے ثمر ہوتا نہیں
زری ہے عفو کی عادت مری ہے عصیاں کی
کیا ہے کس لئے پھر مورد قصور مجھے۔
فراق و درد و الم غم ستم فغاں و طپش
یہ ساتوں گھیرے ہیں ہفتے سے بے قصور مجھے

طپش :- شیخ عبد الغفور ولد شیخ منیر الدین۔ آپ معززین اجمیر سے ہیں۔ قریب ۲۳ سال کے عمر ہے۔ فن سخن میں خواجہ محمد ایوب عیش سے تلمذ ہے۔ جوان طبع شاعر ہیں۔ صاف شعر کہتے ہیں۔ ابتدائی مشق کے کلام کا نمونہ یہ ہے :-

دل لگی ہی دل لگی میں دل گیا — دل لگانے کا نتیجہ مل گیا
کیا کہیں کس سے کہیں کس حال سے — تیرے کوچے سے ترا بسمل گیا
بلبلیں جو ہر طرف ہیں خندہ زن — کوئی گلشن میں نیا گل کھل گیا
پوچھتا ہے قیس یہ ہر ایک سے — کیا ادھر سے ناقۂ محمل گیا
تم طپش کا کچھ نہ کرنا رنج و غم — خاک ہو کر خاک ہی میں مل گیا
کیا سمجھتے تھے دل کو کیا نکلا — درد الفت میں مبتلا نکلا
اب بھروسہ وفا کا ہو کس پر — دل دیا جس کو بے وفا نکلا
نہ رہی تاب گفتگو مجھ میں — جب مرے سامنے وہ آ نکلا
لطف اس میں عجیب آتا ہے — درد بھی اس کا بامزا نکلا
قصۂ غم کہا کرے کوئی — نہ سنے وہ تو کیا کرے کوئی
کچھ کہو تو سہی بھلا کب تک — درد فرقت سہا کرے کوئی
مجھے صحرا میں لے چلا آخر — دل وحشی کا کیا کرے کوئی
زور چلتا نہیں ہے کچھ دل پہ — پھر بتاؤ کہ کیا کرے کوئی
روٹھ جاتے ہیں وہ طپش ہم سے — گرچہ جرم و خطا کرے کوئی

طرار:- منشی میر محمد رضوی خلف حاجی سید محمد غفور باشندہ مچھلی شہر (قریب جونپور) اپنے بھائی حضرت شہید کے شاگرد ہیں۔ اچھی طبیعت پائی ہے۔ زبان صاف کہتے ہیں۔ مضمون آفرینی کی طرف بھی توجہ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔ طرار

ہندوؤں کا ہے وہ معبد یہ مسلمانوں کا — مسجدوں سے نہیں کم مرتبہ بتخانوں کا
بے کسی بھی جو مرے ساتھ نہ ہوتی طرار — کون غربت میں مرا پوچھنے والا ہوتا
ملائیں آنکھ وہ غیروں سے بیقرار ہوں میں — ستم ہے تیر کسی پہ چلے شکار ہوں میں
وہ خاک کر کے مرے دل کو مجھ سے کہتے ہیں — کہاں ہے اس میں دکھاؤ تو آرزو میری

نمود عزت خوباں ہے یوں تذلیل عاشق سے
بلندی کی دکھانے والی جیس صورت سی پستی ہے
حماقت سے دماغ اسکو ہے اپنی زہد و طاعت پر
سرِ بے مغز زاہد میں مئے نخوت کی مستی ہے
خراب آباد دل میں گھر کیا ہے رنج و حسرت نے
یہ ویرانے کا ویرانہ ہے اور بستی کی بستی ہے

طرار

طرار ۔ منشی سید زوار حسین سابق مترجم اودھ اخبار لکھنؤ۔ چند انگریزی افسانوں کے مترجم ہیں۔ لکھنؤ سے ایک رسالہ گوہر شاہوار نامی نکالا تھا۔ جو اب بند ہے۔ مزیدار شعر کہتے ہیں۔ نمونہ کلام نذر ناظرین ہے۔

آنکھوں پہ کیا کھیلینگے دلوں پر یہ کھلتے ہیں
تلوار کے نہیں ہیں جو ہر زبان کے ہیں
غنچے ہزار کھل گئے اُن کے کھلے نہ لب
قائل سخن طراز صنم کے دہن کے ہیں
اب دیکھئے کسی کو نہ سیدھی نگاہ سے
معنی حضور آپ کے یہ بانکپن کے ہیں

طرار

طرار ۔ محمد مسیح اللہ شاگرد حضرت امیر مرحوم۔ رنگ قدیم کے مفتون تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے

نہ ہاتھ آیا نرا وحشی کسی کے موسم گل میں
جنوں نے پاؤں پڑ کر پاؤں میں زنجیر ڈالی ہے
ابھی ہے سادگی سے شوق عالم ہے لڑکپن کا
سُنا ہے کان میں اسکے نہ بُندا ہے نہ بالی ہے

طرب

طرب ۔ منشی دھومی لال مرحوم برادر زادہ راجہ کنول نین کایستھ۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد کے امرا میں تھے۔ شاہ نصیر مرحوم کے باارادت تلامذہ میں سے تھے۔ مشق سخن انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں ان کا توسن طبع خوب جولانیاں دکھاتا تھا۔ صاحب دیوان ریختہ تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

جو گرا آنکھوں سے پھر ہوتا نہیں ہے سر بلند
کس نے دیکھا ہے کہ اشک آنکھوں سے پھر گر کر اُٹھا

اِک بار کر وقتل کہ جھگڑا ہی چک جائے
ہر روز کا تو جور وستم اٹھ نہیں سکتا
ابر و مینا و مے و ساقی و مطرب ہے طرب
کیا مزا اتھا جو مرے پاس وہ دلبر ہوتا

ہزاروں بار آیا ابر گھر کر خوب سا برسا
اُگا سبزہ نہ ہرگز دل جلوں کے آہ مدفن پر
طرب نے دوستی میں ان سے تو نکی جو اُٹھا یا غم
نہ ہو یہ صدمۂ غم یا خدا دشمن کے دشمن پر

اس نے چہرے پہ دکھا زلفِ پریشاں ہم کو
کردیا ازسرِ نو بے سر و ساماں ہم کو

تو ہم بھی ہوئے جاتے ہیں روپوش جہاں سے
تم چہرہ کو پردے سے اگر وا نہیں کرتے

وصل اس صنم کا دیکھئے حاصل ہو کب طرب
اب کوئی فال دیکھ کے قرآن نکالئے

سخت جانی میں شہادت کے ہیں ارماں کتنے
عاشقوں کے ہیں ترے گنجِ شہیداں کتنے

عشوہ و غمزہ و زلف و نگہ و ابرو و ناز
آہ پیدا ہوئے اِک جاں کے خواہاں کتنے

طرب

طرب:- لالہ جھنّولال کایستھ لکھنوی۔ شاگرد رشید شیخ ناسخ عہد قدیم کے شعرا میں ممتاز تھے۔ سنگلاخ زمینیں بہت پسند تھیں۔ ان کا دیوان نایاب ہے۔ مؤلف تذکرہ کے کتب خانہ میں ایک قلمی نسخہ ملا جس میں سے مندرجہ ذیل اشعار ہدیہ ناظرین ہیں۔

اس قدر آنکھوں میں اپنی کھب گئی تصویرِ یار
اس کا خالِ رُخ ہماری آنکھ کا تل ہو گیا

پٹّی نہ کھولی آنکھ سے ہنگامِ ذبح بھی
ارمانِ دید کا دل بسمل میں رہ گیا

مزاج اب رحم پر آیا ہے شاید اے طرب اس کا
جو شب اس شمع رو نے خود بخود گلگیر کو توڑا

معطّر اس کے نہانے سے بس کہ آب ہوا
حباب بحر ہر اک شیشۂ گلاب ہوا

صاف طینت کو نہ کج طبع سے پہنچے آسیب
جسطرح کاٹے سے کٹتا نہیں شمشیر سے آب

تیر سی لگتی ہیں برسات میں بوندیں تن پر
اُس بغیر اب نہیں کم حق میں مرے تیر سے آب

عرق شرم میں غرق ہوا میں دمِ قید
کہ ٹپکنے لگا ہر حلقۂ زنجیر سے آب

سختیاں سی سختیاں کھینچی تھیں ہنگامِ بہار
کیوں نہ کانپ اُٹھے مرا دل سنتے ہی نامِ بہار

پھوڑ سر کو جیب کے ٹکڑے کر اور جنگل کو چل
اِن دِنوں میں مجھ کو یہ پہنچے ہیں احکامِ بہار

اب طرب رونا عبث ہے دل کو بیکل دیکھ کر
دل تجھے دینا تھا ناداں روزِ اوّل دیکھ کر

عالمِ دیوانگی میں اپنا سر ہے اور سنگ
ہے ہجومِ کودکاں اک شور و شر ہے اور سنگ

جب دیکھی اس نے تیری کلائی کی نازکی
مانی کو ساری بھول گئیں دستکاریاں

گر نہ اس سبزہ میں ہو ہمراہ یارِ سبزہ رنگ
سبزہ آنکھوں میں لگے جوں نیشتر برسات میں

خوف بارش ہوا نہیں رکھتے ہوں جو دیوار و در / مجھ بیاباں گرد کو ہو خاک ڈر برسات میں
جو ہوا ایذا بھی دست یار سے ہی موجب راحت / عجب کیا گر نمک پاشی سے اس کی کار مرہم ہو
بوقت نزع زباں بند جب ہوئی اپنی / تب اس نے پوچھا کہ کہہ کیا ہے آرزو دل کی
مژدہ اے چشم گہربار اب ہوا یہ گوش زد / بہر زینت یار کو سلک گہر درکار ہے
نقش حب کی عاشق صادق کو ہے کیا احتیاج / آہ میں بس اس کو تھوڑا سا اثر درکار ہے
ہر دم تڑپ رہا ہے بسمل نہیں تو کیا ہے / تیغ نگہ کا کشتہ یہ دل نہیں تو کیا ہے
اس کی طلب ہے جس کا ملنا نہیں ہے ممکن / ہم کو اگر خیال باطل نہیں تو کیا ہے
میں تو کچھ کہتا نہیں یہ کیجے وہ مت کیجئے / لیکن اتنی عرض ہے بندے کو رخصت کیجئے
اس کی غفلت اور بھی ہشیار کرتی ہے مجھے / واں فراموشی ہے جتنی اتنی ہی یاں یاد ہے۔

طرب

طرب: مولوی رحیم بخش حضرت شیخ نور محمد قادری تھانیسری کے نواسے تھے کتب فارسی مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھی تھیں۔ فن شعر میں عبدالکریم سوز سے تلمذ تھا۔ غدر کے بعد زندہ تھے اور طبابت کے ذریعہ بسر اوقات کرتے تھے۔ ڈیوڑھی صاحب محل میں ان کی طرف سے بزم مشاعرہ بھی ہوا کرتی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

مرغ دل مشتاق ہے تیری مژہ کے تیر کا / دل نہ توڑا چاہئے صیاد اس نخچیر کا
قتل تو کرتا ہے مجھ کو پر میں ہوں برگشتہ بخت / خوف یہ ہے پھر نہ جائے منہ تری تلوار کا
دو ہی دن میں کچھ سے کچھ احوال میرا ہو گیا / جو مجھے دیکھے ہے کہتا ہے تجھے کیا ہو گیا
آفت زدہ تھے اور بھی دنیا میں اے فلک / کیا خاک میں ہمیں کو ملانا ضرور تھا
اے طرب عشق سے پرہیز ہے لازم تجھ کو / جان جائے گی کسی بت پہ اگر دل آیا
ہیں ہاتھ میں سفاک کے یہ تیغ و سناں آج / دو چار کے سر جائیں گے دو چار کی جاں آج
آگے کو دل لگانے کی توبہ ہے اب طرب / پر اب کسی طرح مرے قابو میں آئے دل
ہوائے شوق سے اڑ کر چمن میں پہنچیں گے / نہیں سہی ہم اگر بال و پر نہیں رکھتے

طرب

طرب:- سید آل احمد نقوی سرسوی شاگرد محمد مصطفٰے خورشید لکھنوی۔ لطف زبان کے ساتھ مضمون آفرینی کی جھلک بھی موجود ہے۔ زبان شستہ طبیعت رنگین ہے صفائی بندش کہنہ مشقی کی دلیل ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

ممکن نہیں کہ حسن چھپائے سے چھپ سکے
پنہاں ہوا لاکھ پردۂ شرم و حجاب میں

سوز فراق یار کا ظاہر نشاں نہ ہو
جل جائیں شمع ساں جگر و دل دھواں نہ ہو

اس شرط پر رہا اسے صیاد نے کیا
بلبل کا شاخ گل پہ کبھی آشیاں نہ ہو

عیب کرنے کیلئے چاہیئے دانائی بھی
مجھکو تائب بھی جہاں کہتا ہے صہبائی بھی

قید صیاد سے دم بھر نہ رہائی پائی
کس نے دیکھا جو گلستاں میں بہار آئی بھی

خنجر براں کو کیا نسبت نظر کے تیر سے
تیغ ابرو ہے کہیں بڑھ کر تری شمشیر سے

ان بتوں کی بے دہانی اور ڈھٹائی ہے ستم
باتیں کرتے ہیں زبان خنجر و شمشیر سے

شب وصل ان کا کہنا منہ بنا کے
تجھے کیا مل گیا مجھکو ستا کے

ہمارا امتحاں تو لے چکا ہے
ذرا غیروں کو بھی دیکھ آزما کے

وہ دل سنبھال کر لحد غیر پر گئے
اسکے عوض میں ہائے ہمیں کیوں نہ مر گئے

وہ چہچہے وہ نغمۂ دلکش کدھر گئے
اے بلبلو بہار کے دن کیا گذر گئے

طرب

طرب:- شفقت علی بریلوی شاگرد حضرت حسن مرحوم ان کی طبیعت چلتی ہوئی ہے۔ کلام میں آمد۔ خیالات میں روانی ہے۔ نمونہ کلام سخن یہ ہے۔

تربت سے اٹھ کے جا نہ سکا کوئے یار تک
یہ ناتوانیوں کا اثر ہے غبار میں

اب آگئی ہے حضرت دل کی قضا ضرور
جاتے ہیں بار بار جو یہ کوئے یار میں

کس خوبرو کو دیکھ لیا کس پہ مٹ گئے
کیوں اے طرب تم آج نہیں اختیار میں

گل توڑ کے اس گل نے کہا ہنس کے چمن میں
کیا بلبل ناداں تجھے الفت تھی اسی سے

آغاز محبت ہی میں گھبرا گئے اب! ہے
کیوں حضرت دل نالہ و فریاد ابھی سے

طرز

طرز:۔ منشی گردھاری لال قوم کایستھ۔ شاہجہان آباد کے قدیم باشندے تھے قیام الدین قائم کے ممتاز شاگردوں میں گنے جاتے تھے۔ شاہ عالم ثانی کا زمانہ پایا تھا افسوس ہے کہ کلام میں صرف ایک رباعی دستیاب ہوئی ہے:۔

کھا زلف میں بل جو گوشوارہ ٹوٹا
دھڑکے ہے مرا جی کہ خدا خیر کرے
کیا جانئے کس کا دل بچارا ٹوٹا
اس رات میں بے طرح ستارا ٹوٹا

طرز

طرز:۔ احمد حسین دہلوی تلمیذ مرزا خدا بخش قیصر۔ آپ نے حضرت سالک سے بھی اصلاح لی تھی۔ طبیعت سوز و گداز سے آشنا تھی۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

دل کا تیرے ستانا چاہا نہ ہم نے ورنہ
نے گریہ بے اثر تھا نے نالہ نارسا تھا

پڑی ہیں حسرتیں خون گشتہ لاکھوں
مرے مدفن سے اسکی رہ گذر تک

اب کی مل جائے وہ تو کام نہیں
اگلی پچھلی شکایتوں سے ہمیں۔

طرز

طرز:۔ میر التفات حسین شاگرد سید مقصود عالم صاحب ساکن قصبہ پہانی ضلع ہردوئی۔ پُرلطف شعر کہتے تھے۔ ایک مخمس کے چند بند بطور نمونہ نذر ناظرین ہیں:۔

جھوٹے وعدوں کا کیا ٹھکانا ہے
آپ سچے ہیں ہم نے جانا ہے
بتّے بے فائدہ بتانا ہے۔
روز آنے کا اک بہانہ ہے
آئیے آئیے جو آنا ہے

آسماں سے ملی ہر اک کو گزند
قہر ہے زہر اور لطف ہے قند
کوئی پیدل کوئی سوار سمند
کوئی محتاج کوئی دولت مند
اس کی قدرت کا کارخانہ ہے

طغرا

طغرا:۔ مرزا محمد رضا لکھنوی تلمیذ مولوی مرزا محمد ہادی لکھنوی بالیاقت اور طبیعت دار شخص تھے۔ شعر صاف کہتے تھے۔ کلام ملاحظہ ہو۔

نہ پوچھ حالت بیمار شام ہجر نہ پوچھ
تمام رات فقط سانس کا شمار رہا

وُہ آئے تھے مری تربت پہ فاتحہ پڑھنے
خرامِ ناز سے محشر سرِ مزار رہا

شریک کوئی بُرے وقت کا نہیں طغرا
شبِ فراق میں دل بھی نہ غمگسار رہا

ہر اک آنسو میں جزر و مدّ بحرِ غم نمایاں ہے
یہ وہ قطرے ہیں جو بڑھ بڑھ کے طوفاں ہوتے جاتے ہیں

کرشمے جسقدر تھے چشمِ ماہِ مصر میں پنہاں
وہ اب تعبیرِ رویائے زلیخا ہوتے جاتے ہیں

سونے والے چونکتے ہیں سُن کے آہ
گو انہیں خوابِ جوانی کیوں نہ ہو

غیر ہاتھوں میں لگائیں جب حنا
پھر ہمارا خون پانی کیوں نہ ہو

واعظ کو دیکھ دیکھ کے رندانِ بادہ کش
کرنے لگے بلند صدا یا غفور کی

کن تیوروں سے دل کا نشاں پوچھتے ہیں آپ
پہچانتا ہوں میں بھی نگاہیں حضور کی

طغرا وہ ذکرِ حضرتِ واعظ کو ہے پسند
کچھ کیفیت ہو جس میں شرابِ طہور کی

طفیل

طفیل: شیخ طفیل احمد شاہ جہان پوری۔ کلام معمولی ہے۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

ناز وہ بار بار کرتے ہیں
جانتے ہیں کہ پیار کرتے ہیں

وعدہ کرتے ہو پھر نہیں آتے
روز ہم انتظار کرتے ہیں

مرغِ دل پھانستے ہیں گیسو میں
بیٹھے بیٹھے شکار کرتے ہیں

ضبط کرتے ہیں پر نہیں ہوتا
لاکھ جبر اختیار کرتے ہیں

آنکھ کیوں پھیری شہیدِ ناز سے
کر دو زندہ عیسوی اعجاز سے

انگلیاں کانوں میں دھر لیتی ہیں وُہ
اتنی نفرت ہے مری آواز سے

جب کبھی آتے ہیں مرقد پر مرے
چلتے ہیں دامن اُٹھا کر ناز سے

سر سے پہلے اس لئے کاٹی زباں
تا نہ واقف ہو کوئی اس راز سے

کون پہلو سے چرا کر لے گیا
میرے دل کو اک نگاہِ ناز سے

طلب:۔ نواب میرزا بہاؤالدین احمد خاں دہلوی۔ نواب شہاب الدین احمد خاں خلف اکبر نواب ضیاءالدین احمد خاں جاگیردار لہارو کے فرزند اور حضرت سائل دہلوی کے منجھلے بھائی تھے۔ فارسی اُردو کی تعلیم اپنے جدّ والا قدر کی نگرانی اور تربیت میں حاصل کی۔ خود بھی طبّاع اور ذہین تھے۔ اور طبیعت کو شعر سے لگاؤ تھا۔ ابتداء سے شاعری کا شوق تھا۔ شروع میں میرزا علی حسین خاں شاداں اور میرزا عبدالغنی ارشد گورگانی سے استفادہ کرتے رہے۔ محکمہ ٹھگی ڈکیتی میں انسپکٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ اوائل مشق میں باطل تخلص تھا۔ پھر طلب اختیار کیا۔ سادگی۔ سلاست۔ شستگی کے اعتبار سے کلام میں فصیح الملک میرزا داغ کا رنگ تھا۔ الفاظ کی چستی۔ بندش کی درستی کہنہ مشقی کا ثبوت ہے۔ مضمون آفرینی بھی طبیعت میں بہت تھی۔ زبان کی روانی میں اکثر متروک الفاظ استعمال کر جاتے۔ بعض موقعوں پر قواعد کا بھی زیادہ لحاظ نہ رہتا یا یہ کہئے کہ استبدادی متروکات کو نہیں مانتے تھے۔ باوجود بے پروائی کے پُرمزہ اور دلپسند کلام ہوتا۔ کتنا اچھا شعر کہا ہے ؎

تجھے خوش دیکھکر بلبل چمن میں	مجھے رونا پڑا یادِ وطن میں

اس شعر کا موضوع معمولی مفہوم سے گذر کر حقائق و معارف کی طرف بھی راجع ہے اور اگر اسے سیاسی نقطۂ خیال سے دیکھیں تو مہذب اور تعلیم یافتہ جماعت کے دل میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

مؤلف تذکرہ سے اور ان سے اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

بزمِ دشمن میں کھینچ ہی لایا	دل بے اختیار کیا کہنا
مرتے دم تک رہی مِرے دل میں	حسرت وصل یار کیا کہنا
دل بڑھاتا ہوں کہہ کے قاتل سے	اور بھی ایک وار کیا کہنا

جھوٹے وعدوں پہ آرہا ہے یقین
طرزِ گفتارِ یار کیا کہنا
ایک بوسے کی آرزو کی تھی
گالیاں دیں ہزار کیا کہنا
وعدۂ وصل پر کریں سودا
دل تمہیں دیں اُدھار کیا کہنا
بن کے بیہوش گر پڑا خُم پر
طلبؔ ہوشیار کیا کہنا

دل چھڑانے کے لئے کونسی تدبیر نہ کی
زلفِ پیچاں نے کسی پیچ کو چلنے نہ دیا

کہاں جاؤ گے آنکھوں میں سما کر
مرے دل میں رہو تم گھر بنا کر
وہی دزدیدہ نظریں تاکتی تھیں
وُہی دل لے گئے ہوں گے چُرا کے

کیا کیا تمہارے ہجر میں صدمہ گذر گیا
تم کو سناؤں گا جو ذرا دِل ٹھہر گیا

تجھے خوش دیکھ کر بلبل چمن میں
مجھے رونا پڑا یادِ وطن میں
سوالِ وصل پر ایسے ہیں خاموش
زباں گویا نہیں ان کے دہن میں
نہ الجھو راستی پر سرو سے تم
نہ فرق آئے تمہارے بانکپن میں

نکل جاتا ہے دم پر لطف اس کا دل میں رہتا ہے
عجب دلچسپ کیفیت ہے قاتل تیرے پیکاں میں
پری رویوں کی چاہت بھی نہیں آسیب سے خالی
خلل آیا ہے اکثر زاہدوں کے دین و ایماں میں
سنبھل کر ناتواں سے زور کیجو پنجۂ وحشت
کوئی تارِ نفس اُلجھا نہ ہو تارِ گریباں میں

لاغری دیکھئے کہ حاملِ نعش
شُبہ کرتے ہیں ہم کفن میں نہیں
تیغ ترچھی لگا نہ اے قاتل
ہم کو شک تیرے بانکپن میں نہیں
"کھل گیا جب سے گالیاں مجھے دیں
گفتگو اب تیرے دہن میں نہیں

بتاؤ تو کہاں سوغات میں بھجوائی جاتی ہیں
کہ اب تو روز تصویریں نئی کھنچوائی جاتی ہیں
لکھا تھا میں نے کچھ ایسا خفا تو ہو گئے لیکن
جواب خط میں تحریریں ابھی تک آئی جاتی ہیں
عدو سے مِل کے باطل وہ مکرتے ہیں شرارت سے
مرے سر کی ہزاروں جھوٹی قسمیں کھائی جاتی ہیں
یہ سینہ زوریاں لازم نہیں بزمِ رقیباں میں
ذرا منہ ڈال کر دیکھو تو تم اپنے گریباں میں

طواف در کا ان کے شوق بڑھتا جاتا ہی لیکن
مری توقیر گھٹتی جاتی ہے چشم نگہباں میں

دل لگائے نہ مے پئے واعظ
پھر فرشتہ بشر نہ ہو جائے

عشق نہ آئے نہ دیکھو آئینہ
تمہیں اپنی نظر نہ ہو جائے

لے تو جاتا ہے تو طلب کا خط
سر قلم نامہ بر نہ ہو جائے

ہم ہیں کہ مر رہے ہیں تمنّائے دید میں
پروانہ ہے تو شمع منوّر کے سامنے

محنت ہے رات دن کی اور افلاس کم نہیں
تدبیر رو رہی ہے مقدّر کے سامنے

مشکل ہے صرف عشق میں اک امتحانِ دل
تیغِ دو دم کے روبرو خنجر کے سامنے

عادت سوال مے کی کسی سے بری نہیں
کام آئے گی یہ ساقی کوثر کے سامنے

عشاق کی خطا نہیں اس تیرے حسن نے
ہنگامہ کر رکھا ہے ترے گھر کے سامنے

نکالے وحشت دل کے بہانے
بڑے چکّر دئے مجھکو قضا نے

غضب کھینچا تھا دل زلف دوتا نے
بچایا بال بال اب کے خدا نے

مرے دل اور جگر کو دیں دُعائیں
کہ ٹھیک اب ہو گئے انکے نشانے

بدل دے یوں نہ مانے کو الٰہی
کہ میں روٹھوں تو وُہ آئے منانے

سامنے تیرے آ کے دیکھیں تو
جن کو دعوے ہیں پارسائی کے

اک نظر میں تھا فیصلہ دِل کا
ہم تو قائل ہیں اس صفائی کے

آخر اس بزم سے ہم رشک کے مارے نکلے
ہائے ارماں وہاں غیر کے سارے نکلے

دیکھ کر کاہشوں میں عمر گنوانی مری
خوب روئی مری صورت پہ جوانی میری

ان کے پیکاں میں پہلو سے نکالوں کیوں کر
کتنے ہیں رہنے دے دلمیں یہ نشانی میری

ابھی دل میں حسرت بڑی رہ گئی
شب وصل آدھی گھڑی رہ گئی

قیامت نہ پہنچی تری چال کو
ندامت سے پیچھے پڑی رہ گئی

ادھر کیوں نہ دیکھا جو دل صاف تھا
نظر غیر سے کیوں لڑی رہ گئی ۔

طلب مر گیا عشق میں اے طبیب ۔۔ تری ساری بوٹی جڑی رہ گئی

دشمنِ جان و عزت و دولت ۔۔ اس زمانے کے آشنا نکلے
مجھے بلواؤ تم نہ آؤ اگر ۔۔ کسی صورت سے مدعا نکلے
عشق کی ابتدا ہے مر جانا ۔۔ حشر میں شائد انتہا نکلے

بنا بت کدہ اپنی اُمید گہ ۔۔ خداوند عالم تری شان ہے

عداوت عشق میں ہے اک جہاں سے ۔۔ عدو سے۔ پاسباں سے۔ آسماں سے
قیامت ہے زمین و آسماں پر ۔۔ تری رفتار سے میری فغاں سے
رہا دیوانگی میں ہوش اتنا ۔۔ کہ سر پھوڑا اسی کے آستاں سے
نہ ہم نے دعوی الفت کیا ترک ۔۔ نہ باز آئے کبھی وہ امتحاں سے
نہ چھوڑا جذب دل نے کوئی پیکاں ۔۔ وہ اب کھیلا کریں خالی کماں سے

نام تیرا حسن سے ہے میری شہرت عشق سے ۔۔ کوئی یوں مشہور ہے اور کوئی یوں مشہور ہے
روز کی وعدہ خلافی کی نہیں ہے کوئی حد ۔۔ صاف کہدو ایکدن جو کچھ تمہیں منظور ہے
محو ہوں ایسا جہاں بیٹھا ہوں گویا واں نہیں ۔۔ جو مرے نزدیک بیٹھا ہے وہ مجھ سے دور ہے

طلب

طلب:۔ منشی رام نرائن شاگرد اعظم حیدر آباد سندھ۔ دو شعر ان کے درج ذیل ہیں۔ آدمی طبیعت دار معلوم ہوتے ہیں:۔

جوشِ جنوں نے گھر میں نہ رہنے دیا مجھے ۔۔ تیرا خیال باعث ترک وطن ہوا
عشاق اُٹھ کھڑے ہوئے آنے سے اسکے آج ۔۔ دشمن ہی وجہ برہمی انجمن ہوا

طلیق

طلیق:۔ سید محمد جعفر حسین مدرس رونڈہ۔ ساکن قصبہ کنارکی۔ افسوس ہے کہ زیادہ حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ کلام جو مل سکا درج ذیل ہے۔

صبر اے دل نہ ہاتھ سے دینا ۔۔ آج وہ امتحان لیتے ہیں
اچھی صورت اگر کہیں دیکھی ۔۔ اپنی جان اسکو جان لیتے ہیں

چلے میکشو آج دورِ شراب | وہ دیکھو فلک پر گھٹا چھا گئی
تجھے دیکھ کر زاہدوں نے کہا | کوئی حور دنیا میں کیا آ گئی

دل سے یقین کر لیا دشمن کی بات کا | اس بھولے پن پر آپ کے قربان جائیے
ہم تو نکالے جائیں خدا کی یہ شان ہے | مقبول ہوں رقیب تیری بارگاہ کے
برقع اٹھا دے رخ سے جو وہ غیرتِ قمر | منہ پر اڑیں ہوائیاں خورشید و ماہ کے
خوبیِ تقدیر کی یہ بات ہے | ہم ہیں بیتابی ہے غم کی رات ہے
ہجر ہے تو وصل بھی ہوگا ضرور | اپنے اپنے وقت پر ہر بات ہے

طور

طور: میرزا محمد رضا خلف میرزا اعظم بیگ شاگرد الرشید فتح الدولہ میرزا محمد رضا برق لکھنوی۔ غزل خوانی میں کمال تھا۔ چنانچہ مشاعروں میں حضرت ناسخ کی غزلیں اکثر یہی پڑھا کرتے تھے۔ طبیعت بہت رسا تھی۔ آدمی ذی استعداد تھے۔ گو خاندان ناسخ کی طرح یہ بھی رعایت لفظی کے زیادہ پابند تھے۔ مگر شعر مزیدار کہتے تھے۔ لطف زبان کے ساتھ لطف مضمون بھی ان کے ہاں پایا جاتا ہے۔ شوخی اور متانت کا پہلو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور شعر میں بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے قواعد فن سے بخوبی واقف تھے۔ زور طبیعت کا یہ حال تھا کہ مشکل سے مشکل اور سنگلاخ سے سنگلاخ زمینوں کو پانی کر کے بہا دیتے۔ الفاظ پرستوں کی جماعت میں بالخصوص ان کے کلام نے بہت شہرت حاصل کی۔ دیکھئے کس قدر معنی خیز شعر کہا ہے

زورِ الفت نے تو اس کوچے تلک پہنچا دیا | اب مدد تیری مجھے اے ناتوانی چاہیے

زورِ عشق کی بدولت کوئے یار تک تو رسائی ہو گئی۔ اب ضعف اور ناتوانی کو یاد کر کے مدد مانگ رہے ہیں۔ کہ اٹھ نہ سکیں۔ اور وہیں کے ہو جائیں۔ مضمون کو کس قدر سب سے علیحدہ ہو کر لکھا ہے اور نشستِ الفاظ نے کیا تیور پیدا کر دئے ہیں۔

ایک سادہ شعر اور ملاحظہ ہو۔

عجب سرکار ہے اللہ کی اے طور میں صدقے
ہنرمندوں سے پوچھے جائینگے واں بے ہنر پہلے

دیکھئے بے کمالی کا اعتراف کس شان سے کیا ہے۔

حضرت طور اپنے زمانے کے مشہور اُستاد تھے۔ دیوان بھی ان کا طبع ہوکر شائع ہو چکا ہے۔ اب کچھ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

لب جاں بخش دکھلایا تو ہوتا
ذرا عیسیٰ کو شرمایا تو ہوتا

کفِ پا اپنا دکھلایا تو ہوتا
یدِ بیضا کو شرمایا تو ہوتا

صبح ہجر عاشق جاں باز ہے او بے وفا
کھولدے زلفیں سیہ روئے سحر ہو جائیگا

دل کو اس سنگدل کے موم کیا
نالۂ پُراثر کا کیا کہنا

میں چلا اے پاسباں ان کی تو کچھ تدبیر کر
پاؤں اُٹھنا کوئے جاناں سے بہت دشوار ہیں

بوسۂ رُخ لے لیا تھا خواب میں اکدن کہیں
اس خطا پر وہ نہ آئے ایک مُدت خواب میں

خاک کا پُتلا ہے اکدن خاک میں مل جائیگا
دیکھ کر صورت نہ خوش ہو بیخبر آئینہ میں

کیوں کر ہمارے دل میں تو اے سیم بر نہیں
آئینہ دیکھ لے تجھے باور اگر نہیں

ساتھ اکدن لپٹ کے سوئے تھے
عمر بھر تن سے اس کی بو نہ گئی

ہاتھ بھی جوڑے پاؤں پر بھی گرے
پیش کچھ اس کے روبرو نہ گئی

پھول نرگس کے میں خط میں اسکو رکھکر بھیجدوں
حسرت دیدار کی بھی کچھ نشانی چاہیے

زور اُلفت نے تو اس کوچے تلک پہنچادیا
اب مدد نیری مجھے اے ناتوانی چاہیے

اس طرف ہنس کے اگر چاند سا مکھڑا کرتے
داغ فرقت کو چراغ ید بیضا کرتے

خال لب پر نہیں ہے دلبر کے
ہندو بیٹھا ہے لب پہ کوثر کے

ناتوانی سے اُٹھ نہیں سکتے
بن گئے نقش پا ترے در کے

جاں دُونگا تمہارے سر کی قسم
سامنے سے اگر مرے سر کے

لے گئی خاک کوئے دلبر تک
ہم ہیں ممنون بادِ صرصر کے

مر کے جنّت میں بھی نہ جائینگے
رہنے والے ہیں کوئے دلبر کے

وہ ناتواں ہوں میں کہ پکاروں جو زور سے
طاقت سوا یقین ہے نہ کوئی جواب دے

اک رشکِ ماہِ مصر کو دیکھا ہے خواب میں
یوسف کہاں سے آئے جو تعبیر خواب دے

دل لگانا اجل کا آنا ہے۔
عشق اک موت کا بہانا ہے

کُھل گیا ہستی و عدم کا مآل
یہ قفس ہے وہ آشیانا ہے

طورؔ یاں اس لئے مقام کیا
کہ بہت دُور ہم کو جانا ہے

مَیں جی جاؤں اجل سے آپ جائیں اگر پہلے
یہ پیغام زبانی خط سے کہنا نامہ بر پہلے

قدم وہ محفلِ جاناں میں بیخوف و خطر رکھّے
ہتھیلی پر جو رکھ لے شمع کے مانند سر پہلے

شبِ وصلِ صنم مَیں نے دُعا یہ صبح تک مانگی
الٰہی آج نکلے مہرتاباں سے قمر پہلے

خواب اگر آتا ہمیں شاید وہ آتا خواب میں
حشر کو شاکی اُٹھینگے دیدۂ بیدار کے

طور

طورؔ۔ پروفیسر غلام محمد ایم اے ولد غلام محی الدّین سابق وزیر ریاست کشمیر آپ جولائی ۱۸۸۶ئ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے مورث اعلیٰ مولانا عبدالسلام کو شاہجہان کے عہد میں بارگاہ شاہی سے خدمات کے صلے میں کارداری کا عہدہ۔ مالی۔ دیوانی۔ فوجداری حاصل ہوئے۔ ضلع سیالکوٹ اور گورداسپور میں جاگیریں بھی تھیں۔ سکھوں کے عہد میں بھی آپ کا ستارہ اوج پر رہا۔ شیخ غلام رسول مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مصاحب اور شیخ امام بخش کاردار تھے۔

پروفیسر طورؔ نے ابتدائی تعلیم ایک ورنیکلر سکول میں پائی۔ ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سیالکوٹ کے مشن کالج میں تواریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ پھر علی گڑھ کالج میں تواریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر متعین کئے گئے۔ آپ انگریزی فارسی۔ اردو میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ اور مستند اہل قلم میں آپ کا شمار تھا۔ اخبار آبزرور۔ اخبار وطن۔ ہمدرد۔ کامریڈ کے صیغہ ادارت سے وقتاً فوقتاً تعلق

رہا۔ رسالہ مخزن بھی کچھ دنوں ان کے ہاتھوں میں رہا۔ آپ کی طبیعت کو شاعری سے مناسبت تھی۔ کشمیر کے نظّارہ کو آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کوہسارِ شملہ کی فضا کا لطف اُٹھا چکے تھے۔ اس لئے نظموں میں جہاں عشق و محبت۔ درد کی چاشنی ہے۔ وہاں قدرت کی رنگینی کی نقاشی بھی موجود ہے۔ شاعری کو عطیہ وہبی سمجھتے۔ استادی شاگردی کے قائل نہ تھے۔ افسوس کہ عمر تھوڑی پائی ورنہ شاید یہ خیال قایم نہ رہتا۔

۲۱ نومبر ۱۸۹۸ء کو ۳۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ غزلیات کم کہتے۔ نظمیں زیادہ لکھتے۔ کلام کا انتخاب نذرِ ناظرین ہے۔

جہانِ فانی کے ذرّہ ذرّہ میں ہے تغیّر کا رنگ پیدا
تو ایسے صحرا میں سخت مشکل ہے سیرِ فصلِ بہار کرنا

بہارِ باغ قیام گر دیکھنی ہو کچھ تجھ کو طورؔ محزون
تو دیکھ لے آ کے داغہائے الم کا دلمیں قرار کرنا

رہے گلشن میں ہم جب تک رہے گلشن کی جاں ہو کر
ہنسی گل کی چٹک غنچے کی بلبل کی فغاں ہو کر

یہ کیا رہنا ہے گر دل میں رہے راز نہاں ہو کر
رہو نور آنکھ میں سینے میں دل قالب میں جاں ہو کر

ازل میں جو شرارے اس رُخِ روشن کے چمکے تھے
وہی خورشیدِ خاور ہیں۔ وہی ماہِ منوّر ہیں

الٰہی کون سی بجلی نہاں ہے بیقراروں میں
کہ اہلِ آسماں شامل ہیں ان کے غمگساروں میں

وہ مستی جس پہ سو سو جان سے قربان ہشیاری
مثال اسکی نہیں ملتی جہاں کے بادہ خواروں میں

نہ بالائے زمیں دیکھوں نہ زیرِ آسماں دیکھوں
نگاہیں وہ عنایت کر فرازِ لامکاں دیکھوں

جلا دوں خرمنِ ہستی کو خاکستر بنا ڈالوں
اگر اس حسنِ عالم سوز کو طورؔ تپاں دیکھوں

یہ ہیں تصویرِ عزت کی وہ عبرت کے نمونے ہیں
ثریا پہ جو رہتے ہیں جو زیرِ خاک رہتے ہیں

اسیری وجہ کاہش زاہدِ خلوت نشیں کی ہے
جہاں گردانِ صحرا اس سے بالکل پاک رہتے ہیں

عدم کے رہنے والو جان لیکر تم تو بھاگے ہو
ہمارا حوصلہ دیکھو نہ افلاک رہتے ہیں

جدا ہونے کو مل کر بزم میں سب یار بیٹھے ہیں
ابھی آئے تھے جانے کو ابھی تیار بیٹھے ہیں

کھا نہ جائے کہیں ساقی! غمِ دنیا مجھ کو
وقت امداد ہے دے بادہ و مینا مجھ کو

چھپانا شاہد گل کو ہے گر چشم عنادل سے
بنا دے باغباں گلشن میں اک دیوار پھولوں کی

مژدہ اے دل آمد فصل بہاری ہے شتاب
پھر بیابانِ جنوں ہے اور وحشت کے مزے

بے نمک تھی طبیعت انسان
عشق کا دے دیا مزا تو نے

کوہ مشرق سے روشنی کے لئے
ایک چشمہ بہا دیا تو نے

نقش باطل دلوں سے محو ہوئے
نقش ایسا جما دیا تو نے

فاختہ کا پیغام

ویرانۂ دہلی میں جو گیا اک فاختہ مجھ سے یوں بولی
پیغام تجھے میں دیتی ہوں سُن اے غافل کو میری

یہ ویرانے جو دیکھتے ہو معمور تھے آبادی سے کبھی
یاں شہر بھی تھے باغات بھی تھے بستی تھی کنار جو میری

گو چرخِ کہن کی گردش سے روپوش ہوئی محفل اپنی
ہے آج کے دن پھر متجسّس یہ چشم نظارہ جو میری

تھا شور جہاں تکبیروں کا ہنگامے تھے جرّاروں کے
اب عالم ہو ہے چار طرف باقی ہے فقط کوکو میری

میں تیری طرح ہوں صحرائی مشغلہ ہے بادیہ پیمائی
خونابہ دل ہی کرتی ہے اس دشت میں آنکھ وضو میری

یہ درد آمیز صدا میری جنگل میں درائے قافلہ ہے
اے طور تو یاں ملت کو سنا فریاد حزیں ہر سو میری

شاعر کی محفل

چراغاں ہو رہا ہے ہر طرف گلزار عالم میں
ہے تاریکی مگر شاعر کی بزم رنج و ماتم میں

ٹپکتی ہے مسرت اہل عالم کی نگاہوں سے
ہجوم اشک خوں افگن ہے اسکی چشم پرنم میں

جہاں والوں کی جاں میں جان آئی دید یاراں سے
مگر وہ جان دیتا ہے کسی کے ہجر کے غم میں

نظارے کر رہے ہیں اہل عالم نازنینوں کے
وہ نظّارات بالا کر رہا ہے فکر پیہم میں

وہ ہے موجود عالم میں مگر مفقود گمراہی
وہ پوشیدہ بھی ہے عالم سے ظاہر بھی ہے عالم میں

مگر سننا خدارا طور کی آواز آتی ہے۔
کسی سے ہے مگر گویا وہ تنہائی کے عالم میں

یادِ رفتگاں

یاس و حسرت کیوں اُمنڈ آئے ہیں مجھ ناشاد پر
ہو رہی ہے کس لئے اقلیمِ دل زیر و زبر

کیوں ڈبونے کو مجھے ہے موجِ بحرِ اضطراب
کیوں بہا جاتا ہوں اس دریا میں جوں طفلِ حباب

کیوں تلاطم میں ہے اے دریائے چشمِ خونفشاں
تیرے ہر قطرے میں ہے سامانِ بحرِ بیکراں

میں ترا ممنوں ہوں اے احسانِ یادِ رفتگاں
شوق سے آ اور لے پہلو میں میرے چٹکیاں

میری قسمت میں ازل سے ہی لکھا سوز و گداز
میرے سینے میں خدا تے ہے بھرا سوز و گداز

برقِ خرمن نورِ حسنِ اولیں کی مجھ میں ہے
آتشِ عشق اک بتِ پردہ نشیں کی مجھ میں ہے

درد کہتے ہیں جسے ہیں اس کی اک تصویر ہوں
درد کی یعنی بنا ہوں درد کی تعمیر ہوں

تیری منزل میرے دل سے بڑھ کے ہو سکتی ہے کیا
اس سے بڑھکر کون سا ہوگا مقامِ آرام کا

ہماری زبان

کشمیر سے دکن تک برہما سے تا بہ کابل
یک جاں ہمیں کریگی اُردو زباں ہماری

اس کے بغیر جینا ممکن نہیں ہے اپنا
معلوم کیا کسی کو دشواریاں ہماری

اس کو بچائینگے ہم جب تک کہ دم میں دم ہے
ہم میزباں ہیں اس کے یہ میہماں ہماری

عالم میں یک زبانی سے بن رہی ہیں قومیں
ہے محوِ صد زبانی بستی یہاں ہماری

شمعِ اخیرِ شب ہیں ہم محفلِ جہاں میں
باقی رہیگی کب تک پھر داستاں ہماری

ناواقفِ تپش کو معلوم کیا بھلا ہو
یہ ٹھنڈی گرمیاں ہیں طورؔ نہاں ہماری

طوفان

طوفان:- جناب مولوی عبدالجلیل۔ ڈپٹی کلکٹر ضلع فتح گڑھ۔ بہت صاف شعر کہتے ہیں زبان اچھی ہے۔ تلمذ کا حال نہ معلوم ہو سکا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

ہیں سینکڑوں حجاب ہمارے نصیب سے
موسیٰ نے خوب دیکھ لیا تھا قریب سے

جوشِ جنوں نے پھر مجھے بے خود بنا دیا
پھر کہہ رہا ہوں دل کی تمنا رقیب سے

جوبن چمن کا جس کی بدولت نکھر گیا
وہ گل کھلے ہیں خونِ دلِ عندلیب سے

پردہ نشیں کے درد نہاں کو جتا دیں کیا	کہنے کا ہو مرض تو کہیں ہم طبیب سے

طپش

طپش:۔ محمد یوسف حسن مارہروری۔ شاگرد حضرت داغ مرحوم۔ ابتدائی عمر سے شعر کہتے ہیں۔ پہلے عزیز تخلص تھا۔ اب طپش ہے ریاست رامپور کے درباری شعرا میں رہ چکے ہیں۔ زندہ دل ظریف آدمی ہیں۔ محاورات روزمرّہ کی طرف زیادہ توجہ فرماتے ہیں۔ شعر مزیدار دلنشین کہتے ہیں۔ اپنے اُستاد کے رنگ کو خوب پہچانتے ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

جان بھی لیتی ہے عاشق کی تو کس پیار کیسا تھ	شمع آغوش میں لے لیتی ہے پروانے کو

آپ کو اساتذۂ فارس و ہندوستان کے اشعار کثرت سے یاد ہیں۔ لطائف و ظرائف کا دریا آپ کے سینے میں بھرا ہُوا ہے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

دل سے تم۔ تم سے دل سوا نازک	سب سے نازک معاملہ دل کا
بدگماں خاک سے بھی میری ہے بدظن کیسا	وُہ چلا دیکھو بچائے ہوئے دامن کیسا
تو سہی ضبط میں انداز فغاں کے نکلیں	آپ شیون کو لئے پھرتے ہیں شیون کیسا
کل تو میں پھرتا تھا گلشن میں بتا لے صیّاد	آج پھرتا ہے میری آنکھ میں گلشن کیسا
جانا بھی قیامت ہُوا اس غنچۂ دہن کا	بو ہو کے اڑا جاتا ہے سب رنگ چمن کا
یہ جان لیا اس پہ کوئی حادثہ گذرا	قاصد کو ہوئی دیر تو ماتھا مرا ٹھنکا
وہ تیر بھی پیاسے ہیں وہ تلوار بھی پیاسی	کس کام پھر آئے گا لہو میرے بدن کا
خوش اسکو وصل میں بھی تو پاتا نہیں ہوں میں	دل کا معاملہ ابھی سمجھا نہیں ہوں میں
غم میرے دل میں یاد عدو تیرے دل میں ہے	تنہا نہیں ہے تو کبھی تنہا نہیں ہوں میں
وحشت میں کون جانب صحرا نکل گیا	صحرا پکارتا ہے کہ صحرا نہیں ہوں میں
شرمندہ کیوں نہ اپنے گناہوں سے میں رہوں	یہ بھی نہ ہو تو پھر ترا بندہ نہیں ہوں میں
خدا جانے غضب ڈھائینگی وہ مایوسیاں کیا کیا	جو امّیدوں سے پہلے آئی ہیں امیدواروں میں

ہم بھی پوچھتے پھرتے ہیں زمانے بھر سے	جن کی تقدیر بگڑ جاتی ہے کیا کرتے ہیں
سچ ہیں میکدے سے ہو بیں مچی ہیں بادہ خوار نہیں	شکستِ توبہ کی تقریب ہے پرہیزگار و نہیں
بن گئے دردِ محبت مرے تڑپانے کو	دل میں آئے بھی تو آے مرے تڑپانے کو
جان بھی لیتی ہے عاشق کی تو کس پیار کیساتھ	شمع آغوش میں لے لیتی ہے پروانے کو
ہر چٹکی میں بھی یہ کہ کوئی رہ جانا ہے	آپ کیا کیا نہیں کرتے مرے تڑپانے کو
مے کی تعظیم بھی کرتا ہوں دم بادہ کشی	پہلے آنکھوں سے لگا لیتا ہوں پیمانے کو
یہی اک لاش پڑی ہوگی تمہارے آگے	کہہ تو دیکھو کسی جانباز سے مر جانے کو
ساقیا ہم کو تکلف کی ضرورت کیا ہے	گھر سمجھتے ہیں ہم اپنا ترے میخانے کو
نہ شب وصل رہیگی نہ یہ سامان نشاط	سب یہ آرام کے پہلو ہیں بدل جانے کو
خوش بہت لختِ جگر سے ہوئے طفلانِ سرشک	لال پائے تھے انہیں لڑکوں کے بہلانے کو
ہم امتحان ترا کر چکے ہیں خوب اے موت	پڑے جو وقت کسی پر کبھی نہ تو آئے
سحر ہوئی کہ خرابات گونج اُٹھے اک بار	پکارتے ہوئے میکش سبو سبو آئے

ظ

ظالم **ظالم:** ظالم سنگھ برہمن۔ بیگم سمرو کی سرکار میں متصدی تھے۔ جب بیگم صاحبہ موصوفہ نے وفات پائی اور ان کا پرگنہ سرکار میں ضبط ہوا تو آپ خانہ نشین ہو گئے۔ اور بیکاری سے پریشان رہتے۔ آدمی پڑھے لکھے تھے تعلیم اطفال کو معاش کی سبیل قرار دیا اور غریبانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ دو شعر جو دستیاب ہوئے ہیں۔ درج کئے جاتے ہیں۔

دن تو رو پیٹ کر کٹے لیکن	ہجر کی رات کیا پہاڑ آئی
ہم نے گلچیں ہا پنیہ گرچہ باغ عشق سے	مفلسی کا داغ سوزاں تر ہے داغِ عشق سے

ظامی **ظامی:** حکیم محمد عبدالرحیم۔ ساکن بھڑوچ۔ ان کے حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ صرف دو شعر

ہاتھ آئے ہیں۔ جن سے سادہ گوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔

لکھا صنم کو کہ مدت سے خط نہیں آیا	جواب ہم کو دیا فرصت جواب نہیں
اوائیں۔ ناز میں۔ انداز میں ہو تم یکتا	حسیں ہو ایسے جہاں میں کہیں جواب نہیں

ظاہر ظاہر۔ منشی رام پرشاد کھتری دہلوی۔ تلمیذ مرزا رحیم الدین ایجاد۔ ان کے آباؤ اجداد ملازم سرکار شاہی رہے۔ خود ۱۸۵۵ء میں اہلمد مقرر ہوئے۔ پھر دہلی کے محکمہ کلکٹری میں عرصہ تک سررشتہ دار اور ناظر رہے۔ ۱۸۶۴ء کے آخر میں گوالیار گئے اور بعد حصول سند وکالت ۱۸۹۹ء تک وکالت کرتے رہے۔ ۹ نومبر ۱۸۹۹ء کو مہاراجہ سندھیا والی گوالیار کی قدردانی سے ضلع گرد گوالیار میں مجسٹریٹی کے عہدے پر ممتاز ہوئے۔ میرزا قادر بخش صابر سے بھی مشورہ سخن کرتے تھے۔ اور ان کے برگزیدہ ترین تلامذہ میں ان کا شمار تھا۔ صاحب دیوان ریختہ اور فن تاریخ گوئی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ "کان تاریخ" ان کی تالیف سے ہے۔ کلام میں آمد زیادہ ہے۔ لطف زبان کے ساتھ نزاکت مضمون بھی موجود ہے۔ یہ مطلع ملاحظہ ہو کس قدر بے تکلف زبان سے نکل گیا ہے۔

مانند شمع و شبنم یوں دن بسر کریں گے	مر مر کے شام کی ہے رو رو سحر کرینگے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

تم لڑاتے ہو غیر سے آنکھیں	یہ لڑائی نہیں تو پھر کیا ہے

غور کیا جائے تو اس شعر میں اعلے درجہ کی نثر کا لطف موجود ہے۔ مؤلف تذکرہ سے دوستانہ مراسم تھے۔ جو کلام موصول ہوا۔ اس کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

سارے افلاک نظر آئینگے مانند حباب	موج زن اپنا گر اشک کا طوفان ہوگا
تیغ دو مجھکو کہ میں اپنا گلا کاٹ لوں آپ	مفت میں آپ کا سر پر میرے احسان ہوگا
میں تو مر کر بھی نہ نکلا حلقہ ماتم سے ہائے	گرد میری قبر کے بھی حلقہ احباب تھا
کیا بجھاتا آتش شوق شہادت وقت قتل	ہاتھ میں سفاک کے خنجر بھی تو بے آب تھا

یہ قدم حدِّ مذاہب سے پرے رکھتے ہیں
شیخ ہے مشربِ رندانِ قدح خوار جدا

کہیں دل تُو نے اٹکایا تو ہوتا
محبت کا مزہ پایا تو ہوتا

ہمارا بخت خفتہ ہوتا بیدار
ذرا تو خواب میں آیا تو ہوتا

وفائے غیر کی تعریف اتنی
ذرا تو دل میں شرمایا تو ہوتا

اپنے اشکوں میں بہ گئے ہم آپ
آج یہ ماجرا نیا دیکھا

بہار آئی ہے ظالم خدا خدا کر کے
مٹا نشان نہ بلبل کے آشیانے کا

قسمت میں پائمال جو ہونا تھا ہم نفس
میں رفتہ رفتہ مائل رفتار ہو گیا

ظاہر کی وضع پہ تو نہ تھی پر کچھ ان دنوں
زاہد کی ضد سے رند قدح خوار ہو گیا

کیونکر جلے نہ مزرعہ امید باغباں
ہے برق ریز نالۂ سوزانِ عندلیب

آنکھ ہے پر نظر نہیں آتا
مثلِ نرگس ہیں ہم چمن کے بیچ

آنکھ مجھ سے لڑائے جاؤ تم
یہ لڑائی سے ہے دلربا بہتر

مثالِ برق تمہیں بھی کبھی قرار نہیں
ہنسو نہ تم دلِ پُر اضطراب کے اوپر

دیر سے کام نہ کعبے سے ہے مطلب ہم کو
تیرے کوچے کی محبت ہی ترے در سے غرض

برق کی طرح وہ مجھ پر ہی گری پڑتی ہے
آپ کی تیغ ستم کو ہے مرے سر سے غرض

ہم ہو کے باوفا ہیں دشمن تری نظر میں
تو بیوفا ہے اور پھر تجھ پر نثار ہیں ہم

تاثیر اس کے دل پہ پہنچے کریں گے نالے
پہلے تو آفتوں سے خود ہی دوچار ہیں ہم

ہر چند روز روز کی ایذا سے تنگ ہوں
آتا ہے پر ستم پہ ترے پیار کیا کروں

سمجھا سبب مرض کا تو بن جائیگا رقیب
عیسیٰ کے پاس جا کے میں بیمار کیا کروں

عشق میں کیا ترے ناشاد کیا کرتے ہیں
جاں سی چیز کو برباد کیا کرتے ہیں

کہا تھا ابر میں نے چشم تر کو
لگا دی آگ اس نے میرے گھر کو

ناز اس کے اٹھاتے ہیں جو ہم اور زیادہ
کرتا ہے وہ بُت ہم پہ ستم اور زیادہ

سلجھاتا ہے شانہ اُسے جلنا دم تزئین
پڑتے ہیں تری زلف میں خم اور زیادہ

تم لڑاتے ہو غیر سے آنکھیں
یہ لڑائی نہیں تو پھر کیا ہے
یوں ہر اک بات پر اُلجھ پڑنا
کج ادائی نہیں تو پھر کیا ہے

مانند شمع و شبنم یوں دن بسر کرینگے
مرمر کے شام کی ہے رو رو سحر کرینگے
جب ضعف سے پہنچیں سینہ سے اپنے لب تک
کیونکر فلک پہ جاکر نالے اثر کرینگے

ذلتوں سے حسرت نظارہ کا بنتا ہے کام
گالیاں دیتے ہیں وہ مجھکو بلا کے سامنے
مہمانی اس کو کہتے ہیں جب آیا تیر یار
دل جگر سب رکھ دئے ہم نے اُٹھا کے سامنے

یہاں ہم آئے تھے جس وقت آپ روتے تھے
چلے تو اپنے عزیزوں کو ہم رُلا کے چلے

لبوں پہ دم ہے خدا کیلئے ذرا بولو
ہماری جان چلی آپ کی ادا ٹھہری

بے سبب اسکی اٹھا کر جھڑکیاں ہر بار کی
آپ ہم نے خو بگاڑی ہے بُت عیار کی
ابر اُٹھا دیکھ کے کعبہ کی جانب سے وہ شیخ
خوب سُنتا ہے خدا رندانِ بادہ خوار کی
کچھ اُڑا دی کچھ بہا دی کچھ گرا دی بعد مرگ
کیا ہماری خاک کی ظالم نے مٹی خوار کی

مزا نہیں جو ہمیشہ وصال یار رہے
ذرا تو چاشنیِ دردِ انتظار رہے
مے دو سالہ کو پی کر میں کیا کروں ساقی
وہ مے پلا کہ دمِ مرگ تک خمار رہے

آنے دو یا نہ آنے دو تم اپنے ہاں مجھے
عاشق تمہارا جانتا ہے اِک جہاں مجھے

کثرت آب بھی ہے نخل کو نقصاں کا سبب
شاخِ نخلِ مژۂ اشک فشاں سوکھ گئی

کیوں نہ آوارہ پھریں غمزدگانِ دہلی
کہ ہے عنقا کے نشیمن میں نشانِ دہلی
کوئی ظاہر میں نہ تھا اس کی خرابی کا سبب
اپنے اعمال ہوئے آفت جانِ دہلی
صبح پیری کے ہے کافور سے انکو نسبت
گل سے رخسار جو رکھتے تھے جوانِ دہلی
اک فلک اور بنا اپنے ستانے کے لئے
جب اُٹھا دل سے مرے دودِ فغانِ دہلی

خمسہ بر غزل خود

پہلے امید ہی امید میں رکھا مجھ کو   پھر بلایا کئی بار اور یوں ہی پھیرا مجھ کو
کون سی بات کا ہو یار بھروسا مجھ کو   ہائے گھر میں نہ بلایا نہ بلایا مجھ کو
آج بھی آپ نے وعدے ہی پہ ٹالا مجھ کو

واہ کیا خوب گذرتی ہے تمہاری اوقات   شہر میں پھرتے ہو غیروں کے لئے ہات میں ہات
ان سے یہ بات کہ آتی نہیں جن کو کوئی بات   کور بہتر کہ نہ دیکھیں تمہیں اغیار کے سات
رنج دکھلاتے ہیں کیا دیدۂ بینا مجھ کو

چشم پر آب مرے واسطے اک عالم ہے   دوست روتے ہیں رفیقوں کو نہایت غم ہے
ایک صاحب کی رکاوٹ کا وہی عالم ہے   حالت نزع ہے مرتا ہوں لبوں پر دم ہے
آپ سے دوست نے اسوقت میں چھوڑا مجھکو

کیا کہوں شوق میں حالت ہوئی کیا کیا میری   تو نے پوچھی نہ خبر آن کے اصلا میری
پاس کچھ بھی نہ کیا دلشکنی کا میری   ایک بھی تجھ سے بر آئی نہ تمنا میری
تا دمِ مرگ رہے گی یہ تمنا مجھ کو

واں گئے وہ کہ جہاں تک کا پہنچنا ہے محال   میں گیا ڈھونڈنے ان کو تو دیا مجھ کو نکال
لوگ کچھ اور ہیں واں اور ہے ڈھنگ اور ہی چال   پوچھنا حضرت ظاہر کا میں کس سے احوال
نہ ملا کوئی وہاں اپنا شناسا مجھ کو

ظاہر: خواجہ محمد خاں مرزا مظہر کے شاگردوں میں تھے۔ زیادہ حالات نہیں معلوم ہوئے تذکرہ فتح علی خاں سے مندرجہ ذیل اشعار انتخاب کئے گئے ہیں۔ ظاہر

پھر زلیخا نہ نیند بھر سوئی   جب سے یوسف کو خواب میں دیکھا

اے آہ اس قدر تو گر بے اثر نہ ہوتی   ممکن نہ تھا کہ اُس کے دل کو خبر نہ ہوتی

باطن میں گو کسو سے تجھے دوستی نہ ہو   لیکن تجھے رعایت ظاہر ضرور ہے

ظاہر

ظاہر:۔ سید امتیاز علی خلف میر اعجاز علی اپنے بڑے بھائی حافظ ممتاز علی کے شاگرد ہیں۔ ریاست بھوپال میں ملازم ہیں۔ پختہ عمر ہے۔ سیدھا سادا صاف کلام ہے۔ انداز بیان میں اختراع اور تراش خراش نہیں۔ نمونۂ سخن یہ ہے۔

ہے تیرے تلوّن سے یہ سب ہم کو مساوی
کہتے ہیں کسے مہر و وفا جور و جفا کیا

بوسہ کا کیا میں نے سوال اُن سے جو ناگاہ
جھنجھلا کے کہا پھر تو کہو تم نے کہا کیا

جان و دل و دیں نذر بتاں کر چکا ظاہر
جز درد و غم و یاس مرے پاس رہا کیا

ظریف

ظریف:۔ لالہ جھنجھومل دہلوی شاگرد حضرت نسیم بھرتپوری مرحوم۔ طبیعت بہت رسا معلوم ہوتی ہے۔ پُر لطف اور مزیدار شعر کہتے ہیں۔ زبان کی صفائی کا خیال زیادہ ہے۔ انتخاب کلام درج ذیل ہے:۔

جب کہا ان سے کہ کچھ حال بھی دل کا جانا
ہنس کے فرمایا کہ جھوٹے کا کلیجا جانا

پھر وہی تیر لگانا کہ تڑپ جائے دل
پھر کن انکھیوں سے مجھے دیکھ کے شرما جانا

قبول ہوتی ہے منّت نہ التجا میری
یہ بت ذرا نہیں سنتے مرے خدا میری

مجھے بتائی بھی جاتی نہیں خطا میری
مجھی سے پوچھ رہے ہیں مگر سزا میری

شب فراق کے صدمے سہے نہیں جاتے
الٰہی آج کہاں مر رہی قضا میری

ستم یہ ہے کہ ستم بھی وہ اب نہیں کرتے
سمجھ گئے ہیں پسند اس کو ہے جفا میری

کسی کے سامنے کیوں جاؤں التجا لے کر
ظریف کیا نہ سنے گا مرا خدا میری

نہ کہئے حسیں کوئی ہمسا نہیں ہے
خدا کی خدائی میں کیا کیا نہیں ہے

نہ جھک جھک کے منہ نزع میں میرا دیکھو
نکلتا ہے دم کچھ تماشا نہیں ہے

ترا تیر کیوں چھپکے بیٹھا ہے دل میں
اگر یہ ہماری تمنّا نہیں ہے

شب غم جو نکلے تو کس طرح نکلے
مرا دم عدو کی تمنّا نہیں ہے

ظریف ایک ہی زندہ دل آدمی ہے
کبھی تم نے کیا اسکو دیکھا نہیں ہے

ظریف

ظریف:- سید ظریف حسن ساکن قصبہ تسیہ ضلع مظفر نگر تلمیذ نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی۔ جوان طبع۔ رنگین فکر۔ خوش بیان ہیں۔ غزل میں عاشقانہ راز و نیاز کو صفائی سے نظم کرتے ہیں۔ بندشیں سادہ اور مزیدار ہوتی ہیں۔ طبیعت کی شوخی خداداد ہے۔ قدیم و جدید طرز دونوں میں فکر کی جولانی دکھاتے ہیں۔ زبان پر زیادہ زور ہے۔ راقم تذکرہ کو جو کلام ملا اس کا انتخاب درج ذیل ہے۔

ہمارا حال کہہ دینا نوا سنجانِ گلشن سے / گلستاں کی طرف صیاد تیرا ہو اگر جانا
غضب ہے یوں کسی جانباز کو دادِ وفا دینا / نگاہیں چار کرنا زیرِ لب پھر مسکرا دینا
لبِ خاموش سے یہ ہر حباب بحر کہتا ہے / حیاتِ جاوداں ہے اپنی ہستی کا مٹا دینا
دمِ نزہت نہ دیکھ آئینہ تو پچھتائیگا ورنہ / کہ اس کم بخت کو آتا ہے دیوانہ بنا دینا
سنبھل کر بیٹھنا او سنگدل ہوشیار ہو جانا / مری آہوں کو آتا ہے جگر کے پار ہو جانا
جگر کو تاکنا وہ ان کا نیچی نیچی نظروں سے / نگاہِ ناز کا وہ میرے دل کے پار ہو جانا
وہ مرے دل میں رہا میری تمنا بن کر / رہ گیا ٹوٹ کے سینے میں جو پیکاں تیرا
برق گرتی ہے وہیں سارے چمن کو چھوڑ کر / جس شجر پر دیکھتی ہے آشیانِ عندلیب
غم غلط ہوتا ہے مل جاتے ہیں جب کچھ ہم خیال / دل بہل جاتا ہے دیوانوں کی محفل دیکھ کر
جس قدر تڑپا سکے اے درد تو تڑپائے جا / لطف ان کو آرہا ہے رقصِ بسمل دیکھ کر
سامنے آنکھوں کے پھر جاتی ہے زلفِ شمع رو / دل میں اٹھتا ہے دھواں دودِ چراغاں دیکھ کر
دیکھ کر حشر کے آثار ترے کوچے میں / جمع ہیں طالبِ دیدار ترے کوچے میں
آسماں بن کے ہمیں آنکھ دکھاتی ہے زمیں / ذرہ ذرہ ہے دل آزار ترے کوچے میں
جب کیا چاک گریباں نے سرِ تسلیم خم / ہم بغل اٹھ کر مرے دامن کی کلیاں ہو گئیں
دل اچکتی پھرتی ہیں انکی ادائیں خلق کے / شوخیاں آنکھوں کی بدنامی کا ساماں ہو گئیں
میری پیشانی میں تھیں جتنی لکیریں اے ظریفؔ / رفتہ رفتہ جزوِ سنگِ بابِ جاناں ہو گئیں

آپ کا میرا کہیں ذکر جب آجاتا ہے
جان کو جان نہ سمجھا ہے نہ سمجھیں بخدا

بنکر حسین اسکی بھی مشکل میں جان ہے
یہ کون آج آگیا رندوں کے بھیس میں

زخمی اگر نہ کردے ترے دل کو تو سہی

چھڑا کر مجھ کو ان کے آستاں سے
ہماری جان کے دشمن ہیں دونوں

حسرتیں پوری کرو دونوں کی اس تدبیر سے

جاننے والے بھی اب مجھکو نہیں پہچانتے

یقیں ہے کہ منہ چوم لو آپ اپنا
پھر ذرا کہنا یونہی اے کہنے والے پیار سے

عشق کی نعمت عطا ہوتی ہے اہلِ ظرف کو
نزاکت کی یہی تعریف ہوتی ہوگی دنیا میں

مری بیہوشیوں کا ذکر جب آیا تو فرمایا
ابرو تنے ہوئے ہیں نظر ہے پھری ہوئی

جس نے جلا جلا کے مجھے خاک کردیا
بلبلوں کے وجد پر کیوں ہو نہ حیرانی مجھے

وہ چھیڑتے ہیں مرے زخم دلکو ہنس ہنس کر
وہ کر رہے ہیں مری وحشتوں کا نظارہ

ٹھہر اے دردا ابھی اٹھکر نہ تڑپا سانس لینے دے
یہ کیسا انقلاب آیا خرابات محبت میں

لوگ ہانھو نسی جگر تھام لیا کرتے ہیں
بات پڑتے ہیں ہم آن پہ دم دیتے ہیں

ہر شخص کی زبان پہ ہے ظالم ادھر تو دیکھ
اے پیر مے فروش اُٹھا کر نظر تو دیکھ

آئنہ رکھ کے سامنے اپنی نظر تو دیکھ

مری قسمت کہاں لائی کہاں سے
زمیں بھی کم نہیں ہے آسماں سے

دل کو چھید و تیر سے کاٹو گلا شمشیر سے

میری صورت کو ملاتے ہیں مری تصویر سے

جو تصویر تم کو دکھائیں تمہاری

دُور ہی رہنا ہمارے سایہ دیوار سے
یہ وہ سودا ہے جو مل سکتا نہیں بازار سے

عدو کا ہاتھ ہوتا ہے تمہارا دوش ہوتا ہے
نہیں معلوم ہے وہ جس لئے بیہوش ہوتا ہے

کیا پھر بگڑ گئی مری قسمت بنی ہوئی
وہ کیا بجھائے گا مرے دل کی لگی ہوئی

جب نظر آئے گلوں کی چاک دامانی مجھے
زہے نصیب جو یہ چھیڑ آئے راس مجھے

بنا رہے ہیں تماشا مرے حواس مجھے
دل بیتاب کو پھر سے قرار آیا ہے مشکل سے

نہ ساغر ہے نہ شیشہ ہے نہ ساقی ہے نہ محفل ہے

قطعات

ظریف اس نے یہ جب پوچھا ہیں پالیسی کے کیا معنی
کہا ہیں نے گلا کمزور لوگوں کا دبا دینا
غرض ہے جن سے کرنا ان کی بیجا ناز برداری
جو ہوں آفت رسیدہ خاک میں ان کو ملا دینا

چھائی ہوئی ہیں آفتیں خلقت کی جان پر
ہر وقت ہائے ہائے ہے سب کی زبان پر
افلاس و قحط و بغض و نفاق و حسد ظریف
نازل خدا کا قہر ہے ہندوستان پر

یہ ارادہ ہے ہمارا اے ظریف
کچھ دنوں چل کر رہیں پردیس میں
لائیں ہم رقمیں بنا کر قوم کو
بھیک مانگیں لیڈری کے بھیس میں

خمسہ بر غزل خود

دخل دینا تیری قدرت میں مری منشا نہیں
صرف اتنا پوچھنا ہے اور کچھ کہنا نہیں
مدعا اس خلق کا کچھ ذہن میں آتا نہیں
عزت ملکی و قومی کی جنہیں پروا نہیں
اے مرے خالق انہیں کسواسطے پیدا کیا

رخ پہ زردی چھا گئی رنگ اس کا فق سا ہو گیا
مجھ سے جب پوچھا گیا اے کشتۂ جور و جفا
ظلم اس نے کیا کئے تھے اور ستم کیا کیا ہوا
حشر کے دن داور محشر سے یہ کہنا پڑا
جو ہوا اچھا ہوا جو کچھ کیا اچھا کیا

اُمرا کی حالت

بوئے نخوت سے دماغ اہل دولت ہے خراب
کج روی کج خلقیاں کج رائیاں ہیں ہمرکاب
قوم کو ٹھکرا رہے ہیں کیسے کیسے انقلاب
لیکن آنکھوں میں نہ آنسو ہیں نہ دل میں اضطراب
فکر عقبےٰ ہے نہ کچھ ملت کا اپنی ہوش ہے
کم سے کم ہیں ہستیاں وہ جنکے دل میں جوش ہے

چونکہ ان کا نفس انکے قلب پر ہے حکمراں
اسلئے وہ بن نہیں سکتے معین بیکساں
مفلسوں سے بات کرنی جانتے ہیں کسر شان
چاک کر دیتے ہیں پڑھ کر بیکسوں کی عرضیاں

کس طرح پائی نکالیں خستہ حالوں کے لئے
وقف ہیں ان کے خزانے منہ جمالوں کے لئے

علمائے قوم

ان کے کانوں تک اگر پہنچادے کوئی یہ خبر
آرہے ہیں تم سے ملنے کیلئے کچھ اہلِ زر
باچھیں کھل جاتی ہیں سُنکر مژدۂ فرحت اثر
پیشوائی ان کی خود کرتے ہیں آکر تا بہ در

وقعت و عزّت سے ہاتھوں ہاتھ لاتے ہیں انہیں
بے تکلّف اپنی مسند پر بٹھاتے ہیں انہیں

جائے گر انکی زیارت کے لئے کوئی غریب
خوش نہیں ہوتا کبھی ہو کر مشرف بدنصیب
پا نہیں سکتا جگہ وہ ان کے پہلو کے قریب
صورتیں وضو کے کی ٹٹّی سے تین بیحد مہیب

غنچہ دل جیب خالی دیکھ کر کھلتے نہیں
مفلسوں سے ہم بغل ہو کر کبھی ملتے نہیں

ظریف ۔سید مقبول حسین لکھنوی۔ تلمیذ و برادر خورد جناب صفی لکھنوی۔ پختہ عمر و پختہ مشق شاعر ہیں۔ اکثر لمبی لمبی نظمیں مزاحیہ رنگ میں کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ آجکل ریاست محمود آباد میں مقیم ہیں۔ وہیں تعلق ملازمت ہوگا۔ کئی بار لکھنے کے باوجود ذاتی حالات اور کلام بھیجنے سے آپ نے احتراز مناسب سمجھا۔ ایک نظم شہر آشوب سے چند بند یہاں دئے جاتے ہیں۔

نجھ میں اے ہندوستاں کچھ آجکل حد سے سوا
چارسُو پھیلی ہوئی ہے شاعری کی اک وبا
اس مرض میں اب نواسی فیصدی ہیں مبتلا
مستند شاعر ہے جس نے اک تخلص رکھ لیا

شاعری گو عہد ماضی میں تھی پایانِ علوم
اب تخلص میں سمٹ کر آگئی جانِ علوم

پیسے والے کی سمجھ میں آگئی ہے اب یہ بات
صرف بیجا ناچ گانے کا ہے بالکل واہیات

جب کوئی جلسہ خوشی کا ہو کہیں پر یا برات — منعقد بزمِ سخن ہوتی ہے تا کٹ جائے رات
پہلے اربابِ نشاط آتے تھے گانے کیلئے
اب تو شاعر جاتے ہیں غزلیں سنانے کیلئے

گو کہ شاعر اور مغنّی میں تھا فطری ساز باز — پر جدا رکھتا تھا ان دونوں کو فنّی امتیاز
تھا گلے پر اس کو اور اُس کو زبان پر اپنی ناز — محفلیں دونوں الگ تھیں اور جداگانہ تھے ساز
تھا جہاں نغمہ محل باتیں بنانے کا نہ تھا
بزمِ شعر و شاعری میں دخل گانے کا نہ تھا

کرتا تھا جذبات کی لفظوں سے یوں صورتگری — جس کی کر سکتا نہ تھا کوئی مصوّر ہمسری
نغمہ سنجی کی مدد سے فکر تھی جس کی بری — اب اسی کی شعر خوانی میں ہے رنگِ ابتری
یہ نمک پاشی ہے لے بیدرد لگے گھاؤ میں
شاعری صورت دکھائے ارتھ میں اور بھاؤ میں

یاد ایّامے کہ شاعر کو زبان پر ناز تھا — قوّتِ تخئیل ہی سرمایۂ اعزاز تھا
لفظ ہی میں سوز تھا اور لفظ ہی میں ساز تھا — نغمۂ شاعر کا روح القدس ہم آواز تھا
اب اگر قابو ہو ان پہ تو ملے شاعر کو داد
سُر، رکھب، گندھار، مدّھم، پنچم اور دھیوت نکھاد

جب سخن سنجوں میں کثرت ہو انہیں اصحاب کی — محض نغمے ہی کو جو سمجھیں کمالِ شاعری
قلب پر جنکے اثر کرتی ہو تان اور گٹکری — سوز سے ناآشنا دلدادۂ خنیاگری
انترے ہیں بیچ میں جو لے کیلئے۔ دُھن کے لئے
بھیرویں بے وقت کی ہے اب غزل اُنکے لئے

مٹ گیا تانیث اور تذکیر کا جب امتیاز — اب نہ ڈاڑھی ہے نہ مونچھیں اور نہ وہ زلفِ دراز
رفتہ رفتہ بڑھ گیا گر شوق نغمہ ذوق ساز — شاعر اب آئینگے محفل میں پہن کر پیشواز

ختم اب اس فقرہ پہ ہوگی ہر غزل اُستاد کی
سُنئیے میں ہوں جانکی بائی الہ آباد کی

ظفر

ظفر:۔ نواب سیّد محمد ظفر حسن خاں صاحب تعلقہ دار رسول پور خلف مہدی حسن خاں شاداب تلمیذ حضرت حفیظ جونپوری۔ کلام سے مشاقی پائی جاتی ہے۔

کسی حسین کو کسی پر جو مہرباں دیکھا
نظر اُٹھا کے ظفر سوئے آسماں دیکھا

جو کہئے خاک ہوا جل کے دل تو کہتے ہیں
اڑی نہ خاک نہ اُٹھتا ہُوا دھواں دیکھا

فدا ہے جان مری امتیاز قاتل پر
اُسی کو ذبح کیا جس کو نیم جاں دیکھا

اچھی صورت کا ازل ہی سے فدا ہے یہ دل
اپنے ہمراہ یہی حسن عمل جائے گا

یہ کہکے کوئی اور بھی بیخود بنا گیا
لو پھر کسی حسین پہ دل اُن کا آگیا

وہ حُسنِ دلفریب وہ بوٹا سا قد ترا
یہ دلمیں کُھب گیا وہ نظر میں سما گیا

مہمان اس طرح کے نہ ہونگے جہان میں
غم آپ کا ظفر کے کلیجے کو کھا گیا

ظفر وہ بڑا بول پھر بولئے گا
مرے دل پہ قابو نہ ہوگا کسی کا

یہاں تو گلہ ہے مقدر کا اپنے
شکایت کسی کی نہ شکوہ کسی کا

تڑپنے والے دو ہی ہیں جہاں میں
زمیں پہ ہم ہیں بجلی آسماں پر

ہنس ہنس کے آپ گریۂ بے اختیار پر
بجلی گرا رہے ہیں دل بیقرار پر

تم تو بنے شباب میں گلدستہ حسن کا
جوبن ابھار پہ ہے جوانی بہار پر

ہیں نے تمام خلق کو عاشق بنا دیا
سب چاہتے ہیں تم کو مرے اعتبار پر

زہر کے گھونٹ سے کچھ کم نہیں آنسو پینا
قطرۂ اشک کو ہیرے کی کنی کہتے ہیں

چار میں چھیڑ کے قصّہ مرا چٹکی لینا
اور کس بات کو پھر طعنہ زنی کہتے ہیں

آشنا۔ آشنا ہیں مطلب کے
سچ ہے کوئی کسی کا یار نہیں

چاہئے رسم محبّت کا نباہ
چار دن کی مہربانی کچھ نہیں

دیکھئے کثرت میں وحدت کا ظہور
چھپنے والی اس کی یکتائی نہیں

جام خالی مے صراحی میں نہیں
ساقیا بس زندگانی ہو چکی

ہوئے خوش جو وہ دیکھکر چاندنی
بچھی جاتی ہے بام پہ چاندنی

جہاں تم وہیں جلوۂ حسن ہے
ادھر چاند نکلا ادھر چاندنی

تڑپتی ہے سو رو کے یہ برق تاباں
کہ چمکاتی پھرتی ہے تلوار بدلی

سر بام کھولے نہ ہوں اس نے گیسو
جھکی پڑتی ہے سوئے کہسار بدلی

ہوا پر اڑیں زلفیں بکھرا کے پریاں
کہ منڈلاتی ہے یہ دھواں دھار بدلی

گلابی شلوکا بسنتی دوپٹا
یہ پوشاک تم نے طرحدار بدلی

یہ چالیں ریاکاریوں کی جو آئیں
ظفر تم نے زاہد سے دستار بدلی

ہمیں اپنی تصویر ہی بھیجدو
تسلی کی کوئی تو صورت رہے

آنکھ ملتے ہی حسینوں سے یہ کیا ہوتا ہے
دل سا ہمدرد ہمیشہ کو جدا ہوتا ہے

اثر ظل ہما سایہ دیوار میں ہے
صاحب تاج ترے در کا گدا ہوتا ہے

دم رخصت نہ مری بات بھی پوچھی تم نے
دوست سے دوست گلے ملکے جدا ہوتا ہے

دیکھئے ہوگئی آنکھوں کی حیا بھی رخصت
سامنے میرے رقیبوں کا گلہ ہوتا ہے

دل کو سمجھاؤ ظفر جان کی اب خیر نہیں
عشق کا روگ مری جان برا ہوتا ہے

دل کے آتے ہی محبت نے کہا
زندگی سے ہاتھ اٹھانا چاہئے

تیغ قاتل دیکھ کر کہتا ہے شوق
اب گلے اس کو لگانا چاہئے

ظفر

ظفر - مظفر پوری آپ کا نام وغیرہ نہ معلوم ہو سکا۔ رسالۂ فتنہ سے اشعار ذیل نقل کئے جاتے ہیں جنکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ موزوں طبع خوش فکر ہیں۔

تم کو لہو رلائے پہروں مری کہانی
لیکن ہے شرط اتنی سن لو مری زبانی

غنچوں کا یہ ابھرنا یہ سرو کا اکڑنا
گلشن ہے یا کسی کی اٹھتی ہوئی جوانی

شیشے میں جو پری تھی دل میں اُتر گئی ہے	آنکھوں میں کھُب گیا ہے وہ رنگ ارغوانی
جلنے ہیں داغ دل میں سب آپ کے دئے ہیں	پہلے کے تحفے کچھ ہیں کچھ اب کی ہی نشانی

ظفر:۔ بھیم سین صاحب۔ بزرگوں کا وطن انبالہ تھا۔ مگر آپ کے دادا ملتان میں قیام پذیر ہوئے بھیم سین صاحب یہیں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم پائی۔ تعلیم حسب دلخواہ نہ ہوسکی کیونکہ بچپن ہی میں والد (لالہ البشر داس) کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ مگر تعلیم کا شوق ہے اس لئے انٹرنس اور ادیب عالم کے امتحانات پاس کئے۔ اس سال (۱۹۳۳ئہ) ایف۔ اے کے امتحان میں شریک ہوئے ہیں۔ ابھی ابتدائی مشق ہے۔ غزل کے مقابلہ میں نظم سے زیادہ دلچسپی ہے کلام یہ ہے۔

عشق میں نیستی بھی ہستی ہے	کون کہتا ہے مرگیا ہوں میں
عمر اپنی کوچۂ جاناں میں چل پھر کر گذار	رہگذار عشق ہے دُنیا کوئی منزل نہیں
آج صہبا کی مذمت ہے زبان شیخ پر	مے فروش حسن شاید زینتِ محفل نہیں
مرا معبود نہیں بت مرا مسجود نہیں	دل کے بہلانے کو تصویر بنا رکھی ہے
یہی وعدہ تھا ترا کیا یہ مناسب تھا تجھے	تو نے کیوں اتنی جفا ہم پہ روا رکھی ہے
مقید رہ کے جینے کا مزہ کیا	مٹا دے یا ہمیں آزاد کر دے

ظفر:۔ شیخ ظفر علی۔ ان کا بھی کچھ حال دریافت نہ ہوسکا۔ کلام مندرجہ ذیل سے کہنہ مشقی اور طبیعت داری کا ثبوت ملتا ہے۔

صحرا میں کیسے کیسے بڑھاتے ہیں خار ہاتھ	جوشِ جنوں میں ایک ہے دامن ہزار ہاتھ
منت کروں میں پاؤں پڑوں بوسہ اسکے لوں	آئے جو ایکدن وہ تغافل شعار ہاتھ
فصلِ بہار آتے ہی جوشِ جنوں ہوا	داماں وجیب کرنے لگے تار تار ہاتھ
ہے معرکہ سخن کا مرے ہاتھ اے ظفر	نامہ ملا کہ آئی مرے ذوالفقار ہاتھ

ظفر:۔ حضرت ظلّ سبحانی مرزا ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ دہلی انار اللہ

برہانہٗ و نور مرقدہٗ ابن سلطان عالم پناہ محمد اکبر شاہ ثانی فردوس آرام گاہ من اولاد حضرت امیر تیمور گورگاں عرش آشیاں۔ آپ کو زمانۂ ولی عہدی میں شاہ نصیر مرحوم سے تلمذ تھا۔ جب شاہ صاحب دکن چلے گئے۔ تو خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی مرحوم کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ شعر و سخن کے عاشقِ شیدا تھے۔ اپنے تخلص کی رعایت سے ملک شہرت کو تسخیر کیا۔ آپ کے دربار میں بڑے بڑے اساتذہ اور کہنہ مشق شاعر حاضر رہتے تھے۔ مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔ حافظ عبدالرحمان خاں احسان۔ برہان الدین خاں زار۔ میر غالب علی خاں سید۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم۔ ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق۔ میاں شکیبا شاگرد میر تقی میر۔ مرزا عظیم بیگ عظیم۔ شاگرد مرزا سودا۔ میر قمر الدین منت ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ۔ یہ اساتذہ اپنا کلام سناتے۔ انہیں اساتذہ کے فیضِ صحبت اور خاقانی ہند کے فیضِ تلمذ نے حضرت ظلِ سبحانی فردوس آرامگاہ کی طبیعت میں سونے پہ سہاگے کا کام کیا۔ محاورہ بندی اور معاملہ نویسی پر کامل قدرت ہوگئی ہر قسم کے خیالات کو جس پیرایہ میں چاہتے نظم کر جاتے۔ جو کچھ کہتے سامعین کے دلوں میں تیر و نشتر کی طرح کھٹک جاتا تھا۔ خزائن دولت کی طرح برجستہ الفاظ کے گنج گراں مایہ ان کے سامنے ہر وقت موجود تھے۔ جس لفظ کو جہاں سجتا دیکھتے وہیں جڑ دیتے۔ مضامین کی باریکی کو لطافت کا جامہ پہناتے تھے۔ روشن خیالی اور صفائی ذہن کا یہ عالم تھا کہ نازک سی نازک تخئیل کو روزمرّہ اور محاورہ کے ساتھ ترکیب دیکر آئینہ کے مانند اہل بینش کے روبرو پیش کر دیتے تھے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

واہ تم صبح کو بھلے آئے　　　　دن چڑھے کہہ کے دن ڈھلے آئے

خدا داد چستی اور بے مثال بندش نے جو لطف دکھایا ہے۔ اُسے کچھ مذاقِ سلیم رکھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تو روزمرّہ تھا۔ اب استعارہ اور تشبیہ ملاحظہ فرمائیے۔

مرے مژگاں سے آنسو اسطرح برسوں برستے ہیں　　　　کہ جوں برسات کے موسم میں مینہ چھاجوں برستے ہیں

نازک خیالی اور ادائے مضمون میں بول چال کا لحاظ رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے مِنہ چھاجوں برستے ہیں، پورا محاورہ نظم کر دینا اور آنسوؤں کی روانی کے سامنے بارش کو شرمانا سُننے والے کے دل میں ایک خروش پیدا کرتا ہے۔ یہی قدرتی رنگ ہے، جو ظفرؔ کے کلام پر میر تقی میر کا پرتو ڈالتا ہے۔ مگر مولانا آزاد مؤلف تذکرۂ آب حیات، اُستاد پرستی کے والہانہ جوش میں لکھ گئے ہیں۔ ظفرؔ کا جو کچھ کلام ہے۔ وہ سب حضرت ذوق کے فکرِ سخن کا نتیجہ ہے۔ دُنیائے اُردو اس بیجا ادّعا کو نامعتبر قرار دے کر اس کی تردید کر چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا کافی ہوگا۔ کہ حضرت ذوق کے کلام کا جو رنگ ہے۔ اُس سے ظفرؔ کا کلام بالکل الگ ہے۔ اگر یہ امر بھی تسلیم کر لیا جائے کہ جناب ذوق نے طبع زاد کلام میں بہت کچھ استادانہ تصرّف کیا ہے۔ تو اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ تمام و کمال ظفرؔ کا کلام ذوقؔ کے نام سے منسوب کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ پنجابی اور ہندی میں بادشاہ مرحوم نے جو کچھ کہا اگر اسی پر نظر رکھیں تو ظلِّ سبحانی کا پورا شاعر ہونا ثابت ہوتا ہے ہندی میں شوخ رنگ تخلّص لاتے تھے

حضرت فردوس آرام گاہ نے ۹۰ برس کی عمر پاکر ۱۲۹۹ھ میں بمقام رنگون انتقال فرمایا اور وہیں کی خاک میں آسودہ ہیں آپ کی تصنیفات سے چار دیوان مطبوعہ موجود ہیں جن میں ہر رنگ کا کلام پایا جاتا ہے۔ زبان اور مضمون کے بہترین شعر ملتے ہیں۔ اکثر سنگلاخ زمینوں میں مضامین تازہ کے وہ پھول کھلائے ہیں۔ کہ شاہ نصیر کی روح بھی خُلد میں وجد کرتی ہوگی۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

کوئی صنم اُسے سمجھا کوئی خدا سمجھا
نہ سمجھے ہم کہ وہ کیا سمجھا اور کیا سمجھا

غمِ جدائی میں موت اس کو عین صحت ہے
مریضِ ہجر ترا زہر کو دوا سمجھا

شعلہ خو اک بات تو میری نہ آکر سن گیا
تیری باتوں سے کلیجہ جل گیا دل بھن گیا

غلط ہے جو کہے یہ چُپکے رہنا کچھ نہیں اچھا
نہ کہنے میں مزا ہے منہ سے کہنا کچھ نہیں اچھا

باز آ اس خوں فشانی سے کہیں اے چشمِ تر — دیکھ میرا رازِ دل سب پر عیاں ہو جائیگا

نصیب ہوتے بھلے اپنے گر محبّت میں — تو بد معاملہ سے کیوں معاملہ پڑتا

رفیق راہ محبّت کدھر گئے یارب — کہیں نظر ہی نہیں اب وُہ قافلہ پڑتا

دل کو بوسہ پہ سمجھ تو نہ مری جاں مہنگا — مال اس مول نہیں یہ کسی عنواں مہنگا

عدو سے کچھ کہا اور مجھ سے آکر کچھ کہا تم نے — نہ کیونکر فرق دلمیں سُنکے ایسی بات پڑ جاتا

نرگس کی روش ہم نے ظفرؔ آنکھ جو کھولی — اس گل کے سوا گلشن ہستی میں نہ سوجھا

شرارِ نالہ دل سے ستارونکی ہے یہ کثرت — کہ تل دھرنے کو خالی آسماں پایا نہیں جاتا

کدورت دل میں ہے ظاہر صفائی گر ہوئی تو کیا — ملاپ اُن سے ہُوا تو کیا جدائی گر ہوئی تو کیا

نہیں پرواز کی صیّاد بال و پر میں جب طاقت — قفس سے ہم اسیروں کی رہائی گر ہوتی تو کیا

کج ادا ایسا کیا حسن کی دولت نے اسے — بولتا ہی نہیں وہ شوخِ خود آرا سیدھا

جان بھی لیگا وُہ بت کافر میں نے اب یہ جان لیا — چھوڑا اس نے پاس مرے کیا دین لیا ایمان لیا

دل نہیں مانتا میرا ناصح یہ مانے تو کام چلے — تُو نے جو کچھ مجھ سے کہا سب سچ ہے وہ میں نے مان لیا

سوئے عدم ہستی سے چلا ہے بے سر و ساماں خالی ہاتھ — ہائے مسافر ساتھ سفر کا تُو نے نہ کچھ ساماں لیا

دیکھ پھر آخر خزاں ہے کوئی دن ہے یہ بہار — اس چمن میں آشیاں اپنا نہ اے بلبل بنا

نہیں یہ سوزِ محبّت نے ہم کو داغ دیا — ہمارے خانۂ دِل کے لئے چراغ دیا

لبِ میگوں کے ترے لیگا بوسے گر لبِ ساغر — تو میں اے بادہ کش بوسے ترے ساغر کے لے لونگا

جو اس چشمِ مست کے مست ہیں نہیں ہے کچھ انکو ہوش ساقی — کہ جام کیسا شراب کیسی نشہ ہے کیسا خمار کیسا

نے دل رکھا نہ جاں رکھی میں نے عشق میں — جو کچھ کہ اے ظفرؔ تھا مرے پاس کھو دیا

ہم نے کل ایک عجب آفتِ جاں دیکھا تھا — پر نہیں یاد ہمیں یہ کہ کہاں دیکھا تھا

دل کو کریگا خوب یہ دیوانہ پن خراب — اس کے ابھی سے ڈھنگ بُرے ہیں چلن خراب

جو یہ سمجھے کہ ملتا ہے وہی جو کچھ ہے قسمت میں — ہزاروں کو ظفرؔ پھر بیش و کم سے کیا مطلب

یوں جو مل بیٹھے تو کیا ہے دل لگی کا جب مزا
دونوں ہم تم ایک دل ہوں دل کا ہو دل سے ملاپ

وہ کھا گئے سو بار مرے آگے قسم جھوٹ
اور پھر ہے یہ دعویٰ کہ نہیں بولتے ہم جھوٹ

پھیر لی اس نے مجھے دیکھ کے چتون سچ مچ
ہو گیا پھر کے وہ مجھ سے مرا دشمن سچ مچ

زلف سیہ کی تیری لٹک لے شوخ پری رخسار ہے اور
یہ تو بلا کچھ اور ہے کافر یہ تو کچھ اسرار ہے اور

عشق ہے شاہنشاہ ظفرؔ تم اس کے درگہ عالی میں
جاتے ہو تو ادب سے جاؤ دیکھو وہ دربار ہے اور

جس وقت ہوئے اشک فشاں دیدۂ تر اور
دل اپنا جلا اور بڑھا سوز جگر اور

کھلتا نہیں ہے حال کسی پر کہے بغیر
پر دل کی جان لیتے ہیں دلبر کہے بغیر

کچھ چشم تر و سوز جگر پہ نہیں موقوف
افشائے محبت کے بہت سے ہیں نشان اور

تو گھر کو سدھار اپنے خدا کے لئے ناصح
ہوتا تری باتوں سے ہے مجھ کو خفقان اور

کچھ لطف زندگی کا اگر ہے اسی میں ہے
ہے یہ جو دوستوں کی ملاقات چند روز

کس کس ادا سے دیکھے ہے منہ سے ملا کے منہ
وہ آئنہ میں اپنا اور اپنے ظفرؔ کا عکس

رکھ دو پیالہ جتنی کہ پینے تھے روز مے
ہم آج پی گئے ظفرؔ اس سے دو چند۔ بس

ہم چمن میں کر رہے ہیں آشیاں اپنا درست
کرتا ہے صیاد فکر دام و تدبیر قفس

نہ ہو کیوں مجھے بزم عشرت میں گردش
کہ جوں ساغر مے ہے قسمت میں گردش

بگولے کی مانند مجھ کو ہمیشہ
لئے پھرتی ہے دشت وحشت میں گردش

دلوا دے یاد کوئی انہیں یاد کر کے خط
تکیہ تلے وہ بھول گئے میرا دھر کے خط

سرشک دیدہ میں خوں ہو کے بہہ گئے ایسے
ملا نہ سینے میں میرے دل و جگر کا سراغ

بات سن پائیں گر مروڑ کی ایک
کہہ دیں لاکھوں میں ہم کروڑ کی ایک

روؤں اتنا کہ ڈوب جائے جہاں
اب تو یہ بات ہے نچوڑ کی ایک

دل ہزاروں کے ٹوٹ جائیں ظفرؔ بات کہدیں وہ ایسے توڑ کی ایک
رہی نہ کوئی نشانی پر اس کا داغ فراق ہمارے پاس رہا یادگار برسوں تک
جلیسی ہے عشق کی میرے دل بیتاب میں آگ یوں کوئی بھر تو سکے ساغر سیماب میں آگ
لخت دل آنسوؤں کی رو میں چلے آتے ہیں کیا تماشا ہے کہ یاں بہتی ہی سیلاب میں آگ
آگے تو ہم سے اسقدر تھا نہ کبھو الگ الگ اب ہوئی ایسی کیا خطا رہتا ہی تو الگ الگ
رکھا جب پائے حنائی اس نے اپنا فرش پر بس گئے عطر حنا میں سر بستر قالیں کے پھول
داغ حسرت کیوں نہ پھولوں کی جگہ ہوں بعد مرگ بیکسی کرتی ہے تیرے عاشق مسکیں کے پھول
جوں بوئے گل رفیق نسیم چمن ہیں ہم اے ہمدم و وطن میں غریب الوطن ہیں ہم
دل کی تپش سے شعلہ فانوس کی طرح بیتاب بعد مرگ بھی زیر کفن ہیں ہم
گہہ زمیں پر ہے گہے تو آسماں پر مثل برق ڈرتے ہیں اے شوخ آتش خو تری چھل بل سے ہم
وصل کی بس کر چکے تدبیر ہم ہو گئے ناچار لے تقدیر ہم
پڑ گئی اُلفت کی بیڑی پاؤں میں ہیں ہمیشہ پائے در زنجیر ہم
بعد مجنوں عشق بازوں میں ظفرؔ رکھتے ہیں تھوڑی سی کچھ توقیر ہم
سوا اس دل کے اپنے بس میں آئے کب کسی کے ہیں اگر قابو میں ہیں تو ہم اسیکے ہیں اسی کے ہیں
کیونکہ آگاہ ترے طرز ستم سے ہو جائیں جب تلک تیرے ستم دیدہ نہ ہم سے ہو جائیں
کس زلف کے سودے کی ہے تاثیر ہوا میں ہے موج دخاں صورت زنجیر ہوا میں
خدا جانے کہ سینے میں مرے کیا زنگ ہے دل کا نظر آتی ہے کچھ آمیزش خوں آج آنسو میں
نہ جانا چاہئے کوچے میں اسکے سچ کہا تو نے پر اے غمخوار کیا کیجے نہیں دل اپنے قابو میں
پہنچیں گے کیونکہ چمن تک ہم قفس سے چھوٹ کر طاقت پرواز اپنے بال و پر میں کچھ نہیں
مر چکے ہم اننک باری عشق میں پہلے ظفرؔ اب تو نہ خوں جگر اس چشم تر میں کچھ نہیں
ناصح نصیحتیں تری ہم سن چکے بہت خاموش ہو کہ اب نہیں طاقت دماغ میں

نہ آؤ گھر نہیں آتے مگر جواب تو دو
تمہارے در پہ کھڑے کب سے ہم پکارتے ہیں

میں نہیں اس میکدے میں آج کل سے مست ہوں
مے پرستِ عشق ہوں روزِ ازل سے مست ہوں

کوئی آئینہ دل کا نہیں کہ جہاں رُخِ یار کی جلوہ نمائی نہیں
یہ قصور ہے اپنی نظر کا فقط کہ جو دیتا ہم کو دکھائی نہیں

تِری زلف دوتا نپٹ ہوش ربا وہ ہے دامِ بلا کہ بچائے خدا
کہ جو اس میں پھنسا وہ پھنسا ہی رہا کبھی اسکی امیدِ رہائی نہیں

کہا میں نے جو اس سے کہ اسکو بجھا جو یہ دل میں گیا ہے تو آگ لگا
تو یہ سُن کے وُہ ناز سے کہنے لگا مجھے آتی لگائی بجھائی نہیں

اے جنوں کیونکر اُتار اپنی تجھے پوشاک دوں
ہے لباسِ خاک تن پر وُہ بھی میں کیا خاک دوں

مردِ نیکوکار کو دُنیا سے آمیزش ہو کیا
اے ظفر یہ پاک جوہر اور وہ ناپاک دوں

ظفر وہ قہر وہ آفت ہے گردش میرے طالع کی
کہ ہے باعث سے جس کے آسماں دن رات چکّر میں

یُوں آنسوؤں کے ساتھ پیا ہم نے خونِ دِل
جیسے ملا کے پیتے ہیں پانی شراب میں

مِنّت کشِ اجل نہ ہوئے ہم کہ ہو لیا
کام اپنا ایک تیری نگاہِ عتاب میں

کہے جو عدو سچ نہ جانا کرو
بُرا مانتے ہو تو مانا کرو

جاتے ہو تو اک بوسہ تم دے کے چلے جاؤ
آسان نہیں یوں ہی دل لیکے چلے جاؤ

لڑیں کیا زمانے سے کشتی کہ اس نے
پچھاڑے بہت پہلواں اچھّے اچھّے

اثر کیا خاک ہے گریہ میں تیرے ڈوب مر شبنم
کہ گُل ہنستا ہے تجھ پر اور غنچہ مسکراتا ہے

وُہ آئے یا نہ آئے پر دلِ بیتاب کو اپنے
تسلّی میں یہ دیتا ہوں اب آتا ہے اب آتا ہے

کہاں تک روئیگا اے دیدۂ تر روک اشکوں کو
ہماری آبرو کو خاک میں تو کیوں ملاتا ہے

نہ ہو ہم سے برہم کہ زلفوں کو تیری
صبا چھیڑتی ہے خطاوار وُہ ہے

انتخاب از دیوان چہارم

موت آئی گر مریضِ ہجر کو اچھا ہوا
مر گیا کیوں اسکو کہتے ہو کہو اچھا ہوا

فلک پہ داغ دل کا رشک سے ماہِ مبیں دیکھا
رخ روشن پہ کسکے اس نے خال عنبریں دیکھا

لب شیریں سے اسکے ہم جواب تلخ سنتے ہیں
مزہ دیکھو کہ زہر آلود ہم نے انگبیں دیکھا

دل گرفتہ ہی برنگِ غنچہ رہنا خوب ہے
ہنس کے پایا گل نے کیا گلزار ہستی میں مزا

جو آیا دل میں اسکے صاف منہ پر کہدیا اس نے
نہیں آئینے سے کوئی زیادہ باصفا دیکھا

ظفر کی سیر اس گلشن کی ہم نے پر کسی گل میں
نہ کچھ الفت کی بو پائی نہ کچھ رنگ وفا دیکھا

جوگی بنا پھرے ہے اس ماہ وش کے غم میں
خورشید بھی بڑھا کر سر کی جٹا فلک پر

وہ حسن روز افزوں بڑھتا رہا ہمیشہ
سو بار تو رمہ کا بڑھ کر گھٹا فلک پر

دی ناز سے جو اس نے مژگاں کو اپنی جنبش
سو سو ڈبوئے نشتر ایک ایک نس کے اندر

نہیں ستارے کسی دل جلے نے گردوں پر
تفنگ آہ میں مارا ہے بھر کے چھرا صاف

جو تیرے قد سے ہو ہمسر تو سرو کے سر پہ
چمن میں شہپر قمری ہو فیصل آرا صاف

بے آرزو نہیں ہے یہاں کوئی دل مگر
ہر ایک دل الگ ہے ہر اک آرزو الگ

غیروں کے ساتھ یار ہے مے نوش اور ہم
حسرت سے بیٹھے پیتے ہیں اپنا لہو الگ

مغز میرا اڑ گیا ناصح نصیحت کو سلام
لو سدھارو گھر کو میں کرتا ہوں حضرت کو سلام

طالب دولت سلامی کب ہیں دولت مند کے
کرتے ہیں پردے میں اسکے اسکی دولت کو سلام

تیرے ہاتھ سے دشت وحشت کی ہیں
جنوں کب تلک خاک چھانا کروں

خرد کچھ کہے ہے جنوں کچھ مجھے
کہو میں کہا کس کا مانا کروں

سوزش غم سے جب مرے سینے کے گل چراغ ہوں
چارہ گروں کی عقل کے کیونکہ نہ گل چراغ ہوں

محفل انبیا ہو یا انجمن ملائکہ
اے ظفر ان میں حضرت شاہِ رسل چراغ ہوں

لوگ کہ ہاں کہ حضرت دل ان دغابازوں سے کیا
یہ ہیں وہ عیار جب دینگے دغا دینگے تمہیں

اے ظفر زخم جگر پر جب وہ چھڑکینگے نمک
اس محبت کا مزا اپنی چکھا دیں گے تمہیں

رقیب سنگدل کو لا بٹھاتے ہیں میرے سر پہ
اور آپ ہی پوچھتے ہیں مجھ سے وہ تم سرگراں کیوں ہو

یقیں جب یہ ہوا تمکو نہیں کوئی حسیں مجھ سا
تو پھر فرمایئے میری طرف سے بدگماں کیوں ہو

زلف اس کی صبا سے ہے برہم
دیکھو کافر ہوا سے لڑتی ہے

بزم میں ہر کسی سے آنکھ اسکی
چوری چوری حیا سے لڑتی ہے

اک روز میرے یار کی ابرو جو ہل گئی
لاکھوں سپاہی کٹ گئے تلوار چل گئی

شعلہ ہماری آہ کا ایسا ہوا بلند
بجلی تڑپ کے چرخ کہن سے نکل گئی

اے وائے انقلاب زمانہ کے زور سے
دہلی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی

نہ کر خیال کہ آئی گھٹا بہت سی ہے۔
ابھی تو شیشے میں مے ساقیا بہت سی ہے

کبھی ہمارا بھی خوں مل کے دیکھو ہاتھوں میں
لگائی آپ نے یوں تو حنا بہت سی ہے

زلف کے کوچے سے بہتر ہے دلا مانگ کی راہ
اس میں سو خم ہیں یہ اک سیدھی سڑک جاتی ہے

مجھ سے پھرا ہے سارا زمانہ جب سے پھری ہے تیری آنکھ
زلف ہی جب سے تیری برہم عالم برہم سارا ہے

اللہ اللہ رے اُن بتوں کا غرور
یہ خدائی نہیں تو پھر کیا ہے

موت آئے تو ٹل نہیں سکتی
اور آئی نہیں تو پھر کیا ہے۔

نہیں رونے میں گر ظفر تاثیر
جگ ہنسائی نہیں تو پھر کیا ہے

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہو ان پہ کیسی جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے

اے ظفر بھلا تجھے کس کا ڈر تو خدا کے فضل پہ کر نظر
تجھے ہے وسیلہ رسول کا وہی تیرا حامی کار ہے

ظفر

ظفر۔ نواب نصیر الدولہ معین الملک تجمل حسین خاں بہادر ظفر جنگ معروف بہ حشمت جنگ مسند آرائے فرخ آباد۔ اپنے چھوٹے بھائی نواب سخاوت حسین خاں کے مشورہ سے شعر کہتے تھے۔ بڑے سیر چشم عالی حوصلہ۔ دریا دل امیر تھے۔ علم موسیقی میں اچھا دخل تھا

۱۲۶۲ھ میں ۷۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ منیر شکوہ آبادی ان کی سرکار کے دعاگو تھے۔ کلام باوجود کوشش دستیاب نہ ہو سکا۔ صرف دو شعر بہم پہنچے وہ نذر ناظرین ہیں

اشک سے تر مرا گریبان ہے	ملک گوہر مرا گریبان ہے
اچھا نہیں ہے دامن محشر کا پھیلنا	چھوڑو نہ پائچے دم رفتار ہاتھ سے

ظہور

ظہور۔ منشی شیخ محمد ظہور حسین لکھنوی خلف منشی علیم اللہ۔ شاگرد حضرت امیر مرحوم آپ کے بزرگ عہد شاہی میں معزز رہے ہیں۔ یہ بھی واجد علیشاہ والئے اودھ کے زمانے میں کسی عہدہ پہ ملازم تھے۔ فارسی۔ عربی میں اچھی استعداد تھی۔ انگریزی سے بھی واقف تھے۔ شعر میں مضمون پیدا کرتے۔ زبان کی صفائی پر توجہ فرماتے۔ عرصہ تک سندیلہ میں حضرت واسطی مرحوم تعلقہ دار کی رفاقت میں رہے۔ منشی امیر حسن ہجر اور قاضی نہال الدین نہال ان کے تلامذہ سے ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

انصاف خوب برق تجلّی نے یہ کیا
دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طُور تھا

پروانے کا قصاص جو گلگیر نے لیا
گل شمع کا چراغ سر انجمن ہُوا

میرے سوال کا نہ دیا یار نے جواب
مُنہ کھولنا مرا اسے قفل دہن ہُوا

آنکھ سے گرتے ہی پیوند زمیں تھا طفل اشک
موت آئی گھٹنیوں چلنے کے قابل کیا ہُوا

سبزہ کیا مال ہے سنبل کی حقیقت کیا ہے۔
خط جو دس بیس پہ بھاری ہے تو سَو پر گیسو

تاک میں رند ہیں اور بنت عنب ڈھیان ہے
مجھکو بچنی نظر آتی نہیں حرمت تیری

سمجھکر سنگ اسود پوجتے تصویر پتھر کی
کہ حرمت میں بھی کچھ باقی ہے توقیر پتھر کی

ہوا غش صورت موسیٰ جو میں اس بت کے جلوے سے
بنیں پتھرا کے آنکھیں پتلیاں تصویر پتھر کی

جگہ ملتی آئی انگشت حنابند حسیناں پر
چمک اُٹھی ہے خاتم بن کے کیا تقدیر پتھر کی

وہ پا برکاب اور اجل سر پہ کھڑی ہے۔
اے نزع دو عملی میں مری جاں پڑی ہے

رو رو کے میری لاش پہ بولیں یہ حسرتیں
یہ تو کہو کہ ہم کو چلے کس پہ چھوڑ کے

ظہور

ظہور:- مولوی محمد ظہور علی دہلوی مرحوم خلف مولوی فتح علیخاں بہادر ۱۲۲۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ کتب درسیہ مفتی صدرالدّین خاں آزردہ سے پڑھیں۔ اوائل مشق سخن میں چند غزلیں شاہ نصیر اور حکیم مومن خاں کو دکھائیں۔ بعدازاں ذوق مرحوم سے تلمّذ اختیار کیا۔ ملازمت پیشہ اور مشہور خوشنویس تھے۔ پہلے مدّت تک تھانہ دار رہے۔ پھر سررشتۂ تعلیم میں مدّرس فارسی مقرر ہوئے۔ سرکار شاہی سے شمس الشعرا کا خطاب ملا تھا۔ ۱۲۸۶ھ میں بعمر ۶۵ سال انتقال کیا۔ ان کے والد سرکار انگریزی کے جاگیردار تھے گورنر جنرل ہند نے بمقام دہلی ۱۸۲۲ء میں بصلہ مدح گستری انہیں خلعت فاخرہ عنایت کیا تھا۔ سرکار شاہی سے بھی اکثر انعام واکرام ملتے رہتے تھے انکے چھوٹے بیٹے منشی ذوالفقار حسین مدرسہ دہلی میں مدرس تھے اور اُنھوں نے غنی تخلّص اختیار کیا تھا۔ ظہور مرحوم کو معمّا میں بڑا کمال تھا۔ اس فن میں ایک رسالہ جس میں معمّا حل کرنے کے قاعدے لکھے تھے نظم میں مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کو مرزا قادر بخش گورگانی نے طبع کرایا تھا۔ مگر یہ نسخہ ایّام غدر میں تلف ہوگیا۔ دیوان مطبوعہ میں بیشتر حصّہ غدر کے بعد کی تصنیف ہے۔ قصیدے اور مرثئے بھی خوب کہتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بھی اچھا ملکہ تھا۔ ظرافت اور بذلہ سنجی میں مشہور زمانہ تھے فکر بلند اور مضامین دلپسند ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

ہوا برباد کیا اے ہمصفیرو آشیاں اپنا
کہ گلشن میں رہا باقی نہ کچھ نام ونشاں اپنا

تمہارے دوستوں کا تو کلیجہ ہوگیا ٹھنڈا
بلا سے گر تپ غم میں ہمیں جلتا ہوا دیکھا

نہیں کچھ بود و نابود جہاں جائے غم و شادی
کہ یاں اسباب دنیا کو نہ ہرگز دیرپا دیکھا

گدا کو اے ظہور اکدم میں دیکھا یاں غنی ہوتے
غنی کو ایک لمحے میں یہاں ہوتے گدا دیکھا

تسکین دل ہو کیا ترے قول وقرار پہ
کب تک جیا کرے کوئی اس انتظار پہ

حیران ہوں دیکھکر سر مژگاں پہ اشک کو
کیوں طفل بیگناہ کو کھینچا ہے دار پہ

دشمنی ایک زمانے سے ہوئی ہے پیدا
اور کہ جا کے بتوں سے دل شیدا اخلاص

گردش ہے مجھے چشم کی مانند ہمیشہ / آوارہ ہیں گھر میں ہیں مسافر ہوں وطن ہوں
ہے چار طرف حسن کی جس کے یہ تجلی / وہ شاہد یکتا نہیں معلوم کدھر ہے
دلوں میں جب سے ہے فرق دلبر ادھر ہمارے ادھر تمہارے / جہاں میں تب سے یہی ہیں گھر گھر ادھر ہمارے ادھر تمہارے

ظہور

ظہور۔ منشی محمد ظہور خاں ساکن ریاست ٹیکم گڈھ ملک بندیل کھنڈ ان کا پیشہ ارباب نشاط کو تعلیم دینا ہے۔ فن موسیقی میں باکمال اور یگانہ سمجھے جاتے ہیں۔ علمیت اگرچہ زیادہ نہیں ہے۔ مگر نوشت و خواند میں مجبور بھی نہیں ہیں۔ طبیعت دار اور ذہین آدمی ہیں قریب ۵۵ سال عمر کے ہو گی۔ شاعری کا شوق عرصے سے ہے۔ اپنا کلام مولوی سید محمد نذیر حسن صاحب عباسی تخلص فتنہ رئیس سندیلہ کو دکھاتے تھے۔ بہت خوش آواز اور خوش لحن ہیں مشاعرے میں غزل اس طرح پڑھتے ہیں کہ تمام سامعین بے اختیار داد دیتے ہیں عرصے سے کوئی حال معلوم نہیں ہوا۔ فراہم شدہ کلام کا انتخاب درج ہے۔

بتوں نے باندھ رکھی ہے کمر ایذا رسانی پر / غضب ہیں جان کے پیچھے پڑے ہیں اس زندگانی پر
شباب آتے ہی دل کھنچنے لگے انکی طرف سب کے / ہزاروں انگلیاں اٹھنے لگیں اٹھتی جوانی پر
کیا اس درجہ کشتہ عاشقان سبزۂ خط کو / کہ قاتل جم گئی کائی ترے خنجر کے پانی پر
شہید عشق کا رتبہ مسیح و خضر کیا جانیں / مرے جاتے ہیں یہ طول حیات جاودانی پر
غضب ہے وہ نہ پائے کوئی قطرہ آب خنجر کا / کہ جس کی زندگی موقوف ہو اک گھونٹ پانی پر
ابھی بچپن ہے نچلے کیوں نہ بیٹھیں سادہ وضعی سے / قیامت بنکے اٹھیں گے جب آئینگے جوانی پر
ظہور اس سمت قاتل پھیرتا ہے حلق پر خنجر / ادھر حسرت کھڑی روتی ہے میری نوجوانی پر
کوئی مقتل میں دیکھے آکے یہ اعجاز قاتل کے / لگائی تیغ دشمن پر ہوئے ٹکڑے مرے دل کے
وہ کھل کھیلے تو دشمن کس طرح تجھ سے کبھی یا رب / نکلنے پائے جی بھر کے نہ اب تک حوصلے دل کے
ہوائے آہ مجنوں چل رہی ہے نجد کے بن میں / اڑے جاتے ہیں پردے آج سب لیلی کے محمل کے

ظہیر۔ راقم الدولہ سید ظہیر الدین عرف نواب مرزا دہلوی خلف میر جلال الدین خوشنویس ظہیر

ظہیر: راقم الدولہ سید ظہیر الدین عرف نواب مرزا دہلوی خلف میر جلال الدین خوشنویس

اُستاد محمد بہادر شاہ شاگرد خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ مرحوم آپ کے اکثر بزرگ سلاطین تیمور کے ہاں عہدہ ہائے جلیلیہ پر سرفراز و ممتاز رہے ان کے والد ماجد صلاح الدولہ مرصع رقم خاں حضرت بہادر شاہ بادشاہ غفران مآب کے فنِ خوشنویسی کے اُستاد تھے اور آپ خود بھی گیارہ سال کی عمر میں بعہدۂ داروغگی ماہی مراتب شرف اندوز ہوئے کسب علوم کا شغل اسی عمر تک رہا۔ بعدہٗ فن سخن کی طرف رجوع ہو گئی۔ حافظ قطب الدین خاں مشیہ۔ شاہ نصیر مرحوم کے مکان پر مشاعرہ کیا کرتے تھے قرب مکان کے باعث آپکو بھی شریک بزم ہونیکا اتفاق ہوتا تھا اور یہی صحبت آپکی شاعری کا باعث ہوئی حضرت ذوقؔ کے انتقال کے بعد اپنے کلام کی آپ ہی نظر ثانی کرتے رہے۔ اور ہمیشہ اپنے معاصرین کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ عرصہ تک شعر و شاعری کا بازار گرم رہا۔ پھر یکایک ہنگامہ غدر برپا ہو گیا اور تمام شہر مع قلعہ معلّٰے تباہ و برباد ہو گیا۔ اگلی صحبتیں درہم و برہم ہو گئیں۔ ہر شخص سراسیمہ اور پریشان حال ہو کر اپنی جان اور ننگ و ناموس بچانے کی فکر میں جنگلوں اور صحراؤں میں مُنہ چھپانے لگا۔ حضرت ظہیرؔ بھی تمام اثاث البیت سے دست بردار ہو کر اپنے مکان سے فرار ہوئے۔ عرصہ تک بادیہ گردی اور دشت نوردی کا اتفاق رہا۔ آخر کار دارالریاست رامپور میں جا کر پناہ گزیں ہوئے۔ آپ کے والد اور چھوٹے بھائی امراؤ مرزا انورؔ بھی آپ کے ہمسفر تھے۔ دہلی میں جب امن و امان نے اپنی صورت دکھائی۔ اور سرکار سے واگذاشت جائداد کا حکم ہوا۔ تو آپ اپنے مکان پر تشریف لائے اور اثاث البیت پر قبضہ حاصل کیا۔ اب قوت لایموت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ چند روز کچھ وجہ معیشت بہم پہنچا کر گذر اوقات کی۔ پھر منشی گنیشی لال مالک اخبار جلوۂ طور نے آپ کو بلند شہر بلا لیا۔ اور اپنے اخبار کا اڈیٹر کر دیا۔ کچھ دن وہاں بسر ہوئے۔ پھر اپنے والد کے انتقال کے باعث دہلی چلے آئے۔ اسی اثناء میں مہاراجہ صاحب الور نے یاد فرمایا۔ چند روز ان کی رفاقت میں گذارے لیکن قسمت سے وہاں زیادہ مدّت رہنا نہ ملا۔ الور سے بھی آپ کا آب و دانہ اُٹھ گیا۔ اب

پھر پھر اکر دہلی آگئے۔ حسن اتفاق سے گذشتہ صحبت اور یاروں کی ٹولی پھر گرم ہوگئی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مکان پر مشاعرے ہونے لگے۔ مولانا الطاف حسین حالی کی ابتدائی مشق تھی۔ غدر کے قبل کے مشاعروں میں سید معین الدین معینؔ۔ مولوی عبدالکریم صاحب منورؔ۔ حکیم مولابخش قلقؔ۔ میاں غلام احمد تصویرؔ۔ میاں عبدالقادر توقیرؔ۔ نواب مرزا خاں داغؔ۔ وغیرہ باکمال شعراء کے ساتھ شریک بزم ہوا کرتے تھے۔ الغرض چند دنوں تک یہی صورت رہی پھر میاں ظہیر کو آب و دانے کی کشش جے پور لے گئی۔ وہاں پہنچتے ہی ملازم ہوگئے۔ حضرت انورؔ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ وہ بھی وہیں رہنے لگے بیس سال تک فکر سخن کا بالکل موقع نہ ملا۔ بعد انتقال مہاراجہ رام سنگھ والیٔ جے پور روزگار ترک کر کے خانہ نشینی اختیار کی۔ مگر یہ صورت بہت دنوں تک نہ رہی۔ تھوڑے ہی دن بعد خوش قسمتی دکن کی طرف لے گئی۔ اور آپ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم مملکت حیدر آباد کی سرکار سے وابستہ ہوگئے۔ وہیں دیوانوں کی ترتیب عمل میں آئی اور آپ کے تینوں دیوان یکے بعد دیگرے آگرہ اور بمبئی میں طبع ہوکر اشاعت پذیر ہوئے۔ آپ کے کلام میں زبان کے لطف کے ساتھ استعارہ اور مضامین کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ مضامین میں باریکیاں نہیں بلکہ موشگافیاں کرتے تھے۔ اور ادائے مطلب اور طرز کلام میں بہت فصاحت اور صفائی تھی۔ آپ دہلی کے پرانے سکول کی شاعری کے چند باقی ماندہ نمایندوں میں سے تھے۔ مؤلف تذکرہ کے دولت کدہ پر راقم بھی دو تین بار آپ کی ملاقات سے لطف اندوز ہوا۔ نہایت خوش خلق اور ملنسار بزرگ تھے۔ حیدر آباد میں مارچ ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ میں جاں بحق ہوئے۔ آپ کے دم سے راجستان اور دکن میں اردو شاعری کے مذاق کو بہت فائدہ پہنچا۔ آپ کے تلامذہ کثرت سے تھے۔ جن میں یہ نام قابل ذکر ہیں۔ نادر علی برترؔ۔ صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشق ٹونکی۔ محمد ابراہیم دبیرؔ۔ سید حسن سید بھوپالی۔ خواجہ حسین اثرؔ۔ سعید الدین تمناؔ۔ سورج نرائن خاطرؔ

رمضان علی۔ اختر سہارنپوری۔ اشتیاق حسن شوق۔ گوری شنکر قصیر دہلوی وغیرہم۔
انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

انتخاب از دیوان اوّل

اِک اِک خطا شعار سے رحمت کو ہے لگاؤ
اُلجھا ہے خار خار سے دامن نسیم کا

مرنا ہے جینے جی ترے رنجور کا علاج
رکھّا ہے تونے درد میں درماں سقیم کا

پرستش تری جناب میں کیا زہد و کفر کی
عالم ہے مستحق ترے فیضِ عمیم کا

منظور کچھ شہود سے اپنا ظہور تھا
ہونے کو یوں تو نور سے پہلے بھی نور تھا

اے برق کس کی آگ میں کس کو جلا دیا
ہم بہر سوز رشک تھے جلنے کو طور تھا

ساقی کی چشم شوخ کی کیفیتیں نہ پوچھ
جس سے نظر لڑی وہی مستی میں چور تھا

کہے دیتا ہے رہ رہکر کھٹکنا دل میں پیکاں کا
یہ تیر بازگشتی ہے اُسی برگشتہ مژگاں کا

لب جاں بخش پر جھوٹے مسیحائی کے دعوے ہیں
کہ تم پر دم نکلتا ہے مریض درد ہجراں کا

سلیقہ شرط ہے ہر کام کو بیداد آساں ہے
کبھی آنسو بھی پوچھا ہے کسی کے چشم گریاں کا

ملا یا خاک میں جنکو تو پھر ان سے کدورت کیا
مٹا دو دل سے نقشہ خاکساروں کے مزاروں کا

گریگا خود فلک جانِ عدو پر برق بن بن کر
پڑیگا صبر آخر تو کہیں ہم بے قراروں کا

ذرا سے لب ہلانے میں تمہارا کیا بگڑتا ہے
کہ اک اُمّید پر ہوتا ہے جینا بے قراروں کا

ستم دیکھو کہ دل لے کر مکرنا اور یہ کہنا
تمہیں کیوں اعتبار آنے لگا بے اعتباروں کا

تکلّف برطرف اے میکشانِ محفلِ رنگیں
ظہیر مردہ دل بھی تھا کبھی تو یار یاروں کا

دشت گردی کا مزا قیس کو حاصل نہ ہُوا
خاک ہو کر بھی غبار پس محمل نہ ہُوا

شب غم اور ستمہائے شب غم
فقط گرنا ہے باقی آسماں کا

اُٹھ چکے ہیں حجاب حائل سب
چشم مجنوں ہے پردہ محمل کا

لیا جو رستہ نفاق و کیں کا تو پھیر کھایا کہیں کہیں کا
ملا نشاں منزل یقیں کا تو ایک تھا جادہ کفر و دیں کا

خود بخود دل مرے سینے سے کھنچا جاتا ہے
دلربا آپ کی ایک ایک ادا کو دیکھا

وہ نگاہِ شرمگیں کچھ اس ادا سے پھر گئی
آگیا انکار میں ہم کو مزہ اقرار کا

خوں بہائے عاشق ناشاد کیا
دلبروں کی داد کیا فریاد کیا

دل کو چاہا جس طرح سمجھا لیا
غمزدوں کا شاد کیا ناشاد کیا

نامرادی جس کی ٹھہری ہو مراد
وہ دل ناشاد ہو پھر شاد کیا

ہم کہاں جائینگے چھٹ کر دام سے
چھوڑ کر ہم کو کرے صیاد کیا

بدمستی و رندی میں یہاں عمر گذاری
باقی جو رہی یونہیں گذر جائے تو اچھا

نہ مانوں گا ناصح کہ دل پر ہے قابو
لگا کر کسی سے دکھایا تو ہوتا

وہم تھا یہ خط تقدیر نہ مٹ جائے کہیں
بدگماں نے مجھے سر پاؤں سے ملنے نہ دیا

حسب خواہش گر خدا دیتا تو انساں حریص
حشر تک ہر شے یونہیں نوبت بہ نوبت مانگتا

جسقدر ثروت بڑھی اتنی بڑھی حرص و ہوا
خوب تھا انساں اگر صبر و قناعت مانگتا

اس جور و ستم پر تو ہے پیار چلا آتا
گر مہر و وفا ہوتی کیا قہر خدا ہوتا

تھی سر راہ میکدہ مسجد
رہگیا پردہ پارسائی کا

سادگی میں ہے بانکپن کی نوک
ہائے انداز کج ادائی کا

رہنے دے بتکدے میں نہ چھیڑ اے خدا پرست
جاتا رہوں نہ کفر سے ایمان تو گیا

جفاؤں پر وفا کرنی بڑے مردوں کی باتیں ہیں
بنا ہے چار دن تم سے کسی سے ہو نہیں سکتا

تمہارا کیا ہے تم تو قطع الفت کر چکے ہم سے
تمہیں ہم چھوڑ دیں یہ اپنے جی سے ہو نہیں سکتا

مجھی کو ذبح کرنے کو بنے ہیں سب نصیحت گر
اوسے سمجھائے جا کر کوئی ایسا ہو نہیں سکتا

کون بنتا ہے مکیں اس خانہ برباد کا
یہ دلِ ویراں نمونہ ہے جہان آباد کا

اک نگہ میں جاں بلب اک ادا میں شاد کام
شاد کرنا بات کیا ہے عاشق ناشاد کا

چارہ گر کیا پوچھتا ہے اسکے مژگاں کی خلش
ہے مری رگ رگ میں عالم نشتر فصّاد کا

یہ کانٹا بھی نکل جائے شب ہجر
کہ دم کے ساتھ ہے کھٹکا سحر کا

وُہ ہیں پیش نظر اور پھر نہیں ہیں
سراسر ہے قصور اپنی نظر کا

بتوں سے ڈھب نہ حوروں سے رسائی
ادھر کا ہے نہ یہ زاہد اُدھر کا

کسی کا گلہ کرکے ہم کیوں بُرے ہوں
کوئی منفعل آپ ہوتا رہیگا

جسے خواب میں تم دکھا دوگے صورت
توقع میں تا حشر سوتا رہے گا

اے ظہیر اچھّی نہیں آتش رخوں سے چھیڑ چھاڑ
اس ہنسی میں ایک دن جی کا زیاں ہوجائیگا

اُن کے دل کی کدورتیں نہ مٹیں
اپنی ہستی مٹا کے دیکھ لیا

کچھ نہیں کچھ نہیں محبّت میں
خوب جی کو جلا کے دیکھ لیا

گوارا ہے جو کچھ گوارا نہیں ہے
مجھے پاس کیا جانے کیا ہے کسی کا

گذرنا وادیِ تسلیم سے کار نمایاں ہے
قدم یاں لڑکھڑا جاتے ہیں وقت امتحاں کیا کیا

مری آنکھیں ہی لڑ لڑ کر قیامت مجھ پہ ڈھاتی ہیں
نگاہیں توڑتی رہتی ہیں مجھ پر بجلیاں کیا کیا

جب زمیں پر پاؤں دھرنے کا سہارا ہوگیا
آدمی سمجھا فلک کا میں ہی تارا ہوگیا

مٹ گئے دنیا کے جھگڑے اک نگاہِ ناز میں
تم ہمارے ہوگئے عالم ہمارا ہوگیا

ناگوار خاطرِ رشک آفریں کیا کچھ نہ تھا
مختصر یہ ہے کہ اب سب کچھ گوارا ہوگیا

ہائے ہم اور ترکِ پاسِ وضع اور پھر اسقدر
دل کے ہاتھوں کیا کہیں کیا کچھ گوارا ہوگیا

کیوں ظہیر خستہ جاں دیکھا محبّت کا مزہ
دو ہی دن میں کیا سے کیا عالم تمہارا ہوگیا

آنکھیں تِنی کُھل گئیں تیرے جلووں کو دیکھکر
گویا نظر سے ایک زمانہ گذر گیا

ہم کوچۂ دشمن میں بچھا دیں گے نگاہیں
دیکھیں گے کہ بچ بچ کے وُہ جاتے ہیں کدھر آج

ہو چلا ہے کفر میرا رہنمائے راہِ دیں
خلد مجھ کو یاد آیا کوئے جاناں دیکھ کر

حوصلے جرم کے کچھ اور بڑھا دیتے ہو۔
تم کچھ اس ڈھب سے بگڑتے ہو خطا واروں پہ

کچھ تحفے لیکے جائیے اہلِ وطن کے پاس
اقرار بھی اُسی سے اُسی سے جواب بھی
شکوہائے بیقراری سن کے وُہ کہنے لگے
عشق کیا شے ہے حسن ہے کیا چیز
ستم وہ کس پہ کرتے ہیں کسے ناحق ستاتے ہیں
یہاں غفلت شعاری ہے وہاں آمرزگاری ہے
مجھ سے ہی کیوں نہ پوچھئے میری بُرائیاں
مجھ سے بے مہری دُشمن کے گلے ہیں ان کو
ضد ہے اگر وفا سے تو اچھّا جفا سہی
بھلی لگتی ہے کچھ جس کو تمہاری کج ادائی بھی
خدا کی خدائی میں سب چیز ہے
ستمگاروں کی دلجوئی بھی عیاروں کی گھاتیں ہیں
کچھ تو ہوتے ہی ہیں الفت میں جنوں کے آثار
یہیں تم کیوں نہ سُن لو دردِ دل گر تمکو سننا ہے
یہاں یہ شوق مرن ہے کہ زندہ ہو کے مر جائیں
جلوہ سو سو رنگ میں ہے پردہ در
کبھی آنکھوں میں آنسو ہیں کبھی ہونٹوں پہ نالے ہیں
یہاں بن بنکے مری جاں کہاں جاتے ہیں
عجب کیا اُسکی رحمت سے اگر وُہ بخشدے زاہد
فکر آزادی سے پابند وفا آزاد ہیں
دام سے چھوٹے تو سمجھو قید ہستی سے چھٹے

اِک زخم تازہ چاہئے داغِ کہن کے پاس
اک دوسرا دہن بھی لگا لو دہن کے پاس
تم تو ایذا دوست ہو آرام جاں سے کیا غرض
کچھ ادھر کی ہے کچھ اُدھر کی آگ
اُسی کو آزماتے ہیں جسے اپنا بناتے ہیں
وہ ہم کو یاد رکھتے ہیں ہم اُنکو بھولجاتے ہیں
مجھ سے سوا تو غیر مرا راز داں نہیں
واہ کس لطف کے پردے میں جفا کرتے ہیں
دلدار کیا کہ تم تو دل آزار بھی نہیں
بُرے ہو کر بھی تم اچھے ہو اچھّا اسکو کہتے ہیں
مگر دادِ خونِ شہیداں نہیں
یہ کس کے دوست بنتے ہیں یہ کسکے یار ہوتے ہیں
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں
یہیں ہم کیوں نہ کہدیں جو ہمیں کہنا ہے محشر میں
وہاں یہ بدگمانی ہے کہ جی اُٹھیں نہ ٹھوکر میں
گھر میں کیا ہو تم کہ ہو بازار میں
فلک شاباش ہے کیا کیا مرے ارماں نکالے ہیں
یہ مرے قتل کے سامان کہاں جاتے ہیں
کہ آمرزش کے قابل ہم گنہگاروں کی باتیں ہیں
ہم رہا ہو کر اسیر الفت صیّاد ہیں
ہم اسیرانِ قفس خود قید کی میعاد ہیں

اے ظہیرؔ اپنے سخن میں کیوں نہ ہو لطف زباں
مری بے جوہری پر اہل جوہر رشک کرتے ہیں
کوئی دم کا مسافر ہوں کوئی ساعت کا ہوں مہماں
دل میں وہ زینت کا شانہ بنے بیٹھے ہیں
کیا بُری شے ہے محبّت بھی الٰہی توبہ
زمانے سے وفا کرتے ہو تم تو
سمائی ہے ظہیرؔ ان کو یہ نخوت
کچھ سوچ لو کچھ دیکھ لو اس عشق کے انجام
ہر دم ان کا خیال ہے مجھکو
سب آفتیں جہاں کی مرے دم کیساتھ ہیں
اِک التفاتِ عام نے سب کچھ بھلا دیا
ستم کو جو سمجھنا ہو عنایت
مِرے گھر شوق سے آجاؤ ناصح
اچھّا نہیں اتنا بھی لگا ہوں کا چرانا
قیامت پر نہ رکھو فیصلہ دل کا خدا جانے
زبان خاص اُردوئے معلّٰی اس کو کہتے ہیں

ہم نمک پروردہ شاہجہاں آباد ہیں
وہ ناقص ہوں کہ میں اس نقص میں بھی فن میں کامل ہوں
نگاہ ناز قاتل ہوں ادائے رقص بسمل ہوں
اور اس ربط پہ بیگانہ بنے بیٹھے ہیں
جرم ناکردہ خطاوار بنے بیٹھے ہیں
جہاں میں بے مروّت ہوں تو میں ہوں
جہاں میں خوبصورت ہوں تو میں ہوں
ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ دشمن کو نہ چاہو
ہجر میں بھی وصال ہے مجھکو
بجلی ہی کیوں گرے جو مرا آشیاں نہ ہو
ایسے سے کیا گلہ ہو جو نا مہرباں نہ ہو
شکایت ہو تو پھر ایسے سے کیا ہو
یہ سمجھوں گا کہ تم بھی اِک بلا ہو
ایسا نہ ہو تم خلق میں انگشت نما ہو
تمہارے مُنہ سے کیا نکلے ہمارے منہ سے کیا نکلے
غضب جادو بیاں تم تو ظہیرؔ خوش نوا نکلے

انتخاب دیوان دوم

ملنا ترا حشر پر ہے معلوم
آیا جواب نامہ دل ناامید کا
نظر میں نیند بن کر پھر رہا ہوں

ہوگا جیسے اعتبار ہوگا
قاصد کا سر گواہ ہے خط کی رسید کا
نگہبان میں ہوں خواب پاسباں کا

ظہیر آؤ چلو اب میکدے کو
نکالا زہد و تقوے نے ہے کہاں کا

کشتۂ ناز ک زمانہ ہے
تیغ منہ دیکھتی ہے قاتل کا

اور تو دے لیں گے ہم سب کا جواب
لیکن ان کی گالیوں کا کیا جواب

چلو مل جاؤ طے ہو جائیں جھگڑے
کہاں کے جھگڑے اور کس کی شکایت

ان کے وعدے پہ تسلی شب غم دیتے ہیں
ہم بھی کیا کیا دل بیتاب کو دم دیتے ہیں

بزم دشمن میں بلاتے ہیں غضب تو دیکھو
اس پہ اپنے سر نازک کی قسم دیتے ہیں.

مجھے ہاتھ سے کھو کے روئیگی دنیا
فلک نے بہت پھر کے پایا ہے مجھکو

اٹھا دی جنوں نے قیود مذاہب
بڑی کشمکش سے چھڑایا ہے مجھکو

خطا بھی کوئی کوئی تقصیر میری
وہی ہوں میں جیسا بنایا ہے مجھکو

آج کل ہے نصف ہندی نصف انگریزی ظہیر
اب تو اردو میں زبان میر آدھی رہ گئی

خدا ملتا ہے ڈھونڈے سے اگر انسان جویا ہو
مگر ہاں آدمی کو آدمی مشکل سے ملتا ہے

انتخاب دیوان سوم

تو نے خود چھیڑ کے پھر یاد دلائی اپنی
ہم تو بھولے ہوئے بیٹھے تھے فسانہ تیرا

نہ کہیں طبیعت آتی نہ کسی پہ جان جاتی
نہ یہ دل بغل میں ہوتا نہ یہ حال زار ہوتا

یہ ہمیشہ مرنا جینا یہ امید و بیم کیسی
وہ بلا سے تھا جو ہوتا کہیں ایک بار ہوتا

زندگی بھر اسی امید پر مرتے رہتے
تیرے وعدوں کا ستمگر جو بھروسا ہوتا

سمجھو بات پردہ کی ہے بس پردہ ہی رہنے دو
نہ پوچھو اس دل بیتاب میں ہے آرزو کیا کیا

جلوہ گر ہے ان بتوں میں کون زاہد دیکھ تو
تو جسے کہتا ہے کعبہ ہے وہ بتخانہ مرا

بیقرار ہی ہیں اجزائے دل بیتاب دیکھ
گوہر غلطاں ہے اک اک اشک کا دانہ مرا

بزم دنیا میں ملے ہیں مجھ کو یہ دو غمگسار
شمع ہے مونس مری دلسوز پروانہ مرا

نالوں کے جتانے تو اُٹھے دل سے ہزاروں
کمبخت نکلنے کوئی ارماں نہیں دیکھا

بُرا ہوتا بھلا ہونا لکھا تھا جو مقدّر میں
بلا سے ایک بار اے گردشِ ایام ہو جاتا

کیا تماشہ ہو کہ ہو حشر میں باہم تکرار
تم کہو دل مرا ہَیں تم سے کہوں دل میرا

یار کچھ کہہ تو سہی کیا ترا مشرب ہے ظہیرؔ
کافر اپنا تجھے کہتے ہیں مسلمان اپنا

ہیں کسی کا کبھی شرمندۂ احساں نہ ہُوا
ملک الموت بھی آکر مرا پُرساں نہ ہُوا

دہلی اُردو کی کان ہے گویا
کان کیسی جہان ہے گویا

یہ وُہ خطّہ ہے سرزمین اس کی
ہند کا آسمان ہے گویا

تھی جب آباد تھی کبھی دِلّی
اب تو اُجڑا مکان ہے گویا

اَب نہ دہلی رہی نہ وُہ گفتار
ایک باقی نشان ہے گویا

جو زباں ہے بچی کُھچی باقی
کوئی دن مہمان ہے گویا

ہے نئی روشنی رواج پذیر
دوسری اب زبان ہے گویا

نیم اُردو ہو نیم انگریزی
یہ عبارت کی شان ہے گویا

بن گیا شیخ خُلد کا مختار
اس کے گھر کی دکان ہے گویا

ہر طرح دِلنشیں ترا پیکان ہو گیا
غم بن گیا کبھی کبھی ارمان ہو گیا

اے چشم انتظار ترے شوق کو سلام
دشمن اب انکے در کا نگہبان ہو گیا

تلپٹ کیا دل اُڑا کے جھٹ پٹ
اللہ رے نظر ترا جھپاکا

کیوں کیسی پلائی شیخ صاحب
یاروں سے ملاؤ ہاتھ آ کا

او قولِ الست کے نوازن
مشتاق ہے دل اسی صدا کا

زلف شبگوں کا دھیان ہے دلکو
رات بیمار پر ہے بھاری آج

ملا نصیب سے ہم کو مزاج داں صیّاد
لگا رہا ہے چمن زیرِ آشیاں صیّاد

کہانیاں تو بہت عمر بھر سُنی ہونگی
کلیجہ تھام کے سن میری داستاں صیّاد

کسی کمبخت نے چاہا اگر تم کو خطا کب کی
تمہیں بھی پیار آجاتا ہے اکثر اپنی صورت پر

بگڑنے کے ہیں سو پہلو خفا ہونا ہی جب ٹھہرا
نئی رنجش پہ رنجش ہے نئی تہمت پہ تہمت پر

یہ آنا موت کا آنا ہے جانا جان کا جانا
وہ آئے تیر کی صورت گئے برق تپاں ہو کر

کہتے ہیں کیا سمجھ کے ہمیں تو نے دل دیا
ہوتا ہے لین دین کسی اعتبار پر

دل وہی نے اور بھڑکایا فلق کی آگ کو
آنسوؤں نے پاؤں پھیلائے ہیں دامن دیکھکر

کیا جانے کوئی کون ہیں کیا ہیں کہاں ہیں ہم
جس بزم میں پڑے ہیں وہاں آسماں ہیں ہم

آکر تمہاری بزم میں اتنے سبک ہوئے
دشمن تو دشمن اپنے بھی دل پر گراں ہیں ہم

شوق دیدار طلب طاقت دیدار نہیں
عاشقی کھیل نہیں کار ہوس کار نہیں

جب سے کعبے کو سدھائے ہیں ظہیر میخوار
کوئی جاروب کش خانۂ خمار نہیں

شام ہجراں کی درازی کیا کہوں
ایک شب کی چار راتیں ہو گئیں

کوہکن کیا جی پہ کھیلا اے ظہیر
ایسی لاکھوں وارداتیں ہو گئیں

وصل دشمن کوئی رخ ہے کہ چھپا سکتے ہیں
راستی حرف غلط ہے کہ مٹا سکتے ہیں

بزم جاناں میں مسلمان کا مردہ ہے رقیب
نہ جلا سکتے ہیں اسکو نہ بہا سکتے ہیں

ہائے بگڑی ہوئی قسمت کو بنائیں کیونکر
بات بگڑی ہو تو سو طرح بنا سکتے ہیں

وہ جلوے پیش نظر ہیں جو دو جہاں میں نہیں
مگر بیان کی قدرت مری زباں میں نہیں

زباں سے رنج نہاں شکوے بن بنکر نکلتے ہیں
چبھے ہیں دل میں جو کانٹے یہ نشتر نکلتے ہیں

ہوس مرنے کی ہوتی ہے دوبارہ دادخواہوں کو
وہ اس انداز سے نادم سر محشر نکلتے ہیں

دنیا کے دغاباز ستمگر یہ حسیں ہیں
ایسوں کے مگر چاہنے والے بھی ہمیں ہیں

جل تھل بھرے ہیں دیدۂ خونابہ بار میں
نشتر کی دیر ہے رگ ابر بہار میں

بدنام کرنے والے ہوئے سینکڑوں تو کیا
ہوتا ہے ایک چاہنے والا ہزار میں

ہم جانتے تھے ہوتی ہے دونوں طرف سے چاہ
دھوکے کے بہت اٹھائے اسی اعتبار میں

ہم سا مشتاق کوئی اور نہ پائیگی کہ ہم
صبح تک تیری بلائیں شبِ غم لیتے ہیں

جا نکلتے ہیں جو میخانے کی جانب کو ظہیر
دوڑ کر اہل خرابات قدم لیتے ہیں

اُسے مدِ نظر کیا ہو اُسے اپنی خبر کیا ہو
برنگ آئنہ حیرت میں جو محو تماشا ہو

چھپے چوری سے گر ملتے رہو باہم تو بہتر ہو
نہ میں رسوائے عالم ہوں نہ تم بدنام گھر گھر ہو

چلے ہو اُٹھ کے کدھر کو ذرا سنو تو سہی
مزاج کیوں ہُوا برہم اجی کہو تو سہی

نوجوانی گئی شباب گیا
جھانکنے تاکنے کی خو نہ گئی

توبہ توبہ غیر پر ان کی طبیعت آئیگی
یہ وُہ آنکھیں ہی نہیں جن میں محبت آئیگی

ہم جتاتے نہ محبت نہ جدائی ہوتی
بات نکلی ہوئی منہ سے نہ پرائی ہوتی

بسر کرلینگے مگر کر ستم کش بھی کہیں اپنی
اُٹھا لے اے فلک دنیا کے پردے سے زمیں اپنی

نظر لڑتی رہی جب تک نہ تھی کچھ قدر نظارہ
ہوئے جب روزن در بند آنکھیں کھل گئیں اپنی

پیامی کی زباں سے تو بہت کچھ سن لیا تم نے
سنائیں گے حقیقت اپنے منہ سے کچھ یہاں اپنی

کرتا ہے کچھ اثر شوقِ شہادت
رہ جاتی ہے کھنچ کھنچ کے جو شمشیر کسی کی

جواب التجا کا ہے قطع تعلق
رسید اپنے خط کی سرنامہ پر ہے

یاد آتے ہیں جب عہد جوانی کے فسانے
شعلہ سا نکل جاتا ہے دل اور جگر سے

آسماں سے جو نہ اُٹھا بوجھ وہ اس نے لیا
حوصلے اللہ و اکبر خاک بے بنیاد کے

آنکھ کے لڑتے ہی کیا کیا خلق میں طوفاں اُٹھے
باندھنو کیا کیا بندھے افواہے بے بنیاد کے

ع

عا، **عابد**:۔ مرزا زین العابدین خاں عرف کلن خاں ولد صاحب زادہ اصغر علی خاں نواب یوسف علیخاں جنت آشیاں والیِ رامپور کے داماد اور جے پور میں مدار المہام تھے ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے موزونی طبع سے شعر کہتے کسی سے مشورہ کا اتفاق نہیں ہُوا۔ جب حضرت

امیر مینائی مرحوم نے تذکرہ انتخاب یادگار تالیف کیا تھا۔ اُس وقت ان کی عمر بیالیس سال کی تھی۔ ان کی بیگم کو مہاراجہ مرحوم نے دھرم کی بہن بنایا تھا اور نہایت مہربانی فرماتے تھے جناب عابد کو مضامین عاشقانہ بزلہ سنجی و نازک خیالی میں کمال تھا۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

مُنہ دکھانے میں تمہیں کونسی مجبوری تھی
نظر کعبہ میں جو آیا اسی کو دیر میں دیکھا
اے کاش نکلیں یہ بھی تو لخت جگر کے ساتھ
جینے نہ دے ہجر یار مرنے نہ دے انتظار
غیرت تو کیوں نہیں ہے پہ مجبور دل سے ہوں

حال دل تھا نہ ہمارا کہ دکھایا نہ گیا
عبث جھگڑا ہے اے شیخ و برہمن کفر و ایماں کا
ارماں بھرے جو دل میں ہمارے ہزار ہیں
جاں یونہی بیقرار دیکھئے کب تک رہے
بنتی نہیں ہے یار سے بے التجا کئے

عابد ۔ سید عابد حسین سہسوانی ابن سید غضنفر حسین شاگرد حضرت امیر مینائی۔ عربی فارسی کے علاوہ زبان انگریزی سے بھی ماہر تھے۔ علم عروض جناب قدر بلگرامی سے حاصل کیا تھا۔ طبیعت وقاد اور ذہن رسا تھا۔ شعر میں کوئی نہ کوئی بات نکالتے انداز بیان کی شوخی سے کلام میں رنگینی پیدا کر دیتے الفاظ کی خوبی بندش کی خوش اسلوبی آپ کے ماہر فن اور کہنہ مشق ہونے کا ثبوت دے رہی ہیں۔ پندرہ برس کے قریب ہوئے کہ آپ نے انتقال کیا۔ بہم رسیدہ کلام کا انتخاب نذر ناظرین ہے

کہا تھا نہ جا اسکے کوچے میں لیکن
نہ کروں چاہ بتوں کی تو کروں کیا واعظ
اک مزے کا مشغلہ تو دل کے بہلانے کو ہے
پھر آئے مسجدوں میں حرم کی بھی سیر کی
دل کی تسکین کو بنا لیتے ہیں ہم سو باتیں
عابد یہ وہاں پلٹ کے نہ آئیں گے پھر کبھی

یہ دل کب کہا مانتا ہے کسی کا
دوسرے کام کے قابل ہی نہیں دل اپنا
ہم نے مانا حاصل آہ و بکا کچھ بھی نہیں
جو بتکدہ میں لطف ہے عابد کہیں نہیں
بھول کے بھی جو ادھر آپ نظر کرتے ہیں
دنیا کے خوب لطف اٹھا لو شباب میں

حضرتِ عابد حرم کو جائیں کیوں　　کوئے جاناں کعبہ ہے انکے لئے

وعدہ کو لازمی وفا بھی ہے　　شرط کے واسطے جزا بھی ہے

کاوشِ خارِ غم کا حال نہ پوچھ　　کچھ کھٹک بھی ہے کچھ مزا بھی ہے

مزا ہے زہد کا رندی کیساتھ اے واعظ　　شراب شب کو پیئے دن کو روزہ دار رہے

تیغ سے وقتِ ذبح مل مل کے　　رو لئے خوب حوصلے دل کے

وہ جب آئے برنگِ بادِ بہار　　ہو گئے گل چراغ محفل کے

جب ابھارا شباب نے ان کو　　لے اُڑے مجھ کو ولولے دل کے

دل کو تھامے ہوئے نکلتا ہے　　جو نکلتا ہے تری محفل سے

دم لے اے چشمِ تر آنسو نہ بہا رہنے دے　　خوں شدہ دل کا مرے کچھ تو پتا رہنے دے

دل کو لے لے مگر او تیرِ فگن دل کی جگہ　　ناوک اپنا مرے سینے میں پڑا رہنے دے

اشاروں سے کیا کرتے ہو باتیں　　زباں کا کام لیتے ہو نظر سے

کوئی تاثیر دکھائے کششِ دل ایسی　　کہ طبیعت کی طرح آئیں نہ آنیوالے

عابد

عابد:۔ میرزا خاں صاحب دہلوی خلف و تلمیذ حضرت سالک دہلوی۔ نہایت خوش گو اور نکتہ سنج تھے۔ دہلی اور حیدرآباد کی ہیرا پھیری میں کلام ضائع ہو گیا پانچ چھ سال ہوئے قریبًا چالیس برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

ایک تو موسم گل اس پہ گھٹا ہے واعظ　　دل پہ کس طرح سے قابو رہے میخواروں کا

شمع پروانے کو محفل میں جلا کر نہ بچی　　دیکھو انجام یہ ہوتا ہے دلِ آزاروں کا

نقد جاں عشق کو درکار ہے اے بوالہوسو　　جنس ارزاں ہو تو مجمع ہو خریداروں کا

اہلِ ظاہر پہ کھلے کیا مدعا منصور کا　　کس طرح کوتہ نظر پا جائے مضموں طور کا

اتفاقاً مل گئے ہو آج تو مدت کے بعد
ماجرا سننا پڑے گا عابدِ مہجور کا

عابد

عابد:۔ منشی دیبی دیال خلف منشی بسنت رائے قوم کایستھ ساکن قنوج ضلع فرخ آباد قنوج میں وکالت کرتے تھے۔ ۱۲۹۱ھ تک حیات تھے۔ ان کا دیوان انھیں کی زندگی میں شائع ہوگیا تھا۔ تلمّذ کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ شاعر معمولی درجہ کے تھے۔ کلام میں رطب و یابس موجود ہے۔ قدیم تخیل صنائع بدائع مضمون آفرینی کو شاعری کی روح و رواں جانتے تھے۔ خیال کی رسائی ضلع جگت کے دائرہ تک تھی۔ ان کے دیوان سے اشعار ذیل منتخب کئے گئے ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔

آیا گلشن میں جو خنداں گلِ رعنا میرا — خوب سرسبز ہوا نخلِ تمنّا میرا
ہجرِ مہ وش میں جو کاہش مجھے ہر شب کو ہی — بدر نے سیکھ لیا ہے وہی گھٹنا میرا
سوزِ فرقت نے جو اشکوں کا بہایا دریا — اس میں ماہی کی جگہ ہونگے سمندر پیدا
جوانی ہے جو لطفِ عمر پیری ہے مآل اس کا — مثل مشہور ہے یہ ساتھ ہے چولی سے داماں کا
کہا میں نے کہ کہتا ہوں میں سوزِ دل سرِ محفل — کہا اب تک یہ پوشیدہ ہے سب ماجرا چپ چپ
کہا میں نے پریشاں حال کس نے کر دیا مجھکو — کہا دشمن تری ہے زلف کی کالی بلا چپ چپ
کہا میں نے یہ کس سرمے نے میری کھولدیں آنکھیں — کہا میرے قدم کی خاک سے وہ توتیا چپ چپ
عقبیٰ میں جب کہ دیکھیگا حق نامۂ عمل — عابد جھکا کے سر کو کہیگا خطا معاف
ملنا اگر ہو وصل کا وعدہ ہو راست راست — کہتے کبھی ہو صبح کبھی شام واہ واہ

بند مخمس بر غزل ذوق مرحوم

جام و مے دلدار کی تشبیہ اب میں کس سے دوں — خورشید کو جام کو میں ماہ کس منہ سے کہوں
سیدھی ہی اک بات ہے شام و سحر کہتا ہوں — جام بلوریں میں ہے یوں عکس شراب لالہ گوں
ہو جیسے کیفیت فزا نور سحر رنگ شفق

عابد

عابد:۔ میر عابد حسین شاگرد مشتاق۔ خیال بند۔ الفاظ پرست شاعر ہیں۔ قدمائے لکھنؤ کے خوشہ چیں ہیں۔ نمونہ کلام نذر ناظرین ہے۔

پسِ مردن بھی باقی ہے نشاں وحشت کے ساماں کا
ہمیں چاک کفن پر ہے گماں چاک گریباں کا
کھلا کچھ بھی نہ راز لن ترانی
ہوئے بیہوش موسیٰ کیا سمجھ کر
یکتائی صنم کے تو ناصح مقر ہیں ہم
تشبیہ اس کو خیر نہ دینگے خدا کے ساتھ

عابد: میر عابد علی شگفتہ طبع، سادہ بیان، معنی آشنا سخنور تھے۔ اخبار کارنامہ سے ایک غزل کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

زلفوں میں پھنسکے سینکڑوں جھٹکے اُٹھا چکا
کیا پوچھتے ہو حال کہوں ماجرائے دل
دونوں کا ایک حال ہے ابدائے ہجر میں
روتا ہے میر واسطے دل میں برائے دل
سنتا ہوں آجکل وہ خریدار دل کے ہیں
دھوکے سے جاکے کوئی مرا بیچ لائے دل
اُٹھنے کو بزم یار سے عابدؔ اُٹھے مگر
ہر ہر قدم پہ منہ سے نکلتا ہے ہائے دل

عابد: سید عابد حسین صاحب لکھنوی شاگرد جناب فصاحت۔ خوشگو، خجستہ فکر زبان میں روانی۔ کلام میں مضمون آفرینی اور سادہ بیانی قابل داد ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو۔

بھروں دم پھر بھی اُلفت کا تمہاری
اگر زندہ ہوں میں سو بار مر کے
رقیبوں کی خوشی تھی ان کو منظور
مری میت پہ آئے بن سنور کے
نہ جائیں گے تری جنت میں واعظ
رہیں گے کوچۂ جاناں میں مر کے
مری میت کو دفنا کر وہ بولے
ہوئے ختم آج جھگڑے عمر بھر کے
جیئے بھی تو جیئے ہو کر اسیر قید تنہائی
خضر باز آئے ہم ایسی حیات جاودانی سے
بھلا نامہ تو کیسا سانس کا لینا بھی مشکل ہے
یہ اپنا حال فرقت میں ہوا ہے ناتوانی سے

عابد: قاضی سید عبد العلی ولد مشیر الدولہ سفیر الملک قاضی سید جمشید علی خاں صاحب جم مرحوم۔ وکیل عدالت منصفائے مراد آباد میں ناسور اور اخبار مخبر عام کے ایڈیٹر تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام رضا علیہ السلام سے ملتا ہے۔ مولانا محمد صالح اتالیق بادشاہ عالمگیر آپ کے مورث اعلیٰ تھے جن کو سلطان شاہجہاں کی سرکار سے پرگنہ حسن پور ضلع

مراد آباد میں محمد پور وغیرہ سات آٹھ گاؤں معافی دوام عطا ہوئے تھے۔ وہیں توطن اختیار کیا۔ ان کا انتقال ہو جانے کے بعد سید محمد سعید اس جاگیر کے مالک ہوئے اور پرگنہ حسن پور کی قضا کا عہدہ حاصل کیا۔ جو نسلاً بعد نسلٍ اس خاندان میں منتقل ہوتا رہا۔ اس عہد میں جاگیر کا رقبہ ایک لاکھ بیگھہ کے قریب تھا۔ جو ۱۸۴۷ء میں سرکار انگریزی نے ضبط کر لیا آپ کے والد قاضی سیّد محمد جمشید علی خاں صاحب جمؔ میرزا غالب کے شاگرد عزیز اپنے زمانے کے مشہور مؤرخ اور نامور اخبار نویس تھے۔ اخبار جام جمشید اور رہیلکھنڈ پنچ مراد آباد کی ادارت کے علاوہ ریاست جے پور میں سر رشتہ دار فوجداری۔ کونٹہ میں حاکم اپیل رہے۔ ممتاز الدولہ صاحب حکیم محمد سلیم خاں صاحب چیف سکرٹری کونسل جے پور بہت قدر دانی فرماتے تھے۔

عابد صاحب ۱۹ صفر ۱۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ میر جویا صاحب مرحوم منشی ریاست جے پور نے ولادت کا قطعہ کہا جس کا آخری مصرع یہ ہے ع۔ سال تاریخ او بلند اختر آپ عربی۔ فارسی۔ انگریزی زبان سے واقف ہیں۔ فن شعر گوئی میں ابتداً اپنے والد ماجد کو کلام دکھایا کرتے تھے۔ اسی دوران میں شوکت باغ کے مشاعروں کا آغاز ہوا۔ حضرت داغ بھی رامپور سے تشریف لاکر بزم سخن میں شریک ہوتے تھے۔ آپ نے جناب داغ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور پہلی تخئیل کو زبان اور سادگی کے قالب میں ڈھال کر نہایت دلاویز بنا دیا۔ غزل گوئی کے علاوہ تاریخ گوئی میں اعلےٰ درجہ کا ملکہ تھا۔ داغ مرحوم ہمیشہ آپ کو فخر داغ کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں۔ حاسدانہ طور پر آپ پر جو اعتراضات شاعری اور تاریخ گوئی کے متعلق شائع ہوئے تھے۔ ان کو جناب جلال اور حضرت امیر مینائی نے غلط اور نامعقول قرار دیا۔ انجمن ہمدرد سخن جو ترقی اردو کے لئے مراد آباد میں قائم ہوئی تھی جس میں صاحبزادہ مصطفےٰ علی خاں شرر۔ صاحب زادہ شبیر علی خاں شبیر۔ حضرت مضطر خیر آبادی۔ جناب جلیل وغیرہ شریک تھے۔ آپ اس کے سکرٹری بنائے گئے

تھے۔ اپنے استاد کو صاحب طرز اور یکرنگ مانتے ہیں۔ اور مسئلہ جانشینی داغ کے ابتدا سے مخالف ہیں۔ اور اس کے متعلق با اثر اخبارات میں مضامین نکالتے رہے ہیں۔ اصناف سخن پر قادر ہیں اور محاورات سے ماہر۔ علمی۔ تاریخی اور اخلاقی مضامین کثرت سے لکھے ہیں۔ چند ناول چھپ کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ فن سخن میں منشی محمد عبدالرزّاق اثر۔ شیخ احمد بخش حسرت۔ منشی منظور احمد منظور۔ مولوی محمد علی ہوش۔ مولوی عاشق حسین عاشق۔ عبدالغنی فغاں۔ مولوی علی احمد ثمر آپ کے شاگردوں میں ہیں۔

عابد صاحب سُرخ وسفید رنگ۔ خوشنما خط وخال۔ متوسط قد وقامت کے آدمی ہیں مزاج میں شوخی وظرافت ہے۔ رامپور کے نامی مشاعروں میں داد سخن لے چکے ہیں۔ انجمن اتحاد سخن دہلی کی تحت جو مشاعرے ہوتے تھے۔ ان میں بھی کبھی کبھی شرکت فرماتے۔ زود گوئی میں فرد ہیں۔ الفاظ کی نشست۔ بندش کی خوبی روزمرہ۔ بول چال داغ کی شاگردی کا اظہار کرتی ہے۔ ہر شعر گلزار داغ کی شگفتہ کلی معلوم ہوتا ہے۔ جس میں سادگی اور مضمون آفرینی کا رنگ ہے۔ مفتی تفضّل حسین نے جو کلام روانہ کیا۔ اس کا انتخاب ہدیہ ناظرین ہے۔

پیر میخانہ سے اے شیخ ہے بیعت لازم
سلسلہ ساقیٔ کوثر سے ہے میخواروں کا

چھوڑ کر غیر کو وہ ساتھ ہمارے آئے
ایک چلتا ہوا فقرہ جو سنا یاروں کا

صدمۂ ہجر پہ ہم صبر تو کرتے لیکن
کام وہ کیا کریں جو کام ہو بیکاروں کا

آؤ اب مل کے بہم شکوۂ قسمت کر لیں
تم ہمارے نہ ہوئے غیر تمہارا نہ ہوا

چل دیا صبح شب وصل یہ کہکر مجھ سے
اب بھی کمبخت کلیجہ ترا ٹھنڈا نہ ہوا

تم سنو بھی تو سناؤں تمہیں درد فرقت
تم کبھی جو کہو ہجر میں کیا کیا نہ ہوا

آہ وفریاد کو روکیگی یہ چلمن کب تک
وہ سنیں گے نہ مرا نالہ و شیون کب تک

منتظر راہ میں بیٹھے ہوئے ہیں پیک نظر
تم چھپاؤ گے نظر بازوں سے جوبن کب تک

وُہ داستان درد جگر سن کے ہنس دئے
ایسوں سے کیا کہے کوئی پھر ماجرائے دل

ظالم کوئی حساب بھی ہے ظلم کا ترے
کتنے جگر دکھائے ہیں کتنے ستائے دل

جو رسپہر ظلم بتاں صدمۂ فراق سہے
بڑھکر ہے ان بلاؤں سے مجھ پر بلائے دل

عابد کو عرض حال میں کیا عذر ہے مگر
دِل سے کوئی سُنے تو کہے ماجرائے دِل

انہیں ملی تھو لسی قرآن اب اٹھاتے ہو نہ ملنے کا
جو مدت تک حمائل رہ چکے ہیں میری گردن میں

یہ حسیں روز نیا دل جو لیا کرتے ہیں
کچھ نہیں کھلتا ہے کیوں لیتے ہیں کیا کرتے ہیں

شوخیاں کہتی ہیں کھل کھیلو کہاں کا پردہ
شرم کیا چیز ہے کیوں آپ حیا کرتے ہیں

ماننے کی نہ ہو جو بات وہ مانیں کیونکر
آپ سو بار کہیں ترک جفا کرتے ہیں

اس شکل سے اب دیکھ لیا کرتے ہیں ان کو
اغیار کی محفل میں کبھی راہ گذر میں

کیا شیخ نے دیکھا کوئی صورت نہیں دیکھی
ڈھونڈینگے بتوں کو ہمیں کعبہ کے سفر میں

پردہ میں بھی پردہ ہے کوئی آنکھوں کا پردہ
دلمیں میرے تم رہتے ہو پھرتے ہو نظر میں

نہیں کھنچتی نزاکت سے اگر تلوار تھوڑی سی
کٹے جھگڑا ہلا دے ابروِ خمدار تھوڑی سی

وُہ کچھ ایسے بگڑ بیٹھے منائے سے نہیں منتے
ہوئی تھی باتوں باتوں میں یونہی تکرار تھوڑی سی

مے سے توبہ میں کروں اے شیخ جی اچھی کہی
بس چلو رخصت مرے اب کان کیوں کھانے لگے

صدقے اس شوخی کے اس انداز کے اس ناز کے
آپ ہی چھیڑا مجھے اور آپ شرمانے لگے

یہ سب کچھ ہے کہ ضبط غم سے میری غیر حالت ہے
مگر ان سے کہوں کیا دور کی صاحب سلامت ہے

کیا شکوہ رقیبوں سے جو ملنے کا تو فرمایا
تمہیں کیوں رشک آتا ہے یہ اپنی اپنی قسمت ہے

گراں ہے دیکھنا کیا تم کو وزدیدہ نگاہوں سے
کوئی قیمت بھی ہو دل کی فقط اتنی ہی قیمت ہے

شکایت کیا کروں عابد ہیں انکی بدمزاجی کی
خفا ہونا بگڑنا روٹھنا بچپن کی عادت ہے

عاجز

عاجز:۔ سید محمد مبین صاحب ۱۹۰۴ء میں بماہ دسمبر بمقام بلتھو ضلع گیا پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی تعلیم گھر ہی پر پائی ہے۔ ۱۹۲۹ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ مقامی مشاعروں سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ شروع میں حضرت نشتر بلتھوی کو اپنا کلام دکھلایا۔ اِن کی وفات کے بعد سے جناب احسن مارہروی سے تلمذ ہے زبان اور معاملہ بندی کی طرف طبیعت رجوع ہے۔ ابھی نومشق ہیں۔ کلام مرسلہ کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

ہائے لوٹا ہے تمہاری ان اداؤں نے مجھے
داورِ محشر سے شکوہ کرکے میں نادم ہوا
کس کے دردِ عشق سے عاجز دل افسردہ ہے تو
پردہ میں رہنے لگے عاشق سے شرمانے لگے
مجھ کو عاجز اُنکے آنے کی عبث امید ہے

چال متوالی۔ جوانی۔ آنکھ شرمائی ہوئی
یک بیک دیکھی جو آنکھ اس بت کی شرمائی ہوئی
شکل تیری کیوں نظر آتی ہے مرجھائی ہوئی
جب شباب آیا تو وہ کیا کیا ستم ڈھانے لگے
کب مرے گھر آئے ہیں جو آج وہ آنے لگے

آئی بہار جاں فزا
جاتی رہی سب خستگی
ہر شاخ ہے پھولی پھلی
کیا یاسمن کیا یاسمین
ایک ایک پتّی ہے ہری
پڑھتی ہے بلبل برملا
دلکش فضائیں باغ کی
مثل بتان آذری

لائی نوید دل کُشا
بڑھنے لگی دل بستگی
گُل بن گئی اِک اِک کلی
ہر نخل ہے وجد آفرین
پھولوں کی ڈالی ہے بھری
صلِّ علٰی صلِّ علٰی
ٹھنڈی ہوائیں باغ کی
کرتی ہیں کیا کیا دلبری

دیکھو تو عاجز یہ سماں
بدلے زمیں و آسماں

رباعیات

لوٹے گی خزاں آکے بہارِ ہستی ہو جائیگا ویران دیارِ ہستی
اس باغ خیالی پہ نہ پھول اے عاجزؔ مٹ جائینگے سب نقش و نگارِ ہستی

دیگر

عبرت کا مرقع ہے جہانِ ہستی ہونا ہے فنا جلد نشانِ ہستی
اِک آن میں اِک چشم زدن میں عاجزؔ ہو جاتی ہے خاموش زبانِ ہستی

عاجزؔ:- جناب پیر شیر محمدؐ صاحب صدّیقی چشتی نظامی خلف پیر حیات محمد صاحب ساکن گھانگہ خورد ڈاک خانہ جلال آباد ضلع فیروزپور۔ آپ کے مورث اعلیٰ شیخ شہاب الملک بخارا سے ہندوستان تشریف لائے۔ اکبر بادشاہ نے ان کی کشف و کرامت کا شہرہ سنکر ایک بڑی جائداد خانقاہ کے لئے مرحمت فرمائی۔ شاہی عہد کے بعد سرکار انگریزی نے بھی اس خاندان کی بزرگی کا احترام کیا اور چند گاؤں عطا کئے سگ گزیدہ کا عمل آپکے خاندان میں نہایت مجرّب بنایا جاتا ہے۔ آپ کی عمر اس وقت پچاس سال سے زائد ہے۔ اُردو۔ فارسی اور انگریزی سے بقدر ضرورت واقف ہیں اوائل مشق میں اپنا کلام جناب منشی حیات بخش صاحب رسؔا مرحوم مقرب نواب رامپور تلمیذ جناب داؔغ کو دکھاتے رہے۔ چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے رہے:-

"عاجزؔ کو شاعری کا سلیقہ بھلا کہاں
ساری عنایت اس پہ جناب رسؔا کی ہے"

کلام میں جگہ جگہ تصوّف کی چاشنی ہے۔ ایک دیوان کرشمۂ عشق اور ایک رسالہ موسوم بہ ترانۂ حبیب آپ کی تصنیف ہے۔ ترانۂ حبیب میں نعتیہ کلام ہے اور دیوان میں عشقیہ غزلیات۔ اور قطعاتِ تاریخ۔

کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض غزلیں غیر اصلاحی ہیں۔ متروکات

اور حشو و زوائد سے کہیں کہیں مستغنی ہو گئے ہیں۔ تاہم مجموعی حیثیت سے کلام قابلِ مطالعہ ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو۔

کوئی ساعت کا مہماں ہے مریضِ ناتواں تیرا
لبوں پر جان ہے اور نام ہے وردِ زباں تیرا

بتائیں نام و نشاں کیا کہ اہلِ غربت ہیں
وہی مکان ہے شب کو جہاں قیام کیا

غرورِ حسن کچھ ایسا ہے ان کو اے عاجزؔ
جواب تک نہ دیا ہم نے جب سلام کیا

قاصد کو بتایا نہ پتا رشک سے ہم نے
چکّر میں ہے کمبخت کو اب گھر نہیں ملتا

ضعف سے کوچے میں تیرے بیٹھ جاتا ہوں اگر
آنکھ دکھلاتا ہے ہر روزن تیری دیوار کا

ہوں میں وہ مایوس دُنیا میں کہ جس نے عمر بھر
خواب سوتے میں نہ دیکھا طالعِ بیدار کا

بیخودی نے دی مجھے سیرِ بیاباں سے نجات
سو گئے جب پاؤں پھر خطرہ رہا کیا خار کا

بجائے فرش میں آنکھیں بچھاتا
تو اپنے وعدے پر آیا تو ہوتا

حلقۂ بندگی یار کیا زینتِ گوش
عاجزؔ آفاق میں اس وجہ سے مشہور ہوا

ملے ہیں خاک میں صد حیف شاہانِ جہاں کیا کیا
ہوئے ہیں ریزہ ریزہ آج اُنکے استخواں کیا کیا

پلٹ کر کوئی بھی آیا نہ اب تک کنجِ مرقد سے
گئے ملکِ عدم کو کارواں در کارواں کیا کیا

بن گیا وجہ تسلّی جب وہ پہلو میں رہا
اُٹھ گیا پہلو سے جس دم آفتِ جاں ہو گیا

اس جفا جو نے بلایا ہے جو محفل میں مجھے
ہو نہ ہو پھر کوئی تازہ ستم ایجاد کیا

نام سر نامے پہ دیکھیگا جو وہ قاتل مرا
قتل خط پڑھنے سے پہلے نامہ بر ہو جائیگا

ہو بغیر از گوشۂ عزلت کسے حاصل کمال
بے صدف کیا قطرۂ نیساں گہر ہو جائیگا

ہوئی ہے فقر کو دل بستگی بہت ہم سے
ہمارے تن سے خطِ بوریا نہیں جاتا

ہو گیا عہدِ جوانی خوابِ غفلت میں بسر
کب کھلی آنکھ آ گیا جب اپنے سر پر آفتاب

حسن کی میزان میں تولا تجھے جب عشق نے
تو زمیں پر رہ گیا پہنچا فلک پر آفتاب

نہ بر آئی کوئی امید میری واہ ری گردش
ستارہ روزِ پیدائش سے ہے برجِ نحوست میں

غربت نے شہر شہر کیا در بدر مجھے
آرام کا ملا نہ کہیں ایک گھر مجھے

زخم کھا کھا کے ہم رہے زندہ
تیغ میں آب زندگانی ہے

دیر و کعبہ میں تجھ کو ڈھونڈھ آئے
مدتوں ہم نے خاک چھانی ہے

پوچھتے کیا ہو زیست کا احوال
ہجر میں خاک زندگانی ہے

قطعہ تاریخ رحلت حکیم سید ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

گلزار شاعری میں خزاں ہی خزاں نہ ہو
بعد از امیر داغ بھی کر بیٹھے انتقال

عاجز فلک کے ہاتھوں سے یہ تیسری ہوئی
ضامن علی جلال کا صدمہ ہوا کمال

عاجز

عاجز:۔ محمد حیات نواح وزیر آباد (پنجاب) کے رہنے والے ہیں۔ از خاندان حاجی صاحب جو اس علاقہ میں کامل بزرگ گذرے ہیں۔ عمر ۳۰ برس سے زاید ہو گی۔ اکثر رسالوں میں کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ پہلے آپ نے حضرت ظہیر دہلوی سے تلمذ حاصل کیا۔ آپ کی ابتدائی مشق تھی کہ جناب ظہیر کا انتقال ہو گیا۔ پھر آپ مولوی احمد حسن شوکت میرٹھی کو اپنا کلام دکھلانے لگے۔ پہلے ثابت تخلص تھا پھر عاجز ہو گئے۔ طبیعت موزوں اور ذہن رسا ہے۔ بندش کی صفائی پر کم توجہ دیتے ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو:۔

وہ عدو کے گھر میں جا نکلے مرے دیکھی کل
بخت برگشتہ کے صدقے میری قسمت دیکھنا

سر ہتھیلی پہ جو رکھ لے تو وہ آگے آئے
در جاناں پہ جو پہنچے تو یہ لکھا دیکھا

چمن میں بلبل نالاں جو تیرا آشیاں ہوتا
کہیں صیاد کا کھٹکا کہیں بیم خزاں ہوتا

تری نظروں سے گر کر گر گئے ہم چشم عالم سے
اگر تو مہرباں ہوتا زمانہ مہرباں ہوتا

بھلا یہ سرفرازی تھی کہاں میرے مقدر میں
کہ تم ہوتے مرے مہمان اور میں میزباں ہوتا

کم سنی ہے باز آؤ صحبت اغیار سے
رنگ بگڑا ہے زمانے کی ہوا اچھی نہیں

فائدہ اچھا ملا یہ پیار ر ہیں
مر مٹے ہم حسرت دیدار ہیں

دشمنِ جان سب زمانہ ہو گیا
پھل یہ پایا ان بتوں کے پیار میں

کوئی دم میں ترا بیمار رخصت ہونیوالا ہے
دمِ آخر تو چل کر دیکھ لے تو اپنے بسمل کو

برگشتہ رہا یہ فلکِ پیر ہمیشہ
بن بن کے بگڑتی رہی تقدیر ہمیشہ

ہرگز نہ مٹا گریہ سے اے دیدۂ نمناک
رو رو کے مٹایا خطِ تقدیر ہمیشہ

لئے جاتا ہے دل راہِ خطرناکِ محبت میں
خدا نے دی ہے کس ظالم کے ہاتھوں میں عناں میری

پاؤں کیا ہو گئے قضا کے شل
کیوں شبِ غم ادھر نہیں آتی

کیا ہوئے اب وہ نالہائے رسا
آسماں کی خبر نہیں آتی

عابد **عابد**:۔ لالہ زور آور سنگھ کھتری دہلوی نبیرہ رائے انند رام مخلص۔ ان کو نصیر الدین عزت سے تلمذ تھا۔ طبیعت سادہ گوئی کی طرف مائل تھی۔ بیان میں برجستگی تھی۔ دو شعر جو دستیاب ہوئے ہیں درج تذکرہ کئے جاتے ہیں۔

عاشقوں کو نہ رہے اِک جا نہیں آرام کہیں
دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

شبِ مہتاب کس کمبخت کو ہجراں میں بھاتی ہے
کہ اس سے گرمیِ روزِ قیامت یاد آتی ہے

عاجز **عاجز**:۔ منشی کملا پرشاد صاحب عہدِ قدیم کے بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ کلام میں جہاں آباد کی شاعری کا رنگ ہے۔ شاگرداں نصیر کا انداز ہے نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

لائی نہ کبھی نکہتِ گیسوئے معنبر
چل دور ہوائے بادِ صبا یاں سے ہوا ہو

عاجز نہ رکھو چشمِ وفا ماہ رخوں سے
جبتک کہ نبھے تم سے محبت کو نبا ہو

بغیر دیدار روئے زیبا تڑپتے کبتک رہا کریں گے
اجل تو جھگڑا چکا دے اپنا فراق میں جی کہا کرینگے

بھرا ہے دل میں بخارِ کلفت تپِ جدائی کی ہے حرارت
اگر ہے سوزِ دروں سلا دو دھوئیں لحد سے اٹھا کرینگے

عاجز **عاجز**:۔ مولانا شرف الحق قوال شہر دہلی شیخ جلال الدین تھانیسری کی اولاد میں سے تھے قبل از فساد غدر زندہ تھے۔ کلام میں مضمون آفرینی اور نازک خیالی کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ دو چار شعر جو کمال جستجو کے بعد ہاتھ آئے ہیں زیبِ دیدۂ ناظرین ہیں۔

مژگاں پہ مرے لخت جگر آئے ہیں کیا کیا — یہ خار و خس اب دیکھ ثمر لائے ہیں کیا کیا
سنبل کو آج باغ میں ہے زندگی محال — اس سرو قد کی زلف گرہ گیر دیکھ کر
مدت سے چھوڑ بیٹھا اس جسم ناتواں کو — دم تیرے دیکھنے کو آنکھوں میں آرہا ہے
کس کے یہ دیدۂ گریاں کی نظر ہے کہ اثر — کاہ جو دشت میں بے آب ہری رہتی ہے

عاجز

عاجز:۔ میرزا عبداللہ بیگ دہلوی ابن میرزا احمد بیگ۔ میرزا صابر صاحب تذکرہ گلستان سخن کے دلی دوستوں میں سے تھے۔ بہت پُرلطف اور مزیدار شعر کہتے۔ طبیعت میں متانت اور شوخی تھی۔ مضامین سے سنجیدگی نمایاں ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

کہا نہ تھا کہ نہ کر برق تو مری تقلید — بتا کبھی بھی تجھے آج تک قرار آیا
لخت دل صد پارہ ہے ہر نوک مژہ پر — ہے آج تو کچھ رنگ ہی اے دیدۂ تر اور
یاد آئے ہے جب اس نمکیں لب کا تبسم — دیتے ہیں مزہ مجھ کو مرے زخم جگر اور
روتا ہوں تو ہنستے ہیں وہ کم ظرف سمجھ کر — کرتے ہیں خجل مجھکو مرے دیدۂ تر اور

عاجز

عاجز:۔ اسمٰعیل خاں نبیرہ ملا شاہ نواز خاں متوطن موضع نپسل۔ قدرت اللہ شوق اپنے تذکرہ میں ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ جواں خوش خلق۔ یار باش شائستہ مزاج ہیں۔ اگرچہ نومشق ہیں۔ مگر ذہن سلیم اور طبع مستقیم پائی ہے۔ یہ اُن کا کلام ہے۔

رکھتا ہے محبت جو کوئی آل نبی سے — عاجز نہیں کچھ خوف اوسے روز پسیں کا
جب سے لگن لگائی اُس خوبرو سے ہم نے — جوں شمع جلتے جلتے باچشم نم رہے ہیں
آکر کے جلد اپنے بیمار کی خبر لے — گنتی کے اب تو اُسکے دو چار دم رہے ہیں
نہ جاوے کہیں طوق جنوں گردن میں قمری کی — چمن میں سیر کرنے کو نہ اے سرو رواں جاؤ
جو کچھ مجھ پر شب فرقت میں گزریگا سو گزریگا — یہی گر جاؤں جاؤں ہے تو پھر تم اے میاں جاؤ

عاجز

عاجز:- نواب محمد حسن خانصاحب بریلوی۔ شاگرد میرزا عباس صاحب نادر و جناب نواب محمد عبدالعزیز خانصاحب عزیز۔ بریلی کے موزوں طبع شعرا میں آپ کا شمار تھا۔ اساتذہ کے فیض سخن سے کبھی کبھی مشاعروں میں اچھا شعر نکال لیجاتے طبیعت موزوں پسند تھی۔ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

شمع ساں ہم شبِ ہجراں میں بسر کرتے ہیں
جلتے ہیں گھلتے ہیں رو رو کے سحر کرتے ہیں

سادہ ہی لیجا لفافہ نامہ بر آتا ہے شک
نام اس کا کیوں زبانِ خامہ سے تحریر ہو

کٹی ہجر کی کس مصیبت سے رات
مجھے اک گھڑی اک پہر ہو گئی

چھپایا تو ہم نے بہت رازِ دل
خدا جانے کیونکر خبر ہو گئی

تمہاری نظر مجھ سے کیا پھر گئی
کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو گئی

پئے جو مے کفِ ساقی سے تو کہے ساقی
نہیں ہے زہد میں وہ لطف جو گناہ میں ہے

عاجز

عاجز:- محمد فخرالدین بھاگلپوری۔ ان کا حال باوجود تلاش کے فراہم نہ ہو سکا۔ کلام کے دیکھنے سے آدمی طبیعت دار معلوم ہوتے ہیں۔ نیچرل رنگ میں ایشیائی شاعری کے مرقعے کھینچے ہیں۔ مگر مشرقی نازک خیالی اور الفاظ کی گلکاری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ ایک نظم کے چند بند درج ذیل ہیں۔

برسات آئی آگ بدن میں لگا چلی
منہ پر سے برق ابر کا گھونگھٹ اٹھا چلی

مژدہ دیا بہار نے ٹھنڈی ہوا چلی
میخانے پر برسنے کو اودی گھٹا چلی

دھانی لباس پہنے ہوئے ہر شجر ہے آج
خم کی ہو سیر ساقیِ مہوش کدھر ہے آج

جوبن برس رہا ہے عروسِ بہار پر
گل بوٹے پتّے پتّے ہیں اپنے نکھار پر

نزہت غضب کی چھائی ہے ہر برگ و بار پر
جلوہ ہے شمع طور کا ہر نوک خار پر

بڑھ بڑھ کے پتّے پھولوں کے منہ چومنے لگے

مستی میں آکے نخل چمن جھومنے لگے

دلچسپ کیا ہی سبزۂ خود رو کی ہے بہار — دولھا بنا ہوا ہے ہر اک کوہ سبزہ زار
گلہائے تازہ پر ہے عجب تازہ تر نکھار — ہر برگ سے ہے قدرت صنّاع آشکار

اے ابر برشگال سحاب کرم ہے تو
سرچشمہ حیات خدا کی قسم ہے تو

عادل

عادل:- میر ریاست علی ابن میر منوّر علی۔ ولادت تقریباً ۱۸۹۴ء بمقام اورنگ آباد دکن۔ ان کے والد شاعری کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ عادل صاحب کو ابتداء سے اساتذہ کا کثیر کلام ازبر یاد تھا۔ جب کچھ کہنے لگے تو حضرت آفت تلمیذ حضرت جلال کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ذوق شاعری بھی ترقی کرتا گیا۔ فارسی میں منشی کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت جلیل سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لینی شروع کی۔ امتحان جوڈیشل سرکار عالی میں کامیاب ہونے کے بعد اورنگ آباد میں وکالت کرتے ہیں۔ نواب سالار جنگ بہادر کی اسٹیٹ سے خاندانی منصب کے علاوہ ایک موضع علاقہ سرکار عالی سے جاگیر ہے۔ انجمن عثمانیہ اورنگ آباد جو کم و بیش پچیس تیس برس سے قائم ہے۔ اور جس میں ایک دارالاخبار اور کتب خانہ ہے۔ ایک عرصہ سے ان کی زیر نگرانی ہے۔ جو کلام روانہ فرمایا ہے اس کا انتخاب یہ ہے۔

آیا نہ رحم انہیں جو سُنی داستان ہجر — الزام دے رہے ہیں کہ کیوں دل دکھا دیا
عادل جہاں میں لاکھ حسیں ہوں تو ہم کو کیا — اپنا ہے یہ طریق جسے دل دیا دیا
جلد آجائیں وہ یارب جس تیں بے چین ہیں — آج آغوشِ دعا ہے منتظر تاثیر کا

ظلم پر ظلم ڈھا کے دیکھ لیا — اس نے خوب آزما کے دیکھ لیا
کیا مزہ تیری تیغ ناز میں ہے — زخم پر زخم کھا کے دیکھ لیا
میرے رونے پہ رو دیا خود بھی — رونے والے رُلا کے دیکھ لیا

پانی میں کوئی نقش سلامت نہیں رہتا
لیکن ترا نقشہ ہے مرے دیدۂ تر میں

اللہ رے کرشمے خلش نوک مژہ کے
ڈالے اسی بیدرد نے ناسور جگر میں

ایک کیا تجھ سے محبّت ہو گئی
سارے عالم سے رقابت ہو گئی

بیاں ہجر کا اور زبانی ہماری
وُہ چیخ اُٹھے سنکر کہانی ہماری

نہ چھوڑا غمِ ہجر نے مرتے دم تک
کٹی روتے ہی زندگانی ہماری

جب خبر دی ان کو قاصد نے کہ عادل مر گیا
ہائے یہ کیا ہو گیا۔ گھبرا کے فرمانے لگے

کالی گھٹا ہے چھائی اور مینہ برس رہا ہے
توبہ کہاں کی ساقی۔ لا دل ترس رہا ہے

نہ پوچھو آئینہ سے۔ مجھ سے پوچھو حسن تم اپنا
بہارِ گل کو دیکھا چاہئے چشمِ عنادل سے

الٰہی مبتلا ہوئے دردِ فرقت ہو نہ دشمن بھی
گھڑی ایک ایک کٹتی ہے ہماری سخت مشکل سے

وہی ترچھی نگاہیں آجتک سینے میں چبھتی ہیں
ترے تیروں کی لذت کوئی پوچھے مرے دل سے

عارض عارضؔ:۔ منشی محمد وزیر علی نقشہ نویس پنشنر دہلی۔ کلام سلیس مضامین کی طرف دھیان رہتا ہے۔ اشعار ذیل نذر ناظرین ہیں۔

رہیگی بعد مردن بھی تری مٹی خراب اے دل
گئے یہ دیدۂ تر گر ہمارے ساتھ مدفن میں

خاک نالہ رک سکے وحشت کی دار و گیر میں
پاؤں کی صورت زباں بستہ نہیں زنجیر میں

دل کو نکلے ہوئے پہلو سے زمانہ گذرا
اب جو کھٹکا ہے کھٹکتی کوئی حسرت ہوگی

عارف عارفؔ:۔ منشی شیو نرائن چودھری خلف بابو لالہ چودھری ساکن محلّہ حاجی گنج۔ عمر تخمیناً ۳۰ برس۔ جناب شاد عظیم آبادی مرحوم کے تلامذہ میں سے ہیں۔ تصوّف کا مذاق ہے۔ زباں صاف ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ازل سے لائے جو مستی تھے اسکی خو نہ گئی
جو تھی خمیر کے اندر وُہ رنگ و بُو نہ گئی

یہ طنز کہتی ہے پھولوں سے کھل کھلا کے کلی
تمہارا رنگ نہ بدلا ہماری خو نہ گئی

تو خال و خط کے محاسن کو چھوڑا اصل کو دیکھ
مکاں کی زینت و رونق مکیں کو چھو نہ گئی

میں رو کے اشکوں سے خود اپنے ہو گیا ظاہر	حریم دل میں تری یاد بے وضو نہ گئی
وہ نخل تازہ و تر تھا خیال اے عارف	کہ سوکھ جانے پہ بھی طاقت نمو نہ گئی

عارف

عارف:۔ محمد احسن اللہ ساکن قصبہ سیمبھی ضلع اعظم گڈھ۔ شاگرد مولوی غلام عباس صاحب عباس مبارک پوری ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا۔ طبیعت فطرتاً موزوں تھی شعر کہنے لگے۔ اور کہتے کہتے مشاق ہو گئے۔ پہلے متخلص بہ اسم تھے مگر کچھ عرصہ سے وہ تخلص تبدیل کر کے عارف اختیار کیا۔ کچھ اخباروں کی نامہ نگاری بھی اکثر کی ہے۔ کلام میں ظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ رنگ تغزل اچھا اور پاکیزہ ہے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

دور گردوں کا نہ شکوہ ہے نہ چشم یار کا
ہم تو روتے ہیں بس اپنی گردش تقدیر کو

تجھ کو اے ناصح نافہم بتائیں کیونکر
رہ گئیں چھپ کے جو دل اسکی ادائیں کیونکر

خوف ہے حضرت زاہد کو کوئی دیکھ نہ لے
سوئے میخانہ اگر آئیں تو آئیں کیونکر

بے آبرو ہوئے ہیں بہت چشم تر سے ہم
اشکوں کی طرح گر گئے سب کی نظروں سے ہم

کس درجہ راہ عشق میں ہیں بدگمانیاں
رہزن سمجھ کے ڈرنے لگے راہبر سے ہم

بوتل بغل میں ہاتھ میں جام شراب تھا
نکلے عجیب شان سے ساقی کے گھر سے ہم

ہم دوش کبھی اس بت کافر سے تو ہوتے
حسرت ہے کہ زنار برہمن نہ ہوئے ہم

سچ ہے نہ ہوئے آپ کبھی دوست کسے بھی دوست
ایسا ں کبھی دشمن کے بھی دشمن نہ ہوئے ہم

ملتے ہی آنکھ پہلو میں دل بھی تڑپ اٹھا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

ہوں تلاش یار میں یوں وقف گریہ نالہ کش
جیسے کہتا ہو پپیہا پی کہاں برسات میں

ہیں وہ غم دوست اس غم ہی کو سمجھتا ہوں خوشی
نالۂ درد ہے آواز ترنم مجھکو

تارے گن گن کے شب ہجر سحر کی عارف
کیا غنیمت ہوئے تنہائی میں انجم مجھ کو

اوصاف کوئے یار جو دل سے پوچھئے
گلشن کو پوچھئے تو عنادل سے پوچھئے

ان کا شبِ وصال بگڑنا غضب ہوا	جو مجھ پہ بن گئی وہ مرے دل سے پوچھئے

عارف :۔ نواب زین العابدین خاں۔ نواب غلام حسین خاں شرف الدولہ سہراب جنگ مسرور مرحوم کے خلف الصدق۔ نواب ضیاالدین احمد خاں نیر رخشاں کے بھانجے مرزا غالب کے شاگرد رشید اور سسرال کے رشتہ سے ان کے بھی بھانجے تھے۔ استاد کو حسنِ لیاقت و خداداد ذہانت کے سبب انسے کمال الفت تھی حضرت غالب ان کے کلام کو نہایت توجہ سے درست فرماتے اور ان پر فخر کرتے۔ اوّل اوّل چند غزلیں شاہ نصیر مرحوم کو دکھائی تھیں۔ پھر غالب کے سوا دوسرے کے طالب نہ ہوئے۔

عارف ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ۳۵ سال تک دنیا کی ہوا کھائی ۱۲۶۸ھ میں عالم قدس کو سدھارے۔ حالت نزع میں جب حضرت غالب عیادت کو تشریف لائے تو بستر پہ پڑے پڑے یہ شعر پڑھا۔ ؎

آنکھوں میں دم ہے مثلِ چراغ سحر ہوں میں	لو لگ رہی ہے جان کو کیا انتظار ہے

مرزا غالب نے حضرت عارف کی وفات پر ایک غزل بطور مرثیہ نہایت درد انگیز پیرایہ میں کہی ہے جس کا ایک ایک شعر جگر گداز ہے۔ یہ غزل مرزا کے اردو دیوان میں ہے۔ ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف	کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مرزا غالب نے عارف کے مرنے پر ان کے دونوں بیٹوں کو اپنے آغوش تربیت میں لیا۔ بچوں کی طرح پالا۔ اور متبنے کیا۔ مگر افسوس کہ وہ ہونہار بھی غالب کے بعد عین شباب میں احباب کو داغِ مفارقت دے گئے۔ حضرت عارف کے بڑے بیٹے نواب باقر علی خاں کامل ریاست الور میں ایک اعلےٰ عہدے پر ممتاز تھے۔ اور چھوٹے بیٹے حسین علی خاں شاداں دربار رامپور کے شعرا میں تھے۔

حضرت عارف کے غیر مطبوعہ کلیات میں بیس ہزار سے کم اشعار نہ ہونگے نہایت پُر گو شاعر تھے غضب کی آمد تھی۔ اکثر غزلیں ساٹھ ساٹھ شعر کی ہیں۔ اور ہر شعر کا رنگ نرالا ہے۔ کوئی شعر معرفت اور تصوّف کے رنگ میں ڈوبا ہُوا ہے۔ تو کسی میں حسن و عشق کا افسانہ ہے جب یہ مرزا غالب کی رہنمائی سے تخئیل کی دنیا میں پہنچ جاتے تو اس وقت اہل مشاعرہ دنگ رہ جاتے۔ اور ان کا کلام بلاغت نظام۔ ذوق۔ مومن۔ عیش وغیرہ سے ٹکرا جاتا۔ اور یہ ان سے مقابلہ کرنے میں مرد میدان بنے رہتے۔ طبع رسا کے زور نے ۳۰ - ۳۲ کی عمر میں انہیں مسلّم الثبوت استاد منوا دیا تھا۔ الفاظ کی شوکت۔ بندش کی نزاکت۔ محاورات کی نشست ایسے بزرگوں کے دم قدم سے میر و میرزا کے جذبات کو زندہ کر رہی تھی۔ اگر عارف اور انور دونوں عمر طبعی پاتے تو اوّل الذکر کے خیالات کی رسائی اور آخر الذکر کا حسن بندش اُردو شاعری کو معراج کمال پر پہنچا دیتا۔ دیکھو حضرت عارف سیدھی سادی معمولی بات کو کیسی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں ؎

نہ آئے سامنے میرے اگر نہیں آتا　　مجھے تو اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا

ایک جگہ انسانی زندگی کے درد انگیز پہلو کو یوں دکھاتے ہیں: ؎

برعکس ہُوا کرتے ہیں سب کام ہمارے　　اسواسطے مرنے کی تمنا نہیں کرتے

شوخی کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ ؎

دھوکے میں آکے باغ جناں میں چلے گئے　　دل میں خیال کوچۂ جاناں کئے ہوئے

سادگی سے باغ جناں پر کوچۂ جاناں کا دھوکہ کھایا ہے۔ عجیب پُر لطف پیرایہ ہے حضرت عارف کے دیوان میں حسن کے شرارے۔ عشق کی دبی ہوئی چنگاریاں۔ فلسفہ تصوّف نداہ مضامین اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ گوئی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مرثیہ اور سلام کا بہت شوق تھا۔ پانچ چار قصیدے بھی بہادر شاہ

ثانی اور میرزا فخر الملک ولی عہد کی شان میں بڑے زور کے لکھے تھے۔ افسوس ہے کہ لواحقین کی بے پروائی سے آپ کے کلام کی اشاعت نہ ہوئی۔ کلیات جو ایک نایاب چیز ہے مؤلف تذکرہ کے پاس موجود تھا۔ جودتِ ذہن اور تیزیِ فکر نے ان کے جسم کو لاغر اور کمزور کر دیا تھا۔ وہ سال دہلی کے واسطے کسقدر منحوس ہوگا جس میں سپہر سخن کے تین ستارے اپنی حیات کا دورہ ختم کر کے عازم فنا ہوئے۔ یعنی حضرت عارفؔ جناب مومنؔ۔ میر تسکینؔ نے دنیا کو خیرباد کہی۔ میرزا قربان علی بیگ سالک نے تینوں کے متعلق یہ قطعہ تاریخ وفات کہا۔ ؎

برس دن میں موئے یہ تین شاعر
کہ جو تھے حضرتِ دہلی کے ساکن
نہ ہاتھ آئی کوئی تاریخ رحلت
رہی فکر اس کی سالکؔ کو بہت دن
کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب
ارم میں عارف و تسکین و مومن

کلام کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

وہ صدمہ ہے شکستِ دلِ ناامید کا
گرتا ہے ساتھ کنگرہ عرشِ مجید کا

ہزاروں بار روز حشر ہو کر ہو گیا آخر
میں اب تک منتظر بیٹھا ہوں صبح شام ہجراں کا

یہاں تک چلتے چلتے تنگ اپنی جاں سے آ ئے
کہ لب پر آگیا ہے دم تری شمشیر بُرّاں کا

ہماری خاک سے اسکو کدورت کب کی تھی یارب
سکھایا ہے اسے چلنا اُٹھا کر جس نے داماں کا

بخیہ گر جل گئے کیا ہاتھ ترے سوزش سے
کرتے کرتے جو رفو چاک جگر چھوڑ دیا

اے فلک خانہ خرابی کی ہے پروا کس کو
دشت میں رہتے ہیں مدت ہوئی گھر چھوڑ دیا

مہ و خورشید کی صورت کو ترستا ہے جہاں
دود و آہِ دلِ سوزاں کی وہ چھائی ہے گھٹا

صبح ہجراں کی مصیبت جو یہ ہوتی معلوم
میں شبِ وصل کی ہرگز نہ تمنا کرتا

نہ آئے سامنے میرے اگر نہیں آتا
مجھے تو اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا

کیونکر کروں نہ ناز کہ تصویر ہو گیا
تکتا ہوں جب سے میں تری صورت کھڑا ہوا

دیکھ کے اِک بار ہی اس کو یہ بیخود ہوئے
پھر نہ ہوا حشر تک بارِ دگر دیکھنا

اُٹھکے ہیں دَیر سے یوں کعبے کو جاؤں عارف
کیا کروں جبکہ ہو قسمت میں مسلماں ہونا

ہنگامے کیسے رہتے ہیں اپنے سبب سے واں
ہم سے ہی نام کوچۂ جاناں نکل گیا

اس ضعف کا بُرا ہو کہ ناکام رہ گئے
آج اس کا اپنے ہاتھ سے داماں نکل گیا

موت کی اپنی دعا پر مجھ کو ہنسوانا نہ تھا
ہو کے بیمار محبت میں جو صحت مانگتا

گر ازل میں مجھ کو دیتے مانگنے کا اختیار
خضر کی عمر اور میخانے کی خدمت مانگتا

حذر کر اب تو کہیں لہو و لعب سے عارف
سفید بال ہوئے موت کا پیام آیا

وفورِ نشۂ صہبا سے جھک گئیں آنکھیں
شراب پینے سے اُلٹا اُسے حجاب آیا

سخت جانی مری توڑے گی ہزاروں خنجر
دم نکلنا تو کچھ ایسا نہیں آساں میرا

تم اپنی زلف سے پوچھو مری پریشانی
کہ حال اسکو ہے معلوم مو بمو میرا

دیوانگی میں غیر کو دوں خاک گالیاں
اب مانتا ہے کون بُرا میری بات کا

نامۂ اعمال میرا واں جو کھولا ناگہاں
تھا گماں روزِ قیامت پر شبِ دیجور کا

کونسا شہر میں عالم ہے نہ جس پاس گئے
رشک سے نام مگر تیرا بتایا نہ گیا

اس کو ہی پی کے مست رہے ہم تمام عمر
خونِ جگر ہمیں مئے سرجوش ہو گیا

عارف بتوں سے اسکو محبت اگر نہ تھی
کیوں کعبہ ان کے غم میں سیہ پوش ہو گیا

شیخِ حرم کو جس نے برہمن بنا لیا
اس بت کے در پہ ہم نے بھی مسکن بنا لیا

جو کعبہ میں ہے ہے وہی بتخانہ میں جلوہ
اک پردہ ہے سو شیخ حرم اٹھ نہیں سکتا

دل لگا کر یس کہ رہتے ہیں پریشاں روز و شب
پشت دست عاشقاں ہے وقف دنداں روز و شب

بلبل باغ معانی کیوں نہ ہو عارف نظر
دیکھتے ہیں حضرت غالب کا دیواں روز و شب

پی کر تو دیکھ پہلے کہ کیا شے ہے محتسب
مست تو ہر شیشۂ گلنار ہے بے سبب

اس تنگ سے آئنہ شاید آپ نے دیکھا نہیں
آپ جو کہتے ہیں ہم رکھتے نہیں اپنا جواب

میں تو مر جاتا وہیں غیرت سے کوہ طور پر
اس طرح سے صاف گر ملتا مجھے موسیٰ جواب

آتش و ناسخ کا سمجھا ہے کہیں یہ بھی کلام
لکھ سکے عارف غزل کا میری کوئی کیا جواب

چرخ تک جا کے نہ بدنام ہو لے نالۂ دل
بیٹھ جانے کو ہے یہ ضعف کہن آپ سے آپ

کس نے دل اس کا دکھایا ہے جلا کر یارب
رو رہی ہے جو کھڑی شمع لگن آپ سے آپ

فرقت میں ہو جیو نہ جدا مجھ سے بیخودی
ہم اور تو یہ کاٹیں گے مل کر تمام رات

کھویا گیا ہے مہر بھی دیکھ اس کی تیرگی
بس ہو چکی یہ اے غم ہجراں تمام رات

گر موت ہی نہ آئے تو کیا کیجے ہجر میں
کرتا رہا ہوں مرنے کے سامان تمام رات

رہتا ہوں دن کو دیر میں مسجد میں رات کو
کافر تمام دن ہوں مسلماں تمام رات

پھر دشمنوں کی خاک شکایت کریں بھلا
جب دوست دیکھ سکتے نہیں آرزوئے دل

باتیں ہزار پیچھے بناتے ہیں بیٹھ کر
مقدور کیا کہ بول سکیں روبروئے دوست

دل اسی پاس ہی میں بیکے رہوں گا اس سے
پیچ کرتی ہے تری زلف گرہ گیر عبث

دریائے خوں سے بھی نہ بجھی جس کی تشنگی
ہم سے ہو لبِ خنجر بُراں کا کیا علاج

گو زخمہائے تن مرے بھر آئے چارہ گر
اے بیخبر جراحت پنہاں کا کیا علاج

گرائی برق نگہ اس نے کعبۂ دل پر
غضب ہوئی ہے تری چشم سرمہ سا گستاخ

ہمارے خون پہ جمانے لگی ہے رنگ اپنا
مَل اس کو پاؤں تلے تو کہ ہے حنا گستاخ

ساغر اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں مینائے شراب
ہے یہ انداز ترا ساقی سرشار پسند

دل میں رہا کیا غم جاناں تمام عمر
گھر سے گیا نہ میرے یہ مہماں تمام عمر

آنے دو بھلا روز قیامت کو بھی اک دن
ناپیں گے ترے قامت رعنا کے برابر

مت چھوڑ کے جا مجھ کو تڑپتے ہوئے قاتل
اک ہاتھ لگا اور بھی تو آ کے برابر

ہم بیکسوں کا آن کے تو ہی ثواب لے
اے موت رحم کر مرے حال تباہ پر

جب تک نہ خاک ہو جیئے حاصل نہیں کمال
یہ بات کھل گئی ہمیں اکسیر دیکھ کر

اک شمع اور بڑھ گئی محفل میں یار کی
جلتا رہا میں غیر کی توقیر دیکھ کر

دی ہم کو جان اور کیا ہم سے زر عزیز
زر جان سے زیادہ ہے واں بھی مگر عزیز

چپ پڑے رہتے تو کیوں یاں سے اٹھائے جاتے
ہائے کیوں شور مچایا تری دیوار کے پاس

ان کے آنے کی جنازہ پہ توقع کس کو
وہم کرتے ہیں جو آتے ہوئے بیمار کے پاس

تب بھی نظارہ سے سیری نہیں ممکن ہے اگر
لاکھ آنکھیں ہوں ترے طالب دیدار کے پاس

اور بھی تو بہت اعضا تھے بدن میں یا رب
خون ہونے کو ہوا کیوں جگر و دل مخصوص

اک دیکھنا ہے کہئے تو اسکو بھی چھوڑ دیں
رکھتے نہیں ہیں آپ سے اسکے سوا غرض

مشہور ہے کہ یار کی یاری سے کام ہے
فعلوں سے میرے رکھتے ہیں کیوں آشنا غرض

دل میں کیا ہے گھر مرے اور مجھ سے ہی حجاب
سارے جہاں سے آپ کا دیکھا نیا لحاظ

معشوق ہے تو صورت عاشق جلی ہے کیوں
کچھ آج تک نہ ہم کو کھلا ماجرائے شمع

دم تک نہ مارے اور جلے سر سے پاؤں تک
دیکھا کسی کو ہم نے نہ ایسا سوائے شمع

دل پہ داغ آتشیں کل ہے سدا روشن چراغ
یہ فسون عشق ہے جلتا ہے بے روغن چراغ

چشم عبرت سے تو دیکھ اس خانہ ویراں کی طرف
کیا کریگا جا کے تو گور غریباں کی طرف

ساکنان کوچہ جاناں نے روز حشر میں
آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا باغ رضواں کیطرف

آج کا کل پہ نہ رکھ کام کہ معلوم نہیں
کیا دکھائیگی تجھے گردش دوراں کل تک

قند و نبات کی ہے حلاوت زبان تلک
لذت ہے زہر غم کی مگر کام جان تلک

وادی ایمن میں بھی ہے اسکی چنگاری کلیم
لگ رہی ہے وہ جو میرے سینۂ سوزاں میں آگ

سوزش غم کے مضامین اس میں لکھے ہیں بہت
خوف ہے عارف نہ لگ اٹھے مرے دیواں میں آگ

اس سے ملنے کی بتادے کوئی تو ہم کو بھی راہ
اے خضر عالم میں تجھ کو رہنما کہتے ہیں لوگ

ڈال دو لیجا کے مجھ بیمار غم کو بھی وہیں
کوچۂ دلدار کو دار الشفا کہتے ہیں لوگ

تجھ پر فدا ہے جان ہماری نثار دل
صدقے کریں جو پاس ہوں اپنے ہزار دل

عارف گناہ کیجیو سارے جہان کے

جان پر بن گئی یاں دیکھ کے بیتاب اسکو
ہوئے ہمیشہ کو رنج خمار سے فارغ
وُہ شورِ عشق کی رگ رگ میں ہو گئی تاثیر
رکھتے ہیں دل میں خیال چشم مخمور بتاں
خاک جلکر ہو گئے تو لے اڑی ہم کو نسیم
گر خطا ہم سے کوئی سرزد ہوئی تو کیا عجب
نزع میں جو مرے لب ملتے ہیں سنتا ہمدمو
دیکھا ہے ترے بیمار کو عیسیٰ تو جواب
تکلیف آپ آنے کی کیوں آشنا کریں
خود میں خجل کہ جیتے رہے اس کے ہجر میں
زاہدوں سے خوب ہی لیوینگے اب تو رشوتیں
کچھ تو ہے بات کہ خاموش رہا کرتا ہوں
کس نے یہ نام رکھا چشم سیہ کا تیری
زاہدا میکدے کی راہ سے گذ امت کر
کہتے ہیں رنج ہجر سے کم ہے عذاب گور
وضو کے ہیں آکے باغِ جناں میں چلے گئے
ڈر ہے کہ بہہ نہ جائے تصوّر ترا کہیں
عارف بتا کہ سر ہے یہ کس دن کیواسطے
برعکس ہوا کرتے ہیں سب کام ہمارے
شامت ہے کس کی مُنہ جو ترے ناصحا چڑھے

لیکن لگائیو نہ کہیں زینہار دل
گُذرے اس نالۂ پُر درد کی تاثیر سے ہم
ملا کے آنکھ کسی چشم نیم خواب سے ہم
شراب پی کے رہے مجتنب شراب سے ہم
ڈالتے ہیں کعبہ میں میخانہ کی بنیاد ہم
در تلک پہنچے ترے جب ہو گئے برباد ہم
یارب آخر حضرت آدم کی ہیں اولاد ہم
دردِ الفت کی یہ شاید انتہا کہنے کو ہیں
لب جاں بخش ترے دیکھئے کیا کہتے ہیں
بیٹھے ہوئے وہیں مرے حق میں دعا کریں
اپنا یہ مُنہ نہیں ہے کہ اس سے گلا کریں
میکدے کی ہو گئی ہے ہمکو خدمت ان دنوں
کچھ تو ہے کام کہ دنیا سے ہمیں کام نہیں
شوخ اس طرح ہوا کرتے ہیں بیمار کہیں
رہن ہو جائے نہ یہ جبّہ و دستار کہیں
مرنے کی کس لئے مجھے پھر آرزو نہ ہو
دِل میں خیالِ کوچۂ جاناں کئے ہوئے
بیٹھے ہیں بند دیدۂ گریاں کئے ہوئے
پھرتا ہے آج تیغ وہ عریاں کئے ہوئے
اسواسطے مرنے کی تمنّا نہیں کرتے
جو شخص یوں بلا کی طرح سر پہ آچڑھے

لذتِ درد سے بیچارہ نہیں ہے واقف ‏ لے گیا چھین کے غمخوار نمکداں مجھ سے
کس بات پہ کس بل پہ یہ بُت ہوگئے مغرور ‏ ہے کونسی خوبی نہ کمر ہے نہ دہن ہے
نگاہِ یار کیا شے ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا ‏ جگر کے پار ہوتی ہے نہ برچھی ہے نہ بھالا ہے
ہوں یہ بے پردہ بھی تو کیا نہیں دیکھے کوئی ‏ جلوہ حسنِ بتاں ہوش ربا ہوتا ہے
اسکو کہتے ہیں چڑھانا کہ رقیبوں کا سلام ‏ ان کے خط میں مجھے ہر بار لکھا ہوتا ہے
آغاز دردِ عشق کے انجام کو نہ پوچھ ‏ یہ ابتدا ہے وُہ کہ نہ جس کی خبر ملے
مجھکو اور آپ کو عالم میں نہ رسوا کیجے ‏ آپ ہو رہیئے مرے یا مجھے اپنا کیجے
ہم تو دیوانے ہیں مجنوں کی کہے جائیں گے ‏ ہیں حسیں آپ طرفداری لیلےٰ کیجے
آج کچھ شکل ہے کل اور ہے صورت اپنی ‏ عاجز آجائے نہ کیونکر زر او رباں ہم سے
کون سی جا ہے جہاں خاک نہیں ہے اپنی ‏ بچ کے چلتا ہے کدھر سروِ خراماں ہم سے
زبانِ خضر تھکی کہتے کہتے بسم اللہ ‏ کسی کی رہ میں جو ہم بیقرار ہو کے چلے
ناتوانی کا بُرا ہو کہ قدم اُٹھ نہ سکا ‏ طرف کوچۂ دلدار اُٹھے اور بیٹھے
کبھی اے نالۂ دل اتنی تو تاثیر دکھا ‏ ہو کے مضطر وُہ جفا کار اُٹھے اور بیٹھے

قطعہ

جب سے سرکارِ عشق میں عارف ‏ ہم ملازم ہوئے یہ بندی ہے
کہ خوشی کا نام لیجو نام کبھی ‏ غم سے ہی تجھ کو بہرہ مندی ہے
کیونکہ شادی کو پھر پھٹکنے دوں ‏ نوکری ہے کہ بھائی بندی ہے

قصیدہ کی تشبیب

صدف چشم میں ہیں میرے بھی کیا کیا گوہر ‏ ایک سے ایک سر شکوں کے ہیں اعلےٰ گوہر
خانۂ سے بے در و دیوار نہ لٹ جائے کہیں ‏ دیکھ اے دیدۂ تراب تو نہ برسا گوہر
یہ بھی غماز ہوا کیا مرے دشمن کی طرح ‏ کان تک یار کے ناگاہ جو پہنچا گوہر

دیکھ تو چشمِ حقیقت سے کہ ہے اے غافل
دہنِ مار و صدف میں ہے وہی اک قطرہ

صنعتِ صانعِ قدرت کا تماشا گوہر
ایک جا زہر بنا اور وہی اک جا گوہر

آبرو چاہے تو ہو گوشہ گزین عالم میں
دیکھے گر وہ ترے دندانِ صفا پرور کو

گوہرِ بحر سے بہتر ہے یہ تیرا گوہر
غرق ہو آبِ خجالت میں سراپا گوہر

گر نکلتا نہ صدف سے تو نہ ہوتا ہرگز
رہگذر میں ترے مجنوں کے گرے ہیں آنسو

اس طرح برزن و بازار میں رسوا گوہر
ہار کے تیرے یہ ٹوٹے نہیں لیلا گوہر

راستی پیشہ ہو گر چاہیئے عالم میں وقار
قدر پاتا نہیں ہرگز کہیں جھوٹا گوہر

عارف:- سید عارف علی عرف پیرجی صاحب ساکن ریاست الور مقیم حال کوٹہ خطۂ راجپوتانہ۔ آپ نے فارسی کی کتب درسیہ مولوی امیر علی صاحب نارنولی سے پڑھیں جھالرا پاٹن کے ہائی سکول میں تعلیم پائی۔ وہیں محکمہ حساب میں اہلمد تھے۔ اب ریاست کوٹہ کے اکونٹنٹ آفس میں ملازم ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں جب ریاست جھالرا پاٹن کے دو ثلث علاقہ کا کوٹہ کی ریاست سے الحاق ہو گیا۔ تو اس کے ساتھ ملازمین کا جم غفیر بھی کوٹہ میں آگیا۔ اسی سلسلہ میں آپ کو بھی منتقل ہونا پڑا۔ ابتدا میں منشی عبدالشکور خاں صاحب برقؔ اجمیری سے اصلاح لیتے رہے۔ کوٹہ میں مولوی نذیر حسن صاحب فتنہؔ سندیلوی سے رسم دوستانہ قائم ہو جانے پر ان سے مشورۂ سخن جاری رکھا۔ ترتیب تذکرہ کے وقت آپ کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ کلام میں شگفتگی۔ طبیعت میں جدت اور آمد ہے۔ آپ خوشنویس بھی ہیں۔ اشعار ذیل آپ کے کلام سے انتخاب کئے جاتے ہیں۔

مقصود جو تھا کوچۂ دشمن میں ٹھہرنا
ہاتھ آگیا حیلہ اُسے کیا لغزشِ پا کا

مشتاقِ ستم سینکڑوں ہیں چاہنے والے
دیدیتی ہیں کام ان کی جفائیں بھی وفا کا

عارف ایسی بیخودی بھی کیا تو نکلے عشق میں
آدمیت ہی سے اے مردِ خدا جاتا رہا

غضب کی ہے ادا اس فتنہ زا میں
حیا شوخی میں اور شوخی حیا میں

آتی ہے نظر خدا کی قدرت
جب ان کا جمال دیکھتے ہیں

دیتے ہیں تسلیاں وہ پیہم
جب مجھ کو نڈھال دیکھتے ہیں

ہے قیامت کہ وہ یوں کرتے ہیں قائل مجھکو
جان پیاری ہے کسی کو تو نہ دے دل مجھ کو

اُٹھ کے پہلو سے خفا ہو کے یہ کہکر وہ چلے
اب دکھانا اثر جذبۂ کامل مجھکو

تیری صورت سے جو کچھ ملتی ہے صورت اسکی
دھوکے دیتا ہے شبِ غم مہ کامل مجھ کو

چلدیئے تاب و تواں جان حزیں رخصت ہوئی
مجھسے سب مٹ گئے دنیا سے اب فرصت ہوئی

کام آتی ہے دعا اور نہ دوا آتی ہے
ایک چلتی نہیں جب سر پہ قضا آتی ہے

نہ طریقے کی محبت نہ قرینے کا ستم
نہ وفا آتی ہے تم کو نہ جفا آتی ہے

کیا صبح شب وصل قیامت کی گھڑی تھی
بلیساختہ آنسو مری آنکھوں میں بھر آئے

دھوکا ہُوا کیا غیر کے گھر کا مرے گھر پر
تم بھول کے اس وقت مری جاں کدھر آئے

سہل ہر بات ہے جو آپکے دل میں ٹھن جائے
نہ جفا آپ کو مشکل نہ وفا مشکل ہے

تم اگر چاہو تو آساں ابھی سب کچھ ہو جائے
مشکلیں ہیں تو مجھے ہیں نہیں کیا مشکل ہے

مجھے یاد کرکے وہ بھولے ہیں شاید
کہ رہ رہ گئیں ہچکیاں آتے آتے

نہ نکلا کام کچھ آہ و فغاں سے
نہ بدلہ لے سکے ہم آسماں سے

پھنکے ہم اف ری گرمیِ محبت
جلے ہم آتشِ سوزاں نہاں سے

ہوئیں مشہور سب خلوت کی باتیں
ذرا ہشیار اپنے رازداں سے

عارف: نواب سید خاقان حسین خاں دہلوی رئیس اعظم کانپور۔ ان کے بزرگ قم سے آکر شاہانِ مغلیہ کے دربار میں ملازم ہوئے۔ پچھلی صدی کے اوائل میں نواب معتمد الدولہ بہادر سرکار لکھنؤ میں عہدہ وزارت پر ممتاز تھے۔ حضرت عارف کے والد ماجد نواب سید مظفر حسین خاں صاحب خلف نواب معتمد الدولہ کے نواسے تھے وہ عارف

سرکار انگلشیہ سے دو ہزار ماہوار وثیقہ پاتے رہے۔ علاوہ ازیں قسمت آگرہ میں بھی زمینداری ہے۔ ۱۲۸۵ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ اردو۔ فارسی۔ عربی۔ انگریزی سے واقف ہیں۔ مذاہب کی تحقیقات کا شوق ہے۔ کتب فلسفہ کا مطالعہ زیادہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی رسالہ زمانہ میں مضامین بھی لکھے ہیں۔ اپنے مذہب کی تائید میں ایک کتاب بزبان انگریزی لکھی ہے جس کا نام "اسٹڈی آف شیعہ ازم" ہے۔

شروع میں چند غزلیں حضرت داغ کو دکھائی تھیں۔ اب عرصہ سے اپنے کلام پر خود ہی نظر ثانی کر لیتے ہیں۔ صاحب حامد آذر بائجانی سے فارسی میں اصلاح لی ہے۔ مشق نے کلام میں پختگی پیدا کر دی ہے۔ حسن بیان اور لطف محاورہ کی لذت سے دلوں کو گرما دیتے ہیں۔ آمد طبیعت۔ مضامین کا وفور۔ لفظوں کی شوکت قابل داد ہے۔ لیکن اکثر جگہ توارد بھی نظر آتا ہے۔ مطلع ذیل ملاحظہ ہو:۔

وہ مجھے ہجر میں جینے کی دعا دیتے ہیں کس محبت سے محبت کی سزا دیتے ہیں

اسی غزل کا ایک شعر اور ہے۔

یہ ادائیں ہیں مری جان کی لینے والی یہ اشارے مجھے پیغام قضا دیتے ہیں

مندرجہ بالا دونوں اشعار حضرت داغ کے دیوان میں موجود ہیں۔ اور بلا تحریف الفاظ زبان زد عوام ہیں۔ اسی طرح یہ شعر بھی۔

گھر راہ میں ہو غیر کا یہ بھی مری قسمت اے جذب محبت انہیں آنا تو یہیں تھا

حضرت انور کا شعر ہے۔ جس کے مصرعہ ثانی میں جناب عارف نے خفیف سی تحریف کی ہے۔ اس امر سے قطع نظر کلام اچھا ہوتا ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو۔

اپنے دشمن ہوں تو غیروں کی شکایت کیسی انہیں حسرت ہے اپنے چاہنے والوں میں شامل ہوں ستاتا ہے زمانہ آسماں آزار دیتا ہے	اور تو اور مجھے دل نے سنبھلنے نہ دیا تڑپ کر مجھ سے کہتے ہیں کہ میں بھی ترا دل ہوں یہ کس ناشاد کا ارماں یہ کس کمبخت کا دل ہوں

خوگرِ رنج و بلا ہوں مجھے راحت ہے عذاب
تاثیر دے خدا جو مرے اضطراب میں
لے پاس جاکے غیر کے ارمان لوٹ لے
جی چاہتا ہے آج سُنیں کہکے وصل کو
کہنے لگے وُہ میرا بُرا حال دیکھ کر
موسٰی نہیں ہوں میں کہ مجھے آپ ٹالدیں
دم دے کوئی تو آپ پر احسان ہی نہیں
کیوں بھیجئے اجل کو تقاضے کے واسطے
میرا مرنا بھی شبِ غم انہیں منظور نہیں۔
کوئی رہ جائیگا ارماں تو مصیبت ہوگی
انکے اس کہنے پہ آتا ہے تبسم مجھ کو
میری خاطر سے وُہ دشمن کو بُرا کہتے ہیں
تمھیں رُو وگے جو مر جائینگے میرے دشمن
کوئی نہ ہوگا میری قبر پہ تو کیا ہوگا
وفا کا اب تو کہیں نام بھی نہیں سنتے
شوخی کسی کی آنکھ میں تاثیر کر گئی
کیسا وصال کِس کی تمنّا۔ کہاں کا لطف
پہلی سی وُہ تراوش خوں آنکھ سے کہاں
یہ نظر غیر پر نہ ہو جائے
زلف جاناں ہوا سے بگڑی ہے
میری بلا سے کیوں میں کہوں کسکے گھر رہے

میں تو مر جاؤں اگر آپ نہ بیداد کریں
گھبرا کے آپ آئیں وہ خط کے جواب میں
یاں کیا دھرا ہے اس دل خانہ خراب میں
وہ بات جو کبھی نہ سنی ہو جواب میں
اچھا ہُوا کمی تو ہوئی اضطراب میں
میں لن ترانیاں نہ سنونگا جواب میں
گویا کسی غریب کی کچھ جان ہی نہیں
ہم جان دیں کہاں سے یہاں جان ہی نہیں
آج گھبرا کے چلے آئیں تو کچھ دُور نہیں
خیر سے دل میں ابھی تک کوئی ناسُور نہیں
پاس بیٹھوں گا تو چھیڑوگے بہت تم مجھ کو
آنہ جائے کہیں کم بخت تبسّم مجھ کو
رات دن بیٹھ کے کوسا نہ کرو تم مجھ کو
غریب جان کے موجود بیکسی ہوگی
کسی زمانہ میں شاید کسی نے کی ہوگی
میری نگاہ شوق کدھر سے کدھر گئی
ہم بھی ہوئے تمام وہ شب بھی گذر گئی
دل کیا گیا کہ لذت زخم جگر گئی
جو اِدھر ہے اُدھر نہ ہو جائے
یہ کہیں میرے سر نہ ہو جائے
اب بھی وہیں نہ جاؤ جہاں رات بھر رہے

کہتے ہیں جسکو شرم وہ کچھ اور بات ہے
کچھ یہ نہیں ضرور کہ نیچی نظر رہے

ہم آج سے ارمان کسی کا نہ کریں گے
لو جاؤ تمہاری بھی تمنا نہ کریں گے

دشوار نہیں ہے انہیں کچھ میرا جلانا
اک ضد ہے کہ تقلید مسیحا نہ کرینگے

ہم سے گلہ جور و جفا ہو نہ سکے گا
یہ تو نہ کیا ہے دل شیدا نہ کرینگے

ابھی سے روکتے ہو یوں مجھے اچھی کہی تم نے
قیامت تک کہونگا تمکو کیا سمجھا تھا کیا نکلے

ستم وہ ہو کہ جس میں لطف آئے مہربانی کا
عداوت وہ کرو جس میں محبت کا مزا نکلے

قیامت کی ادا شوخی یہاں آفت کی بیتابی
مزا آئے جو دونوں کا برابر حوصلہ نکلے

سن لیجئے کچھ دل کا تقاضا تو نہیں ہے
فریاد مری آپ کا شکوہ تو نہیں ہے

دل میرا ستانے کو نہ لیجئے ہوا دیجئے آپ
ایسا تو نہ ہو دیکھئے ایسا تو نہیں ہے

دنیا مجھے کہتی ہے کہ دیوانہ ہوا ہے
پھر آپ کو کیا آپ کا چرچا تو نہیں ہے

عارف
عارف۔ محمد عارف رفوگر کشمیری شاہ نجم الدین آبرو کے شاگرد اور میر و مرزا کے ہمعصر تھے۔ دہلی میں سکونت تھی۔ ایک پرانی بیاض میں کچھ کلام ملا۔ اُس میں سے چند شعر منتخب کئے گئے جن میں محاورات کی صفائی اور بندش کی چستی قابل ملاحظہ ہے

جس قدر دشوار ہے ہم سے وفا کا چھوٹنا
تم سے مشکل ہے میاں جور و جفا کا چھوٹنا

یا الٰہی بلبل و گل میں رہے دائم ملاپ
ہے قیامت آشنا سے آشنا کا چھوٹنا

سرو لے کر عصا ترے آگے
ہے کھڑا چوبدار کے مانند

پاؤں لگتے ہی ترے بھاگ لگے مہندی کو
رشک سے ہم تو جلے آگ لگے مہندی کو

جس وقت اٹھ کے ہنستے تم یک بیک چلے
بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک چلے

وحشت زدہ سے کہو کہ آن ملے
ورنہ عارف افیم کھاتا ہے

ہمیشہ دل پہ خیال نگار گذرے ہے
اسی خیال میں لیل و نہار گذرے ہے

عارف

عارف:۔ مولوی انعام اللہ خاں سپرنٹنڈنٹ فرخ آباد۔ ان کی زبان صاف اور شستہ ہے محاورات خوب نظم کرتے ہیں حسن بیان پاکیزہ ہے۔ مضمون آفرینی کی بھی کمی نہیں۔ بندش الفاظ اگر زیادہ چُست نہیں تو اسقدر سُست بھی نہیں ہے۔ کہ سننے والوں کو شعر بے لطف معلوم ہو۔ اکثر گلدستوں میں غزلیات شائع ہوتی رہی ہیں۔ فراہم شدہ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

مجھ کو حیرت ہے میں ہوں کس کے گنہگار و نہیں
کہ ہے رحمت مرے عصیاں کے خریدار و نہیں

ٹکڑا ہے چاند کا رُخ زیبا کہیں جسے
ٹکّا ہے نور کا قد رعنا کہیں جسے

عشق بُتاں کا رنج کہاں تک اُٹھائیے
پتھّر تو کچھ نہیں ہے کلیجا کہیں جسے

مشتاق وصل کیا ترے وعدہ سے شاد ہو
وعدہ بھی وہ کہ وعدہ فردا کہیں جسے

مطلب نہیں ہے اور کسی خوش نصیب سے
قسمت بدل سکے تو بدل لوں رقیب سے

کیا سایہ اُن پہ اُس گل رعنا کا پڑ گیا
قمری سے سرو کھنچ گئے گُل عندلیب سے

گلچیں کا ڈر ہے خار کا کھٹکا خزاں کا خوف
پوچھو نہ حال اُلفت گُل عندلیب سے

شاید ہمارے مرنے کا ہے ان کو انتظار
خود حال پوچھ جاتے ہیں آکر قریب سے

عارف

عارف:۔ میر جمال الدین مرحوم شاگرد خواجہ حیدر علی صاحب آتش۔ زیادہ کلام دستیاب نہ ہوا۔ جو کوئی رائے قائم کی جاتی۔ اشعار ذیل میں فرسودہ مضامین کے سوا کوئی جدت نہیں ہے۔

پلاؤ جام اے ساقی کہ جو ہو رشک جام جم
تماشا دو جہاں کا دیکھ لوں میں ایک ساغر میں

نکل جاتا ہے مُنہ سے رزق گر ہووے نہ قسمت کا
بہ رنگ آسیا انساں رہے گر لاکھ چکّر میں

مری وحشت کا باعث ان حسینوں کی ہے آرائش
وہاں زُلفیں سنورتی ہیں جنوں بڑھتا ہے یاں سر میں

اُدھر جنبش ہوئی اسکو اِدھر لاکھوں ہوئے بسمل
قیامت کی بُرش دیکھی ترے ابرو کے خنجر میں

عاشق

عاشق:۔ مرزا والا جاہ بہادر عرف چھوٹے صاحب خلف نواب دلیر الدولہ

مرزا محمد علی خاں عرف آغا حیدر نیشاپوری فیض آبادی مقیم لکھنؤ۔ آپ کو سرفراز علی قادر سے تلمذ تھا۔ فنِ سخن کو حاصل کیا تھا۔ علوم معانی و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ عروض و قافیہ کے بھی ماہر تھے۔ طبیعت میں آمد اور شاعری سے مناسبت تھی۔ بڑی بڑی شور زمینوں کو الفاظ کے آب شیریں سے سبزہ زار بنا دیا ہے۔ جیسے نازک خیال تھے زبان پر بھی ویسی ہی قدرت رکھتے تھے۔ طبیعت کا زور مطبوعہ مختصر دیوان میں نہیں سماتا۔ لکھنؤ کے قدیم رنگ میں خوب کہتے ہیں۔ الفاظ کی دھوم دھام سے معمولی مضامین کو بھی بلندی پر پہونچا دیتے ہیں۔ کیا اچھا شعر کہا ہے۔

امید نامہ نے لی جان آخر	مرا لکھنے کے قابل ماجرا ہے

ایک جگہ فرماتے ہیں:

اس لئے ہے ترے ابرو کا تصوّر دل میں — یہ نہ کہنے کو ہو کعبہ تو ہے محراب کہاں

شعرا دل کو کعبہ سے مناسبت دیتے چلے آئے ہیں۔ مگر حضرت عاشق نے اس میں یہ جدت پیدا کی ہے۔ کہ کعبۂ دل میں محراب بھی قائم کر دی۔

لیکن باوجود ان محاسن کے رعایت لفظی کے پھیر میں کبھی بھٹک بھی جاتے ہیں۔ اور واہی تباہی کہنے لگتے ہیں مثلاً ؎

لڑائی وصل میں سونے پرائے پری ہو جائے — ہمارے آپ کے یہ جنگ زرگری ہو جائے

انتخاب میں ایسے اشعار قلمزد کر دئے گئے ہیں۔

افسوس ہے کہ آپ کے حالات دستیاب نہ ہوئے۔ جسقدر تحقیق ہو سکے زیب تذکرہ کر دئے گئے۔ آپ کا دیوان موسومہ بہ "فیض نشاں" ۱۲۹۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ آپ کی عمر کا بھی حال نہ معلوم ہو سکا۔ صرف یہ تحقیق ہوا کہ ۱۲۸۹ھ میں آپ نے رحلت فرمائی۔ دیوان "فیض نشاں" کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

خزاں کے ہاتھ سے گلشن میں خار تک نہ رہا	بہار کیسی نشانِ بہار تک نہ رہا

حساب روز جزا سے مجھے فراغت ہے
کئے وہ جرم کہ جن کا شمار تک نہ رہا

مرے تو نشۂ الفت اُتر گیا عاشق
وہ کیا شراب تھی جس کا خمار تک نہ رہا

مجھ کو حیرت ہے عجب دریا ہی اس کوزے میں بند
اشک تھا آنکھوں میں جب ٹپکا سمندر بن گیا

اپنے باغ حسن کا اس نے تماشہ دیکھ کر
آئینہ جب رکھ دیا پھولوں کی چادر بن گیا

سر پٹک کر خانۂ زنداں میں میں نے جان دی
در میں رخنے پڑ گئے دیوار میں گھر بن گیا

نشۂ فکر رسا سے کیوں نہ عاشق مست ہو
سر جھکا جب کاسۂ زانو کا ساغر بن گیا

بنا ہے روح مجھ افسردہ دل کو نشہ پانی کا
مے گلگوں کو سمجھا پھول باغ زندگانی کا

ہم کو کالے سے سوا وہ مار کا کل ہو گیا
آنکھ ملتے ہی چراغ زندگی گل ہو گیا

اس قدر مضمون غم لکھنے کی میں نے مشق کی
ایک عشرے میں کمیت خامہ دُلدل ہو گیا

رنگ دکھلاتا ہے پر نور روئے آتشناک کا
کیں سونے کی نظر آتا ہے تنکا ناک کا

کل تو تھی سونے کی بالی آج بنوائی ہے نتھ
میرے مرنے سے بڑھایا اس نے زیور ناک کا

آپ صحرا میں جو میرے قتل کا بیڑا اُٹھائیں
پان کی صورت بنے ہر ایک پتا ڈھاک کا

مجھ کو قاتل کی نزاکت پر اچنبھا ہو گیا
تیغ میں نے کھائی اس کا ہاتھ جھوٹا ہو گیا

چور چوری سے گیا کیا ہیرا پھیری سے گیا
دُور سے دیکھ آتے ہیں جب سے مچلکا ہو گیا

گیسو حجاب روئے دل آرام ہو گیا
نور سحر سواد سر شام ہو گیا

وہ رشک مہر کوٹھے پر آیا ہے دیکھنے
عاشق جب آفتاب لب بام ہو گیا

کہتے ہو جانے پہ ترے آئینگے اک روز
کیا کیجے بہانے سے ہمیں مر نہیں آتا

تم نے جگنو جو باندھے آنچل میں
برق چھپتی پھرے گی بادل میں

غم و شادی بھی یکجا ہے زمانے کی دو رنگی سے
ہنسی شدت سے جب آتی ہے تب آنسو نکلتے ہیں

دکھائے شعبدے اس چشم نے سیر چراغاں میں
دوالی میں جگانے کیلئے جادو نکلتے ہیں

پاؤں تھکتے ہی نہیں اس راہ میں
دل کھنچا جاتا ہے سوئے لکھنؤ

پھر گیا میرا ستارہ تو نکالوں گا غبار
خاک میں چرخ ملا دوں گا نہ سے تاروں کو

گھر جلا کر سیر دیکھی آہ آتشبار کی
بن گیا نالہ مرا آواز موسیقار کی

جنبش ہوئی ابرو کو لب پارسی پہلے
تلوار لگا بیٹھے وہ تکرار سے پہلے

کھٹکا ہے عبث آٹھ پہر راہ عدم کا
یا چار سے پیچھے گئے یا چار سے پہلے

مجھ کو جی بھر کے مزہ درد کا حاصل ہوجائے
دوسرے پہلو میں بھی چاہتا ہوں دل ہوجائے

کتنے ہوجائیے گھر اسکے جو اپنے گھر آئے
یہ تو جب ہو کہ تمہارا سا مرا دل ہوجائے

بات جو منہ سے نکل جائے وہی بات رہے
ترک ہو اس میں محبت کہ ملاقات رہے

سوزش داغ و دم سرد و سرشک حسرت
کبھی گرمی کبھی جاڑا کبھی برسات رہے

نہ بڑھاؤ تو گھٹاؤ بھی نہ غیروں سے ہمیں
نہیں منظور ترقی تو مساوات رہے

لڑائی وصل میں سونے پڑے پری ہوجائے
ہمارے آپ کے یہ جنگ زرگری ہوجائے

خو نامہ و پیغام کی دلبر نہیں رکھتے
بت کیسے خدا ہیں کہ پیمبر نہیں رکھتے

صدا فریاد کی آتی ہے چاک سینۂ گل سے
چمن میں کوئی گل پھولے نہ گلچیں خون بلبل سے

امید نامہ نے لی جان آخر
مرا لکھنے کے قابل ماجرا ہے

عاشق :- منشی غلام حسین صاحب خلف اکبر و شاگرد مولوی غلام عباس صاحب متوطن سمبھی ضلع اعظم گڈھ۔ انہوں نے اپنے والد سے فارسی کی تحصیل کی۔ فن سخن میں بھی انہیں سے استفادہ کیا ہے۔ شاعری کا اوائل عمر سے شوق ہے۔ متعدد رسالوں اور گلدستوں میں کلام شائع ہوچکا ہے۔ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ شعر سمجھ کے کہتے ہیں۔ اور اچھا کہتے ہیں۔ اب کچھ حال معلوم نہیں۔ کلام یہ ہے۔ عاشق

نہیں گردوں پہ یہ مہ تاباں
عکس ہے اسکے روئے انور کا

چشم بینا کے واسطے عاشق
ایک نسبت ہے سنگ و گوہر کا

کل تو آنکھیں نہ لگیں شام سے تا صبح مری
آج کیا حال کرے گی شب ہجراں مرا

عجب انداز سے اس سنگدل نے اس کو توڑا تھا
کہ نکلی شیشۂ دل سے صدائے آفریں برسوں

نہ دام بلا دونور ہے گیسو کی الفت میں
مری جانِ حزیں برسوں دلِ اندوہگیں برسوں

رحمت حق سے تو محروم رہے گا واعظ
بخشے جاتے ہیں وہی جو کہ خطا کرتے ہیں

ابھی سے حشر کا عالم نظر آتا ہے آنکھوں میں
ہماری شام غم صبح قیامت ہونیوالی ہے

عاشق

عاشق:- میرزا نظام الدّین گورگانی از اولاد شاہ عالم ثانی۔ میرزا عالی کے شاگرد تھے ستار خوب بجاتے تھے۔ اپنے رنگ میں اچھا کہتے تھے۔ زیادہ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ یہ چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

دردِ فراق جور بتاں نالہ ہائے شب
کن کن مصیبتوں میں خدایا نہیں ہوں میں

اس گل کے مگر باغ میں آنے کی خبر ہے
ہر غنچہ لئے ہاتھ میں یک مشت جو زر ہے

مجھے فیضِ سخن عالیؔ سے یاں پہنچا ہی اے عاشقؔ
کہ ان کو فیض ثابتؔ سے اور ثابتؔ کو احساںؔ سے

عاشق

عاشق۔ نواب مہدی علی خاں دہلوی نبیرہ نواب علی مرداں خاں مرحوم۔ ان سے تین دیوان اور چند مثنویاں یادگار ہیں۔ شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں اپنے مکان پر مشاعرہ کیا کرتے تھے ایک تذکرۂ شعرائے ریختہ بھی مرتب کیا تھا۔ بڑے مضمون آفرین تھے شعر میں محاورات اور روزمرہ خوب نظم کرتے۔ زبان بہت اچھی تھی۔ نمونۂ کلام یہ ہے

ابر آتا ہے۔ آفتاب چھپا۔
ساقیا مت شراب ناب چھپا

گو آہ میں اپنی نہیں تاثیر سر دست
پر ہے یہ۔ بساط اپنی ہے اک تیر سر دست

دن تو جوں توں کے کٹا رات پھر آئی سر پر
آفت تازہ جدائی تری لائی سر پر

عاشق

عاشق،- میرزا رحمت بخش مرحوم نبیرہ شاہ عالم ثانی۔ میرزا رحیم الدین حیا کے شاگرد طبیعت دار و روشن خیال شاعر تھے۔ نتیجۂ فکر کا نمونہ یہ ہے۔

دوستوں نے پس مردن یہ کیا مجھ سے سلوک
کہ رکھا اس ستم آثار کی دیوار کے پاس

پگھلے نہ دلِ بتوں کا نہ دل غیر کا جلے
نالوں کے اب اثر وہ خدا جانے کیا ہوئے

عاشق

عاشق :- محمد مرتضےٰ عرف میرزا مچھو بیگ خلف میرزا اچھو بیگ و داماد مولوی مصطفےٰ خاں صاحب مطبع مصطفائی ارشد تلامذہ نواب اصغر علی خان نسیم دہلوی اخبار اودھ پنچ کے نامی اور قابل نامہ نگاروں میں تھے "ستم ظریف لکھنوی" کے نام سے جو معرکتہ الآرا مضامین نکلتے تھے۔ وہ ان کی شوخی طبع کا نمونہ ہوتے۔ آزاد مزاج رند مشرب آدمی تھے۔ لوگوں کو آخر وقت تک نہ کھلا کہ شیعہ تھے یا سنی المذہب عشق بازی کا چسکا اور حسن پرستی کا لپکا تھا۔ میرزا صاحب مرحوم نے اودھ پنچ کے زمانۂ شباب میں چانڈو خانوں کے متعلق جو مضمون شروع کیا تھا وہ ادبی حیثیت سے اہل قلم میں آج تک مشہور ہے۔ آپ نے ایک مثنوی "نیرنگ خیال" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں لکھنؤ کی بیگماتی زبانوں کو نہایت خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے۔ ایک لغات زبان اُردو میں مرتب کیا تھا۔ جس کے حصۂ اول میں الف ممدودہ اور الف مقصورہ تک کے الفاظ ہیں۔ دوسری جلد مرتب کر رہے تھے۔ کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے چیدہ ظریفانہ مضامین "چشمۂ بصیرت" کے نام سے ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے تھے۔ مگر قابل قدر ادبیات کا سرمایہ اب تک اودھ پنچ کی قدیم جلدوں میں محفوظ ہے فن شعر گوئی میں بھی ید طولیٰ رکھتے۔ کلام سرتا پا عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ پھر محاورات کی برجستگی۔ زبان کی شیرینی اور روزمرّہ کی صفائی قابل دید ہے جو کچھ کلام ہاتھ لگا ہے۔ اس کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

کچھ بھی نہ تھا جو حسن ترا جلوہ گر نہ تھا
اندھیر تھا جہاں میں جو تو اے قمر نہ تھا

کیا کیفیت بیان کروں شام وصل کی
جس طرح عیش خواب کہ وقت سحر نہ تھا

یہ اُس کی شان کر گئی تاثیر یار پر
میری دعا کہ نام کو جس میں اثر نہ تھا

کیوں چارہ گر سے کہہ نہ دیا اپنے دل کا حال
کیا قابل بیاں لب زخم جگر نہ تھا

اسی نظر سے ہے واعظ کو شوق جنت کا
پئیں گے مفت کی چل کر شراب کوثر پر

بتوں کی قدر تو کعبے میں جا کے مجھ کو ہوئی
خدا کے گھر میں بھی سجدے کئے جو پتھر پر

حسن پریوں کا سُنا کرتے تھے پر کچھ بھی نہیں
دُور کے ڈھول سہانے تھے مگر کچھ بھی نہیں

یُوں دل لگا کے بہت خوش ہوا نہال ہوا
خطا حضور پھر ایسی نہ عمر بھر ہوگی

بیکار تھی دھوم چشم تر کی
اِک دن نہ بجھی لگی جگر کی

جلتا ہے بتوں کے عشق میں دل
کیا قدر ہوئی خدا کے گھر کی

صبح شب وصل خاتمہ ہے
ساری ہے یہ دھوم رات بھر کی

ابھی نہ آپ سمجھ لیجئے خدا کے لئے
بگڑ کے یہ تو نہ فرمائیے خدا کے لئے

عاشق :- پنڈت کنھیالال صاحب کشمیری دہلوی ثم لکھنوی خلف پنڈت ٹھاکر داس دہلوی۔ آپ کی ولادت اور تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ پھر لکھنؤ چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ مدتوں راجہ گڈھ امیٹھی کے دیوان رہے۔ آپ کی تصنیف سے ایک مکمل دیوان کے علاوہ ایک مثنوی گل با صنوبر اور بحر العروض مطول قابل ذکر ہیں یہ کتاب اس وقت تک کی فنِ عروض کی کتابوں میں طرۂ امتیاز رکھتی ہے۔ اوزان بحور اور اصول قافیہ سے نہایت معقول اور مفید بحث کی ہے۔ نظیر میں اُردو اشعار دئے ہیں۔ آپ کا مذاق سخن اچھا ہے۔ دیرینہ مشاق اور سیدھے سادے طرز قدیم کے دلدادہ ہیں۔ دیوان اور عروض کی کتاب کئی بار چھپ چکے ہیں۔ دیوان میں رطب و یابس سب کچھ موجود ہے۔ کلام میں قواعد فن کی پابندی کی لگن زیادہ پائی جاتی ہے۔ جب اس سے علیحدہ ہو کر کہتے ہیں۔ تو مؤثر اور درد بھرے شعر نکال لے جاتے ہیں۔ بہت برس ہُوئے شاید انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں سر گباش ہوئے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے

فکر دارین سے معذور رہا خوب ہوا
دل مئے عشق سے مخمور رہا خوب ہوا

تیر ہے۔ دشنہ ہے۔ خنجر ہے کہ تلوار نظر
صاف جو ہو گئی سینے کے مرے پار نظر

جو تیغ کھینچی ہے تو سر حاضر۔ لگاؤ بسم اللہ ہاتھ لیکن
تمہاری صورت ہی دل میں میرے لگا نا ہاتھ اسکو تم بچا کے

کیا چشمِ ظاہری سوئے باغِ جناں کروں
لازم ہے چشمِ دل کو سوئے باغباں کروں

ہم کو بھی صبر دے گا دیا جس نے تم کو حُسن
کیا آپ کا خدا ہے ہمارا خدا نہیں

یا الٰہی نہ ہوں کم جور و ستمِ قاتل کے
صدمۂ جور اُٹھانے کو جگر پیدا ہو

نہ کی عبادت نہ کچھ ریاضت نہ کی کبھی یادِ حق کوئی دم
کٹی گناہوں میں عمر ساری الٰہی توبہ الٰہی توبہ
ترا ہے عفو عطا برابر مرا قصور و خطا سراسر
ہے عفو کی بس امیدواری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

خوش رہے گو نہ کیا وصل سے دلشاد مجھے
دِل کے بہلانے کو کافی ہے تری یاد مجھے

عاشق:۔ سید اقبال حسین عاشق خلف منشی نور الدین دہلوی۔ پُرانے سخن سنج تھے۔ دہلی کے مشاعروں اور قدیم صحبتوں کو دیکھ چکے تھے۔ مگر ان کی طبیعت نے ابتدا میں جو رنگ اختیار کیا تھا۔ وہ آخر وقت تک نہ بدلا۔ ۱۸۵۸ء میں ریاست لوہارو میں ملازم تھے ۶۸ئہ میں سرکار بیکانیر میں وظیفہ خوار ہوئے ۱۸۸۴ء میں وکیل حاضر باش ریاست ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ ہوئے۔ چالیس سال تک مشقِ سخن میں مصروف رہے مگر اس میدان میں نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے۔ معاملہ بندی کا عجیب ڈھنگ تھا۔ ان کی زود گوئی اور صفائی کے سامنے مضمون کا قافیہ تنگ تھا۔ اوائل سخن میں اساتذہ کی غزل پر غزل کہنے کا شوق تھا۔ اور ایک ایک قافیہ کو کئی مرتبہ لکھتے اور جب تک سامعین سے یہ نہ کہوا لیتے کہ آپ کا قافیہ دوسروں سے بڑھ گیا۔ اس وقت تک ان کا پیچھا نہ چھوٹتے آپ کو سخن فہم حضرات کی ہمیشہ تلاش رہتی۔ اپنے سامعین سے داد لینے کے لئے انہیں کئی روز تک اپنا مہمان رکھتے اور خاطر تواضع سے پیش آتے۔ چند ظرافت پسند حضرات نے ان کے دل میں یہ بٹھا دیا تھا۔ کہ آپ داغ سے بہتر کہتے ہیں۔ اسی بناء پر آپ نے حضرت داغ کے

دو دیوانوں کا جواب قافیہ بہ قافیہ لکھا۔ کاتب کی غلطی سے جناب داغ کے دیوان میں ایک قافیہ غلط چھپ گیا تھا۔ آپ نے اس کا مطلق خیال نہ فرمایا۔ اور اس کو اپنے ہاں بھی اسی طرح باندھ دیا۔ جو کوئی بیکانیر یا دورانِ قیام اجمیر میں آپ سے کلام سننے کے واسطے جاتا سب سے پہلے اس کو داغ کا دیوان دیا جاتا تھا۔ اُس کا فرض تھا کہ وُہ داغ کا شعر پڑھتا جاتا۔ اور آپ اپنا دیوان لیکر اسی زمین کا ہم قافیہ شعر سناتے اور دادِ سخن لیتے۔ حضرت داغ کو جب یہ واقعات معلوم ہوئے تو وُہ ہنسے اور انہوں نے مذاقاً اپنے کئی خطوط میں آپ کے باکمال ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ حضرت مضطر خیرآبادی نے ان کے دیوان کی تقریظ میں یہ مزیدار فقرہ بھی زیب رقم کیا ہے "حضرت داغ کا کلام ہنستوں کو رُلا دیتا ہے۔ مگر آپ کا کلام رونوں کو ہنسا دیتا ہے"۔ حضرت عاشق ہر قسم کی نظم و نثر پر قدرت رکھتے تھے۔ تین دیوان اسرارِ عاشق۔ افکارِ عاشق۔ اعجازِ عاشق ان سے یادگار ہیں۔ شعر پڑھنے کا انداز عجیب و غریب تھا۔ یارانِ مجلس بہترین اشعار کی داد بھی ظرافت کے پیرایہ میں دیتے تھے۔ اپنے آپ کو مرزا غالب کا شاگرد بتاتے تھے حضرت زکی دہلوی۔ مولانا راسخ۔ سوزاں وغیرہ کے ہم مشاعرہ اور بے تکلف دوست تھے سیاہ فام آدمی تھے۔ مگر آپ کا حسن باطن اور اخلاق تعریف کے قابل تھے۔ اکثر اپنے مکان پر بھی مشاعرہ کرتے۔ مرتب تذکرہ ایسی کئی صحبتوں میں شریک ہو چکا ہے۔ دہلی میں شاہ تارا کی گلی میں ان کا مکان تھا۔ تینوں دیوانوں کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

انتخاب دیوان اوّل و دوم

تھا وہم دوئی تفرقہ پرداز وگرنہ
جس مرتبہ تو دور تھا اتنا ہی قرین تھا

اچھا ہیں بُرا سہی ولیکن
ہم اپنی کہو نہیں ہوا کیا

عشق میں بس یہ ہنر پیدا کیا
کچھ نہ رکھا جس قدر پیدا کیا

جو نمک زخموں پہ چھڑکے رات دن
چارہ گر وہ ڈھونڈ کر پیدا کیا

چشم میگوں سے تری مست ہے عالم ساقی
پھر خبر کس کو کہ یہ نشۂ صہبا کیسا

تیر پہلو میں چبھو کر مرے کہتا ہے وہ شوخ
ہم بھی دیکھیں کہ ہے پتھر کا کلیجا کیسا

اے جنوں شوق ہو کیوں بادیہ پیمائی کا
گھر ہی ویرانے سے بہتر ہے تو صحرا کیسا

کمبخت اک امید پہ جیتے ہی رہے ہم
مرنا شب ہجراں میں تو مشکل نہیں ہوتا

تیر کا پیکاں جو میرے دل کے اندر رہ گیا
بدگماں بولا اِدھر آ کیا چرا کر لے چلا

رہ گیا صیّاد بھی بس دیکھتا کا دیکھتا
صید وہ تڑپا قفس کو بھی اُڑا کر لے چلا

ہائے کس ناز سے کہتے ہیں وہ مجھ سے ہر دم
اپنی صورت کو تو دیکھو تمہیں چاہیں کیونکر

وہ عیادت کو جو آتے ہیں تو یہ کہتے ہیں
ناتوانی میں نکلتی ہیں یہ آہیں کیونکر

کرتے ہیں مجھ کو ہی وعظ و پند ناحق رات دن
حضرت واعظ اُسے کچھ جا کے سمجھاتے نہیں

تمناؤں کی رخصت ہے تو ارمانوں کی آمد ہے
مسافر سینکڑوں مہمان سرائے دل میں رہتے ہیں

انہیں غصہ کہ میری بزم میں یہ کس لئے آیا
مجھے یہ غم کہ وہ پہلو میں کیوں دشمن کے بیٹھے ہیں

مقدّر اپنا اپنا ہے کسی کا کیا اجارہ ہے
عدو سے مل کے بیٹھے ہیں وہ مجھ سے تن کے بیٹھے ہیں

نگاہِ ناز سے لوٹا ہے سارا قافلہ دل کا
کلیجے پر ہزاروں تیر اس رہزن کے بیٹھے ہیں

وہ دل ہے خاک جس میں تری آرزو نہ ہو
وہ گل ہے خار جس میں محبّت کی بُو نہ ہو

نامہ کے ساتھ ساتھ چلی جان بے قرار
عاشق کو نامہ بر کی ضرورت نہیں رہی

گر ہماری بندگی ہے نا قبول
تو بتوں کی اب خدائی ہو چکی

ابھی تو عمر نہیں ہے حیا کے آنے کی
عجیب خو ہے تمہاری لجا کے آنے کی

جو آؤ تم تو رہے منتظر لبوں پر جان
وگرنہ راہ نہ دیکھے قضا کے آنے کی

کل تو سمجھاتے تھے حضرت ناصح مجھ کو
آج اُسے دیکھ کے خود بن گئے دیوانے سے

ہم مٹے ہائے مگر وصل کی لذت نہ مٹی
دل گیا ہائے مگر دل سے یہ ارماں نہ گئے

شب فرقت مری آئی بڑی ہے
قیامت جس کی اک چھوٹی گھڑی ہے

یہاں وہ آئینگے کہنے کی ہے بات
بناوٹ ہے یہ فقرہ ہے تڑی ہے

اس شرارت کو تو دیکھو کہ دم نزع وہ شوخ
ہنسکے کہتا ہے کہ پہلے سے تو حال اچھا ہے

از دیوان سوم

آنکھ جادو تھی مگر اس کو نہ چلتے دیکھا
زلف ناگن تھی مگر من نہ اُگلتے دیکھا

تیرہ بختی مری صبح شب وصل آئی کام
چھا گئی ایسی کہ سورج کو نکلنے نہ دیا

ابھی چڑھتی جوانی ہے ابھی اُٹھتی اُمنگیں ہیں
ابھی دل کو ہٹالوں دل لگی سے ہو نہیں سکتا

قیامت کل کی آنیوالی یارب آج آجائے
دل بیتاب سے اب صبر فردا ہو نہیں سکتا

دل کس کی نگاہوں کا پڑا تجھ پہ اثر آج
جو ہم سے بچائے ہوئے جاتا ہے نظر آج

ہو تم کو نہ ان حسن پرستوں کی نظر آج
مُنہ تکتے ہیں آئینہ و پروانہ و عاشق

اسی دل کو برباد تم نے کیا
رہے جس مکاں میں مکیں دیر تک

کسی کے جو آنے کی امید تھی
رہی لب پہ جان حزیں دیر تک

شوخی نے رخنے ڈالدئے ہیں نقاب میں
سو بے حجابیاں ہیں تمہارے حجاب میں

ملتے ہی کام کر گئی وہ چشم سرمہ سا
گویا میں اس طرح ہوں کہ منہ میں زباں نہیں

غیر فتنہ تو نہیں ہے کہ اٹھایا اس کو
میں قیامت تو نہیں ہوں کہ اٹھا دیتے ہیں

غیر کو بھیجتے ہیں میری عیادت کے لئے
مرنے پر اور وہ سو ڈرے لگا دیتے ہیں

لے لیا بوسۂ رخسار تو کیا جرم کیا
پیار کی بات پہ ناحق وہ سزا دیتے ہیں

لگا لینگے مجھے سینے سے وہ ہمدم یقیں آیا
مری پرچھائیں سے جو بھاگتے ہیں مجھ سے ڈرتے ہیں

ترے گیسو پریشاں ہو کے کیوں آتے ہیں عارض پر
یہ کافر ہیں کلام اللہ پر کیوں ہاتھ دھرتے ہیں

سینے پر میرے نشان کف پا رہنے دے
اسکو ظالم مری چھاتی سے لگا رہنے دے

شیخ جی تاک میں ہیں دختر رز کی ساقی
در میخانہ کو ہرگز نہ کھلا رہنے دے

کوئے جاناں میں چلوں بھیس بدل کر شاید ۔۔ پاسباں جان کے درویش پڑا رہنے دے
نیت بھی بُری اس کی نگاہیں بھی غضب ہیں ۔۔ ہاں دختر رز آئے نہ دیندار کے آگے

عاشق

عاشق :- یوسف صاحب عرف دوّلار ے صاحب ولد کپتان مانوک صاحب قوم فرانسیسی۔ ریاست بھوپال کے منوسلین سے ہیں۔ علمی مذاق اعلےٰ درجہ کا ہے تفنگ اندازی میں ہوشیار ہیں۔ ایک یورپین کا فرزند ہو کر آپ مشرقی شاعری کی جملہ خوبیوں کو برتنے میں مشتاق ہیں۔ کلام میں قدما کا رنگ ہے۔ زبان صاف ہے محاورات اور امثال کو بہت خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات پُر لطف ہوتی ہیں۔ کیا خوب کہا ہے ؎

سرمئی خال ہے کہ ابروئے خمدار کے پاس ۔۔ ایک سپر رکھ لی ہے قاتل نے یہ تلوار کے پاس

یہ سپر بالکل نرالی ہے۔ ایک مغربی نژاد شخص پر مشرقی معاشرت و ادبیت کا اس قدر اثر پڑنا علم نفسیات کا ایک باریک نکتہ حل کرتا ہے یعنی مذاق کی ہم آہنگی ذہنی یگانگت پیدا کر دیتی ہے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو :-

محو نظّارہ ہوا کس کے نظر کے تیر کا ۔۔ طائر دل پر گماں ہے طائر تصویر کا
سیاہی زلف شبگوں کی مری آنکھوں میں چھائی ہے ۔۔ گماں ہوتا ہے خورشید فلک پر دن کو جگنو کا
چبھوتا ہے کوئی میرے جگر میں نوک خنجر کی ۔۔ اشارہ یاد آتا ہے جب اس قاتل کے ابرو کا
اشک کا ہر ایک قطرہ ہے سمندر کا جواب ۔۔ ابر نیساں کب ہے میرے دیدۂ تر کا جواب
ہنستے ہنستے چلے آئے مرے گھر آپ سے آپ ۔۔ میرے گریہ نے دکھایا یہ اثر آپ سے آپ
کیا ہوا کس نے کئے دل کے جگر کے ٹکڑے ۔۔ خون روتا ہے مرا دیدۂ تر آپ سے آپ
دیکھو دنیا اسی کو کہتے ہیں ۔۔ یاں ہے سب کی جدا جدا قسمت
مہرباں پھر ہوئے وہ لے عاشق ۔۔ دیکھئے اب دکھائے کیا قسمت
ہے فقط خنجر ابرو کا اشارہ کافی ۔۔ قتل عاشق کی کیا کرتے ہو تدبیر عبث

گل کس کو چمن کس کو۔ کسے سرو وسمن یاد — باقی جو رہا بھی تو رہا گور و کفن یاد
دل میں خیال ہے جو کسی مست خواب کا — ہر لحظہ ہر گھڑی مجھے کیونکر نہ آئے نیند
باندھا تصور قد جاناں تو سو گیا — عاشق مثل یہ سچ ہے کہ "سولی پہ آئے نیند"
سرمئی خال ہے کب ابروئے خمدار کے پاس — اک سپر رکھ لی ہے قاتل نے یہ تلوار کے پاس
ہے عجب۔ گل سے بن گیا غنچہ — ہنستے ہنستے ہوا وہ جب خاموش
ہم نے کافر جان کر اس کو جو سجدہ کر لیا — اس لئے ملتا نہیں طفل برہمن کا دماغ
آتشیں رخ کو چمن میں مرے گلرو کے نہ دیکھ — ورنہ پڑ جائینگے دل میں ترے چھالے بلبل
وصل کتنے ہیں لسے باغ جہاں میں عاشق — بس میں بلبل کے ہو گل۔ گل کے حوالے بلبل
سوزن عقل نے گو بخیہ گری دکھلائی — دست وحشت نے مگر جامہ دری دکھلائی
نزع میں جب اس نے پکارا مجھے — ہو گیا جینے کا سہارا مجھے

عاشق

عاشق:۔ کنور گوبند سہائے نوجوان۔ شوخ طبع۔ خود روشاعر ہیں۔ طبیعت میں جدت ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں اچھے شعر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ارم کو لے اڑی وحشت کسی بلقیس کے پیچھے — پریزادوں نے لوٹا ہے سلیماں کی دہائی ہے
نہ کیونکر لیلی و مجنوں کو ہو الفت میں یکرنگی — ہوئے جب چشم جاناں کی محبت میں ہرن کالے
اثر نالوں کا ہو گا برق سوزاں سے سوا عاشق — مری آہوں سے ہو جائینگے جل کر سب چمن کالے

عاشق

عاشق:۔ نواب شمس الدین علی خاں رئیس اجمیر شریف تلمیذ حضرت داغ دہلوی۔ نواب مہابت خاں امیر عہد جہانگیری کی اولاد سے ہیں۔ جاگیردار ہیں۔ برسوں حضرت ظہیر کو کلام دکھایا۔ مؤلف تذکرہ سے اجمیر میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت پچاس کا سن ہو گا۔ حضرت ظہیر سے تلمذ کے علاوہ قرابت بھی تھی۔ انہیں نانا جان کہا کرتے تھے۔ دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ان کی طبیعت میں آمد زیادہ پائی جاتی ہے مضمون

کی تلاش میں الفاظ کا گورکھ دھندا اور استعارے کے ایچ پیچ سے کام نہیں لیتے بلکہ سیدھی سادی زبان اور روزمرہ لکھتے ہیں۔ کثرت فکر سے طبیعت بہت مشاق ہوگئی ہے۔ بے ساختگی اور بے تکلفی کلام میں بہت پائی جاتی ہے۔ شوخی اگرچہ بدرجۂ اتم ہے۔ مگر متانت کے پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ یہ کلام کا انتخاب ہے۔

کس طرح کر سکے تری رحمت کا سامنا
اتنا تو حوصلہ نہیں میرے گناہ کا

وہ کہتے ہیں تو مبتلا ہے کسی کا
خطا ہے تری جرم کیا ہے کسی کا

جوانی کے دم تک ہیں ساری بہاریں
سدا دور دورہ رہا ہے کسی کا

نہ لینا کبھی صبر تم دلجلوں کے
مری جاں ستانا برا ہے کسی کا

اڑا لے گئے دل کو وہ اک نظر میں
قیامت تھا اُن کا ادھر دیکھ لینا

ایک دل تھا پاس وہ بھی لے خدا جاتا رہا
دل لگی کا لطف جینے کا مزا جاتا رہا

دل اُڑا کر پوچھتا ہے یہ تجاہل سے کوئی
آپ کیوں خاموش ہیں کہئے تو کیا جاتا رہا

کس کے نصیب تم نے جگائے ہیں رات بھر
آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں جو میخوار کی طرح

سزاوار جور و جفا اب ہیں بیشک
وہ مُنہ پھیر کر ہائے کہنا کسی کا

مگر بعد مرنے کے یاد آئینگے ہم
مرو یا جیو یونہی ترسائینگے ہم

در پہ مجھکو وہ پڑا دیکھ کے یہ کہتے ہیں
کیا کہیں تیرا ٹھکانا ہی نہیں گھر ہی نہیں

یہ تو فرمائیں چاہنے والے کیونکر
قتل کرتے بھی نہیں پاس بلاتے بھی نہیں

جان دینے کو میں پھرتا ہوں تو وہ اس ضد سے
آج کل ہاتھ میں تلوار اٹھاتے بھی نہیں

حضرت دل کی عنایت ہے مری رسوائی
دیکھتے ہی یہ حسینوں کو مچل جاتے ہیں

دل بھی میرا لیگئے برباد بھی مجھ کو کیا
پھر بھی کہتے ہیں کہ یہ جور و جفا کچھ بھی نہیں

غیر سے میرے لئے ان کا یہ کہنا دیکھو
دیکھو اس شکل کو اور ان کی تمنا دیکھو

دل یہ کہتا ہے کہ تم عشق ہی کرتے کیوں ہو
جان کا ڈر ہے تو اس شوخ پہ مرتے کیوں ہو

شکوۂ جور پہ وہ ہنس کے یہ دیتے ہیں جواب | جان پیاری ہے تو پھر عشق ہی کرتے کیوں ہو
قطع ہو گی دم خنجر سے مسافت میری | جان لیکر ہی کٹیگی شب فرقت میری
ہائے یہ کہکر اٹھایا بزم سے اس نے مجھے | بد نظر ہے یہ مجھے اس کی نظر ہو جائیگی
لوگ کہتے ہیں کہ اک روز قیامت ہو گی | میں یہ کہتا ہوں یہ تیری ہی شرارت ہو گی
وہ بھری بزم میں کہتے ہیں اٹھا کر مجھ کو | پھر نہ آؤگے اگر کچھ تمہیں غیرت ہو گی
عرض مطلب پہ مرے ہائے کسی کا کہنا | کوئی سنتا بھی ہے اسکی یہ کہنا کیا ہے
یہ تو سمجھاؤ مجھے حضرت زاہد للہ | دل مرا حور پہ کیوں آئے بشر کے ہوتے
یہ تم نے چھیڑ کے پہلو نئے نکالے ہیں | تماشا دیکھتے ہو غیر سے لڑا کے مجھے
جب کہا کان میں اک بات مری سن لیجے | بولے دھوکے نہ دے معلوم ہیں عیار مجھے
بوسہ پھر کیوں نہیں دیتے ہو کہ جھگڑا چک جائے | تم تو کہتے ہو کہ بھاتی نہیں تکرار مجھے

عاشق:- صاحبزادہ احمد سعید خاں صاحب خلف صاحبزادہ محمد سعید خاں ساکن ٹونک آپ نواب امیر خاں کی اولاد سے ہیں۔ اجمیر میں پیدا ہوئے۔ وہیں میو کالج میں ابتدائی تعلیم پائی کچھ عرصہ دہلی میں رہے۔ نکات شاعری خواجہ الطاف حسین حالی سے حاصل کئے۔ حضرت داغ کو بھی آپ نے اپنا کلام دکھایا اور انہیں کا رنگ تغزل دل سے پسند کیا۔ سب سے آخر حضرت ظہیر دہلوی سے تلمذ اختیار کیا۔ آپ کا شمار ان کے ارشد تلامذہ میں ہے۔ ۱۹۰۴ء میں مؤلف تذکرہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ فالج کی وجہ سے آپ کا ایک ہاتھ بیکار ہو گیا تھا۔ مگر مشق سخن برابر جاری تھی۔ کلام میں روانی اور سلاست ہے۔ زبان صاف ہے۔ کلام کا انتخاب مندرجہ ذیل ہے۔

انھیں نے حال محبت کو آشکار کیا | چھپا چھپا کے زمانہ کو رازدار کیا
نہیں ہے چرخ سے شکوہ کہ اس نے آخر کار | مٹا کے آپ کے دل کا مجھے غبار کیا
جو آپ اپنی ہی آنکھیں چرائے ہر لحظہ | وہ چھوڑ دے گا کوئی چیز پھر پرائی کیا

آگیا اب وہ زمانہ عشق میں
باعث آرام فرقت ہو گئی

ان سے ترک عشق کرنا تھا کہ بس
اور بھی دونی محبت ہو گئی

دیا اس نے جواب صاف ادھر کس بے نیازی سے
کہ ہیں گر اور بھی اچھے تو میری التجا کیوں ہے

ندامت اور کیا ہوتی کہ طعن ربط دشمن پر
وہ کہتے ہیں تمہارا ہی کوئی ہوگا مرا کیوں ہے

گلے شکوے مرے سن سن کے وہ چپکے سے کہتے ہیں
ستانے بھی نہیں دیتے تو دل تم نے دیا کیوں ہے

خلاف ایک سے ہے ایک دلربا کیلئے
کہ دل نے لطف اٹھا ہو سے بھی چھپا کیلئے

عاشق

عاشق:۔ نواب مجید الدولہ ممتاز الملک مرزا محمد ابوطالب علی خاں بہادر رستم جنگ استعارہ اور تشبیہات پر والہ وشیدا تھے۔ لکھنؤ کی قدیم شاعری کو سرمایہ افتخار جانتے تھے۔ زبان کی طرف توجہ بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ اور سادہ بیانی کا رنگ نامطبوع خاطر ہے۔ کہیں کہیں محاورات بھی نظر آجاتے ہیں۔ فراہم شدہ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

گر دکھادے رخ رنگیں بت پرفن اپنا
بھول جائے گل تازہ ابھی جوبن اپنا

مسی مالیدہ ترے لب سے اسے نسبت کیا
منہ تو بنوائے ذرا باغ میں سوسن اپنا

تم اٹھا دو گے جو اپنے روئے روشن سے نقاب
ٹکڑے ٹکڑے چاند مانند کتاں ہو جائے گا

شب فرقت میں اب تو اے غم یار
تجھ سے بہتر کوئی رفیق نہیں

کنج مرقد میں بے کسی کے سوا
کوئی مونس نہیں شفیق نہیں

سب کو نجات دیتی ہے قید حیات سے
احساں کسی کے سر پہ ترا اے اجل نہیں

اللہ جانتا ہے یہ حسرت ہے اے بتو
دیکھا کروں یونہی تمھیں بٹھلا کے سامنے

وہ آنکھیں اس میکش کی اس دم یاد آتی ہیں
مجھے معذور رکھ صحبت میں ساقی جام صہبا سے

تمہاری محرم اب واں جب دن سے دیکھی ہیں
اٹھایا سر حبابوں نے نہ اپنا آب دریا سے

ہمیشہ دیکھ کر سینے کو مرغ دل پھڑکتا ہے
اڑے جاتے ہیں طوطے ہاتھ کے محرم کی چڑیا سے

لڑی ہے آنکھ ان سے وزوں جو پھر اک شوخِ کم سن سے
نہیں قابو میں میرے یہ دل ناداں کئی دن سے

آنکھیں کھلی ہیں بعد فنا بھی جو قبر میں
کس باقیِ جفا کا انہیں انتظار ہے۔

کٹے گا ماہِ نو شمشیرِ ابروئے ہلالی سے
گر بگی ایک دن بجلی ترے کانوں کی بالی سے

بہار آتے ہی یاں تک شدتِ وحشت میں گل کھائے
مشابہ ہاتھ اپنا ہو گیا پھولوں کی ڈالی سے

ریاضِ حسن میں اب دل کی آرزو کم ہے
کہ اس چمن کے گلوں میں وفا کی بُو کم ہے

عاشق **عاشق**:- شیخ عاشق الزمان خاں صدیقی۔ شاگرد حضرت امیرؔ۔ زیادہ حال اور کلام نہ مل سکا۔ زبان اچھی ہے۔ الفاظ چست ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

بدلی سی کے نظر آتے ہی نیت مری بدلی
توبہ کا رہا پاس نہ گھنگھور گھٹا میں

حسرتِ دید میں مرتا ہوں میں اک مدت سے
دیکھتا جا مجھے او آنکھ چرانے والے

کیا کہا پیکِ اجل نے کوئی پوچھے تو کبھی
کیسے خاموش چلے جاتے ہیں جانے والے

عاشق **عاشق**۔ محمد کریم بخش تلمیذ حضرت محمد طاہر میں پوری۔ ذہن رسا رکھتے ہیں فکر عالی پائی ہے۔ زبان صاف اور شستہ ہے۔ کلام ذیل ان کی فکر کا نتیجہ ہے۔

یا خدا وہ دل ویران کبھی آباد نہ ہو
جس میں دُنیا کا ہو غم اور تیری یاد نہ ہو

ضبط کہتا ہے کبھی شکوۂ جلاد نہ ہو
سر بھی کٹ جائے تو لازم ہے کہ فریاد نہ ہو

شکوۂ ظلم و جفا اُس سے عبث ہے اے دل
جس کی بیداد کی فریاد نہ ہو داد نہ ہو

مجھے روٹھا ہوا پایا ہے جب شوقِ شہادت نے
گلے کس پیار سے تیغِ دو پیکر نے لگایا ہے

کعبہ و دیر کو تو چھوڑ کے آئے تھے یہاں
در دلدار سے جاتے تو کدھر کے ہوتے

لطف جب تھا کہ نہ کعبے سے نکالے جاتے
ہم بتوں کے یہ بیت اللہ کے گھر کے ہوتے

عاشق **عاشق**۔ نواب راحت علی خاں صاحب شاگرد میر تجمل حسین تجملؔ۔ رعایت لفظی کے پابند ہیں۔ مگر انداز بیان اچھا ہے۔ محاورہ بھی لکھتے ہیں۔ فرسودہ استعارات اور تشبیہات [illegible] ہیں۔ زیادہ حال نہ معلوم ہو سکا نمونہ کلام یہ ہے

سیہ چادر جو میری قبر پر یاروں نے تانی ہے
کسی کی زلف کا مارا ہوں یہ اسکی نشانی ہے

قضا آتی ہے یوں تو ایکدن اور جان جانی ہے
شبِ فرقت میں آجائے تو اسکی مہربانی ہے

سراپا عاشقِ کاکل یہ بدبختی کے پتلے ہیں
بلا میں مبتلا ہیں اک پریشاں زندگانی ہے

نہ چھٹ جائیگی مہندی پانو کی جل دیکھ اے لیلی
کہ تیرے عشق میں مجنوں نے کیا کیا خاک چھانی ہے

عاشق

عاشق ۔ لالہ گوکل چند قوم کایستھ ساکن محلہ اشرف آباد لکھنؤ۔ کبھی کبھی ریختہ بھی کہہ لیتے تھے۔ مندرجہ ذیل چند اشعار تذکرۂ شوق سے انتخاب کئے جاتے ہیں۔

آپ کا دل ہم سے شاید کچھ میاں بیزار ہے
ورنہ کیا تشریف لانا اک قدم دشوار ہے

آنکھ سے نیند اڑ گئی اور چین بھی دلکو نہیں
اے طبیبو دیکھیو یہ کونسا آزار ہے

اری اے آہ ہر دم شعلہ ساں اٹھتی ہے کیوں دل سے
خدا کا ڈر نہیں تجھ کو کسی کا گھر جلائے گی

عاشق

عاشق ۔ شاہ محمود احمد رُدولوی۔ رُدولی ضلع بارہ بنکی اودھ کے رہنے والے ہیں آپ حضرت شاہ النفات احمد صاحب قدس سرہٗ سجادہ نشین کے عزیز ہیں۔ باکمال بزرگ ہیں۔ ترتیب تذکرہ کے وقت عمر ۶۰ سال سے متجاوز تھی۔ نہایت خوش مزاج اور خوش اخلاق ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اردو میں حضرت اسیر مرحوم سے تلمذ تھا۔ آپ کا اُردو کلام اگر جمع کیا جاتا تو کئی دیوان مرتب ہو جاتے مگر افسوس ہے کہ ان کا کہیں نشان تک نہیں ملتا۔ چند اشعار جو دستیاب ہو سکے ہدیہ ناظرین ہیں ۔

موسیٰ سے لن ترانی احمد سے خوش بیانی
بدلا ہے رنگ اس نے کیا خوب گفتگو کا

تارِ نظر سے اپنے ٹانکے لگاؤ اس میں
چاک جگر ہمارا محتاج ہے رفو کا

ہمارے اشک سب چشم ہی میں واورے ضبط
کسی حسین کا جوبن نہ تھے کہ ڈھل جاتے

عبث پھرا کئے عشاق تیرے آوارہ
تری گلی میں جو آتے تو کچھ بہل جاتے

یہ وہ مرض ہے کہ جاتا ہے تن سے روح کیسا تھ
مریض عشق کو دیکھا نہیں سنبھل جاتے

عاشق

عاشق۔ جگنّاتھ پرشاد عرف ببّو۔ ذات کھتری سریں۔ خلف منشی رادھا کشن مرحوم ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ محلہ چھوٹی پٹن دیبی شہر عظیم آباد میں سکونت تھی ۱۸۹۷ء میں مرض سل میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ بڑے موزوں طبع تھے۔ جناب شاد عظیم آبادی سے تلمذ تھا۔ جن کی اصلاح نے لطف کلام کو دوبالا کر دیا تھا۔ مزاج میں انکسار و ہمدردی کا مادّہ بہت تھا۔ بڑے دوست پرور تھے۔ مرنے سے کچھ قبل ایک غزل کہی جس کا مقطع تھا

لباس تن بہت میلا ہوا ہے ارادہ ہے کہ اے عاشق بدل دیں

دیوان معروف بہ کارنامہ عاشق اگست ۱۸۹۵ء میں چھپا تھا۔ کلام میں لطف زبان کے ساتھ سوز و گداز بھی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

رہا نہ ہوش ان کے عشق میں بجا اپنا بتوں کو سجدہ کیا جان کر خدا اپنا

گلی میں یار کی اللہ ری بیخودی دل کی میں سب سے پوچھتا پھرتا ہوں خود پتا اپنا

ان کے فقروں میں اگر آیئے گا دل سے کہتا ہوں کہ پچھتایئے گا

عالم نزع ہے فرصت کم ہے ادھر آنا ہو تو جلد آئیے گا

قطعہ

کوچۂ یار میں اک دن عاشق چل کے جب پاؤں کو پھیلائے گا

دیکھیئے گا جو ملے گی راحت آپ میں پھر نہ کبھی آئے گا

لطف ہے قبر کی تنہائی ہے آنکھ لگ جائیگی سو جائیگا

بن چکا تھا کل جنازہ رہ گیا جی اٹھے عاشق تمہارا رہ گیا

فصلِ گل تو جا چکی عاشق مگر سر میں اب تک اپنے سودا رہ گیا

کیا خوب عشق ہے کہ اُسے جانتے نہیں مرتے ہیں جس پہ ہم اُسے پہچانتے نہیں

ناصح تو مجھ کو قیس کی ہرگز نہ دے مثال ہم تو سنی سنائی کبھی مانتے نہیں

قید کچھ دل پہ نہ تھی زلف گرہ گیر میں بھی ہم تو آزاد رہے خانۂ زنجیر میں بھی

اک حسیں ہم نے تصور میں بنا رکھا تھا	وہی صورت نظر آئی تری تصویر میں بھی
ہے فرق صرف نام کا پر ذات ایک ہے	تم رام یا رحیم کہو بات ایک ہے

عاشق:- پنڈت شیوراج ناتھ دہلوی قوم برہمن کشمیری عرف کول خلف پنڈت کاشی ناتھ صاحب ان کے خاندان میں بہت نامی نامی لوگ گذرے ہیں اور اچھے اچھے عہدوں پر سرفرازی حاصل کی ہے۔ یہ بھی پہلے ریاست بنارس میں سپرنٹنڈنٹ کارخانہ جات تھے۔ اب عرصے سے ریلوے کے محکمہ میں ملازم ہیں۔ اور قیام زیادہ تر بمبئی میں رہتا ہے۔ شعر وسخن کا شوق ان کو عنفوانِ شباب سے ہوا پہلے مولانا نظام گلشن آبادی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد شاہزادہ مرزا قیصر بخت فرخ خلف مرزا قادر بخش صابر گورگانی سے فیض سخن پاتے رہے آپ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ اودھ پنچ۔ زمانہ اور انڈین گرافک میں آپ کے مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں۔ اجمیر شریف کی ایک تاریخ بھی آپ نے لکھی ہے جو آپ کی تصانیف میں سب سے زیادہ وقیع ہے۔ بہت حاضر جواب۔ بذلہ سنج۔ خوش خو اور خوش لباس آدمی ہیں۔ تخمیناً ۵۰ برس کی عمر ہو گی۔

صوفیانہ خیالات کے شاعر ہیں۔ عاشقانہ رنگ بھی اچھا ہے۔ سلجھی ہوئی طبیعت پائی ہے۔ زبان پاکیزہ اور صاف ہے۔ کلام سے کہنہ مشقی اور پختگی کا اظہار ہوتا ہے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

کبھی دل میں اُتر جاتا کبھی آنکھوں میں آ جاتا	رہا کرتا ہے وہ ظالم نہاں برسوں عیاں برسوں
میری تربت پہ بھی یاروں کا رہیگا مجمع	یاس و ارماں کبھی ہونگے کبھی حسرت ہو گی
آپ جب عرصۂ محشر میں خراماں ہونگے	ہاتھ جوڑے ہوئے قدموں پہ قیامت ہو گی
وہ بھری بزم میں کہتا ہے اٹھا کر مجھ کو	پھر نہ آئیگا اگر کچھ تجھے غیرت ہو گی
چٹکیاں لے کے کیا پہلو سرخ	پاس بیٹھے پہ شرارت اتنی

بکتے پھرتے ہو جو عاشق اتنا / پی نہ جایا کرو حضرت اتنی
دل یہ کہتا ہے بہت عشق کا پایا ہے مزہ / آنکھیں کہتی ہیں ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے
دیکھ لیجے کسی بیدرد پہ عاشق ہو کر / مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں ہجر میں ہوتا کیا ہے
ماجرا اور محبت کا کہوں کس کس سے / سب یہی پوچھتے ہیں حال تمہارا کیا ہے
ہم بُرے ہیں تو بُرے ہی سہی بس جانے دو / بزم اغیار میں پھر ذکر ہمارا کیا ہے
بیخودی وصل میں اس درجہ بڑھی تھی عاشق / نہ رہا یاد مجھے میری تمنا کیا ہے

عاصم

عاصم۔ سید میاں خلف سید قاسم متوطن قدیم کڈپہ احاطۂ مدراس۔ ان کے بزرگ بسبیل تجارت کڈپہ سے نندیال آئے۔ ایک صدی تک وہاں سکونت رہی مگر اب یہ بنگن پیلی میں مقیم ہیں۔ مہدوی مشرب کے آدمی ہیں۔ شاہ نیسان کو کلام دکھاتے ہیں نعتیہ شاعر ہیں۔ عاشقانہ غزلیں کم کہتے ہیں گلدستہ معراج خیال مدراس میں اکثر کلام شائع ہوتا تھا۔ فکر سخن معمولی ہے مگر کسی قدر کلام میں صفائی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

اضطرابِ جنونِ الفت میں / مجھ سے بھولے سے بھی گلہ نہ ہوا
وہ شانِ حق کا تصور ہے رات دن مجھکو / تجلیات کا دل میں مرے ظہور ہوا
گرانی جرم تغافل کی کیوں ہو منہ میرے / نبی کا نام لیا مجھ سے جب قصور ہوا

عاصی

عاصی۔ حافظ سید محمد سلیمان تلمیذ حضرت داغ۔ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ طبیعت شگفتہ رکھتے ہیں۔ یہ نمونۂ کلام ہے۔

بیقراری نے رہ شوق میں چلنے نہ دیا / وہ مرے پانوں اکھڑے کہ سنبھلنے نہ دیا
پوچھتے ہیں اب وہ اپنے عاشق محزوں کا حال / ہو چلا شاید اثر کچھ نالہ و فریاد کا
تابِ رخسار وہ جس وقت دکھا دیتے ہیں / جلوۂ طور کو آئینہ بنا دیتے ہیں
حسرت و شوق و تمنا ہیں بلا کے دشمن / مٹتے مٹتے بھی یہ کمبخت مٹا دیتے ہیں
آپ جرأت تو کریں قتل کی ہمت تو کریں / لیجئے ہم سرِ تسلیم جھکا دیتے ہیں

عاصی

عاصی:۔ سید علی عبد القادر عرف شاہ مرشد علی۔ معمولی فکر و خیال کے شاعر ہیں کلام میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ چند شعر ان کے درج ذیل ہیں۔

نیازِ شوق وحسرت ہے ادھر سے
جفا و ناز و استغنا ادھر سے

نزاکت کہتی ہے زلفِ دوسر سے
یہ دوہرا بوجھ اُٹھیگا کب کمر سے

یہ ٹھنڈی گرمیاں اے ابر کب تک
برس کر سامنا کر چشم تر سے

عاصی

عاصی۔ منشی گھنشام رائے کایستھ ماتھر دہلوی خوشہ چین خرمن شاہ نصیر دہلوی شاہ عالم ثانی کے زمانہ سے بہادر شاہ کے عہد تک دفتر شاہی سے متعلق رہے اور فارغبالی سے اوقات بسر کرتے رہے۔ شعر و سخن سے کمال ذوق تھا۔ پُرگوئی۔ تیز طبعی۔ حاضر جوابی میں بے مثل تھے۔ غدر سے بہت پیشتر مدرسہ نواب غازی الدین خاں بیرونِ اجمیری دروازہ میں منشی پارسا کے اہتمام سے بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی اور مدت تک وہ ہنگامہ گرم رہا۔ شاہ نصیر کی تحریک سے یہ قرار پایا کہ ہر مشاعرے میں علاوہ غزل طرحی ”تیلیوں“ کی زمین میں بھی طبع آزمائی ہُوا کرے۔ ایک روز شیخ ابراہیم ذوق نے یہ شعر سرِ مشاعرہ پڑھا۔

چقِ ترے والاں کی نازک بہت ہے نازنین
کیا لگائی اس میں ہیں پائے مگس کی تیلیاں

جناب عاصی نے اعتراضاً یہ قطعہ فی البدیہہ کہکر سنایا۔

قطعہ

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے
قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں

آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا بہرِ خدا
یار کی چلمن ہو اور پائے مگس کی تیلیاں

شیخ صاحب وہ چلمن ہے کہ جس میں بیدریغ
باندھئے گر ہو سکیں تارِ نفس کی تیلیاں

الغرض یہ شاعر شاہ صاحب کے شاگردوں میں بڑے سیف زبان اور دبنگ گذرے ہیں۔ ایامِ غدر ۱۸۵۷ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔ ان کے بڑے صاحبزادہ

مکند لال بہادر شاہ ثانی کے میر منشی تھے۔ اور چھوٹے صاحبزادہ منشی بنسی لال تحصیلدار تھے۔ مشتاقؔ اور قیصرؔ ان کے حقیقی نواسے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

عزیزو ضبط اشک و دیدۂ تر ہو نہیں سکتا | کروں کیا بند کوزے میں سمندر ہو نہیں سکتا
مرے گریہ کا سن کر ماجرا اس نے کہا آخر | کہ اس برسات میں آنا ترے گھر ہو نہیں سکتا
وہ معجزہ سے حسن کے اپنے کمال کر | ابرو ہلا کے چاند کے دے دو ہلال کر
ناسور جگر پر نہ لگانا کوئی مرہم | رسنے سے ہوا بند تو بس جائینگے مر ہم
اس پہلو میں خنجر ہے ادھر تیر ہے عاصی | لے سکتے ہیں کروٹ نہ اِدھر ہم نہ اُدھر ہم
وہ رند بادہ کش ہوں کہ تو کیا ہے زاہدا | قاضی نے نذر دی مجھے بوتل شراب کی
سو جائیں ایسے بخت کہ جاگیں نہ پھر کبھی | ہو آرزو اگر مجھے فرقت میں خواب کی
اِدھر اپنے رخ تاباں پہ زلف اس نے پریشان کی | اُدھر خورشید پر چھائی گھٹا بس آ کے جھٹ کالی
خیال زلف کیونکر اس دل آشفتہ سے جائے | چھٹائے سے چھٹے کب جب بلا جائے جھپٹ کالی

عاصی

عاصی۔ منشی عبدالرحمٰن خاں خلف الصدق چودھری نور محمد خاں صاحب مالگذار قصبہ ننگ تھلہ ضلع حصار۔ مسلمان راجپوت ہیں اور حنفی المذہب۔ عمر ۲۸ سال ہے۔ رنگ گندمی۔ دراز گردن۔ خندہ پیشانی۔ موزوں قد۔ سن بلوغ سے قبل ہی سایہ پدری سر سے اٹھ گیا۔ کاروبار خانگی کی اہم ذمہ داریوں کا بار سر پر آ پڑا۔ اوائل عمر سے ہی شوق شاعری دامنگیر ہے۔ منور احمد صاحب ناسخ ہانسوی کے فیضان صحبت نے اس شوق کو دوبالا کر دیا پھر حضرت خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی سے مشورہ سخن کرنے لگے کلام اکثر رسالہ منظر لکھنؤ۔ رسالہ ناسخ ندرۃ گیا۔ اخبار مسلم راجپوت۔ امرتسر وغیرہ میں شائع ہوتا رہا ہے۔ نثر لکھنے کا بھی شوق ہے۔ کلام خامیوں سے خالی نہیں۔ امید ہے استاد کے فیضان مشورہ اور مشق سے نقائص دُور ہو جائیں۔ جو کلام بھیجا اس کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے۔

دل وہ ہمارا لیکر ہنس ہنس کے کہہ رہے ہیں
قابو میں جو ہے جسکے اس کا ہی مال ہوگا

کیوں نہ ہوتا دمِ رفتار قیامت کا گماں
چال سے اسکے عیاں حشر کا انداز بھی تھا

کس کے نالوں سے ہوئی باغ میں بلبل خاموش
نغمہ سنجی پہ اسے فخر بھی تھا ناز بھی تھا

حرف کوئی نظر آتا ہے نہ کوئی مضمون
درد ہی درد بھرا ہے مرے افسانے میں

نہ لینگے نام حوروں کا کبھی اے حضرتِ زاہد
اگر بیٹھینگے دو دن آپ جاکر گلعذاروں میں

بیخودی تجھ پہ جان و دل سے نثار
دونوں عالم سے بے خبر ہوں میں

ایک دفتر ہے زندگی اپنی
اور سمجھو تو مختصر ہوں میں

لیکے خود جا رہا ہوں نامۂ شوق
آپ ہی اپنا نامہ بر ہوں میں

لاکھ کوشش کیجئے قابو میں دل آتا نہیں
آج کیا ہے آپ کو میں آپ میں پاتا نہیں

کیوں اپنے ساتھ دفن دلِ بے قرار ہو
لازم ہے ہم سے دور کچھ اس کا مزار نہیں

عاصی

عاصی:- مولانا احمد علی خاں موسوم بہ شوخ بہچین۔ اصل میں نارنول کے رہنے والے تھے۔ ابتدائے عمر ہی میں اپنے والد کے ساتھ رام پور گئے اور وہیں تعلیم پائی۔ پہلے نیاز احمد خاں ہوش بریلوی کے شاگرد ہوئے۔ پھر حضرت امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔ بذلہ سنجی اور ظرافت نگاری میں فرد تھے۔ اخباری دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ میرزا ستم ظریف۔ جناب سید محمد صاحب آزاد۔ نامہ نگارانِ اودھ پنچ کے ان محاورات کی برجستگی اور بے ساختہ پن کے معترف تھے۔ ظریفانہ مضامین کے ذریعہ معاشرت کی اصلاح ان کا حصہ تھا۔ مضامین کا مجموعہ جس میں بعض ظریفانہ نظمیں بھی شامل ہیں شاہد ظرافت کے نام سے فضل الدین بک ڈپو لاہور سے شائع ہوا تھا۔ ایک رسالہ شیخ و برہمن کے اتحاد کے نام سے لکھا تھا۔ جس میں ہندو مسلمانوں کو باہم اتفاق پر توجہ دلائی ہے۔ ایک واسوخت۔ نالۂ دلشکن۔ احمد المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا تھا فسانۂ عجائب

کے طرز پر فسانۂ لاجواب تصنیف کیا تھا۔ جو طبع نہ ہوا۔ بریلی میں قاضی محمد عبدالجلیل خاں تخلص جنون رئیس بیہر چشم تھے۔ وہ ان کی کفالت کرتے تھے۔ آخر عمر میں بریلی ہی میں قیام رہتا تھا۔ اور وہیں سنہ ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا۔ قریب ۷۰ سال کی عمر پائی۔ غزل۔ قصیدہ خمسہ سب کچھ کہہ سکتے تھے۔ کلام کا رنگ پختہ ہے۔ غزل گوئی میں پستی اور بلندی کا نام نہیں۔ آپ نے اپنے بعد مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا کافی مجموعہ چھوڑا۔ دیوان اور رشاہد ظرافت کا دوسرا حصہ بھی مرتب کر لیا تھا۔ جو اب تک نہ طبع ہوا۔

مولوی عبدالکریم عروج۔ بنے میاں شاکی۔ حاجی کلب حسین مائل ان کے تلامذہ سے ہیں۔ فراہم شدہ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

جو عشق میں دارین سے غافل نہیں ہوتا ۔۔۔ عارف نہیں ہوتا کبھی کامل نہیں ہوتا
ظاہر سے کہیں ہوتی ہے باطن کی صفائی ۔۔۔ غازہ سے کوئی حور شمائل نہیں ہوتا
دل میں لیتا ہے مرے علم الٰہی موجیں ۔۔۔ ایک قطرہ میں ہے ڈوبا ہوا دریا کیسا
کعبہ و دیر تو معمور ہے جلوہ سے ترے ۔۔۔ پھر بنا شیخ و برہمن میں ہے جھگڑا کیسا
ہستی میں نیستی ہے فنا ہے بقا کے ساتھ ۔۔۔ جس کا یقین تھا وہی وہم و گماں ہے اب
دم کو سمجھ عدم کا مسافر ہے راہ میں ۔۔۔ ہر دم رواروی میں نیا کارواں ہے اب
میں بھی کسی کا روز ازل راز دار تھا ۔۔۔ جو کہہ رہا ہوں گذری ہوئی داستاں ہے اب
رحمت کسی کی ڈھونڈتی پھرتی ہے حشر میں ۔۔۔ اس کے گناہگاروں کا مجمع کہاں ہے اب
لب ہے نزار شیشہ و ساغر ہے سامنے ۔۔۔ وہ پارسائی حضرت عاصی کہاں ہے اب
کس کا حجاب دیکھنے والا ہی کون تھا ۔۔۔ شرما گئے وہ طور پہ اپنی ادا سے آپ
دل میں رہے کسی کے کسی کی نگاہ میں ۔۔۔ نکلے کبھی نہ پردہ کے باہر حیا سے آپ
دنیا کو چار چاند لگائے ہیں حسن نے ۔۔۔ عالم چمک اٹھا ہے کسی کی ضیا سے آپ

مست وحدت نے کہی ہے ہوش اُڑ جانے کی بات　　عقل سے خالی نہیں ہے اسکے دیوانے کی بات
گل پہ بلبل جان دے پروانہ اپنی شمع پر　　طالب حق عشق ڈھونڈے ہے یہ مرجانے کی بات
چلبلی۔ چنچل۔ انیلی۔ شوخ ہرجائی بہار　　مسکراتی۔ ناز کرتی جھومتی آئی بہار
جب چمن میں آئی دولھا کی روش بادِ صبا　　کیا دلھن کی طرح سہمی جھجکی شرمائی بہار
اہل عرفاں سے کوئی پوچھے حقیقت دل کی　　کعبۂ دل کو مرے عرش خدا کہتے ہیں
کفر و اسلام میں سب کہتے رہیں اپنی اپنی　　جو سمجھ کر نہیں کہتے انہیں کیا کہتے ہیں
جان منصور نے دی اپنی تنک ظرفی سے　　راز کی بات کہیں مردِ خدا کہتے ہیں
اُٹھ کے کعبہ کو چلو کوئے بتاں سے عاصی　　کچھ خبر بھی ہے تمہیں لوگ بُرا کہتے ہیں
رہیگا رندوں کے سر پہ سہرا بنیگا ہر مست آج دولھا　　عروس گل اب نہ منہ چھپائے بہار آئی بہار آئی

عاصی

عاصی:۔ جناب مولوی احمد رضا صاحب خلف الصدق مولوی حسن رضا صاحب۔ ساکن سندیلہ قصبہ اودھ　زیادہ حال نہ معلوم ہو سکا۔ نمونہ کلام یہ ہے

پھولے پھلے شاداب رہے تا دمِ آخر　　عاصی کا الٰہی چمنستان تمنّا
جلوہ ہو جس کے نور کا ہر چیز میں عیاں　　اسکو بتاؤں کیا کہ کہاں ہے کہاں نہیں
والشمس کے ہے گرد میں واللیل کا سواد　　اس رُخ کے گرد گیسوئے عنبر فشاں نہیں
شہ اقلیم یکتائی محمد ہیں محمد ہیں　　مہ چرخ دل آرائی محمد ہیں محمد ہیں
اس بزم کی جو بُو ہے کہاں وہ چمن کی بُو　　کھاتی ہے شرم اس سے خطا و ختن کی بُو
بلبل کو رنگ و بوئے گل تر ہو نا پسند　　سونگھے اگر کہیں وہ مرے گلبدن کی بُو
آتا ہے جی میں جامۂ ہستی کروں میں چاک　　آتی ہے یاد جب مجھے اس پیرہن کی بُو
پہنچائے لے صبا تو یہی ان کے دماغ تک　　اس عاصی نحیف کے دل کی جلن کی بُو

قطعہ

خلقت کا دو عالم کی سبب ہیں تو یہی ہیں　　اُن سب کے لئے رحمتِ رب ہیں تو یہی ہیں

اسرار الٰہی کے تھے سب بند خزائن — مفتاح در علم و ادب ہیں تو یہی ہیں

عاصی

عاصی، منشی برج باسی لال صاحب خلف منشی دھوم سنگھ کایستھ بھٹناگر رئیس مراد آباد تحصیل امروہہ میں واصلباقی نویس تھے۔ اس سے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔ دیوان ان کا ۱۳۰۶ھ میں "نغمۂ طرب" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس کے دیکھنے سے کثرتِ مشق اور پُرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کلام میں لطافت اور صفائی ہے۔ مضمون آفرینی کے ساتھ زبان اور محاورات پر بھی توجہ رہتی تھی۔ اکثر مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ رباعیات کہنے میں بھی مشاق تھے۔ تلمذ کا حال دریافت نہ ہو سکا طبیعت میں آمد بہت ہے۔ مگر کہیں کہیں مضمون آفرینی کی قید سے لطف زبان کم ہو گیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے کلام اچھا ہے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

میں نے کہا کہ مفت مجھے خوار کیوں کیا — کہنے لگے کہ تو نے ہمیں پیار کیوں کیا

کیفیت عشق اس کو سنانی تھی جو منظور — عاصی نہ بتاتے اسے تم نام ہمارا

آنکھوں نے مری اس کی ادا کو نہیں دیکھا — ان دیکھنے والوں نے قضا کو نہیں دیکھا

کیا قافلے آنکھوں سے چلے جاتے ہیں یارب — اس راہ میں نقش کف پا کو نہیں دیکھا

کہتا ہے مرے سامنے حوروں کی جو باتیں — زاہد نے بت ہوش ربا کو نہیں دیکھا

حسرت مری جس طرح مجھے پیٹ رہی ہے — یوں میں نے کسی اہل عزا کو نہیں دیکھا

ہر ذرہ میں تاباں ہے اسی مہر کا جلوہ — عاصی کہیں کس طرح خدا کو نہیں دیکھا

کامل سجود دیر سے ایماں ہو گیا — دیکھا رخ صنم کہ مسلماں ہو گیا

وہ طرفہ آئینہ ہوں میں دیدار یار سے — آیا جو دیکھنے مجھے حیران ہو گیا

عاصی صنم پرستی میں ایماں ہوا نصیب — کافر جو میں ہوا تو مسلمان ہو گیا

ہزاروں حیلے غلط کہتے ہیں وہ لگاوٹ سے — مگر نہیں کی جگہ لفظ ہاں نہیں ہوتا

پھرا کے انگشت پوچھتے ہیں وہ رکھ کے دل پہ ہاتھ — کہاں یہ ہوتا ہے درد اب کہاں نہیں ہوتا

میں کیا کہوں کہ ہے سب کچھ حضور پر روشن
جو مدعا ہے زباں سے بیان نہیں ہوتا

ظاہر میں گو وہ ملتے ہیں الفت کہاں ہے اب
دل میں جگہ کہاں ہے محبت کہاں ہے اب

مرجاؤں کاش ہجر کے صدموں سے ہو نجات
مجھ میں ستم اٹھانے کی طاقت کہاں ہے اب

بیشک بجا ہے راست ہے جھوٹا ہوں میں مگر
تم ہی کہو وہ پہلی سی الفت کہاں ہے اب

عاصی بشر کو چاہیے دیکھے بچشمِ حال
پھولے ہو جس پہ تم وہ ریاست کہاں ہے اب

رندی کسی نے زہد کسی نے کیا پسند
عاصی کسے خبر ہے کہ ہے اسکو کیا پسند

اے بت تیرے دماغ میں کتنا غرور ہے
کرتا نہیں کسی کی خودی کو خدا پسند

مجمع حشر سر راہ تماشائی تھا
ہیں جو گذرا طرف کوچۂ جاناں ہوکر

رک گیا آکے لبوں پر جو شب ہجر میں دم
رہ گیا موت کا سر پہ مرے احساں ہوکر

نہ ہوا صاف غبار دل جاناں عاصی
مل گئے خاک میں ہم گرد بیاباں ہوکر

باقی نہیں رہا ہے گریباں میں تار تک
وحشت یہ کیا کرے گی ترے انتظار تک

ایک ہی دم میں زبان سوکھ کے کانٹا ہو جائے
جو مری طرح کرے باغ میں نالے بلبل

واہ جی واہ ہنسی میں یہ بگڑنا کیا خوب
ہم تو سمجھتے تھے کہ کچھ ہوگئے مگر کچھ بھی نہیں

کیوں دمِ مرگ نہ ہو فکر گنہگاروں کو
ہے سفر دور کا اور زادِ سفر کچھ بھی نہیں

روٹھیں ہم آئیں وہ منانے کو
یاد کرتے ہیں اس زمانے کو

ہونا تھا ایک کا ہمیں ممنون ہجر میں
جو وہ نہ آئے موت ہی احسان کر گئی

سر میں وہ اب جنون کہاں وہ ہوا کہاں
آندھی سی چڑھ کے آئی طبیعت اتر گئی

قطعہ

ہرزہ گردی یہ مری قابلِ الزام نہیں
بے سبب دیر و حرم تک نہیں چکر اپنا

حق یہ ہے انکی رہا کرتی ہے ہر وقت تلاش
نہ تو گردش ہے نہ برگشتہ مقدر اپنا

رباعیات

کرتا ہے کوئی خوشی کوئی غم افسوس
شادی ہے کہیں کہیں ہے ماتم افسوس

ہے فکر میں اپنی اپنی ہر ایک عاصی	بھولا ہے اُسے تمام عالم افسوس

دیگر

اعلیٰ کیسا ہے اور ادنیٰ کیا ہے	پستی کیا شے ہے اور بالا کیا ہے
جس کو کہ نہیں ہے نیک و بد کی تمیز	کیا جانے بُرا کون ہے اچھا کیا ہے

عاصی **عاصی**:۔ محمد شرف ولد ابا ذر پیرزادہ ساکن قصبہ آنولہ۔ آپ جوان وجیہ باوقار ذہین خوش اطوار و خوش خلق تھے۔ قدرت اللہ شوق اپنے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ میرے حال پر بہت مہربانی فرماتے ہیں۔

کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ رعایت لفظی کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کا ایک مختصر دیوان ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

کس لیا ہم کو کسوٹی پہ وفا کی تو بار	نس پہ ملتے نہیں لے سیم بدن کیا باعث
زلف سیہ کے پیچ میں جاتا ہے خود بخود	اس دل کو ہائے کچھ نہیں کالی بلا کا خوف
ناصح خیال زلف تو سر سے نہ جائے گا	اُلفت اب اُس سے ہو گئی ہے مجھکو مُو بمُو
ہمیشہ غیر پر کرنا کرم اور مجھ پہ جھنجلانا	نہیں معلوم مجھ سے کیا ہوئی تقصیر صاحب کی
تیغ نگاہ ڈوب رہی ہے لہو میں آج	کس خانماں خراب کو تم پار کر چلے

عاصی **عاصی**:۔ ان کا نہ نام معلوم ہو سکا نہ کچھ حال۔ لالہ شنکر داس کی بیاض سے اشعار ذیل نقل کئے جاتے ہیں۔ جن کے دیکھنے سے اندازہ ہو جائے گا کہ کلام میں کسقدر سوز اور شوخی ہے۔ بہت پُر گو اور مشاق معلوم ہوتے ہیں۔ ترکیب الفاظ اور انداز بیان بتا رہا ہے۔ کہ دور چہارم کے شاعر ہیں۔ اب کلام ملاحظہ ہو۔

زلف و خط کیوں نہ بگاڑیں دل ناکام کے کام	آگ ستہ وہ ہیں اس شوخ گل اندام کے دام
دل کا دل چھین لیا بوسہ کبھی اس پہ نہ دیا	مال کا مال لیا اور نہ لئے دام کے دام
بلبلے دمبازیاں صدقے تری دمبازی کے	صبح کے صبح دئے اور دئے شام کے شام

یک قلم حرفِ محبت یہ مٹایا دل سے
جو مجھ سے یار صادق کو وہ عالم آشنا سمجھے

کبھی خط بھی نہ لکھا عاصیؔ بدنام کے نام
بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے

عاصی

عاصی:۔ منشی مہادیو پرشاد صاحب تلمیذ جناب منشی بالکرشن صاحب قمر لکھنوی شاگرد حضرت امیر مینائی۔ والد کا نام منشی گنگا پرشاد تھا۔ آپ کائیست سریواستو ہیں۔ آپ کے جدِ امجد دیوان پرم سکھ رائے صاحب ڈلمئو ضلع رائے بریلی سے قانون گوئی چھوڑ کر شاہ نصیر الدین حیدر والیِ اودھ کے دربار میں عہدہ جلیلیہ پر مقرر ہوئے۔ اُن کے انتقال کے بعد ان کے خلفِ اکبر دیوان لچھمن پرشاد صاحب مشعلخانہ کے دیوان مقرر ہوئے۔ فوج کے دو رسالے آپ کی تحت میں تھے۔ جب دیوان لچھمن پرشاد صاحب کے ہاں دوسرا پوتا یعنی منشی گنگا پرشاد پیدا ہوئے۔ تو عین مسرت میں دیوان جی نے دو ضرب توپ کا حکم دے دیا۔ ہرکارہ نے پرچہ لگایا۔ فرمانِ شاہی صادر ہوا کہ قصوروار کو گرفتار کر کے حاضر کرو۔ فی الفور عہدی آئے۔ مگر دیوان جی کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ لیکن دیوان جی نے فرمان کی نہایت توقیر کی فنس پر روانہ ہوئے۔ دربار پہنچ کر بادشاہ سلامت (واجد علی شاہ) سے عرض کی کہ جہاں پناہ غلام کے گھر پر پوتا ہوا تو خوشی نے از خود رفتہ کر دیا۔ اور یہ قصور سرزد ہوا۔ بادشاہ سلامت نے خوشی کا اظہار کیا۔ اور خلعت عطا فرمایا۔ اور چھٹی کے روز محل خاص سے ایک شیردہان جڑاؤ کپڑے کی جوڑی اور دیگر سامان آیا۔ انقلاب سلطنت کے ساتھ دیگر مقربین بارگاہ سلطانی کی طرح ان پر بھی تباہی آئی۔ یعنی ۱۸۵۷ء کے غدر میں گھر بار لُٹا۔ مکان مسمار ہوا۔ اور دفینہ تک نہ بچا۔

جناب عاصی منشی گنگا پرشاد کے خلفِ اکبر ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے آپ نے فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۲ء میں بعمر ۱۶ سال انٹرنس

پاس کیا۔ غدر کی تباہی کا اثر خاندان پر ایسا پڑا کہ اسی عمر میں جناب عاصی تلاش معاش کی فکر میں گرفتار ہو گئے۔ مختلف دفتروں میں کام کیا۔ فی الحال واٹر ورکس لکھنؤ میں کام کرتے ہیں اور لکھنؤ میونسپلٹی کے عہدہ داران میں آپ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ مگر جناب قمر سے اصلاح لینا اور مشاعروں میں شریک ہونا انٹرنس پاس کرنے کے بعد سے شروع کیا۔ صحبت فقرا سے بہت کچھ فیض پایا ہے۔ ہندی میں بھی بھجن تصنیف کئے ہیں۔ اردو اور فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں طبیعت کا میلان حقانیت کی طرف زیادہ ہے۔ عشقیہ کلام بہت کچھ ضائع کر دیا۔ زبان شستہ اور بندشیں چُستہ ہیں۔ تخئیل پاکیزہ اور پُر لطف ہے۔ نمونہ کلام نذر ناظرین ہے۔

مرحبا صد مرحبا دل نذر دلبر ہو گیا — پہلوئے سے دل ہمارا یار کا گھر ہو گیا
جسم خاکی پر پڑی جب مہر مرشد کی ضیا — ذرہ ذرہ نور ایماں سے منور ہو گیا
مل گیا جب سے مئے وحدت کا تھوڑا سا مزا — دُردِ خُم میرے لئے کوثر سے بہتر ہو گیا
اشک عاصی فیض مرشد سے ہوئے معجز نما — داغ عصیاں دُھل گئے دامن اگر تر ہو گیا
عشق نے قصہ چکایا کافر و دیندار کا — دانۂ تسبیح سے رشتہ ملا زنّار کا
سحر ہے عالم پہ کس کے پرتو انوار کا — ذرہ ذرہ میں ہے پیدا حوصلہ دیدار کا
کشتیِ عاصی کو ہے موجِ حوادث کا خطر — ناخدائی کیجئے فرماں روائے دوار کا
نہ کوئی رہنما تھا اور نہ کوئی خضر منزل تھا — طریقِ عشق جس آثار میں بس تھا مرا دل تھا
زن و فرزند و خویش و اقربا کا زعم باطل تھا — انیس یاد غا وقتِ مصیبت اک مرا دل تھا
اٹھایا تم نے کیا مجھکو اٹھا دی بزم کی گرمی — دل سوزاں مرا رونق فزائے حسنِ محفل تھا
اجل سر پہ کھڑی تھی دم نہ رستا تھا نکلنے کو — [illegible] قضا پہنچی تو قاتل تھا

کیا ہوا دل مرا پہلو میں جو پایا نہ گیا
ان نگاہوں کے سوا اور تو آیا نہ گیا

مختصر رازِ حقیقت کی حقیقت یہ ہے
عاصی ہیچمداں کو وہ بتایا نہ گیا

ان کے چہرہ پہ ہے شباب کا رنگ
ہیچ ہے غازہ و گلاب کا رنگ

شیخ جی بزم مَے پرستاں میں
جم چکا جم چکا جناب کا رنگ

خونِ دل سے لکھا تو ہے نامہ
دیکھنا ہے مجھے جواب کا رنگ

آپ اُڑ جائیگا حجاب کا رنگ
ان پہ آنے تو دو شباب کا رنگ

ہو گئی صبح شام آتے ہی
تھا شبِ وصل میں شباب کا رنگ

حسن خود آیا آئینہ بن کر
دیکھنے کو ترے شباب کا رنگ

چشم میگوں یہ ان کی کہتی ہے
اب چھلکنے کو ہے شباب کا رنگ

ایک بُتِ نایاب پہ مائل طبیعت ہو گئی
تھی کشش دل کی کہ بے صورت کی صورت ہو گئی

تیرا عکس رخ پڑا آئینۂ کونین پر
اس دوئی کے ہاتھ سے وحدت میں کثرت ہو گئی

ہم عدم میں تھے تو نورِ حق کا وحدت نام تھا
روشنی وحدت کی جب پھیلی تو کثرت ہو گئی

تیری قدرت نے دکھائے وہ مناظر دلفریب
دل تجھے بھولا تیری صنعت سے الفت ہو گئی

جس پہ عاصی کہہ کے سب کہتے تھے نفرت سے نظر
رحمت مرشد سے اسکی بھی شفاعت ہو گئی

عاصی

عاصی :- خواجہ برہان الدین۔ منشی لچھمی نرائن شفیق اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "شاعر و مورخ عدیم المثال تھے" فنِ سپہگری میں بھی مہارت تھی مندرجہ ذیل اشعار ان کے ہیں۔

چمن کے تخت پر جس دن شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی بھیڑ تھی اور شور تھا غل تھا

خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو کے یاں غنچہ تھا واں گل تھا

رات کو میں شمع کے مانند رو کر رہ گیا
صبح کو دیکھا تو سب تن اشک ہو کر بہہ گیا

عاقل :- جناب رما شنکر صاحب طبیعت جدّت پسند اور شوخ پائی ہے

افسوس ہے کہ حالات اور زیادہ کلام نہ دستیاب ہوا۔ یہ چند شعر فراہم ہوئے جو درج ذیل ہیں۔

اس کے لبوں کے سامنے جامِ شراب ہے
گویا کہ دو ہلالوں میں اک آفتاب ہے

مرتا ہوں مَیں تو اس بتِ جادو جمال پر
جس کی چڑھی جوانی پہ نازاں شباب ہے

ممکن نہیں کہ خاک سے میری سبو بنے
مرنے کے بعد بھی مری مٹی خراب ہے

کہتے ہیں وہ کہ کیجیئے فردا کا انتظار
یاں تو قیامت آج ہی اپنے حساب ہے

مجھ سے نہ ہوگی خاک بھی پرسشِ روزِ حشر
بندوں پہ اس کا رحم اگر بے حساب ہے

عاقل: - میاں عاقل محمد خاں جاگیردار خلف میاں شیر محمد خاں عمائد بھوپال سے ہیں۔ ۱۲۶۴ھ سال پیدائش ہے۔ طبیعت میں روانی اور صاف بیانی ہے بہت سمجھکر شعر کہتے ہیں۔ اور ہر شعر میں کچھ بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تلمذ وغیرہ کا حال دریافت نہ ہوسکا۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

ساغر ذرا چلے تو سہی چشمِ یار کا
پوچھیں گے پھر مزاج ہر اک ہوشیار کا

کس وقت انکی چشمِ فسوں گر نے کی کمی
جب کام رہ گیا تھا فقط اک وار کا

کھٹکا مدام دشمنِ بد بیں کی آنکھ میں
کانٹا بنا خیال مری چشمِ زار کا

جو کہ ظالم ہیں جزائے ظلم سے بچتے نہیں
شمع کا سر کاٹکر کالا ہے منہ گلگیر کا

آتا ہے ترے چہرۂ رنگیں سے چمن یاد
کانٹوں میں گھسیٹیگی تری غنچہ دہن یاد

وار لاکھوں میں کیا مجھ عاشقِ ناشاد پر
واہ وا جلاّد پر اور آفریں اس یاد پر

مرحبا آفریں شاباش ہے تجھ کو ساقی
ایک چلو میں کیا مجھ کو چھکا کہ بے ہوش

فرقتِ گل میں نہ کر سوز کے نالے بلبل
پڑ نہ جائیں تری منقار میں چھالے بلبل

عاقل: - حکیم مرزا محمد علی بیگ دہلوی - ان کا دیوان معصوم علی خاں سوختہ نائب تحصیلدار علی گڑھ کی حسب فرمائش آگرہ میں چھپا تھا۔ ایک واسوخت بھی ان سے

یادگار ہے۔ مضمون آفرینی اور لطفِ زبان میں مشّاق ہیں۔ یہ کلام انتخاب ہے۔

ہاتھ میں لے کے وہ اب خنجرِ برّاں نکلا
مژدہ اے شوقِ شہادت ترا ارماں نکلا

اس پتے سے ڈھونڈھنا قاصد گھر اس خونخوار کا
خون ہوتا ہے وہاں ہر روز و شب دو چار کا

غیر سے یار کا پتہ پایا
مدعی سے ہی مدعا پایا

لاغر ہیں اسقدر کہ نہاں ہیں نظر سے ہم
گویا کہ اب مشابہ ہیں اسکی کمر سے ہم

آہ میں سوز ہیں گریہ میں اثر کچھ بھی نہیں
کیا قیامت ہے اُسے میری خبر کچھ بھی نہیں

نہ دن کو چین آتا ہے نہ شب کو نیند آتی ہے
لگایا تم سے کیا دل پڑ گئی آفت سے جاں میری

زمیں جنبش میں آئی ہے فلک چکر میں آیا ہے
خدا جانے کرینگی اور کیا بے تابیاں میری

جفا سے باز وہ آتے نہیں ہیں کیا کہئے
بھلا کہا ہے جسے اس کو کیا بُرا کہئے

عاقل

عاقل :- منشی فخر الدین باشندہ میرٹھ۔ مولانا شوکت کے تلامذہ سے ہیں اکثر مقطعوں میں اپنی فضیلت شاعری کا ادّعا کیا ہے۔ اور کیوں نہ کریں۔ جب کہ جناب شوکت جیسے خود ستا استاد کے شاگرد ہیں۔ کلام میں کوئی خاص لطف نہیں۔

مژگاں کی سوزن آج بڑے کام آگئی
تارِ نظر کا زخم پہ ٹانکا لگا دیا

حاصل کچھ اس سے نفع سوائے زیاں نہیں
جس آدمی کے بس میں خود اس کی زباں نہیں

رقیب رُو سیہ کسطرح پہنچا کوئے جاناں میں
گذرا ابلیس کا کیونکر ہُوا گلزارِ رضواں میں

عاقل

عاقل :- شیخ فقیر علی متوطن کانگڑہ مقیم جموں شاگرد یاس۔ ریاست میں ملازم ہیں۔ زبان صاف ہے۔ زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔ زمانہ نو مشقی کا کچھ کلام دستیاب ہوا جس کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

نہ بھولے گی تری بیداد مجھ کو اے صیّاد
بہار آتے ہی تیرے قفس میں بند ہوا

جلاتا ہے سرِ شام آکے کوئی شمع مدفن پر
نصیبہ جاگ اٹھا آجکل گورِ غریباں کا

آہ کرتا ہوں تو جلتا ہے جگر اے عاقلؔ
ضبط کرتا ہوں تو پڑتا ہے پھپھولا دل میں

چھری تیری رگ رگ کے چلتی رہی	مری موت آ آ کے ٹلتی رہی
خدائی ہو گئی دشمن ہماری	بتوں سے ہم نے ناحق دوستی کی
ستایا جائے جتنا وہ ستالیں	یونہی حسرت نکالیں اپنے جی کی
مزہ ان کو نہیں کچھ درد دل کا	تری نوک مژہ کے جو ہیں شاکی

عاقل

عاقل:۔ مولوی احمد حسین صاحب متوطن مچھلی شہر شاگرد حضرت اسیر لکھنوی طبیعت دار شاعر تھے۔ یہ دو شعر ان کے درج کئے جاتے ہیں۔

لگایا اس نے جو ہے تیغ آبدار کا ہاتھ	ہمارا زخم جگر کیوں نہ پھر ہرا ہو جائے
اُٹھا کے آنکھ بھی دیکھوں کبھی نہ جنت کو	گذر جو کوچہ دلدار میں مرا ہو جائے

عاقل

عاقل:۔ سید محمد سلطان دہلوی۔ ۱۵ر شعبان ۱۲۷۰ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ عالم جوانی میں بنارس گئے۔ میر وزیر علی صاحب سفید پوش کے ہاں شادی ہوئی۔ جو پھکیتی کے فن کے نامی اُستاد تھے۔ اپنے خسر سے انہوں نے اس فن کو حاصل کیا۔

شاعری میں پہلے مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا قادر بخش صابر دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ سُننے میں آیا کہ مرزا صابر جیسے اُستاد فن کو ان کی شاگردی پر ناز تھا۔ لیکن کلام جدت طبع۔ مضمون آفرینی تخیل کی رفعت اور اسلوب کی برجستگی سے معرّا پایا گیا۔ ہاں پُرگوئی اور مضامین فرسودہ کو سلاست اور رعایت لفظی کا جامہ پہنانا ضرور پایا جاتا ہے۔ قواعد فن کی رُو سے آپ کا کلام اغلاط سے پاک ہے۔

عاقل مرحوم بمقتضائے وقت حیدر آباد کی قدر دانیوں کا آوازہ سُنکر ۱۲۹۹ھ میں وہاں تشریف لے گئے۔ چند ہی دن میں طبقۂ اُمرا کی کمال شناسیوں کا ایسا ہجوم ہوا۔ کہ وہیں قیام پسند فرمایا۔ علاوہ شعر و سخن میں دخل رکھنے کے علم مجلس

میں بھی کچھ ایسا ملکہ حاصل تھا کہ جس محفل میں تھوڑی دیر بیٹھ جاتے اپنی جادو بیانی و شیریں کلامی کا سکّہ جما کر اٹھتے۔ چند ہی روز میں ہر دلعزیز ہو گئے۔ بعض احباب کی رائے و مدد سے ایک مطبع قائم کر کے اخبار "ہزار داستان" نکالنا شروع کیا۔ عرصہ تک یہ اخبار بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلتا رہا۔ مگر بعض وجوہ سے ہزار داستان سے قطع تعلق کر کے مطبع آصفی قائم کیا۔ اور سنہ ۱۳۰۱ھ سے اخبار آصفی کی اشاعت شروع کی۔ مرحوم اعلیٰ خیالات کا مجموعہ تھے۔ جن کو اپنے زورِ قلم سے بذریعہ اخبار ملک پر ظاہر کرتے رہے۔

عالی جناب نواب نظام یار جنگ حسام الملک خان بہادر و عالی جناب نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت و عالی جناب نواب بہرام جنگ بہرام الدولہ بہادر۔ بالخصوص مرحوم کے قدر شناس تھے۔ آخر میں نواب بہرام الدولہ بہادر عاقل مرحوم کے نہایت درجہ کفیل و معین رہے۔ حتیٰ کہ اُن کے انتقال کے بعد سے اب تک ان کے عیال کی پرورش اسی سرکار فیض آثار سے ہو رہی ہے اور دیوان بھی سرکار محتشم الیہ کی فیاضی سے طبع ہوا ہے۔ جو اعلیٰ قدر افزائی کا ایک دیرپا ثبوت ہے

حضرت عاقلؔ مرحوم باوجود شاعرانہ خیال اور وجیہ و جامہ زیب ہونے کے حد درجہ صالح اور متقی تھے۔ افسوس کہ صرف ۳۹ سال کی عمر میں ۸ محرم سنہ ۱۳۰۹ھ کو اس دار فانی سے رحلت کی۔ ایک فرزند رشید سید فخر سلطان کو اپنی نشانی چھوڑ گئے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

عدم آباد کو جب کاروانِ دم رواں ہوگا　　　تنِ خاکی جسے کہتے ہیں گرد کارواں ہوگا
یہاں ہے ضبط مانع صبر واں قفل وہاں ہوگا　　　ہمارا آپ کا انصاف یاں ہوگا نہ واں ہوگا

جب کہا میں نے کہ کب آئیے گا　　　ہنس کے بولے یونہی مر جائیے گا
چھیڑ کی حد ہے چلو چپ بھی رہو　　　ہم جو چھیڑینگے تو گھبرائیے گا

اب ناز سے وہ پاؤں زمیں پر نہیں رکھتے
بوسہ نہ ملا خاک ہوئے پر کف پا کا

نہ زندہ نہ مردہ نہ دنیا نہ دین کا
مجھے تو نے رکھا نہ ظالم کہیں کا

ہاں اہل حشر چین سے آرام اب کرو
دفتر کھلا مرے گنہ بے حساب کا

داغ ہوتے جو نہ سینے میں تو ویراں ہوتا
دل اگر باغ نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

غنچے کو دیکھ لو ہنسنے کی کہاں فرصت ہے
دل اگر جمع بھی ہوتا تو پریشاں ہوتا

تم نہیں غیر سہی غیر نہیں مرگ سہی
مدعا یہ کہ کوئی جان کا خواہاں ہوتا

شرما کے منہ پھرانا لڑا کر نگاہ کو
ظالم یہ سیدھی سی ہے ادا بانکپن میں کیا

وصل میں پیتا ہوں آنسو بدشگونی جان کر
گریہ شادی ہوا ہے گریہ پیما نہ آج

کیوں آئینے پر پیار کی پڑتی ہیں نگاہیں
ہو جائے نہ تم کو کہیں اے جان نظر آج

یارب یہ چلی کیسی ہوا بزم میں اُن کی
رخ کرتے ہیں غیروں کی طرف تیر نظر آج

ضبط نے قتل کے وقت اشک بہانے نہ دئے
حلق میں اُترے وہ آب دم خنجر ہو کر

ہر اک سمت ارمان گھیرے ہوئے ہیں
مرے دل سے جاؤ گے کیونکر نکل کر

وطن کو چھوڑنا لازم نہیں گو ہو پریشانی
کہ بوئے گل پریشاں ہو کے رہتی ہے گلستاں میں

وہ ہے نا آزمودہ کار اور مجمع قیامت کا
کہیں کہہ دے نہ گھبرا کے کہ اس کا میں ہی قاتل ہوں

کدورت دل کی ہے آہوں کے ہمراہ
بنا دینگے زمیں ہم آسماں کو

وصل کی شادی ہجر کا صدمہ اُن سے کہا تو کہتے ہیں
روز تو نہیں تم جیتے ہو اور روز تو نہیں کسی مرتے ہو

دل میں ہو اور آنکھ میں جلوہ عیاں نہ ہو
یہ بھی کوئی ادا ہے وہاں ہو یہاں نہ ہو

گذرا میں حور و خلد سے ظالم نہ کر شہید
دوزخ مجھے قبول ہے تو بدگماں نہ ہو

جو چُپ رہوں تو کہیں کیجئے ماجرا کیا ہے
جو مدعا کہوں کہتے ہیں مدعا کیا ہے

کہتا ہے کب یہ حسن بتاں قدرت اللہ
یہ تسبیح ربانی نہ ادھر ہے نہ ادھر ہے

ناز یہ اور یہ برداشت خدا کی قدرت
ناز کرتے ہیں نرے ناز اُٹھانے والے

عاقل

عاقل:۔ محمد فدا علی خانصاحب وکیل رامپور۔ تلمیذ جناب داغ دہلوی۔ کلام میں سادہ بیانی ہے۔ اشعار تکلف اور ہر قسم کی بناوٹ سے پاک ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

عشق کر کے دکھ لگایا جان کو
دل میں اب کوئی تمنا ہی نہیں

شوق سے کھنچوائیے دیوار در کے سامنے
دل چرایا ہے مرا پوچھو تو صاف انکار ہے

آپ لایا اپنی شامت کیا کہوں
میہماں ہیں خود بدولت کیا کہوں

اس کی کیا بنیاد اس شوریدہ سر کے سامنے
یہ غضب اس پر کہ بیٹھے ہیں کسی کے سامنے

عالم:۔ صاحبزادہ عالمگیر محمد خانصاحب رئیس جاورہ۔ تلمیذ حبیب کنتوری۔ آپ جناب نیاز محمد خانصاحب مرحوم کے جو بعہدہ کپتانی فوج جاورہ ممتاز تھے۔ فرزند ارجمند تھے۔ نواب صاحب بہادر ریاست جاورہ کے رشتہ دار تھے۔ ریاست سے منصب بھی ملتا تھا۔ اور جاگیر بھی تھی۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ پرگوئی کا یہ عالم تھا۔ کہ دو ہی برس میں صاحب دیوان ہو گئے۔ زبان اچھی کہتے تھے۔ اگرچہ مضامین رسمی ہیں۔ مگر شگفتہ بیانی سے انہیں تازہ بنا دیتے ہیں۔ متانت کے ساتھ شوخی بھی اپنا رنگ دے جاتی ہے۔ قریب تین چار سال کے ہوئے کہ انتقال فرمایا۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

نگہِ شوق ہر جگہ پہنچی
وقتِ بد میں شریک درد و الم

آ گئے پہلو میں جب تم پھر کہاں رنج و الم
ترے جمال کا پرتو مری نظر میں رہا

برائے نام بنا گرچہ فاعل مختار
خدمت سے خوش ہو تم نہ اطاعت پسند ہے

ان حسینوں سے کہاں جاؤ گے بچکر عالم

جلوہ یار جا بجا دیکھا
نہ برادر نہ آشنا دیکھا

اے صنم اک بات میں سارا گلہ جاتا رہا
ہزار شکر یہ سودا ہمیشہ سر میں رہا

مگر نہ دخل مجھے کوئی خیر و شر میں رہا
صاحب نکالو کوئی تو رشتہ نباہ کا

آنکھ جب لڑ گئی مشکل ہے بچانا دل کا

عاشقی نے خراب حال کیا
ورنہ اپنا بھی اک زمانہ تھا

بنائے گا عالم کو دیوانہ اک دن
پس پردہ جلوہ دکھانا کسی کا

شراب خانے میں زاہد کدھر سے آنکلا
مگر اسے بھی اڑا لائی ہے ہوائے شراب

ذرا بھی اس کے مزے سے ہو یہ اگر آگاہ
تو اپنے ہاتھ سے زاہد ہمیں پلائے شراب

جفائیں کر کے شرماتے نہیں وہ
خفا بھی اُلٹے ہوتے ہیں ہمیں پر

شب فرقت کے صدمے جھیلتا ہے
جری دل شیر دل میرا کڑا دل

ستم دیکھو وہ لیکر پوچھتے ہیں
کہاں ہے اب وہ تیرا چلبلا دل

ایک پر ایک کو خالق نے فضیلت دی ہے
ہیچ وہ ہیں جو سمجھتا ہے کہ یکتا ہوں میں

ہمارے سامنے غیروں کا نام لیتے ہیں
زباں سے تیغ کا اب تو وہ کام لیتے ہیں

جب بے مے پیتے ہیں رحمت کی گھٹا آتی ہے
واعظا رند بھی خاصانِ خدا ہوتے ہیں

بے نیازی کے چلن سب سے جدا ہوتے ہیں
جھوٹے دعوے سے کہیں بت بھی خدا ہوتے ہیں

باتوں باتوں میں اڑا لیتے ہیں عشاق کے دل
ان حسینوں کے اشارے بھی بلا ہوتے ہیں

جس دل پہ ناز تھا وہی خون ہو کے بہہ گیا
جس پہ حسیں فدا تھے وہ صورت نہیں رہی

دل لیکے مکرتے ہو یہ کیا بات ہے صاحب
جھوٹی قسم اچھی نہیں اور وہ بھی خدا کی

ذبح کرنا مری جاں خوب تھا ترسانے سے
زندگی تلخ ہوئی جاتی ہے غم کھانے سے

جی چاہتا ہے چیر کے پہلو کو پھینک دوں
نکلیں دل و جگر جو نہ آنکھوں کی راہ سے

زیبا ہیں شوخیاں نگہ یار کے لئے
تیزی ہو جتنی وصف ہے تلوار کے لئے

ہرگز نہ ان حسینوں سے کوئی لگائے دل
سب بیوفا ہیں لاکھ میں کہہ دوں پکار کے

رقیبوں سے میرا گلہ ہو رہا ہے
ستم کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے

ہر طرف سے یہی رندوں کی صدا آتی ہے
کھول ساقی در مے خانہ گھٹا آتی ہے

دی تسلی ہجر میں آکر خیال یار نے
آج آنسو ڈبڈبا کر چشم تر میں رہ گئے

عالی

عالی:۔ سید محب اللہ الرفاعی الملقب نواب میر منوّر علی خاں بہادر۔ آپ کے جدّ اعلیٰ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں مچھلی بندر اور ارکاٹ (حصۂ ملک دکن) کے صوبہ دار تھے۔ اس خاندان کا سلسلہ سید احمد کبیر رفاعی تک پہنچتا ہے۔ اس قبیلہ کی صاحبزادیاں شاہی خاندان اور والیانِ سلطنت سے بیاہی گئی ہیں۔ آپ کے والد نواب مظفر جنگ مرحوم حضرت آصف جاہ خامس والیِ دکن کے نواسے تھے۔ جو اپنے زمانہ کے فاضل اجل، خطّاط ہفت قلم اور فارسی کے عمدہ شاعر شمار کیے جاتے۔ وہ آخر دم تک صیغۂ امور مذہبی کے ناظم رہے۔ درویش صفت برگزیدہ صفات نیک خو تھے۔ دودمان آصف جاہی کی اکثر شہزادیاں آپ کے خاندان میں منسوب ہوئیں۔ انہوں نے نظام گورنمنٹ میں تین سال کنیٹ کونسل میں رہ کر اپنی انتظامی قابلیت کا نقش دلوں پر بٹھا دیا۔

حضرت عالی کو لڑکپن سے شاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں نشتر تخلص کرتے تھے اپنے والد بزرگوار کی فہمائش سے اس تخلص کو چھوڑا اور عالی تخلص کیا۔ اس زمانہ میں آپ کی عمر چودہ۔ پندرہ سال کی تھی۔ پہلے آپ سید محمد کاظم حسین شیفتہ کنتوری مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ پھر ان کے بعد کبھی اپنا کلام سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی لکھنوی حیدر یار جنگ کو دکھاتے رہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ اپنے دادا نواب فریدوں جنگ رفیع الدولہ حیدر الملک ثانی مرحوم کی نگرانی میں گذرا۔ پھر آپ کے والد بزرگوار نے تعلیم پر دلی توجہ فرمائی۔ آپ عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ خوشنویسی باپ سے ورثہ میں ملی ہے۔ اور چار خطوط میں کمال حاصل ہے۔ آپ کو اصلاح زبان اردو اور محاورات والفاظ کی تحقیقات سے خاص دلچسپی ہے۔ آپ نے ایک انجمن اربابِ اردو کی بنا ڈالی تھی۔ جس کے معتمد اعزازی رہے۔ رسالہ تحفہ کے مدیر اعلیٰ تھے۔ آپ نے ایک

ذخیم کلیات قدما کے طور پر مرتب کیا ہے۔ جس میں تقریباً دس ہزار بیت ہیں۔ اور ایک دیوان بھی مرتب کیا ہے۔ جدید وضع کی شاعری میں بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ کلام میں شوکت الفاظ کے ساتھ شوخی اور متانت بھی ہے۔ نہایت پُرگو اور زود فکر ہیں۔ گو آپ دہلی اور لکھنؤ کی بیجا پیروی کو حلقۂ غلامی سمجھتے ہیں۔ اور خذ ما صفا کے مؤید ہیں۔ لیکن کلام کا زیادہ حصہ قدمائے لکھنؤ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

حضرت عالی سلیم الطبع منکسر المزاج۔ کم سخن۔ درویش صورت و درویش سیرت۔ خوش اخلاق۔ گوشہ نشین۔ حنفی المذہب۔ صوفی مشرب ہیں۔ مؤلف تذکرہ کو جو کلام روانہ کیا گیا تھا۔ ان کا انتخاب درج ذیل ہے

ہوا ہوں پر شکستہ فصل گل میں اڑ نہیں سکتا
میں رہ جاتا ہوں منہ تک تک کے دیوار گلستاں کا

اہل بینش ہیں کہاں سرمہ بنائیں آ کر
سوختہ برق تجلی سے ہے خرمن اپنا

جب ہوئی وحشت تو عریانی کا ساماں بڑھ گیا
پاؤں سے دامن تو ہاتھوں سے گریباں بڑھ گیا

اس آئینۂ دل میں مجھے کیا نظر آیا
کچھ کہہ نہیں سکتا جو تماشا نظر آیا

صورت تیری آغاز میں بھولی نظر آئی
انجام میں پتھر کا کلیجا نظر آیا

بدل گئی ہے فغاں سے مری زباں کی طرح
دعا بھی منہ سے نکلتی ہے آہ فغاں کی طرح

آئی بہار آتشِ گل نے لگائی آگ
جلنے لگی ہے آج سر شاخسار شمع

رتبۂ شعر ہے الفاظ و معانی سے بلند
پھول پھل ہوتے ہیں دنیا میں شجر کی رونق

رعب حسنِ یار کے باعث نہ نکلا ایک حرف
ورنہ کیا کیا سوچ کر آئے تھے اپنے دل میں ہم

خیر محشر میں سہی فیصلہ اپنا ان کا
نہ سہی آج اگر کل ہی تو کچھ دور نہیں

منکشف ہونے لگے راز ہر اک گھونٹ کے ساتھ
یا الٰہی مئے عرفاں تو نہیں شیشہ میں

وصل صنم کی کرتے ہیں ہر روز و شب دعا
کس درجہ بے ادب ہیں یہ بندے خدا کیساتھ

رنج و غم کیونکر جدا ہوں ہیں جو اپنے دم کیساتھ
غم جو مٹ جائیگا مٹ جائینگے ہم بھی غم کیساتھ

رو دیئے سوزشِ نہانی کو
یا بُرا کہیئے نوجوانی کو

قصۂ قیس تو سُنا تم نے
کبھی سُن لو مری کہانی کو

جلوۂ یار و تمنا و امید و ارماں
جمع ہیں دل میں تماشے بھی تماشائی بھی

تو ستمگر ترے انداز ستمگر ظالم
تری تلوار بھی قاتل تری انگڑائی بھی

اس قدر بڑھ گئی وحشت ترے دیوانوں کی
دامن کوہ بھی صورت ہے گریبانوں کی

مثل ہے ہوتی ہے نعمت کی قدر بعدِ زوال
اُمنگیں پیری میں یاد آتی ہیں جوانی کی

باندھی جو آسماں نے ہوا انقلاب کی
وہم و خیال ہو گئی ہستی حباب کی

اعمال میں نہیں ہے مرے ایک بھی ثواب
محتاج ہی نہیں مری فردیں حساب کی

نہ صرف علم کے پڑھنے سے آدمی ہوگا
بشر کو چاہیئے کچھ سیکھے آدمیت بھی

ہاتھ میں نشترِ جنوں ہے جوشِ سودا سر میں ہے
سارے ویرانوں کی ویرانی ہمارے گھر میں ہے

میں جو ہو جاؤنگا خوگر رنج کا پھر لطف کیا
کچھ خوشی بھی چاہیئے اے آسماں میرے لئے

کام کر دیتی ہے تمام ادا
مفت مرنے کا نام ہوتا ہے

گلے ملتے ہیں تیغ قاتل سے
آج قصّہ تمام ہوتا ہے۔

کہوں کیا محبت کی تکلیف عالیؔ
جو گذری ہے مجھ پر خدا جانتا ہے۔

کبھی تو اپنی جفاؤں سے باز آ ظالم
کبھی تو لینے دے اے سنگدل قرار مجھے

ہماری سرفروشی پر زمانہ بھر کو حیرت ہے
کسی کی تیغ بھی تکتی ہے ہم کو چشم جوہر سے

یوں مجازاً ہیں ترے چاہنے والے لاکھوں
فی الحقیقت وہی تیرا ہے جسے تو سمجھے

نہ دوستی شکوہ نہ بخت سے شکوہ نصیب کا ہو رہیگا لکھّا
نوشتۂ کاتب مقدر بھلا کہیں رائیگاں ہوا ہے

مری آنکھوں سے جو دیکھو آئینہ
تم بھی رہ جاؤ کلیجہ تھام کے

وفورِ ضعف سے فرقت میں لڑکھڑاتا ہوں
خدا کے واسطے اے بیخودی سنبھال مجھے

چلوں نہ دوڑ کے عالیؔ نہ ٹھوکریں کھاؤں
پسند اس لئے ہے راہِ اعتدال مجھے

کروں کس طرح عرض مطلب دل — انہیں نفرت ہے حرف مدعا سے
روز اک ظلم نیا اے ستم ایجاد رہے — دل کو کچھ حسن پرستی کی سزا یاد رہے
پرستش میں تری شیخ و برہمن سر بسجدہ ہیں — یہاں تو ایک راہ کفر و دیں معلوم ہوتی ہے
لطف جب ہے ایک سمجھو عاشق و معشوق کو — شمع میں ہے کس کا جلوہ کون پروانے میں ہے
کیا جانے کیا کیا سوچ کے آئے تھے دل میں ہم — خاموش رہ گئے تری صورت کے سامنے
وہ جو پہلو سے مرے اُٹھ کر چلے — دل پہ بس چھریاں چلیں خنجر چلے
دل کو تسکین دے رہا ہوں میں — وہ نہ آئیں اجل تو آتی ہے
دیکھتا ہوں کہ وہ محفل میں کدھر دیکھینگے — یہی ہر اک کو گماں ہے کہ ادھر دیکھینگے
حیف اے دل تو نہ سمجھا عمر بھر — عمر گذری تجھ کو سمجھاتے رہے
محبت ہے جو مجھ وحشی کو حسن فتنہ ساماں سے — جنوں نے سر نکالا ہے مرے چاک گریباں سے
بگولے خاک اُڑاتے ہیں قبائے گل دریدہ ہے — جنازہ آج بلبل کا نکلتا ہے گلستاں سے
ہم کو عمر شاہد گل اے صبا معلوم ہے — ہے مخالف باغ عالم کی ہوا معلوم ہے
اس سے کچھ کہنا اگر چاہوں تو کہتا ہے وہ شوخ — ہم کو پہلے سے تمہارا مدعا معلوم ہے
خلوت پسند ہے مجھے اور حشر عام ہے — کہدو کہ میں نکل نہیں سکتا مزار سے

عالی:۔ میرزا عالی بخت گورگانی ابن میرزا فیروز بخت خلف شاہ عالم ثانی۔ حضرت احسان دہلوی اور میرزا فخر الدین ثابت سے تلمذ تھا۔ خوش فکر۔ عالی خیال شاعر تھے نمونۂ کلام یہ ہے۔ عالی

مژگان ستمگر کی طرح روز ازل سے — جو شخص کہ ٹیڑھا ہے وہ سیدھا نہیں ہوتا
جوں نخل شمع ہوں نہ کبھی سبز آب سے — آتش اگر ہو سر پہ رہوں آب و تاب سے
صریح اس کو اگر حال دل جتا نہ سکے — تو کیا غزل میں بھی پڑھ پڑھ کے ہم سنا نہ سکے
بہیوں تو دل کی نہ بجھے آگ آہ اس پہ سے — ذرا سا وار کے پانی بھی پار نہ لا سکے

عالی

عالی:۔ منشی میرزا علی صاحب مرحوم لکھنوی۔ آپ عرصہ تک بلگرام اور سندیلہ میں سیاہہ نویس رہے۔ پنشن حاصل کرنے کے بعد منشی سید التفات رسول تعلقہ دار سندیلہ کے ہاں ملازمت کرلی اور آخر عمر تک وہیں رہے۔ بہت با وضع اور خوش اخلاق تھے۔ سید منصب علی صاحب ہنر مرحوم سے دوستانہ مراسم تھے۔ اور انہیں سے کبھی کبھی مشورہ سخن بھی کرتے۔ ساٹھ ستر برس کے قریب عمر پائی۔ لکھنؤ میں جاکر انتقال ہوا۔ آپ کا دیوان غنچۂ رمز کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ پرگو شاعر تھے۔ مشاعرہ میں بالعموم دو غزلہ پڑھتے۔ شعر میں صنائع بدائع رعایات لفظی کا زیادہ خیال تھا۔ باریکی اور نکات کو مدِ نظر رکھتے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

زکوٰۃ حسن ہے اک بوسہ دے بھلا ہوگا	دُعا فقیر کی بھی لے لگار لیتا جا
جو چاہا نزع میں لپٹوں تو ہٹ کے وہ بولے	لحد میں حسرتِ بوس وکنار لیتا جا
کروں گا خون میں اپنا نہیں تو اے صیاد	قفس مرا طرف لالہ زار لیتا جا
ملال و حزن و درد و غم نکلتے ہی نہیں دل سے	یہ مہماں خوب میرے گھر کے مالک بن کے بیٹھے ہیں
جس مرغِ دل کو تاک لیا ہو گیا شکار	تیر قضا کا ڈھنگ تمہاری نظر میں ہے

عالی

عالی:۔ سید زبیر احمد صاحب سکندر آبادی۔ تلمیذ حضرت داغ دہلوی۔ زبان بہت پیاری ہے۔ انداز بیان دلکش ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

شیخ جی یہ میکدہ میں تاک جھانک	کیا بُری حضرت کی نیت ہو گئی
روز بوسے کی طلب اچھی نہیں	دیکھو عالی کیا بُری لت ہو گئی

عامل

عامل:۔ میرزا محمد یعسوب ولد مرزا ایوب بیگ دہلوی۔ ریاست جے پور میں مدرس ہیں۔ میرزا عبدالغنی ارشد مرحوم کے شاگرد ہیں۔ میرزا سعادت یار خاں رنگین کو اپنا نانا بتاتے ہیں۔ سادہ گفتار سلاست پسند ہیں۔ کلام جو کچھ فراہم ہوا اس کا انتخاب درج ذیل ہے

غم عالم ہمارے دل میں ہے۔	کیا ٹھکانا ہے اس سمائی کا

دل جگر لڑ رہے ہیں ناوک پر
پہلو سے نکل کے خود گیا دل

بھائی دشمن ہوا ہے بھائی کا
کیوں نام لگائیں ہم کسی کا

ہے کچھ اثر مرے دل پُر اضطراب کا
انداز ہے چلنے میں وہ اس رشک پری کا
فتنہ نہ اُٹھے آج کوئی اے دل حیدل
خانہ برباد کیے جائیے ہاں شوق سے آپ

اُڑتا گھڑی گھڑی ہے جو گوشہ نقاب کا
جیسے کوئی جھونکا ہو نسیم سحری کا
کیوں خیر تو ہے کیوں وہ اِدھر دیکھ رہے ہیں
فکر اس بات کی کیا ہم کو یہاں گھر ہی نہیں

تمھیں کہدو ذرا خدا لگتی
کس جفا کار ستمگر پہ طبیعت آئی

تم کو دل دے کے کیا کرے کوئی
بس جی بس حضرت دل آپکی شامت آئی

حال یہ پوچھیئے مرے دل سے
کٹتی اک اک گھڑی ہے مشکل سے
ایسے بے مہر پہ نہ دیتے جان
اُف ری سوز جگر تری گرمی
تمھیں بتاؤ نہ کیوں جان بیقرار رہے

رات گذری ہے کیسی مشکل سے
جان آفت میں آگئی دل سے
ہم تو مجبور ہوگئے دل سے
بڑھ گئے دل کے آبلے دل سے
جو دل سی چیز پہ اپنا نہ اختیار رہے

عبادت

عبادت:۔ میر عابد علی صاحب۔ خوش فکر پاکیزہ خیال شاعر ہیں۔ بندشیں صاف ستھری ہوتی ہیں۔ اور حالات معلوم نہ ہو سکے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

تپِ فرقت کی اللہ رے حرارت
الجھتا ہے سدا کانٹوں سے دامن
ہر اک کی آنکھ میں بھر آئے آنسو
ہُوا مجنوں سے روشن نام لیلےٰ
عبادت بندگی حق کیا کر

نکلتے ہیں شرارے تن بدن سے
جنوں ہم باز آئے پیرہن سے
ہوئے رخصت جو ہم اہل وطن سے
ملا شیریں کو رتبہ کوہکن سے
وسیلہ رکھ جہاں میں پنجتن سے

عباس

عباس:۔ عباس خاں برادرزادہ اخوندزادہ ارادت خاں صاحب۔ مصاحبان نواب

عنایت اللہ خاں سے تھے۔ قدرت اللہ صاحب شوق نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "عالی حوصلہ۔ خوبصورت پاکیزہ سیرت باتمکنت ہیں اگرچہ نومشق ہیں۔ مگر ذہن اچھا پایا ہے"۔ محمد قائم سے ان کو تلمذ تھا۔ یہ ان کا کلام ہے۔

جز عشق وسوز دیر نہ کعبہ سے کام ہے	اُس کو تو رام رام اور اس کو سلام ہے
رُخ دام زلف دام ہے کاکل ہے دام دل	ہے راست یہ کہ اس کا ہر اندام دام ہے
بازار و شہر و مسجد و بت خانہ باغ و راغ	دیکھا تو تیرے عشق ہی کی دھوم دھام ہے
نجانے کیا ہوا ایدل تجھے پھر ان دنوں ہے ہے	کہ ہر نالہ میں تیرے حشر ہے شور قیامت ہے

عباس

عباس:۔ سید محمد جعفر علی عرف شہریار مرزا۔ عامیانہ محاورات و بازاری عشق کے معاملات ان کے تغزل کی جان ہیں۔ چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

نہیں بھولتی یاد حبانی تری	زباں پر ہے ہردم کہانی مری
پیام اجل ہے ترا روٹھنا	غضب ہے یہ نامہربانی تری
کیا حشر برپا تری چال نے	قیامت ہے جانی جوانی تری

عباس

عباس:۔ مرزا محمد عباس المشتہر بہ علی مرزا تلمیذ حضرت حکیم لکھنوی۔ بہت مشاق شاعر ہیں۔ کلام سے پختگی کا رنگ ٹپکتا ہے۔ لطف زبان کیساتھ لطف مضمون بھی موجود ہے زیادہ کلام دستیاب نہ ہوسکا۔ فراہم شدہ اشعار درج ذیل ہیں۔

پڑی تھی کیا اُسے کیوں جاگتا وہ ساری رات	نصیب خفتہ مرا چشم انتظار نہ تھا
شب فراق ہمیں اور شب وصال تمہیں	سحر کا شام سے دونوں کو انتظار نہ تھا
امید وصل پہ عباس اور جیتا تھا	ہزار وعدہ کا اس بت کے اعتبار نہ تھا

عباس

عباس:۔ میرزا عباس بیگ مرحوم بریلوی۔ کہنہ مشق پرگو شاعر تھے۔ فن شعر گوئی میں خواجہ آتش سے تلمذ تھا۔ اساتذہ بریلی میں نامور اور شہیدی کے ہم عصر تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ غدر میں ان پر جرم بغاوت عائد کیا گیا۔ اور پھانسی دیگئی۔ میرزا صاحب مرحوم

نہایت سنجیدہ مزاج تھے۔ انہیں شور و شر سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ مگر بدقسمتی سے اسوقت بریلی کا جو حاکم تھا وہ مشرقی لٹریچر اور اردو شاعری کی خوبیوں سے ناواقف تھا۔ جس وقت اس نے یہ شعر سنا ؎

اختر چھپک گئے ترے خالوں کے سامنے	گوروں کے پاؤں اٹھ گئے کالوں کے سامنے

تو اس کو بغاوت پر محمول کیا اور ان کو پھانسی کا حکم دے دیا۔ اگر اس موقعہ پر کوئی ہندوستانی ہوتا تو وہ زبان داں ہونے کیوجہ سے اختر اور خال کی چپک۔ سیاہی اور سپیدی کے فرق کو سمجھ لیتا۔ اور اس سے یہ غلطی سرزد نہ ہوتی۔ کلام جو کچھ دستیاب نذر ناظرین ہے۔

جب بیعت گل کا شجرہ گل نے نکالا	گیسو سے نیا سلسلہ سنبل نے نکالا
اس قامت موزوں نے کیا سرو کو سیدھا	بل طرہ شمشاد کا کاکل نے نکالا
بدلا ہوا ہے رنگ سیاہی گھٹا کی ہے	لا ساقیا شراب کہ رحمت خدا کی ہے
پیتا نہیں شراب کبھی بے وضو کئے	قالب میں میرے روح کسی پارسا کی ہے
عباس روز حشر یہ کہتا اٹھوں گا میں	لوٹا مجھے بتوں نے دوہائی خدا کی ہے

عباس

عباس مولوی غلام عباس صاحب۔ آپ قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڈھ کے باشندے ہیں۔ اپنے والد سے عربی فارسی کی تعلیم پائی۔ عرصہ دراز سے قصبہ سمبھی میں سکونت پذیر ہیں۔ علم دوست اخلاق پرست دوست ہیں۔ اکثر اصحاب آپکے فیضان علمی سے مستفید ہو چکے ہیں۔ عربی فارسی میں اعلےٰ درجہ کی لیاقت ہے۔ احادیث و آیات قرآن کو بے تکلف اردو شعر میں نظم کر دیتے ہیں۔ فن شعر میں آپ کو صابر نظام آبادی سے تلمذ ہے جو حضرت ناسخ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ متعدد رسالہ جات میں آپ کا کلام شائع ہو چکا ہے۔ کلام نہایت بامزا ہوتا ہے۔ جو پختہ مشقی کا ثبوت ہے۔ آپ جس طرح پُرگو شاعر ہیں۔ اسی طرح مشاق نثار بھی ہیں۔ عرصہ تک اخبارات میں مضامین

لکھتے رہے ہیں۔ غزل کے علاوہ سلام بھی کہتے ہیں۔ کلام جو منشی محمد احسن صاحب نے روانہ کیا اس کا انتخاب درج ذیل ہے۔

جس کو طوفانِ نوح کہتے ہیں
تھا وہ طوفان دیدۂ تر کا

نزع میں چھوڑ کر نہ جاؤ مجھے
بس یہ جھگڑا ہے اور دم بھر کا

سنگِ اسود کو چومتے ہیں بشر
یہ بھی پتھر ہے کیا ترے در کا

کہاں جنت کہاں کوئے صنم خاموش اے واعظ
ارے دیکھا ہوا ہے باغ فردوس ارم میرا

سلام اس بندگی کو۔ دیں ہزاروں گالیاں اس نے
ہوا جب سامنے اسکے سرِ تسلیم خم میرا

اِن دنوں شوق جو ہے ان کو خود آرائی کا
عالم آئینہ میں ہے چشمِ تماشائی کا

جس کو عباس ہم ولی سمجھے
وہی رندوں کا پیشوا نکلا۔

لَو لگائی جو بتوں سے تو خدا کو پایا
دلِ روشن ہے چراغِ رہ عرفاں میرا

وفورِ داغ سے ہے لالہ زار دل اپنا
یہ بوستاں کبھی منت کشِ بہار نہ تھا

تمہاری جستجو میں ہم نے برسوں خاک اُڑائی ہے
زمیں یہ مدتوں سر پر پھری ہے آسماں ہو کر

جب تنگ گہر صدف میں رہا آبرو نہ تھی
عباس قدر ہو گئی جب نکلے گھر سے ہم

بحرِ عالم میں ہے اپنی زندگی شکل حباب
جب چلا جھونکا ہوا کا ہو گئے برباد ہم

مے بھی ہے۔ ابر بھی ہے۔ باغ بھی ہے۔ جام بھی ہے
سب تو موجود ہے پر ساقی کمسن ہی نہیں

دم بدم آتی ہے اے عباس بوئے باغ خلد
کوچہ جاناں میں بستر ہے کہ میں جنت میں ہوں

ناز سے جب وہ مسکراتے ہیں
برق کو شرمسار کرتے ہیں

وہ خلوتخانہ دل میں ہیں موجود۔
حرم میں دیر میں کس کیلئے جائیں

جدائی ہے اگر منظور عباس
جدا تن سے ہمارا سر کئے جائیں

چھیڑ کر کہتا ہی مجھ کو وہ پری رو عباس
لوگ کیوں آپ کو دیوانہ کہا کرتے ہیں

کہتا ہوں دل میں ڈر ہے ان کو یقیں نہیں
کہتے ہیں ہاتھ رکھ کے کہاں ہے کہیں نہیں

جب نظر تم دو چار کرتے ہو	تیر سینے کے پار کرتے ہو
وہ تلوّن مزاج ہے عباسؔ	اس کا تم اعتبار کرتے ہو
ویرانۂ دل میں تجھے ہم ڈھونڈ رہے ہیں	اے حسرت مردہ تری تربت نہیں ملتی
ایک دل میں کیا ہے یادِ خدا یادِ صنم	لطف تھا ہم کو جو ملتا دوسرا دل اور بھی
دن تو فرقت کا گذر جاتا ہے اٹھتے بیٹھتے	کاٹنا راتوں کا ہو جاتا ہے مشکل اور بھی
ترکِ ملت کر چکے جب ہم تو کچھ حاجت نہیں	ہاتھ کو تسبیح کی اور دوش کو زنار کی
طرح انداز مکان و لامکاں تو ہی تو ہے	زمزمہ سنج نوائے کن وکاں تو ہی تو ہے
آں راکہ عقل بیش غم روزگار بیش	بیعقل جو یہاں ہے وہی بے نیاز ہے
کیوں ہنسے آپ دل میں کیا سمجھے	کیا مرے دل کا مدعا سمجھے
خاک ہی سے بنے تھے خاک ہوئے	ابتدا اور انتہا سمجھے
بیٹھ کر پہلو میں کس انداز سے	لے گئے وہ دل نگاہِ ناز سے
میری آنکھوں سے جو آنسو گر پڑے	ہنس کے بولے ہم ہیں واقف راز سے
دردِ دل اشکوں نے ظاہر کر دیا	بھید گھر کا کھل گیا غماز سے
اے آہ تو اثر نہ دکھا مضطرب ہیں وہ	اے دل نہ تو تڑپ کہ انہیں اضطراب ہے
تنگ آکے یہ ہم کہنے لگے بیقدری سے	اچھا نہیں اب کوئی ہنر بے ہنری سے

لغت در صنعت غیر منقوط

ملک و ملک و حور کا سردار محمد	واللہ دو عالم کا مددگار محمد
ممدوح ہوا مہر و مہ و لوح و سما کا	اللہ کا وہ محرم اسرار محمد
معصوم وہ محمود وہ طاہر وہ مطہر	عالم کا مدد اور مددگار محمد
واللہ مرا ہوگا مددگار علمدار	وہ داد رس عامہ مددگار محمد

مسدس

مرغوب کیوں عروس سخن کی ادا ہے آج
اونچا فلک سے بھی کہیں ذہن رسا ہے آج
قرطاس بحر نور میں ڈوبا ہوا ہے آج
مطلع بھی اپنا مطلع شمس الضحیٰ ہے آج
حرفوں میں میرے نور ہے مہر منیر کا
سدرہ کے سر پہ غل ہے قلم کے صریر کا

اے شاہد سخن مجھے جلوہ گری دکھا
حسن و جمال حور ادائے پری دکھا
اے اسپ خامہ چال اب اپنی نئی دکھا
لی باگ میں نے ہاتھ میں چابکسری دکھا
اے شمع ذہن نور دکھا کوہ طور کا
یہ کاغذ سپید مرقع ہو نور کا

اے گلشن طبیعت انور شگفتہ ہو
ہاں جلد غنچۂ دل مضطر شگفتہ ہو
نخل سخن میں آج گل تر شگفتہ ہو
سطح سخن چمن کے برابر شگفتہ ہو
سن سن قلم برنگ نسیم سحر چلے
بوئے گلاب ساتھ ادھر اور ادھر چلے

عبرت **عبرت** :۔ نواب حسین علی خاں لکھنوی بڑے مرزا خلف نواب محمد علی خاں ابن نواب شجاع الدولہ بہادر۔ صاحب دیوان و شاگرد غلام ہمدانی مصحفی بہت زبردست شاعر تھے۔ کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فن سخن پر قدرت حاصل تھی۔ زبان بھی سلیس پائی تھی زیادہ حال ان کا نہ مل سکا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

اجڑا پڑا ہے آج سراسر دیار دل
کس زلف نے کیا ہے الٰہی شکار دل
تکیئے میں دفن ہیں ہوں وہ ہی کوئے یار میں
میرا الگ مزار جدا ہے مزار دل
گرد کدورت آئینہ رو کی مٹی نہ ہائے
ہر چند آب گریہ سے دھویا غبار دل

عبرت **عبرت** :۔ منشی دولت رام دہلوی رائے ہیرا لال برادر زادہ راجہ کنول نین مرحوم ساکن کوچہ بلاقی بیگم متصدی پیشہ تھے۔ اوائل میں شیخ ابراہیم ذوق سے تلمذ تھا۔ پھر

مولانا ظہیر سے صلاح لینے لگے۔ ۱۲۸۹ھ میں ستر برس کی عمر پاکر قضا کی۔ صاحبِ دیوان تھے۔ مگر کچھ ذاتی استغنا اور کچھ اولاد کی غفلت سے کلام برباد ہوگیا۔ نمونہ کلام درج ہے

سخت جانی تو نے شرمندہ کیا قاتل سے ہائے
وقت کشتن پھر گیا منہ یار کی تلوار کا

عامل ہزار سورۂ جن مجھ پہ دم کریں
پر اُس پری کی زلف کا سایہ نہ جائیگا

تمہاری بات کا جب ہم کو اعتبار نہ ہو
تمہیں بتاؤ کہ دل کیونکہ بیقرار نہ ہو

تم کو چاہا جو صنم ہم نے برائی کیا کی
الفت انسان کو ہو جاتی ہے انسان کے ساتھ

پہلے تو غصہ ہوئے غیر کے بہکانے سے
بارے کچھ سوچ چکے سمجھے مرے سمجھانے سے

کونسا ہے وہ پری رو کہ جسے تم عبرت
دیکھے دل ایسے بنے پھرتے ہو دیوانے سے

عبرت

عبرت:۔ احمد دین خاں خلف رستم ہند قطب الدین خاں نبیرہ نواب عظمت اللہ خاں مرادآبادی۔ جوان صاحب مروت تھے۔ طبیعت اچھی پائی تھی۔ قوت مشق کی بدولت زبان صاف ہوگئی تھی۔ بہت پرگو تھے۔ ایک ضخیم دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

فقط دل ہی نہ دلبر کا مکاں ہے
جہاں دیکھو وہ ہرجائی وہاں ہے

نہ مجھکو آہ کی طاقت نہ اُن کو مہربانی ہے
کٹے ہیں اس طرح دن یہ بھی کوئی زندگانی ہے

تسلی کس طرح سے ہجر میں ہو اس جفاکش سے
نہ نامہ ہے نہ قاصد ہے نہ پیغام زبانی ہے

بلا ہے فتنہ ہے آفت ہے یا یہ تیرا قامت ہے
کہ جس کے ہاتھ سے سروِ گلستاں پر قیامت ہے

خدا ہرگز نہ دکھلاوے کسی آزردہ خاطر کو
شب ہجراں جسے کہتے ہیں سو روزِ قیامت ہے

خستہ جاں اشک فشاں خاک بسر آتا ہے
نامہ بر شہر سے دلبر کے مگر آتا ہے

عبرت

عبرت:۔ منشی محمد عبدالرسول صدیقی تلمیذ جناب میر حشمت علی صاحب حشمت بہت صاف اور پاکیزہ کلام ہوتا ہے۔ مشاق معلوم ہوتے ہیں۔ دو شعر بطور نمونۂ کلام درج ذیل ہیں:—

زلف کا منہ پر نقاب دیکھئے کب تک رہے	ابر میں یہ ماہتاب دیکھئے کب تک رہے
ہجر میں اک شوخ کے نزع کے عالم میں ہوں	جان پہ میری عذاب دیکھئے کب تک رہے

عبرتی

عبرتی :۔ سید خورشید عالم صاحب خلف الصدق سید مقصود عالم رضوی ساکن قصبہ پہانی ضلع ہردوئی۔ مشتاق شاعر تھے۔ تخمیس میں کمال حاصل تھا۔ بہت سی غزلوں پر اعلے اعلے مصرعہ لگا کر اپنی استادی کا ثبوت دیا ہے۔ حضرت مقصود کی ایک غزل پر جو مصرعے لگائے تھے۔ اس کے کچھ بند درج ذیل ہیں ـــ

کسے یہ دیتے ہیں ہم صاف صاف اجی تم سے	جواب عمر کو دے جو لگائے جی تم سے
کریگا کیا مہ کنعاں برابری تم سے	ملائے خاک بھلا آنکھ آدمی تم سے

خفیف حور ہے تم سے خجل پری تم سے

بنے ہیں وہ کے لگانے سے مفت میں ناداں	فراق میں ہوئے راہی شکیب و ہوش و تواں
مصیبتوں کا کہاں تک بیاں کرے یہ زباں	یہ کیا ستم ہے زمانہ بنا ہے دشمن جاں ۔

غضب میں جان پڑی کی جو دوستی ہم سے

جو بانکپن کا کبھی ذکر ہو اکڑتے ہو	وہ کر گذرتے ہو جس بات پر کہ اڑتے ہو
طلب جو بوسہ لب ہو تو صاف لڑتے ہو	ہنسی کی بات پہ تم اس قدر بگڑتے ہو

تو جاؤ آج سے موقوف ہے ہنسی تم سے

عادم

عدم :۔ سید عبدالحمید صاحب خلف منشی حیدر علی شاہ بن صوبیدار مہتاب شاہ آپ کے آباؤ اجداد میں سے بیشتر فوجی ملازمت میں منسلک رہے ہیں۔ عدم صاحب ۱۹۰۸ء میں تلونڈی موسئے خاں نامی موضع میں پیدا ہوئے جو گوجرانوالہ سے قریب چار کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ تعلیم اپنے وطن اور لاہور میں پائی۔ اکثر امتحانات میں سرکاری وظیفہ بھی ملا۔ ۱۹۲۸ء میں ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں ملازم ہوئے۔ آجکل بطور آڈیٹر کام کر رہے ہیں اور راولپنڈی میں مقیم ہیں۔

دورانِ قیام لاہور میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ پہلی غزل ۱۹۲۵ء میں فرمائی اور ۱۹۲۷ء سے اکثر مشاعروں میں شرکت فرماتے ہیں۔ آپ کو علم موسیقی سے بھی دلی تعلق ہے۔ اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے کلام میں نہایت دلکش ترنم ہوتا ہے۔ آپ کی شاعری صرف غزل گوئی تک محدود نہیں ہے۔ دیگر اصنافِ نظم میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ گو مشق کو بہت عرصہ نہیں ہوا۔ مگر کلام کا انداز نہایت دلکش ہے۔ تخیئل کی بلندی کے ساتھ ساتھ محاکات کا لطف بھی آپ کے کلام میں موجود ہے۔ دُور از کار تشبیہ و استعارات سے کلام پاک ہے۔ تلمذ کسی سے نہیں ہے، مذاقِ سلیم خود ہی رہنما ہے۔ ملک کے اکثر ممتاز رسالوں میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ اگر مشق جاری رہی تو وہ دن دُور نہیں کہ آپ کا شمار بھی نامی اساتذۂ فن میں ہوگا۔ کلام کا انتخاب ہدیہ ناظرین ہے۔

جفا کا لطف باندازۂ وفا نہ ملا — ترے جہاں میں تو مرنے کا بھی مزا نہ ملا
نہ دل سے محو ہوئی آرزو نہ بر آئی — ستم ظریفیٔ فطرت کا مدعا نہ ملا
جنوں سوار تھا سر پہ پاؤں توڑ آئے — کچھ اپنی منزلِ موہوم کا پتہ نہ ملا
جناب شیخ یہ کیا ماجرا ہوا آخر — سنا ہے کہ آپ کو کعبہ میں بھی خدا نہ ملا

ہائے کیا بیداد پر بیداد کر لیتا ہوں میں — شام غربت میں وطن کو یاد کر لیتا ہوں میں
ضبط مشکل ہے خلاف ضبط ننگ عشق ہے — دل ہی دل میں بیٹھ کر فریاد کر لیتا ہوں میں۔
چاندنی راتیں محبت اور جوانی ہائے ہائے — تھام کر دل ان دنوں کو یاد کر لیتا ہوں میں
اب کہاں پینے کا پہلا سا وہ لطف اے ہمنشیں — ہاں ذرا لطفِ بہم ابر و باد کر لیتا ہوں میں
یہ وہیں مجھ کو خبر کیا ہے حقیقت کیا مجاز — دیکھ کر ان کو خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں
گو تری محفل سے او بیداد گر جاتا ہوں میں — دیکھ کیا نقشہ جگر آشفتہ سر جاتا ہوں میں۔
شوق بے پایاں کی کوشش کا کوئی حاصل نہیں — اے فریب آرزو آخر کدھر جاتا ہوں میں۔

زندگی کی راہ پُر آفات ہے لیکن عدمؔ
ہر کٹھن منزل سے وحشت میں گذر جاتا ہوں میں

حسرت بھری ہے رونق ناپائیدار میں
میرے لئے بہار کا غم ہے بہار میں۔

فرصت کہاں کہ ہوش میں آنا نصیب ہو
کھویا گیا ہوں کشمکش روزگار میں

محرومیوں میں بھی مری تکمیل شوق دیکھ
معدوم ہو گیا ہوں تری رہ گذار میں

تڑپا دیا ہے عہد فراغت کی یاد نے
کچھ ڈھونڈھتا ہوں گردش لیل و نہار میں

مقصود انتظار ہے کیا کچھ خبر نہیں۔
بیٹھا ہوں کتنا محو ترے انتظار میں

انکی ہر ایک بات پہ آتا ہے اب یقیں
وہ بس گئے ہیں سادگی اعتبار میں۔

چلتے ہو خضر سوئے عدم یا کہ حشر تک
بیٹھے رہو گے غمکدۂ روزگار میں

کیا دیکھتے ہو منہ مرا احوال پوچھ کر
کیا مجھ سے کوئی سجدۂ شکرانہ چاہیے

دلجوئی خوب کرتے ہیں واماندگی میں دوست
کہتے ہیں مجھ سے ہمّت مردانہ چاہیے

آخر فریب وعدہ کی کچھ انتہا بھی ہے۔
یہ مانتا ہوں میں کہ تقاضا نہ چاہیے

کچھ کہہ رہی ہے رات کی خاموش چاندنی
کچھ احترام شیشہ و پیمانہ چاہیے۔

جستجو وہم سے تعبیر ہوئی جاتی ہے
ہائے تدبیر بھی تقدیر ہوئی جاتی ہے

مٹتی جاتی ہیں جوانی کی اُمنگیں جوں جوں
زندگی موت کی تصویر ہوئی جاتی ہے

طلسم اعتبار خوبی تدبیر قائم ہے
ابھی ہم اپنی بربادی کو قسمت تو نہیں کہتے

جذبات محبّت

روح میں کیوں سما گئے ہو تم
میری ہستی پہ چھا گئے ہو تم

دل کو مجنون کر دیا تم نے
ہوش کا خون کر دیا تم نے

دل ہی مندر تم اسکی مورت ہو
ہائے تم کتنے خوبصورت ہو

دُور رہتے ہو ماجرا کیا ہے۔
جور بیجا سے مدّعا کیا ہے

شب کو یہ خدمت محال کہاں
رات کو ضبط کی مجال کہاں

رات کی حشر خیز خاموشی	خامشی کی عمیق سرگوشی
دل سراپا خیال ہوتا ہے	اور تمہارا جمال ہوتا ہے
روح محو نیاز ہوتی ہے	آنکھ وقف نماز ہوتی ہے
کاش ایسے میں تم کبھی آؤ	آ کے اک بار دیکھ ہی جاؤ
لیکن ایسے مرے نصیب کہاں	تم کہاں اور میں غریب کہاں

دریا

اپنے دامن میں لئے پُر جوش ہیجانوں کا شور	تند موجوں کا تلاطم مست طوفانوں کا شور
ساحلوں سے عالمِ وحشت میں ٹکراتا ہوا	پتھروں کو پائے استغنا سے ٹھکراتا ہوا
جنگلوں میں آندھیوں سے گفتگو کرتا ہوا	بادلوں کے قہقہے کی جستجو کرتا ہوا
چلچلاتی دھوپ کے ناز و ادا سہتا ہوا	تلملا کر مضطرب انداز میں بہتا ہوا
چاندنی راتوں کے جلووں پر فدا ہوتا ہوا	شمع رو تاروں کی محفل میں فنا ہوتا ہوا
صبح کے پُر نور جلووں کی ضیا سے فیضیاب	شام کے خمخانہ رنگیں کا سرمست و خراب
سبزہ زاروں کی حسیں زلفوں کو سلجھاتا ہوا	بے خودی کے کیف میں ہنستا ہوا گاتا ہوا
اپنی رگ رگ میں چھپائے زندگی کی کائنات	کامیابی سے کئے جاتا ہے طے راہِ حیات
شورشِ ہستی سے مل سکتا نہیں کیفِ جمود	اضطرابِ زیست کا پیکر ہے دریا کا وجود

قطعات

رواں ہے شوق کا بجرہ سنہری جوئباروں میں	بہا جاتا ہوں نورانی امنگوں کے خماروں میں
فضائے زندگی پر حسن کا سیلاب حاوی ہے	گھرا ہوں ماہ طلعت آرزوؤں کی بہاروں میں

دیگر

ہمہ تن پائے شکستہ ہمہ تن یاس ہوں میں	کس قدر روح شکن وحشت کی تنہائی ہے
چاندنی رات ہے ویرانہ ہے اور یادِ وطن	واہ کیا غمکدۂ دل میں بہار آئی ہے

عدیل

عدیل - خواجہ وحید الدین خاں - تفصیلی حالات دریافت نہ ہو سکے - کلام ذیل نذر احباب ہے -

خدا کے سامنے پرستش کیوقت رو رو کر
نہ روئیں نالۂ بلبل کو سن کے کیوں ایدل

گناہ دھوئینگے اس چشم اشکبار سے ہم
پھنسکے ہوئے ہیں بہت عشق گلعذار سے ہم

عدیل

عدیل - سید محمد عسکری کنتوروی جناب حبیب کنتوروی کے برادر خورد ہیں اور انھیں سے مشورہ سخن کرتے ہیں - ہیئت ہندسہ ریاضی وغیرہ حیدر آباد کے مدرسہ تعلیم المعلمین میں پڑھا - اس وقت سرکار نظام میں پولیس انسپکٹر ہیں بہت طبیعت دار شاعر ہیں مضمون اچھے پیدا کرتے ہیں - زبان کی صفائی کی طرف توجہ کم مگر خلاف محاورہ شعر نہیں کہتے - فراہم شدہ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے -

ہو رہا کس طرح کیونکر چین پائے عندلیب
ہے ازل سے موج گل زنجیر پائے عندلیب

کیا انقلاب دہر کا ڈر اہل وضع کو
بدلا کسی ہوا سے نہ گل کی قبا کا رنگ

چہرہ اداس حال پریشان دل نڈھال
بگڑا ہوا ہے آج ترے مبتلا کا رنگ

آئی اگر ہنسی بھی تو آنسو ٹپک پڑے
مدت سے ہے یہی دل درد آشنا کا رنگ

دن رات منتظر ہوں قیامت کا اس لئے
شاید ہو اُس میں بھی کوئی تیری ادا کا رنگ

گر کام لیں کبھی دل صبر آزما سے ہم
تیری جفا کو صاف بدل دیں وفا سے ہم

دیر و حرم کا پردۂ اسرار ایک ہے
عشق صنم میں پھر نہیں سکتے خدا سے ہم

یہ خاکساریاں یہ وفا یادگار ہے
آنکھوں کو مل رہے ہیں ترے نقش پا سے ہم

نہیں ہیں جوہر اصلی نمایاں تیغ قاتل میں
ہماری سخت جانی نقش ہے فولاد کے دل میں

کیا جانے اور کیا ہو پھر قتل گاہ میں
ہم تو شہید ہو گئے پہلی نگاہ میں

امید مغفرت نے کیا دل کو مطمئن
رحمت تری شریک ہے میرے گناہ میں

غش آیا جس سے طور پہ موسیٰ کو اے عدیل	جلوہ ہے اُس جمال کا میری نگاہ میں
سرگذشت اپنی بیاں کی ہے مگر ڈرتا ہوں	کل نہ یہ بھی کہیں مجنوں کا فسانہ ہو جائے
کیمیا ہوتی ہے اربابِ خرد کی صحبت	چار دن بیٹھے تو نادان بھی دانا ہو جائے
کام لو خلق و مروّت سے اگر دنیا میں	دوست بن جائے عدو غیر یگانہ ہو جائے

عراقی **عراقی**۔ ولی دکنی کے معاصرین میں سے تھے۔ نام نہ معلوم ہو سکا۔ ایک شعر عراقی کا یہ ہے:۔

جس کے نین جاری نہیں سو دل سرا ویران ہے	معمور ہو کیونکر بسے جس گاؤں میں پانی نہیں

عرش:۔ ضمیر الدین احمد صاحب شاگرد جناب تسلیم لکھنوی۔

جی ہی تو ہے اپنا جسے چاہا اُسے چاہا	دل ہی تو ہے ظالم جدھر آیا اُدھر آیا
خوب برہم کیا ہے کام مرا	بیخودی اب تو لے سلام مرا
پختگی میں بھی اپنی خامی تھی	عشق تھا اک خیال خام مرا
عرش کیونکر نہ قدر قیس کروں	عاشقی میں ہے وہ امام مرا
صورت تصویر ہم ذوق بیاں رکھتے نہیں	منہ تو رکھتے ہیں مگر منہ میں زباں رکھتے نہیں
وہ چمن اپنا نہیں جس میں کہ ہو خوف خزاں	جس کو بجلی پھونک دے وہ آشیاں رکھتے نہیں

عرش **عرش**:۔ منشی محمد احسن حسین دہلوی تلمیذ جناب جلال لکھنوی شگفتہ طبع فصیح البیان تھے۔ روزمرہ بہت صاف ہے۔ مضمون آفرینی کلام میں موجود ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

مجھ سے بل تیرے وہ اے گیسوؤں والے نہ گئے	پیار سے ہاتھ لگے ہیں کبھی ڈالے نہ گئے
زندگی بھر تیرے کوچے میں رہے مر کے گئے	ہم وہ آدم ہیں کہ جنت سے نکالے نہ گئے
راہ میں دید کے مشتاق تھے کتنے اون کے	جاتے جاتے بھی فقیروں کی دعا لے نہ گئے
مر گئے جب تو یہ دیکھا کہ جنازے اُٹھے	اُٹھ کے کوچے سے ترے چاہنے والے نہ گئے

عرشی **عرشی**۔ جناب امتیاز علی خاں صاحب ولد ڈاکٹر ممتاز علی خاں سنہ ۱۹۰۴ء میں بمقام

پیدا ہوئے۔ ابتداءً عربی و فارسی کی ضروری تعلیم حاصل کی۔ بعد کو انگریزی پڑھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں شعر و شاعری سے شوق تھا۔ چند غزلیں اور نظمیں لکھی تھیں جو کلام موصول ہوا۔ اس کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

تمکینِ عز و ناز سے اٹھتی نہیں نگاہ
اللہ رے نزاکتِ حسن و جمالِ دوست

پہلی سی اب وہ لذتِ دردِ جگر کہاں
اب روز و شب تلاشِ درِ چارہ گر کہاں

تھا مشغلہ کبھی دلِ ایذا پسند کا
اب چاشنیِ کاوشِ زخمِ جگر کہاں

معلوم ہیں بتوں کی تغافل شعاریاں
اب انتظارِ وعدہ شام و سحر کہاں

مانا کہ جذبِ دل ہے ذریعہ وصال کا
لیکن مجھے دماغِ نیازِ اثر کہاں

شوریدگیِ عشق کا ذمہ لئے ہوئے
آ۔ ساتھ اپنے حسن کی دنیا لئے ہوئے

صہبائے بیخودی سے تہی جامِ زیست ہے
آ۔ نرگسِ سیاہ کا مینا لئے ہوئے

ہونٹوں سے کوئی برقِ تبسم گرا کہ دل
مشتاق ہے متاعِ تمنا لئے ہوئے

تیری دلنشیں آنکھیں کاش دل میں رکھ لیتا
آہ انھیں بہت کچھ دخل کاوشِ نظر میں ہے

عرشی

عرشی: میر احمد حسین خلف مولوی اولاد حسن برادر کلاں امیر الامرا والاجاہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم شوہر شاہجہان بیگم صاحبہ والیہ بھوپال۔ ۳۰ برس کی عمر میں حج بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ جب بمقام بڑودہ ملک گجرات پہنچے یکایک عارضۂ اسہال میں انتقال فرمایا۔ سنِ رحلت ۱۲۷۰ھ ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے اور حضرت غالب سے مشورہ سخن کرتے۔ کلام فصیح و بلیغ ہے فضلا اور اہل اللہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ کلام جو کچھ دستیاب ہو سکا۔ اس کا انتخاب نذر ناظرین ہے

مغلوب ہیں سب اہلِ زباں میرے سخن سے
ہوں زلہ ربا غالبِ اعجاز رقم کا

اتنی ہی آرزو ہے ہمیں تجھ سے اے فلک
یہ آگ اک نہیں بجھتی ہووے جو ہاں نہ ہو

شعلۂ عشق وہ ہے جس سے زمانہ جل جائے
یوں تو پتھر کے بھی سینے میں شرر ہوتا ہے

عرشی

عرشی ۔ منشی سید محمد عبدالشکور صاحب ساکن ضلع پٹنہ شاگرد جناب شوق نیموی۔ کلام میں سوز اور لذت ہے۔ مضمون خوب پیدا کرتے ہیں۔ اور انداز بیان سے شعر کو اور زیادہ لطیف بناتے ہیں۔ افسوس ہے کہ زیادہ کلام نہ مل سکا۔ تین شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

کچھ اور رنگ ہے قاتل کا ہیرے ذبح کے بعد	کہ ایک ہاتھ جگر پر ہے ایک خنجر پر
جو مے کو کہتے ہیں واعظ حرام لے عرشی	قیامت آئے تو پوچھیں ہم ان سے کوثر پر
زاہدا ابھی کدورتِ دل تیری صاف ہو	تھوڑی سی مے جو مانگ کے پی لے کلال سے

عروج

عروج ۔ منشی عبدالکریم صاحب بریلوی تلمیذ حضرت داغ۔ طبیعت میں آمد زیادہ ہے۔ شعر میں سلاست اور پاکیزگی ہوتی ہے۔ زبان بھی صاف اور شستہ ہے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

سختیاں جھیلے کہاں تک دل ہر کچھ پتھر نہیں	موت ہی آجائے یارب وہ اگر آتے نہیں
دلمیں آجاتے ہیں اور آنکھ کو نہیں پھرتے سنتے نہیں	بے تکلف مجھ سے ہیں پرشکل دکھلاتے نہیں
دل کو بہلاؤ ذرا اٹھو ہنسو بولو عروج	رنج و غم میں آدمیت سے گزر جاتے نہیں

عروج

عروج ۔ مولانا عبدالحق کانپوری۔ شاگرد حضرت تجلی مرحوم ثالثی۔ آپ عرصہ تک مشن سکول کانپور میں پرشین ٹیچر رہے ہے۔ حضرت ناسخ مغفور کے رنگ کلام کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اور خود بھی اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ شاعری کا بہت شوق ہے۔ اکثر اپنے مکان پر بھی مشاعرہ کرتے ہیں۔ اپنے استاد سے بہت عقیدت رکھتے ہیں چنانچہ ایک مقطع میں فرماتے ہیں۔ ع

اپنے سخن میں فیض تجلی کا ہے عروج	حاصل فروغ خدمت استاد سے ہوا

آپ انداز قدیم کے دلدادہ ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نوادر کی مثالیں آپ کے یہاں بکثرت موجود ہیں۔ آپ کی چند غزلیں ایک مختصر رسالہ کی صورت میں چھپی ہیں

جس کا نام عشق کی چھیڑ چھاڑ رکھا ہے۔ کلام ملاحظہ ہو۔

یہ منظر بھی رہیگا یادگار عالم فانی
لحد پر پھول رو رو کر چڑھائے شمع تربت نے

عقیدت کی کرشمہ سازیاں تھیں طور پر موسےٰ
پہنچینگے آستاں پہ بھی صبر سے کام لیجئے

گڑے جاتے ہیں ان رسوائیوں سے ہم تو مرقد میں
پھونکدے روح اک نئی قالب مست حال میں

اپنی نگاہ ناز تو ڈال نہ قلب غیر پر

آیا خیال اس بُت کافر کا صبحدم
مانگی دعائے مرگ بہت کچھ شب فراق

اندھیر اچھا گیا جب حضرت موسیٰ کی آنکھوں میں
اہل نظر سے چھپ کے تو جائیگا حشر میں کہاں

ممکن ہے نام کے لئے باقی نشاں رہے
گو ہم کو بیخودی میں تھی افتادگی نصیب

کہتے ہیں گر کے اشک ندامت یہ حشر میں
زنجیر تو اسیروں نے پہنی ہے شوق سے

دو گز زمیں کیواسطے رگڑی تھیں ایڑیاں

نظر بھر کر کسی کو دیکھ لینا اور مرجانا
وگرنہ اک ہنسی ہوتی کسی بیکس کا مرجانا

جسے تم جلوہ سمجھے تھے تمہارا نور ایماں تھا
کوچۂ یار میں عروج کیجئے ہائے ہائے کیوں

گذرنے والے تربت پر تمہارا نام لیتے ہیں
گیسوئے مشک عنبریں عمر تری دراز ہو

اہل نظر کو چاہئے صاحب امتیاز ہو

یارب غضب ہوا کہ نماز سحر گئی
آتی نہیں ہے ہجر میں کیا موت مر گئی

پکارا طور پر جلوہ کہ دیکھی روشنی میری
حسن ازل تو کس لئے آج نقاب پوش ہے

آہ رسا سے دب کے اگر آسماں رہے
تھامے ہوئے تجھے تو دل ناتواں رہے

وہ آرہی ہے رحمت غفّار دیکھئے
ہوتی ہے اب یہ کس کو سزا اور دیکھئے

اک لاش ہے پڑی پس دیوار دیکھئے

عریاں **عریاں**۔ میاں غلام محمد غوث سوائی خلف شاہ عالم خاں سوائی۔ جناب عریاں مدراس کے باشندے اور تجارت پیشہ تھے۔ نواب رؤف احمد خاں پرتو سے تلمذ تھا سنہ ۱۳۰۵ھ میں ان کا ایک مختصر سا دیوان مسمّٰی تیغ عریاں شائع ہوا تھا۔ اسکے چند سال بعد انتقال ہو گیا۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ طبیعت موزوں پائی تھی۔ یہ بھی پایا جاتا ہے

کہ ناسخ کے تتبع کی کوشش میں رہتے تھے۔ کلام بے نمک ہے۔ پھر بھی اب سے نصف صدی قبل مدراس میں رہ کر جو کچھ کہہ گئے غنیمت ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

ہوا ہے جب سے سودا مجھ کو اُس زلفِ پریشاں کا
مرے دستِ جنوں سے چاک ہے دامن بیاباں کا

تپِ دوریِ لیلیٰ نے بڑھائی سوزشِ مجنوں
بنے گا حال پتلا موم سے بھی سنگِ طفلاں کا

ہے اثر کس کے خیالِ چہرۂ پر نور کا
آہ آتشبار میں عالم ہے برقِ طور کا

قیامت میں خدا کے آگے اے دل
کسی کا ہاتھ ہے دامن کسی کا

کہنے لگے سب چاند نے کیا کھیت کیا ہے
آیا مہِ تاباں جو سرِ شام ہمارا

قلقلِ مینا سے آتی ہے صدا گھنگرو کی آج
رقصِ ساقی بزم میں کرتا ہے جو طاؤس کا

پھر بہار آئی ہے پھر لطفِ چمن تازہ ہے
دل میں پھر جوشِ جنوں سلسلہ جنباں ہوگا

تھم تھم کے نہ کرتا ہو مرا ذکر وہ عُریاں
رہ رہ کے جو ہوتا ہے مجھے دردِ جگر آج

لبِ رنگینِ جاناں کی جو ہے تاثیر رونے میں
تصدق ہوتے ہیں لعلِ یمن ہر قطرۂ خوں پر

سر اُٹھانا ظالموں کا ہے سیہ بختی کی شکل
وقتِ گل ہونے کے ہوتا ہے بہت روشن چراغ

گلرخانِ گلشنِ ہستی پہ آجاتا ہے دل
کب تلک سمجھائیں عُریاں ایسے دیوانے کو ہم

صدمۂ ہجراں سہا جاتا نہیں
موت کا پیغام بھی آتا نہیں

یار ہے یوں زمرۂ اغیار میں
جس طرح گل ہو ہجومِ خار میں

سیر کر میرے دل پہ داغ کی
اے گلِ تر خاک ہے گلزار میں

چڑھ گیا دیکھتے ہی نشۂ صہبا مجھ کو
مست کرتی ہے تری نرگسِ شہلا مجھ کو

زندگی کا ہے مزہ یار ہو جب یار کے پاس
بے ترے ایک سے جینا ہو کہ مرنا مجھ کو

کعبہ سے سروکار نہ مطلب ہے حرم سے
ہم اس بتِ بے پیر کے ہیں چاہنے والے

مرا بزم میں سُن کے افسانۂ غم
پریشان ہوئے قصہ خواں کیسے کیسے

عزیز

عزیزؔ ۔ قاضی عزیز الدین صاحب شاگرد و خلف قاضی ممتاز حسین صاحب ساکن

پہلی پھبت کلام میں سوا صفائی کے اور کوئی بات نہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

اب تو آنا کھو نہیں مری پھرتا ہی دن بھر کوئے یار
ایک دن وہ تھے کہ میں پھرتا تھا کوئے یار میں

مر کے میں مل جاؤں زندوں میں اگر آجائے موت
موت تو یہ ہے کہ جیتا ہوں فراق یار میں

عزیز

عزیزؔ۔ نواب عبدالعزیز خاں خلف نواب محمد سعادت یار خاں نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہادر والی روہیلکھنڈ عدالت دیوانی فرخ آباد میں وکالت کرتے تھے۔ عبدالملک ممتاز کے شاگرد تھے۔ شعر خوب کہتے تھے۔ طبیعت دار اور ذی استعداد تھے۔ دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ۱۲۷۵ھ میں تذکرہ سخن شعرا کی تالیف کے وقت حیات تھے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

نظارۂ جمال سے سرشار ہو گیا
مجھ کو شراب شربت دیدار ہو گیا

کرتے تھے دعا ہم ترے ملنے کی خدا سے
کعبہ میں صنم نام ترا ورد زباں تھا

دیکھ جا اپنے مریض ہجر کو ہنگام نزع
عمر بھر کی ہے تلافی اک نگاہ ناز میں

نملا خانۂ دنیا میں تو آرام عزیزؔ
آؤ اس گھر سے چلیں اور کوئی گھر دیکھیں

غضب ہے تو کہ تو نے اک ادا میں
جگہ کر لی دل دیر آشنا میں

عجب شیریں ہے آب تیغ قاتل
حلاوت یہ کہاں آب بقا میں

صیاد کے جو دام محبت میں ہے اسیر
بلبل کو اب پسند قفس ہے چمن نہیں

روز و شب شورش و کاہش میں بسر کرتے ہیں
رشک داغوں سے مرے شمس و قمر کرتے ہیں

ادب سے خون رکا ہے گلوئے بسمل میں
کہ پڑ نہ جائے کہیں داغ تیغ قاتل میں

نیرنگ قیامت سے نہ ہو گی مجھے حسرت
میں ایسے تماشے تو بہت دیکھ چکا ہوں

رات فرقت کی بسر ہوتی نہیں
یا الٰہی کیوں سحر ہوتی نہیں

رات دن کعبہ ابروئے صنم دیکھتے ہیں
ہم تو بتخانے میں بھی سیر حرم دیکھتے ہیں

لئے پھرتی ہے اڑائے ہوئے صحرا صحرا
کیا ہوا ہے کہ بھری ہے سر سودائی میں

وُہ ہدف مجھکو کرے یہ شوق میں تاثیر ہو
آہ حسرت کی جگہ سینہ میں ان کا تیر ہو

عزیز اپنے حریم دل کے ہم تو گرد پھرتے ہیں
یہ ہے کعبہ مبارک شیخ کو کاشی برہمن کو

دیکھا جو عزیز اپنے دل صاف میں ہم نے
آیا وہ نظر جام جہاں بیں میں نہ جسم کو

سوا تیرے نہ کوئی یاد آئے آرزو یہ ہے
ستم وہ کر کہ ظالم بھول جاؤں جور گردوں کو

آمد یار سے خوش ہے دل ناتجربہ کار
نہیں واقف کہ قیامت دم رخصت ہوگی

دشت جنوں میں پاؤں ادب سے رکھ اے عزیز
پامال ہو نہ جائیں کہیں خار راہ کے

ہے میری آبلہ پائی سے دشت رشک چمن
نہیں گلوں میں وہ رنگت جو نوک خار میں ہے

فراق میں تو بجا پیچ و تاب ہوتا ہے
وصال یار میں کیوں اضطراب ہوتا ہے

یا خدا دل میں غم یار کی مہمانی ہے
شرم رکھ لے کہ بہت بے سر و سامانی ہے

تم جو آجاؤ دلربائی پر
کون دل کو سنبھال سکتا ہے

عزیز — **عزیز** منشی سید عبدالعزیز ناگپوری وکیل بھوپال۔ موزوں طبع اور پاکیزہ خیال شاعر ہیں۔ یہ چند اشعار نذر ناظرین ہیں۔

تری صورت پہ شیدا ہیں ہزاروں
ادا کر شکر صورت آفرین کا

شوخی کا جوانی میں یہ اصرار ہے ان سے
کھل کھیل کہ اب لطف نہیں شرم و حیا میں

کیونکر نہ مسخر دل عشاق ہوں ظالم
جادو ہے بلا کا تری ایک ایک ادا میں

نہیں کونین میں اس کا ٹھکانا
گرائیں وہ جسے اپنی نظر سے

عزیز — **عزیز** اعزالدین عثمانی بدایونی۔ قدرت اللہ شوق اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ جوان سعادت مند اور ابھی طالب علم ہیں۔ آپ کی طبیعت موزوں ہے۔ اور تاریخ نکالنے میں مہارت کامل ہے۔ یہ ان کا کلام ہے۔

قطعہ

صبح ہوتے ہی لے کے آئینہ
منہ لگا دیکھنے وہ کافر کیش

میں نے اُس دم کیا یہ اُس سے سوال
کہنے لگا سنی نہیں یہ مثل

ہیں بھی دیدار پاؤں کچھ کم و بیش
اولاً خویش بعدہٗ درویش

عزیز

عزیز۔ مولوی محمد عبدالعزیز دہلوی مہین پور مولانا امام بخش صہبائی۔ علمی استعداد معقول تھی۔ فن سخن میں اپنے پدر عالی قدر کے شاگرد تھے۔ ایام غدر میں ظفریاب لشکر کے ہاتھوں بے گناہ شہید ہوئے۔ طبیعت کا رنگ نرالا تھا۔ بہت پُر لطف اور دل میں اُتر جانے والے شعر کہتے تھے۔ خیالات میں باریکی ہے۔ زبان صاف ہے۔ بہم رسیدہ کلام کا انتخاب پیش احباب ہے۔

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا
ہم عاصیوں کا بار گنہ سے جھکے ہے سر

جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا
اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا

نہیں ہے رحم و مروت جو تجھ میں خبث نہ ہو
ذرا خدا ہی کا کچھ تیرے دل میں درد ہوتا

جب معنی وحدت ہوئے ظاہر تو یہ جانا
یہ شیخ و برہمن میں جو جھگڑا تھا بد نہیں تھا

کٹ کٹ کے خون آتا ہے آنکھوں سے بار بار
خنجر رکھا ہے پہلو میں میرے بجائے دل

بیقراری کا کیا سبب ہے عزیز
کہیں دل تو نہیں لگا بیٹھے

عزیز

عزیز۔ مرزا عزیز الدین گورگانی مرحوم از اولاد شاہ عالم ثانی۔ حضرت احسان مغفور سے تلمذ تھا۔ اچھے شاعر تھے۔ کلام میں ندرت ہے۔ اشعار ذیل میں ان کی فکر کا نمونہ ہیں۔

میں یہ حیران ہوں عزیز و آہ یہ کیا ہو گیا
بیٹھے بیٹھے عشق کا آزار کیسا ہو گیا

تو جو خنجر کو ادھر قاتل اٹھا کر رہ گیا
میں ادھر حسرت سے اپنا سر جھکا کر رہ گیا

کہوں ہمدم کیا کہ اس دل کے ہاتھوں
نہ تھا دیکھنا سو وہ لاچار دیکھا

عزیز

عزیز۔ عبدالعزیز رائٹر رہیلنتھ آفس شہر کلکتہ ولد منشی کرامت اللہ شاگرد ناسخ۔ کلکتہ میں تعلیم و تربیت پائی وہیں زیادہ قیام رہا۔ کلام میں مضمون آفرینی کو زیادہ دخل تھا۔ اطلف زبان کو کم پسند کرتے تھے۔ پُرگوئی کا یہ عالم تھا کہ اوائل عمر میں صاحب دیوان

ہو گئے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

اُس شوخ پر جفا پہ کسی کا جو آئے دِل
صدمہ ہزار لاکھ جفائیں اُٹھائے دل

ذرّہ افشاں یہ نہیں ہیں زلفِ عنبر فام میں
تارے چھٹکے ہیں مقرر یہ سوادِ شام میں

کرتے ہیں یوں مریضِ محبّت کا وُہ علاج
دیتے ہیں زہر گھول کے مجھ کو دوا کے ساتھ

خواب میں ہمکنارِ دلبر تھا
مجھ کو ہے ہے جگا دیا کس نے

تعجب سب کو ہے اس فکر میں سارا زمانہ ہے
مہِ نو ابر میں ہے یا کہ اُن زلفوں میں شانہ ہے

آج سر خنجرِ بُرّاں سے جدا ہوتا ہے
مجھ پہ قاتل کا جو احساں تھا ادا ہوتا ہے

عزیز۔ پنڈت شام ناتھ صاحب خلف اکبر رائے صاحب پنڈت منوہر ناتھ صاحب زتشی دہلوی اکونٹنٹ محکمہ پبلک ورکس پنجاب۔ پنڈت صاحب موصوف فاضل اجل عالم اکمل پنڈت رام کشن صاحب بسمل مرحوم کے جو پُرانی دہلی کالج میں ماسٹر تھے۔ نواسے تھے۔ علوم رسمیہ سے بخوبی ماہر تھے۔ بچپن سے فنِ سخن کا ذوق اور شعر گوئی کا شوق تھا۔ خلق و مروت و شرافت و زندہ دِلی میں فرد تھے۔ افسوس کہ عالم شباب میں بعمر ۳۲ سال انتقال کیا۔ کلام میں سادگی تھی تصنع سے بہت دُور تھے۔ روزمرّہ زیادہ لکھتے تھے۔ یہ کلام ہے۔ عزیز

دلبر تو ہم نے مانا ادھر سے نکل گیا
پہلو سے دل بتاؤ کدھر سے نکل گیا

غنچۂ دل مرا کھلاتا جا
شکل بہرِ خدا دکھاتا جا

عزمِ رخصت اگر مصمّم ہے
مجھ کو راہِ عدم بتاتا جا

ہائے تجھ بن نہیں ہے کل پڑتی
جا یہ جھگڑا مگر چکاتا جا

بیکلی ہے عزیز کو پیارے
اس کی تدبیر کچھ بتاتا جا

آنکھ گو مست ہے بدمستوں کی
نیک باطن میں تو بیدار ہے دل

گئی افسوس جوانی تری برباد عزیز
کچھ نہ سمجھے کہ یہ افتادہ مصیبت کیا ہے

عزیز۔ مرزا یوسف علی خاں المخاطب بہ سراج الشعرا سلطان الذاکرین اصلی وطن بنارس عزیز

تھا۔ مگر دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مرزا غالب کے عزیز و تلمیذ تھے۔ مرثیہ گوئی کا بڑا شوق تھا۔ انیس اور دبیر کے مرثیوں میں اکثر جگہ جا و بیجا غلطیاں نکالی تھیں۔ عرصہ دراز تک حضرت غالب کی خدمت میں رہے انہیں کے توسط سے قلعہ میں رسائی ہوئی۔ احترام الدولہ حاذق الزمان حکیم احسن اللہ خاں صاحب ثابت جنگ نے حضرت بہادر شاہ سے بہ نذر مرثیہ و قصیدہ خلعت چار پارچہ معہ گوشوارہ و خطاب سراج الشعرا سلطان الذاکرین دلوایا تھا۔ یہاں ان کے متعلق ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

قصہ شہزادہ ممتاز کو فارسی سے زبان سلیس اردو میں سید ظہیر الدین حسین صاحب ظہیر دہلوی نے بفرمائش حکیم صاحب موصوف ترجمہ کیا تھا۔ جس کے صلہ میں شاہ دہلی نے خطاب و خلعت عنایت فرمایا تھا۔ اتفاق سے وہ قصہ حکیم صاحب سے بندا لال عطار چھاپنے کے لیے لے آئے اور مرزا صاحب کے حوالہ کیا کہ روزمرہ درست کر دیں ۳۵ روپیہ اجرت کے ٹھہرے۔ حضرت نے قصہ مذکور کو گھر لیجا کر جا و بیجا خوب اصلاح کی جب اپنے زعم میں عیوب و نقائص سے پاک کر چکے لالہ صاحب کو دے آئے۔ ان سے لیکر جناب ظہیر نے بھی ملاحظہ کیا۔ اور ایک کاغذ پر جو جو غلطیاں سمجھکر مرزا صاحب نے اصلاح دی تھی اس کو اور اپنے ترجمے کو بطور محضر لکھ کر فصحا و بلغائے دہلی کو دکھایا۔ ازراہ اتفاق سب نے میر صاحب کے محاورات کو درست و صحیح قرار دیا۔ اب میر صاحب کا ارادہ ہوا کہ بذریعہ اخبار و خطوط اہل لکھنؤ سے اس کی تصدیق کرائیں۔ مرزا عزیز نے جو سنا فوراً ان کے پاس آئے اور منت کہا کہ میں غریب آدمی ہوں۔ جو کچھ ہوا ازراہ ضرورت ہوا۔ آپ معاف فرمائیں۔ میر صاحب نے مروت کی رو سے درگذر کی اور وہ محضر چاک کر ڈالا قصہ مختصر ان کے مزاج میں کسی قدر مراق تھا۔ بڑے پُر گو تھے۔ آخر عمر میں بتلاش روزگار بھوپال گئے وہیں ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا۔ ان کے شاگردوں میں سیف الحق ادیب مرحوم وہ شاگرد تھے۔ کہ جن کو فخر استاد کہا جائے تو بجا ہے۔ غزلخوانی کا ڈھنگ بہت اچھا تھا

کلام میں رنگینی تھی۔ شعر میں بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ آپ کا کلام بہت ہی کم مل سکا۔ جو کچھ دستیاب ہوا نذر ناظرین ہے۔

بدطالعی سے نیک نہ ہوگا مآل کار / بگڑی میں کوئی کام بنایا نہ جائے گا
کہتے ہیں ہم سے جا بیگی معشوق کی صفت / گر تم کو بیگناہ ستایا نہ جائے گا
نقشِ وفا اگرچہ خداداد کیوں نہ ہو / لیکن دل صنم میں جمایا نہ جائے گا
کیا کہوں کوچہ قاتل میں کیا کیا جا کر / ہمنشیں خاک میں ملنا تھا مجھے مل آیا
باغ میں سنکر غزلخوانی مری / بلبل شیدا ہے دیوانی مری
ہو گئے شوق کو سوئے یار میں خاک / یہ نہ دیکھا ہوا کدھر کی ہے

عزیزؔ۔ جناب محمد یوسف حسین صاحب حنفی شاگرد جناب داغِ دہلوی شگفتہ طبع اور پاکیزہ بیان شاعر ہیں۔ اپنے استاد کے پیتو پر چلتے ہیں۔ طبیعت میں آمد کے باعث رنگینی ہے۔ استعارہ اور تشبیہات کی خاردار جھاڑیوں سے حتی الامکان اپنا دامن بچاتے ہیں شعر صاف کہتے ہیں۔ اور صفائی کلام کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جو کچھ کلام ان کا مل سکا پیش احباب ہے۔ عزیز

آج پھر وصل کی شب ذکر عدو کا نکلا / پھر وہی قصہ چھڑا پھر وہی جھگڑا نکلا
مل گئے خاک میں ہم خاک بھی برباد ہوئی / لیجئے اب تو غبار آپ کے دل کا نکلا
تو تو کہتا تھا کہ دل میں نے چرایا ہی نہیں / ارے او شعبدہ گر دیکھ یہ اب کیا نکلا
سختیاں ہجر کی کھینچیں تو مجھے قدر ہوئی / ملک الموت مرا چاہنے والا نکلا
جگر کے ساتھ نہ اڑ جائے دل بھی تیروں سے / ذرا خدا کے لئے دیکھ بھال کر دیکھو
مری وفا کا مرے شوق کا تمنا کا / یقین نہ آئے تو تم امتحان کر دیکھو
برا نہ مانو تو اک بات ہم کہیں تم سے / بروں کے ساتھ کوئی دن بھلائی کر دیکھو
جب چلا چھوڑ کر مجھے بسمل۔ / ہنس دئے زخم منہ پہ قاتل کے

عزیز

عزیز:۔ منشی مہاراج سنگھ مرحوم دہلوی شاگرد شاہ نصیر دہلوی قوم کایستھ۔ آپ نے اپنے استاد مرحوم کا پراگندہ کلام بڑی محنت سے جمع کر کے کلیات قریب ۱۰۰ جزو کے مرتب کیا تھا۔ ایام غدر میں قضا کی خود صاحب دیوان تھے۔ اپنے زمانہ کے اعتبار سے اچھے شاعر تھے۔ دیوان ان کا اب کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔ جو دو چار شعر مختلف بیاضوں سے ہاتھ لگے درج ذیل ہیں:۔

ہوا نہ صاف وہ آئینہ رو کبھی ہم سے	سدا ہماری طرف سے اُسے غبار رہا
جام مے گلرنگ سے واقف نہیں ساقی	غنچہ کی طرح پیتے ہیں خون جگر اپنا
لیکے نقد دل کبھی جو ایک بوسہ بھی نہ دے	اے عزیز اُس ہفت بر سے کسطرح سودا بنے
ضعف سے ہر رگ تن جس کی ہو تار بستر	کیونکہ وہ بستر بیماری سے اُٹھے بیٹھے

عزیز

عزیز:۔ جناب حافظ عبد العلی صاحب ولد شیخ محمد جان صاحب۔ آپ کے آبا و اجداد لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ آپ ۱۸۸۰ء میں بمقام محلہ یحیٰی گنج شہر لکھنؤ پیدا ہوئے جب آپکی عمر نو برس کی تھی آپ اپنے والدین کے ساتھ کانپور میں قیام پذیر ہوئے سب سے پہلے آپ نے حافظ ناصر خاں صاحب سے کلام مجید حفظ کیا۔ اُس کے بعد قاری عبد الحق صاحب سے فن تجوید حاصل کر کے جناب حکیم محمود الحق صاحب سے فارسی پڑھتے رہے۔ اس وقت جناب عزیز مسجد محمد تقی میں امام ہیں۔ پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ ۱۸۹۷ء میں آپ نے حضرت اطہر کانپوری سے تلمذ اختیار کیا۔ جناب قضا و قدر نے استاد کا سایہ سر سے اُٹھا لیا تو کچھ عرصے آپ نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ مگر احباب کے کہنے سننے سے پھر شعر کہنے لگے۔ اس زمانہ میں حضرت حکیم ناطق لکھنوی کانپور تشریف لائے ہوئے تھے۔ ایک مشاعرہ میں شرکت ہوئی۔ آپ نے جناب ناطق کا کلام سنا اور باقاعدہ شاگرد ہو گئے۔ اس وقت سے آپ اپنا بہت وقت جناب ناطق کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ آپ کی زبان شستہ ہے اور تخیل پاکیزہ مولانا ناطق کے شاگردوں میں آپ کا درجہ ممتاز ہے۔

کلام کا نمونہ یہ ہے :-

چاہیئے حفظِ مراتب کو نہ رسوا کرنا
ورنہ دشوار نہ تھا قطرہ کو دریا کرنا

ہمت جوشِ جنوں کا یہ تقاضا ہے عزیزؔ
خاک میں مل کے ہر اک ذرّے کو صحرا کرنا

جلوہ رنگیں میں اُسکے سب کی نظریں غرق ہیں
دیکھنے والا ہے کون اب مجھ گریباں چاک کا

پھِل آبادی سے اب اے عشق ویرانے کی سمت
دیکھ لوں رُخ دوسرا دنیائے وحشت ناک کا

امتحان ضبط اگر دنیا نہ ہوتا اے عزیزؔ
روک دیتا دورا ابھی میں گردشِ افلاک کا

بڑھاتا ہوں تصور جس قدر میں چشمِ قاتل کا
ہُوا جاتا ہے گہرا زخم اتنا ہی مرے دل کا

ضعف سے نالہ مرے سینے میں رُک کر رہ گیا
ٹکڑے ٹکڑے ہو کے گویا دل میں نشتر رہ گیا

مفہوم تم سمجھ نہ سکے ایک لفظ کا
کیا مدعائے دل کوئی قدرت کا راز تھا

نہ اُلجھو دامنِ صیاد سے تم اے کانٹو
چمن میں اتنی ہی دن میرا آب و دانہ تھا

امتیاز رند و زاہد بادۂ غم میں نہیں
سب کو پینا ہی پڑے جب دور میں جام آگیا

قطرہ قطرہ جوش میں جامِ شراب
ذرّہ ذرّہ میکدہ کا آفتاب

عشق کا جو نقطہ ہے وہ ناپسند
حسن کا جو نقطہ ہے وہ انتخاب

لیکے آیا ہوں حیاتِ بے سکوں
میری ہستی کیا ہے شرحِ اضطراب

ہر نفس ہے روح فرسا اے عزیزؔ
زندگی کا موت کیا دیگی جواب

تُو بھی تو دیکھ ذرا جذبِ نگہ کی تاثیر
دل تو میں دیکھ رہا ہوں ترے پیکاں کے قریب

ہم نفس ایک نہ اک ہم کو بھی مل جاتا ہے
شمع رکھ لی ہے جلا کر دلِ سوزاں کے قریب

گو اس کا شکوہ کرنے آیا ہے دم لبوں پر
لیکن زبان میری خاموش ہے دہن میں

ہم کو تقسیمِ غمِ عشق کی منظور نہیں
اپنے صدمات کا تنہا ہی اثر لیتے ہیں

عہدِ فلک میں جان غنیمت قفس کو تو
اب اس کو بھول جا کہ مرا آشیاں نہیں

صیاد کی نگاہ میں اللہ ری کشش
پھر میں پلٹ کے جا نہ سکا آشیانے میں

میرا سکوت کیا ہے شرحِ غمِ نہاں ہے
کہنے کو لفظ ہے اک سمجھو تو داستاں ہے

دل کی کدورتوں نے دھندلا کیا ہے اس کو
انسان کی ورنہ ہستی آئینہ جہاں ہے

ہر گوشۂ فضا میں تنکے پہونچ رہے ہیں۔
آزاد میرے بدلے اب میرا آشیاں ہے

پھر اثر حادثے زمانے کے
واقعے ہیں مرے فسانے کے

جلتے ہیں راستے زمانے کے
رہنما ہیں اُس آستانے کے

دیکھ لو مجھ کو دیکھتا ہوں اگر
انقلابات اس زمانے کے

رونا آتا ہے رو نہیں سکتے
یہ نتیجے ہیں دل لگانے کے

اس نے بھی پھیر لی نگاہ عزیز
اب تو قائل ہوئے زمانے کے

سامنے اُن کے نہ ذکرِ عشق آنا چاہیئے
یہ مرض اپنے معالج سے چھپانا چاہیئے

کوئی دیکھے تو تجلی اس کی ہر محفل میں ہے
روشنی ہر آنکھ میں ہے نور ہر اک دل میں ہے

جز غم کے مسرت کا یہاں کام نہیں ہے
یہ دل ہے مرا انجمن عام نہیں ہے

لگا کے حسن سے لو روح تن میں آئی ہے
یہ شمع جلنے کو اس انجمن میں آئی ہے

ذرا جی بھر کے تجھ کو دیکھ لوں اے صبح کے تارے
کہ اک تو ہی مرے ڈوبے ہوئے دل کی نشانی ہے

آگئی اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔
بس بس اے گریہ یہیں تک سرحدِ تاثیر ہے

آرہا ہے کوئی شاید لے سوادِ شامِ غم
دیکھتا ہوں میں کہ اب تارے ضیا دینے لگے

میری مرگ و زیست کیسی کشمکش میں پڑ گئی
یہ دعا کا وقت تھا اور تم دوا دینے لگے

عزیز:۔ شاہ عزیز اللہ۔ عہدِ قدیم کے سخن سنج تھے۔ جن کے حالات پردۂ راز میں ہیں۔ تذکرہ چمنستان شعرا سے یہ دو شعر نقل کئے جاتے ہیں:۔

ڈرتا نہیں ہوں نوک کٹاری کے زخم سے
بانکی نگاہ دیکھ تری ہل گیا ہوں میں۔

کان نمک ہوا ہوں ترا حسن سبز دیکھ
لونی برہ کی جب سے لگی گل گیا ہوں میں

عزیز:۔ محمد عزیز الحق ہاشمی ساکن محلہ کمھار اعظم آباد خلف مولوی شیخ اکرام الحق مرحوم

عمر تخمیناً ۵۵ یا ۵۶ سال ہوگی۔ استعداد علمی معقول ہے۔ آپ ایک عالی خاندان رئیس ہیں شعروسخن سے بہت دلچسپی ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی دخل ہے۔ مولانا شاد عظیم آبادی کے شاگردوں میں سے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

عجب کیا صبح کو شکوہ کرے نرگس جو سوسن سے
نہ لگنے پائیں آنکھیں رات بھر بلبل کے شیون سے

تن خاکی کو میری روح نے آخر گرا چھوڑا
خدا کا شکر ہے یہ بوجھ اترا میری گردن سے

ہیں آنکھیں کو چۂ جاناں کی خوگر کب بہلتی ہیں
بہار ارغواں و لالہ و نسرین و سوسن سے

مرا مشرب ہے رندانہ مرا ایمان خالص ہے
ملا کرتا ہوں یکساں بے تحاشہ شیخ و برہمن سے

نہ چھوڑا اپنا پیچھا بعد مردن وحشت دل نے
ہماری خاک بھی لپٹی رہی صحرا کے دامن سے

عدو مرنے پہ بھی دل کے دکھانے سے نہ باز آیا
بہت رویا عزیز اک دن جو گزرا اسکے مدفن سے

عزیز۔ جناب مرزا محمد ہادی لکھنوی۔ ابن مولانا مرزا محمد علی مؤلف نجوم السما۔ ابن مرزا صادق علی۔ پانچ چھ پشت تک ان کے بزرگ کشمیر میں سکونت پذیر تھے۔ وہاں سے ہندوستان آئے۔ اور لکھنؤ کو اپنا مستقر قرار دیا۔ کہتے ہیں۔ کہ حضرت عزیز کا سلسلۂ نسب سادات کرام سے ملتا ہے۔ آپ کا خاندان علمی مذاق سے بہرہ ور تھا۔ آپ کے اساتذہ کی ذیل میں مولانا سید محمد صاحب۔ علامہ مفتی محمد عباس صاحب شوستری اور مولانا سید حامد حسین جیسے بزرگوں کے نام گنائے جاسکتے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی حکیم محمد مہدی صاحب لکھنؤ کے بہترین طبیبوں میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت عزیز کی ولادت ۵ ربیع الاول سنہ ۱۳ھ مطابق ۱۸۸۲ء ہوئی۔ اور ۲ر اگست ۱۹۳۵ء کو انتقال ہوا۔

بچپن ہی میں والد کا سایہ عزیز مرحوم کے سر سے اٹھ گیا اور تعلیم و تربیت کا بار ان کی والدہ ماجدہ کے ذمہ آپڑا۔ اس بزرگ خاتون کی تربیت و پرداخت اور جناب عزیز کی ذہانت اور فطانت ان سب نے مل ملاکر عزیز کو فرد کامل بنادیا شاعری

کا جوہر جو قدرت سے ودیعت ہوا تھا۔ ان کو کمال پر لے اُٹھا۔ زمانہ اہل کمال کا دوست نہیں بنتا۔ عزیز مرحوم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ابتدا میں لکھنؤ کے ممتاز و مخیر رئیس مرزا بہادر عباس علی خاں مرحوم نے ان کو اپنا استاد بنایا۔ اور معتمد و حاشیہ نشین بھی جب تک مرزا بہادر زندہ رہے۔ عزیز مرحوم دنیا کی فکروں سے بے نیاز ہو کر اپنے ذوق کی تکمیل میں مصروف رہے۔ اس زمانہ کو عزیز کی شاعری کے شباب کا عہد کہنا چاہیے۔ مرزا بہادر کے بعد عزیز مرحوم کو اسباب معیشت بہم پہنچانے کی فکر ہوئی اور امین آباد ہائی سکول میں فارسی کی مدرسی کرنی پڑی۔ تیرہ چودہ برس تک یہ سلسلہ رہا۔ ابھی سکول ہی میں تھے۔ کہ صحت جسمانی نے جواب دے دیا۔ اور مختلف شکایتوں نے آگھیرا آخر اس ملازمت سے دست بردار ہونا پڑا۔ بہت مدت نہیں گزری کہ مہاراجہ محمود آباد یعنی راجہ سر علی محمد خاں صاحب مرحوم نے جوہر شناسی سے کام لے کر عزیز مرحوم کو اپنے ولیعہد خان بہادر راجہ امیر احمد خاں صاحب کا نگراں مقرر کر دیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ان کو کتب خانے کی خدمت سپرد ہو گئی۔ جس پر وہ اخیر دم تک مامور رہے۔

راقم السطور کے مشاہدے کے مطابق عزیز مرحوم نے نہایت سلجھی ہوئی اور خاموش طبیعت پائی تھی۔ ان میں خودداری کمال درجہ کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی تمکین کی جھلکی ان کے کردار میں ضرور تھی۔ راقم کے مہربان حکیم آشفتہ صاحب لکھتے ہیں "چونکہ شاعر فطرتاً ذکی الحس اور نازک مزاج ہوتے ہیں۔ اسلئے ایک حد تک ان میں نازک مزاجی ضرور تھی۔ جو خودداری کے ساتھ مل کر کبھی غرور اور تکبر کا دھوکا دیتی تھی" مرحوم کے مزاج کی یہ تشخیص حکیم صاحب موصوف نے درست کی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہو گی اس ہنگامہ آرائی کی جس کا ہدف بعض حضرات نے عزیز مرحوم کو بنایا۔

عزیز مرحوم کا پایہ اردو شاعری اور ادب میں اعلےٰ تھا۔ ادب کی اشاعت اور مذاق عامہ کی اصلاح میں آپ ہمیشہ ساعی رہے۔ لکھنؤ میں شعرا کی ایک نئی اور

نوجوان جماعت آپ ہی کے دم سے قائم ہوئی۔ جو اب عنفوانِ شباب کی معصوم شوخیوں کے چکّر سے نکل کر متانت کا جامہ پہنے ہوئے ہے۔ جناب عزیز مرحوم رسالہ معیار کے بانیوں میں تھے۔ جس نے اپنے وقت میں خوب نام پایا۔ آپ کی نثر کے نمونے بھی کہیں کہیں اسی میں ملتے ہیں۔ ادبی یا تخیلی نظمیں آپ نے بہت کم کہیں۔ زیادہ تر نظمیں عتقادی یا منقبت کی نوعیت رکھتی ہیں۔ ایسی نظموں کا ایک مجموعہ طبع ہو چکا ہے اس کے سوا غزلیات کا ایک مجموعہ گلکدہ کے نام سے ۱۹۱۸ء میں مطبع نول کشور کا چھپا ہوا شائع ہو چکا ہے۔ عزیز مرحوم مکرّمی جناب صفی کے ارشد تلامذہ تھے۔ خود عزیز کے شاگرد اس وقت اردو کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ جیسے بابو جگت موہن لال رواں مرحوم۔ مرزا جعفر علی خاں اثر۔ جناب شبیر حسن خاں جوش۔ حکیم سید علی صاحب آشفتہ۔ طاہر مرحوم۔ ان حضرات کے علاوہ اور بہت سے خوشگو اصحاب ہیں جو بجائے خود ایک ادارہ ادب کا حکم رکھتے ہیں۔ شعر الہند کے اس اقتباس کے ساتھ اس تذکرہ کو ختم کیا جاتا ہے۔" بالآخر لکھنؤ بھی اس رنگ سے متاثر ہوا۔ اور وہاں کے شعرا میں چند لوگوں نے اس رنگ میں سخن گستری شروع کی۔ چنانچہ عزیز لکھنوی جو اس گروہ کے پیشرو ہیں کہتے ہیں۔

کہتے ہیں ریختہ کو جو اس رنگ میں عزیز
کچھ لوگ اور شہر میں ہیں اک ہمیں نہیں

لیکن ان لوگوں میں عام طور پر عزیز لکھنوی سب سے زیادہ مشہور ہیں اور ان کا کلام اوّل سے آخر تک دلّی کے رنگ کا ایک عمدہ نمونہ ہے"۔

راقم الحروف کو اس رائے سے اتفاق ہے۔ اختلاف صرف پیشروی کے بارے میں ہے۔ جس کا ذکر حضرت صفی کے حال میں آچکا ہے۔ اب جناب عزیز کے کلام فصاحت نظام سے استفاضہ کیجیے۔

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

یوہیں گھٹ گھٹ کے مٹ گیا آخر
عقدۂ دل کسی سے وا نہ ہوا

عشق ہے اک طلسم رازِ بقا
مٹ گیا دل مگر فنا نہ ہوا

ہجوم شوق کا بس قصۂ مختصر یہ ہے
کہ جو میں چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا

آگے خدا کو علم ہے کیا جانے کیا ہوا
بس انکے رخ سے یاد ہے اٹھنا نقاب کا

لکھا ہے خط میں عذرِ ستم اس نے اے عزیز
اب کیا جواب دے کوئی اس کے جواب کا

سب ہے محبت کی نظر میں کیا مزا خود دیکھ لو
چار آنکھیں جب ہوئیں تم کو حجاب آہی گیا

حقارت سے نہ دیکھو ساکنانِ خاک کی بستی
کہ اک دنیا ہے ہر ذرہ ان اجزائے پریشاں کا

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیران ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخل زندان ہونا

الحذر گور غریباں کی ڈراونی راتیں
اور وہ ان کے گھنے بال پریشان ہونا

ہوگا اک وقت میں یہ واقعہ تاریخی
یاد رکھنا مرے کاشانہ کا ویران ہونا

وہ محویت رہی طاری رہا کچھ ایسے عالم میں
نہ شامِ غم کو پہچانا نہ اندازِ سحر جانا

یہ مختصر سی ہے میری سوانح عمری
ہمیشہ وقف ستمہائے روزگار رہا

ہے فنا آموز ہر اک خط تری تحریر کا
رنگ اڑنا کہہ رہا ہے پیکرِ تصویر کا

دل ہوئے جاتے ہیں ٹکڑے دیکھنے والوں کے بھی
کم نہیں شمشیر سے زخم آپ کی تصویر کا

شمع بجھکر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا
یادگارِ حسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا

دیکھ لی دنیا چلو شہرِ خموشاں اب عزیز
قابلِ دید اک یہی دلچسپ منظر رہ گیا

میرا قصہ ہے جدا اس کا ہے افسانہ جدا
گو کہ ہے پاس مگر ہے دلِ دیوانہ جدا

ربط دیرینہ سے باقی ہے تعلق پھر بھی
لاکھ کعبے سے بنائے کوئی بتخانہ جدا

کیا فائدہ ہے عرض ہنر سے عزیز اب
جب امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

عزیز اب کونسا وقت آگیا کیا ہونے والا ہے
کہ وہ خود پوچھتے ہیں حال آکر دم بدم میرا

مریضِ ہجر کو نم زہر دینا یا دوا دینا
مگر بالیں سے دم بھر چارہ سازو نکو ہٹا دینا

رک جائے بات بات پہ جس ناتواں کی سانس
ایسے مریضِ غم کا بھلا اعتبار کیا

پیرا سکون موت نزا اضطراب زیست
تجکو قرار آ گئے دلِ بیقرار کیا

پیدا وہ بات کر کہ تجھے روئیں دوسرے
رونا خود اپنے حال پہ یہ زار زار کیا

یہ کھکے لگائی ہے کسی شوخ نے ٹھوکر
دیکھوں تو کوئی قبر سے کیونکر نہ اُٹھے گا

آبلہ پہلے پڑا پھر زخم اُس کے بعد داغ
مختصر یہ ہے یونہیں سب دل ہمارا جل گیا

اپنی حد سے سوزِ دل اب بڑھ گیا
آخری درجہ تھا پارہ چڑھ گیا

عزیز قابلِ عبرت یہ ناتوانی ہے
اب اپنا حال بھی ہم سے بیان نہیں ہوتا

افشائے رازِ عشق سے کیا فائدہ ملا
میں خود تمہاری بزم میں صورت سوال تھا

وہ خود اسیرِ حلقۂ دامِ نمود تھا
کیا دلفریب نقشِ طلسمِ وجود تھا

آہو نسے میری زلف شکن در شکن بنی
آرائشِ جمال کا سرمایہ دود تھا

ابرِ آزادِ زمانہ کو مقید نہ کرو
کون اشعار میں پابندِ قوافی ہوگا

دلمیں کیوں پائی جگہ اور لب تک آیا کس لئے
آہ وہ نالہ کہ جو نا بشر سے بیگانہ تھا

تھی جس کے دم سے کیفیت لذتِ نشاط
مدت ہوئی عزیز کہ وہ دل ہی کھو گیا

عشق کی مجبوریاں کیونکر کہیں کس سے کہیں
مختصر یہ ہے کہ جو ہم کو نہ کرنا تھا کیا

شرح اس راز کی پوچھے کوئی میرے دلسے
چار ہوتی ہیں محبت میں نگاہیں کیونکر

ہُو کا عالم اور بھیانک رات اور وہ بیکسی
ہل گیا دل عالمِ گورِ غریباں دیکھ کر

پتھرا کے رہ نہ جائیں یہ آنکھیں مری کہیں
روتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

زندہ رہنے کی ہمیں راہ بتا جاتے ہیں
جاتے جاتے وہ کوئی بات بنا جاتے ہیں

کوئی مریضِ غم کا دمِ واپسیں نہیں
اک جان ہے سو وہ کہیں ہے اور کہیں نہیں

تا چند ضبط آہ کہ رکنے لگا ہے جی
یا آج آسمان نہیں یا ہمیں نہیں

کہتے ہیں ریختہ کو جو اس طرز پر عزیزؔ
دم الٹ جائے گا عزیزؔ عزیز

ہر داغ دل ہے گویا تاریخ میرے تن میں
دل کھنچ گئے سبھوں کے لبیک کہہ کے دوڑے

تعمیل حکم احباب اب ہے عزیزؔ ورنہ
ہے اک فریب ہمت و ناکامی خیال

جنون شوق کا یہ مختصر سا قصہ ہے
عزیزؔ قابل عبرت ہے بیکسی اس کی

یہ مانا کہ آزردہ تم سے ہمیں تھے

تم تھے اور ہم تھے دور ساغر تھا
لاکھ دنیا نے کھائے ہیں چکر

داغ دل شام جوانی میں مزا دیتے ہیں
حقیقت میں جو سیر عالم ایجاد کرتے ہیں

ہمارے ضبط میں پنہاں ہے نظم عالم ہستی
نہ پوچھ اے عشق پایہ حقیقت انکی ہستی کی

جب کوئی عالم وہ ایجاد کیا کرتے ہیں
یہ تیری آرزو میں بڑھی وسعت نظر

واہمہ خلاق ہے جو دیکھتا ہوں خواب ہے
وقت وہ آیا کہ دنیا بھر میں ہو اک انقلاب

مدتیں گذریں دماغ و دل میں وہ قوت نہیں
فرصت زیست کم ہے کام بہت

کچھ لوگ اور شہر میں ہیں اک ہمیں نہیں
رہ نہ خاموش کچھ تو کہہ باتیں۔

جلوے ہیں رفتگاں کے پیدا اسی چمن میں
آواز تھی یہ کس کی ناقوس برہمن میں

نیرنگی فلک سے کیا رنگ ہو سخن میں
مشکل جو کام ہے وہی دشوار بھی نہیں

اب امتیاز رقیب اور راز داں میں نہیں
کہ جسکا کوئی ٹھکانا کہیں جہاں میں نہیں

مگر آؤ اب ہم تمہیں کو منا لیں

ہائے وہ وقت بھولتا ہی نہیں
اپنے مرکز سے میں ہٹا ہی نہیں

ہے بہار اور یہی ان چٹکے ہوئے تاروں میں
وہ ہر ذرہ میں اک دنیا نئی آباد کرتے ہیں

نہو تمکو یقین اس کا تو ہم فریاد کرتے ہیں
جو اپنے ساتھ اس دنیا کو بھی آزاد کرتے ہیں

عمر رفتہ تجھے ہم یاد کیا کرتے ہیں
دنیا ہے سب مری نگہ انتظار میں

اللہ اللہ میں کہاں اور آپکی محفل کہاں
اب دل آشوب گشتہ صبر کے قابل کہاں

اب عزیزؔ اشعار میرے در خور محفل کہاں
کل جو کرنا ہے ہم کو آج کریں

یاد کرتے ہیں اگر اہلِ وطن یاد کریں
دامِ وحشت میں کوئی یوں بھی گرفتار نہو

قصد کہنے کا ہے کچھ منہ سے نکلتا ہے کچھ اور
ہوگئے ضرب المثل سب رازِ دل آخر عزیزؔ

آئینۂ مجاز حقیقت نما ہے جب
کس واسطے میں ہوں در کعبہ پہ جبہ سا

عزیزؔ اب تک ہوا ظاہر نہ یہ راز اہلِ دنیا پر

ہوں گے بدنام تو ہو لینے دو
ہمت عشق یہ کہتی ہے عزیزؔ

نہیں افکارِ دنیا دی سے فرصت

وہ بادۂ شبانہ کی مستی وہ دورِ جام
وارفتگانِ حسن پہ کیا جانے کیا بنے

رو رہا ہوں اسی تصور میں
ناصح تری نصیحت بیجا بجا سہی

رشک کے قابل ہے اس وحشی کی حالت اے عزیزؔ
کس سے لیں داد جا کے اہلِ وفا

تھا تغیر مری حالت میں کچھ اسطرح عزیزؔ
مرے مرتے ہی گویا اس زمانہ کا ورق الٹا

واعظ بنانِ دیر سے نفرت نہ کیجئے
یاد آ ہی جاتا ہے کبھی ناصح کا قول بھی

سامنے آئینہ تھا ہستی تھی

ایک آوارہ غربت کو خبر کیوں کر ہو
دم الجھتا ہے گریبان میں اگر تار نہ ہو

مجھ سا دل باختہ کوئی دمِ دیدار نہ ہو
لاکھ کوشش کی کہ میرا رازداں کوئی نہو

ظاہر میں پھر بتوں کی محبت ہی کیوں نہو
یہ سب ہے تو آشنانِ محبت ہی کیوں نہ ہو

وہی چار و نظر جب جلوہ گر ہو پھر نہاں کیوں ہو

ہمکو جی کھول کے رو لینے دو
اب جو ہونی ہے وہ ہو لینے دو

عزیزؔ اس شاعری میں نام کیا ہو

ابتک مزے ہیں یاد شبِ ماہتاب کے
اٹھ جائیں گر نگاہ سے پردے حجاب کے

دہی تھی یہ محبت کو زندگی کیسی
کیونکر دکھاؤں تجھکو کلیجہ نکال کے

چاک وہ خود ہاتھ سے جس کا گریباں کر چکے
جب زمانے میں منصفی نہ رہی

آج بیداد سے وہ ہاتھ اٹھا کے اٹھے
نہ ہیں وہ اہلِ محفل اور نہ وہ رونق ہی محفل کی

کج بحثی مجاز و حقیقت نہ کیجئے
سب کیجئے جہاں میں محبت نہ کیجئے

ان پہ اک شان خود پرستی تھی

وہم سے عقلِ محبت نے ترقی پائی
ہے حقیقت پر تو نکی اس قدر گہری نظر
برق سے خورشید سے گلہائے رنگا رنگ سے
منظور ہے جو سیر سپید و سیاہ کی
اسقدر کیوں تڑپ رہے ہو عزیزؔ
کنارہ کیجئے گا صحبتِ رندان کالج سے
عزیزؔ اب منطقِ پارینہ کو دہراؤ گے کبتک
سوادِ شہرِ خموشاں کا دیکھئے منظر
ہم گذشتہ صحبتوں کو یاد کرتے جائینگے
حسن ہو جس رنگ میں محتاجِ آرائش نہیں
دلِ پُر درد سے جو آہ پر تاثیر نکلی ہے
اک روز جستجو تھی کسی اور کی ہمیں
گردِ اڑی ہے صبح کو جو رفت و روب دیر سے
خامۂ قدرت نے ولکا نام یہ کہکر لکھا
زندگی ہے تو دکھا دینگے فروغِ اردو
سرِ منبر جنہیں واعظ نے کہا لا مذہب
یہ مانا کہ فرصت بہت تم کو کم ہے
ہے سر تا قدم سادہ لوحی کا نقشہ
فراغت ملے بتکدہ سے تو جاؤں
عشق کے جذبات انہیں کچھ کچھ مزا دینے لگے
مانا کہ کسی سے نہ کرونگا میں کوئی بات

اپنی پرچھائیں میں پاتا ہوں شباہت تیری
یاد ہے کعبہ کا ابتک سنگِ بنیاد مجھے
مختلف شکلوں سے صورت اُسنے دکھلا دی مجھے
گردش کو دیکھ دیدۂ عبرت نگاہ کی
کیا کلیجے میں درد ہوتا ہے
غضب ہی ڈھائینگے ای شیخ یہ پڑھے ہیں انگریزی
علومِ مغربی حاصل کرو پیدا ہو کچھ تیزی
سُنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے
آنیوالے دور بھی یونہی گذرتے جائینگے
وہ بگڑتے جائینگے جتنا سنورتے جائینگے
غمِ پنہاں کی لیکر ساتھ اک تصویر نکلی ہے
یا آج ہے وہ دِن کہ خود اپنی تلاش ہے
کعبہ جاتے وقت وہ چہرہ پہ ملتے جائینگے
ہر جگہ اس لفظ کے معنی بدلتے جائینگے
ہم بھی اِس بزم میں اِک شمع جلا ہی دینگے
نظر آتے ہیں وہی مستِ مئے ذات مجھے
ٹھہر جاؤ دم بھر ابھی دم میں دم ہے
غنیمت زمانے میں تا صبح کا دم ہے
بہت دن سے قصدِ طوافِ حرم ہے
اب تو وہ بھی مجکو مرنے کی دعا دینے لگے
چھپتی ہے کہیں چاہنے والے کی نظر بھی

ابھی تہ تک حقیقت کی نظر پہنچی نہیں زاہد
شوخی و اضطراب کے دیکھو تعلقات
سوجھے نہ یہ بتوں سے محبت ہے اے عزیز
وہ نظر شوخ و فتنہ زا ہی سہی
یہ سناٹا یہ تاریکی یہ گورستان یہ ویرانی
کسیکو اور کیا سمجھا سکوں گا مدعا دل کا
ابھی سمجھے ہیں ویران طبقہ گورِ غریباں کو
ہوا ہے قصد پھر معیار کی شیرازہ بندی کا
پھانس ہو تو نکال دیں احباب
آج کل تیار ان کا ہاتھ ہے
زاہد بتا نکالے گئے کعبے سے یہ کیوں
اِک جزوِ مستقل ہے دلِ بیقرار کا
عشق بیتاب نہ رویا تھا ازل میں جبتک
کیا جہانسوز ترے حسن کا نظارا ہے
طولِ شبِ فراق کی کچھ انتہا نہ پوچھ
حسرت پہ اہلِ ذوق کے رونا ہے اے عزیز
خدا خلاف اگر ہے تو کچھ نہیں پروا
ہوئے ہیں قوم کے احرار داخلِ زنداں
موسمِ گل ہے چمن ہے اور بھری برسات ہے
ذرہ ذرہ ہے چمن کا آئینہ دارِ بہار
سبزہ لہریں لے رہا ہے نکہتِ گل بیقرار

نظر پڑا وہیں کعبہ کی اک بتخانہ آتا ہے
جو کچھ ہے میرے دلمیں تمہاری نظر میں ہے
رکھنی تھی ایک آہ اثر میں بھری ہوئی
کیوں مرے حال زار پر نہ ہوئی
تمہیں اے سونیوالو کس طرح آرام آتا ہے
سمجھتا ہوں خود اپنے دل کی باتوں کو میں مشکل سے
یہیں ہر چوکھٹے میں اک نئی تصویر دیکھیں گے
عزیز اہلِ قلم کی قوتِ تحریر دیکھیں گے
خلشِ دل کو کیا کرے کوئی
دل اُڑا دینا بھی کوئی بات ہے
کمبخت ان بتوں میں تو شانِ خدا بھی ہے
پیکان اب حضور کا پیکاں نہیں رہا
خون میں جوش نہ تھا دل میں کچھ احساس نہ تھا
آفتاب ایک دہکتا ہوا انگارا ہے
اتنا جئے کہ زیست سے بیزار ہو گئے
زنداں میں جا کے داخلِ احرار ہو گئے
یہ دیکھنا ہے کہ سرکار تو خلاف نہیں
خطائے اہلِ محبت مگر معاف نہیں
تختۂ سنبل کے نیچے اک اندھیری رات ہے
ہو رہی ہے مست خوشبو سے ہوائے مرغزار
ہر طرف ہے جلوہ گر حدِ نظر تک لالہ زار

تتمۂ ض

ضامن[۱] - کپتان سید ضامن علی صاحب صدر شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی - آپ کا سلسلۂ نسب سادات گردیز سے ملتا ہے - اِس خاندان کے اکثر بزرگ عربی و فارسی کے اچھے عالم گزرے ہیں - آپ کے دادا سیّد نور علی شاہانِ اودھ کے زمانے میں ناظمِ سلطنت کے عہدے پر مامور تھے - جو عہدہ آج کل کے کمشنر کے برابر تھا یہ ہندی کے اچھے شاعر تھے - ضامن صاحب کی وِلادت ۱۸۹۴ء میں قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی میں ہوئی - آپ کی تعلیم لکھنؤ میں شروع ہوئی -

مولانا سیّد جوّاد اور مولانا شیخ فِدا حسین کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا --- انگریزی تعلیم کے سلسلے میں باہر جانا پڑا - چنانچہ الہ آباد سے ایم - اے کی ڈگری حاصل کی - اگرچہ آپ ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد ہو گئے تھے - مگر علم و ادب کے جبلّی ذوق نے کرسچین کالج الہ آباد میں فارسی کی پروفیسری کی کرسی پر لا بٹھایا - چھ سال کے بعد الہ آباد یونیورسٹی نے اِن کی علمی خدمات سے اِستفادہ کیا - جہاں آپ ۱۹۲۴ء میں نئے قائم ہوئے شعبۂ اُردو کے صدر بنائے گئے -

شعر و شاعری کا چسکا ابتدائی عُمر سے تھا - میر علی عباد صاحب نیساں سے مشورۂ سخن کرتے رہے اُستاد کی شفقت اور طبیعت کے خُدا داد جوہر نے کلام میں پختگی اور دلکشی پیدا کر دی - جناب نیساں کے انتقال کے بعد آپ نے ناسخ کے رنگ کو چھوڑ کر صفائی کا رستہ اختیار کیا - چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

حضرتِ نیساں کے دم تک لُطف تھا اس رنگ کا
اب کہو ضامن غزل اُس رنگ میں جو عام ہے

آپ مختلف اصنافِ شعر میں کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کرتے ہیں - ضامن صاحب کی

[۱] بہ سلسلۂ صفحہ ۳۶۶ بعد میں یہ مسالہ وصول ہوا - اِس لیے تتمہ کے طور پر یہاں درج کیا جاتا ہے -

طبیعت میں جدّت۔ زبان میں گھلاوٹ اور بیان میں اثر بہ درجۂ غایت ہے نظموں کے اگر دلاویز موضوع تلاش کرنے میں انھیں کامیابی ہوتی ہے تو غزل میں بھی برجستہ اور بلند مضامین اُن کے لیے پیش پا افتادہ چیز ہیں۔ نئے طرز کے اچھے کہنے والوں میں آپ کا شمار ہے بڑی بات یہ ہے کہ آپ کی نظم شیوا بیانی کے ساتھ اخلاقی اور اصلاحی پہلو لیے ہوتی ہے۔ قصیدوں میں تخیل کی پرواز اور معنویت کا زور ایک خاص رفعت پیدا کر دیتا ہے۔ گریز کی وہ بانکی طرز ہاتھ آئی ہے کہ قاآنی یاد آجاتا ہے۔ رومان آپ کے ہاں نہایت ستھرا اور دلکش ہے۔ درد اور اثر سے کلام مالا مال ہے۔ افسوس ہے کہ آپ اپنے کلام کی اشاعت کی طرف سے بہت بے پروا ہیں۔ کاش یہ بے توجہی جلد دُور ہو۔ اب چند غزلوں سے جو دستیاب ہوئیں انتخاب ملاحظہ ہو۔

وہی خبر تیری جانتا ہے جسے کچھ اپنی خبر نہیں ہے
نہیں تو کہنے کے واسطے تو کہاں نہیں ہے کدھر نہیں ہے

یقین کیونکر تمھیں دلائیں دکھانے کی شے ہو تو دکھائیں
کہ ایک چلتا ہوا ہے جادو نظر تمھاری نظر نہیں ہے

فراق کی شب ہو یا قیامت کچھ ایسا ان میں نہیں تفاوت
کسی کی ہے صبح شب نہیں ہے کسی کی شب ہے سحر نہیں ہے

ہے عقل نا واقفِ حقیقت اسیر ہے شوقِ بے خودی کا
ہیں راہِ عرفاں میں اُس جگہ ہوں جہاں کوئی راہبر نہیں ہے

وفا کے بندوں پہ ہے یہ روشن نیاز کی حد نہیں معین
جو تیرے نقشِ قدم سے اُٹھے وہ سر حقیقت میں سر نہیں ہے

پڑی ہے نالہ کشی کی عادت نہیں تو اِس دارِ غم میں ضامن
اثر شریکِ فغاں نہیں ہے فغاں کو ذوقِ نظر نہیں ہے

کر کے پہلے محو نقشِ عالم آرائی سے مجھے
خود بنایا اک تماشا پھر تماشائی مجھے

ہو کے محرومِ شہادت بن گیا ہوں ننگِ عشق
گاڑے دیتی ہے زمیں میں شرم و رسوائی مجھے

اسیروں سے کہے کیوں حالِ خوشِ باشِ چمن کوئی
کلیجہ مُنہ کو آتا ہے نہ لے نام چمن کوئی

ہجومِ یاس و حرماں میں نشاں دل کا نہیں ملتا
نہ ہوگی بے چراغ ایسی جہاں میں انجمن کوئی

بیاں کیونکر کریں لطفِ جراحت تیغ و زخمِ تن — دہانِ بے زباں کوئی زبانِ بے دہن کوئی
مزاجِ عشق سے شوریدگی جاتی رہی شاید — سرِ وادیٔ الفت پھر نہ آیا کوہ کن کوئی
نمایاں یوں نہ ہر تصویر ہوتی بزمِ امکاں میں — پسِ پردہ سہی لیکن ہے شمعِ انجمن کوئی
جمالِ حق وہ کیا دیکھیں گے جو خود کورِ باطن ہیں — مری آنکھوں سے دیکھے شوخیٔ رنگِ چمن کوئی
ہمیں ضامن جو ہستی و عدم دونوں میں رہنا ہے — بتاؤ تو سہی کس کو کہے اپنا وطن کوئی

صیاد خونِ دل مرا شوقِ وطن میں ہے — سنتا ہوں کچھ بہار ابھی تک چمن میں ہے
یاس و ہراس سے بھی نہ بہلا دلِ حزیں — خلوت میں تھا جو حال وہی انجمن میں ہے
دیر و حرم ہی میں نہیں اے دلِ ضیائے حسن — پرتو فگن وہ شوخ ہر اک انجمن میں ہے
عبرت اثر ہے رونقِ گلزارِ دہر بھی — جو پھول کل تھا آج کہاں وہ چمن میں ہے

اگر ٹکرائے گی کشتی کبھی ہم غم نصیبوں کی — صدائے نالہ و شیون لبِ ساحل سے نکلیگی
مداوا درد کا بالمثل ہوتا ہے محبت میں — خلش قلبِ حزیں کی ناوکِ قاتل سے نکلیگی
فغاں مظلوم کی برمائیگی سینہ زمانے کا — اُتر جائیگی دل میں بات وہ جو دل سے نکلیگی
نمودِ حسن سمجھی ہے ابھی تو مرگِ پروانہ — سحر کو شمع ہو کر دم بخود محفل سے نکلیگی
ازل ہی سے لکھا تھا عاشقِ محزوں کی قسمت میں — کہ موت آئیگی آسانی سے جاں مشکل سے نکلیگی
غمِ فرقت رہیگا ساتھ جب تک سانس چلتی ہے — کسی کی یاد ضامن اب مِرے دل سے نکلیگی

جب کہ اُسی کا دخل ہو گردشِ روزگار میں — رات یہ کیوں گھٹے بڑھے وصل و فراق یار میں
شیشۂ قلبِ شیخ میں تھی جو حقیقت نہاں — بن گئی صورتِ مجاز ساغرِ بادہ خوار میں
ہو کے ہر اک جگہ عیاں کیسے نہ لن ترانیاں — ایسا نہ ہو کہ فرق آئے آپ کے اعتبار میں

معنیٔ جبر و اختیار عشق میں یہ ہوئے ہیں حل | دل کو ہی اختیار سب دل نہیں اختیار میں
دیکھ کے دل کی قوتیں منتظم ازل نے بھی | بھر دیا کوٹ کوٹ کر سحر نگاہِ یار میں

سینہ وہ کیا جو داغدار نہیں | آنکھ وہ کیا جو اشکبار نہیں
چار دن کی بھی یہ بہار نہیں | زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
کتنی دلکش ہے منزلِ ہستی | مگر افسوس پائیدار نہیں
جھوٹ بھی تم کہو تو سچ ٹھہرے | میرے سچ کا بھی اعتبار نہیں
ہاتھ دل پر وہ رکھ کے کہتے ہیں | ضامن اب بھی تجھے قرار نہیں

سجدے کرتا ہوں سزاوار سمجھ کر تجھ کو | خواہشِ خلد نہیں آرزوئے حور نہیں
ہوش کہتا ہے کہ ہے منزلِ عرفاں ابھی دور | بے خودی کا ہے اشارہ کہ نہیں دور نہیں
طالبِ دید کا دم کھنچ کے لبوں پر آیا | اب بھی آ جاؤ کہ آنکھیں ابھی بے نور نہیں
دیکھو جرأت کہ یہ انسان ضعیف البنیان | ہو کے مجبور سمجھتا ہے کہ مجبور نہیں
جان جائے کہ رہے کچھ نہیں پروا ضامن | خارِ غم دل سے نکل جائے یہ منظور نہیں

ضمیمہ ع

عرش۔ سید محمد عسکری عرف میر کلو خلف میر تقی میر۔ عمر بھر نہ کسی رئیس کی درباری کی نہ کسی کی شان میں قصیدہ کہا۔ فقر و فاقہ میں بسر کر دی۔ باپ کی طرح نازک مزاج تھے۔ حضرت عشرت لکھنوی اپنے تذکرۂ آب بقا میں لکھتے ہیں۔ کہ ناسخیوں نے عرش سے مخالفت کی اور ان کو ناسخ کا شاگرد مشہور کیا تو عرش نے ناسخ کے تمام سرقے کھول دیئے اور اپنے شاگرد میر تراب علی عرف منجھو صاحب معروف بہ سپہر الدولہ ولد میر اکرام علی کے نام سے یہ اعتراض مشہور کئے جو آب حیات میں درج ہیں۔ ان کے چند مخصوص شاگرد تھے۔ انسب میر ابو طالب۔ انسخ میر تراب علی۔ انجم مرزا بندہ رضا۔ تپش شیخ فدا علی۔ فلک میر سجاد حسین۔ قمر شیخ سرفراز علی۔ شاد شیخ محمد جان۔ غدر کے بعد تباہی آئی۔ گھر لٹ گیا۔ مفتی گنج میں اٹھ گئے۔ اور میاں الماس کے امام باڑے میں قیام کیا۔ ایک روز کلام سن کر میر ٹکڑ باز بانکے نے سر برہنہ ہو کر کہا کہ الٰہی عرش کو میر کا مرتبہ عطا کر۔ آپ کہنے لگے یہ کیا کہتے ہو۔ عسرت تو مجھے میر سے زیادہ ملی۔ رتبہ شاعری میں میر سے کم نہیں۔ ۱۸۶۷ء میں انتقال کیا۔ اور رکاب گنج۔ لکھنو میں دفن ہوئے۔ قاعدہ کی پابندی اور زبان کی صحت کا خیال مزاج پر بہت حادی تھا۔ باپ سے زیادہ بیٹے نے شائقین سخن کو فیض پہنچایا۔ عرش کا دیوان (نول کشور پریس سے شائع ہوا تھا۔ مگر اب کمیاب ہے۔ یہ چند شعر تذکرۂ آب بقا سے بطور نمونہ کلام نقل کئے جاتے ہیں۔ عرش

ہوں وہ روشن دل کہ مرنے پر بھی میرا غم نہیں،	بزم عالم میں چراغ کشتہ کا ماتم نہیں،
سرو قد غیرت صد غنچہ دہن پتھر کے	بتکدے میں نظر آتے ہیں چمن پتھر کے
آسیا کہتی ہے ہر صبح بہ آواز بلند	رزق سے بھرتا ہے رزاق دہن پتھر کے
ڈھول اب عشق پیری سے نہیں اٹھتا عرش	توڑتے تھے کبھی ان ہاتھوں سے من پتھر کے

عشرت۔ خواجہ عبد الرؤف لکھنوی۔ ارشد تلامذہ شیخ محمد جان شاد پیر و میر تشنہ لکھنوی نے جو آپ کے خاندانی حالات تذکرۂ آب بقا میں ضمیمہ کے طور پر درج کئے۔ ان سے پایا جاتا ہے۔ کہ عشرت

آپ کے والدِ ماجد کا نام خواجہ عبدالشکور تھا عشرت صاحب کے سکڑ دادا کا نام بھی عبدالشکور تھا جن کو خان بہادر کا خطاب تھا کیونکہ والیٔ بلخ کے خلف اصغر تھے۔ یہ صاحب بھائیوں کی نااتفاقی سے دل برداشتہ ہو کر ۱۱۸۰ھ سنہ ہجری میں وطن کو خیرباد کہہ کر چل کھڑے ہوئے۔ دلی پہنچے۔ اس وقت دلی تباہ ہو چکی تھی وہاں سے فیض آباد آئے۔ نواب شجاع الدولہ نے بہت عزت کی اور الہ آباد کا قلعہ دار کر دیا۔ خان بہادر معہ اہل و عیال وہیں رہنے لگے۔ ۱۱۹۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اور الہ آباد کے قلعہ ہی میں شہ نشین کے وسط میں مدفون ہوئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے محمد علی خاں قلعہ دار رہے۔ سعادت علی خاں کے عہد میں جب الہ آباد انگریزوں کو دے دیا گیا۔ تو محمد علی خاں کو لکھنؤ بلا لیا گیا۔ سعادت علی خاں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ اور یہ لکھنؤ کے محلہ اماطہ خانساماں میں رہنے لگے جہاں خواجہ عشرت صاحب اس وقت تک سکونت پذیر ہیں۔ اودھ میں آ کر محمد علی خاں نے اپنے لڑکوں کی شادی اہلِ کشامرہ میں کی اور نواب ظہیر الدولہ وزیر اودھ سے قرابت کا سلسلہ قائم کیا۔ عشرت صاحب کے پرنانا عبداللہ خاں لاہور کے سفیر تھے۔ خواجہ صاحب کے والد عبدالشکور خاں آخری شاہ اودھ کے عہد میں نواب گنج ضلع گونڈہ کے تھانہ دار تھے۔ انتزاع سلطنت اور غدر نے یہ سلسلہ بھی بگاڑ دیا۔ عشرت صاحب ۱۸۶۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم مولوی امید علی قدوائی سے شروع ہو کر مولوی فریاد حسین مرادآبادی کے پاس ختم ہوئی جو فارسی میں دُرّہ نادرہ تک پہنچی۔ عربی میں بھی اچھی دستگاہ حاصل کی۔

ظہور بخش کی کوٹھی واقع لکھنؤ میں یورپین لوگوں کی تعلیم اردو کے لئے ایک درسگاہ قائم ہوئی۔ مسٹر جانسن اس کے پرنسپل اور خواجہ عشرت ان کے اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ جنگ جرمن تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ بعد میں آپ نجی طور پر ان انگریزوں کو پڑھانے لگے جو پرافیشنسی کے امتحان میں جانا چاہتے۔

خواجہ صاحب راقم السطور کے مہربانوں میں ہیں۔ انہوں نے غیر معمولی ہمہ گیر طبیعت پائی ہے۔ آپ کا کلام عام پسند اور دلچسپ ہوتا ہے۔ نظم کہیں یا غزل فصاحت اور محاورے

کے گلزار کھلا دیتے ہیں۔ شاعری اور عروض پر آپ نے جو کچھ لکھا وہ محقق طوسی کو غیر ضروری بنا دیتا ہے۔ لکھنؤ کے شاہی عہد کے حالات اس تفصیل اور مصوّرانہ صداقت سے لکھتے کہ پڑھنے والوں کو گمان ہوتا ہے۔ کہ وہ شاہی دربار یا حرم سرا میں موجود ہے۔ آپ کثیر التصانیف اور کثیر التلامذہ ہیں۔ شاعری کے مختلف شعبوں پر چار کتابیں۔ لغات اردو کا مکمل سٹ مضمون نویسی۔ اصلاح زبان اردو۔ زبان دانی۔ ہجولی۔ ترجمان پارس۔ جانِ اردو۔ تذکرۂ آب بقار وغیرہ آپ کی وہ تصانیف ہیں جن سے بے شمار شایقین مستفید ہوتے ہیں۔ کوئی رسالہ ایسا ہوگا جو آپ کے رشحۂ قلم سے سرسبز نہ ہوا ہو۔ ان مضامین کو فراہم کیا جائے تو طلسم ہوش ربا کے جواب میں ایک طلسم ہوش افزا بن جائے۔ اب نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:- (افسوس کہ اس اثنا میں انکا انتقال ہوگیا)

جہاں میں ڈھونڈنے والے کو کیا نہیں ملتا
مگر ہمیں دل بے مدعا نہیں ملتا

بشر کو عاقبت کار کا خیال رہے
بغیر نیک عمل کے خدا نہیں ملتا

ہُوا ہے سرد زمانے سے دل یہ اے عشرتؔ
خوشی میں غم میں کسی میں مزا نہیں ملتا

جب ازل میں حسن اپنا آشکارا کر دیا
آگ سینے میں لگا دی عشق پیدا کر دیا

اس نے جب چاہا کہ دیکھے اپنی صنعت کی بہار
خاک کا پتلا بنا کر اس کو گویا کر دیا

سنیں وہ یا نہ سنیں اختیار ہے ان کو
ہمیں حقیقتِ دل فرض ہے سنا دینا

کفر کا نام نہ اندیشۂ اسلام آیا
سب کو بھولا وہ جسے یاد ترا نام آیا

ہر شہر اور دیار میں مشہور ہو گیا
مجھ سے تو میرا نام بہت دور ہو گیا

الفت جتا کے یار کو مغرور کر دیا
اب تو مزاج اور بھی اُن کا بدل گیا

ہجومِ بے خودیٔ عشق نے کرامت کی
فراق میں بھی کسی سے مجھے وصال رہا

اب اس کے رحم پہ موقوف ہے نجات اپنی
تمام عمر گناہوں کا انفعال رہا

مغربی تہذیب پھیلانے لگی اپنا اثر
ہم بھی اب کہنے لگے گڈ مارننگ مائی ڈیئر

ہمیں تو فخر ہے اپنی زباں کے جوہر پہ
وہ اور ہوں گے جو احسانِ غیر لیں سر پہ

ہر ایک بات کا ہے لطف اپنی اردو میں
یہ گڑ وہ ہے کہ تفوق ہے جس کو شکر پر

سر میں سودائے محبت دل میں شوق دید ہے
روزِ اول سے یہی اک مدعا لائے ہیں ہم

برہمن بت سے جو پاتا ہے مرادیں اپنی
یاد کیا کیا ترے الطاف و کرم آتے ہیں

جیسے ہوں پابند متروکات کی زنجیر میں
لطف اردو معلے ہے مری تحریر میں

رنگ ناسخ ہو نہ طرزِ مومن و غالب پسند
ہے شکر ریزی مری بالکل زبانِ میر میں

وہ عندلیب ہوں چمن روزگار میں
جس کی زباں نہ بند کبھی ہو ہزار میں

عدالت میں تو اب جاتے ہوئے اشراف ڈرتے ہیں
سر دربار عملے والے سب جیبیں کترتے ہیں

امام اپنی جماعت کا بنا جب پیر میخانہ
صدائے قلقلِ مینا ہوئی تکبیر میخانہ

بیانِ کوثر و تسنیم زاہد نے کیا ایسا
مری آنکھوں میں عشرت پھر گئی تصویر میخانہ

پھر کر نہیں آتا عدم آباد سے کوئی،
کچھ خیر خبر تک نہیں ملتی ہے ادھر کی،

ہمارا جذب انہیں کھینچ لائیگا گھر سے
یہ کب امید تھی پھوٹے ہوئے مقدر سے

جگر میں زخم کوئی پڑ گیا نیا شاید
لہو ٹپکتا ہے ہر وقت دیدۂ تر سے،

انتہا ہو گئی عشرت کی بداعمالی کی،
کہ فرشتوں کو بھی لکھنے میں حجاب آتا ہے

آپ بھی جلتے ہیں غیروں کو جلانیوالے
صاف روشن یہ ہوا شمع کے جل جانے سے

محفل آباد رہے خیر ہو خم کی ساقی
ایک دو گھونٹ چھلکتے ہوئے پیمانے سے

قطع کر رشتۂ تسبیح اگر دانا ہے
کشتِ امید ہری ہوگی نہ اس دانے سے

دیکھ تو چل کے ذرا سیر وہاں بھی عشرت
دو قدم خانۂ اللہ ہے بت خانے سے

علم سے خالی ہیں تو ہندی صنایع سیکھتے
بیکسوں کی شکل پر کچھ تو بحالی دیکھتے

قدردانی کا سبق دنیا میں گو مسدود ہے
لیکن اردو کی ترقی آج تک موجود ہے

بیوفا تیری نظر کا رنگ ہر محفل میں ہے
اک چھری سینے میں ہے تو ایک برچھی دل میں ہے

ہر نمنچے میں ہر گل میں ہر اک برگ شجر میں
جلوہ تیری نیرنگی قدرت کا عیاں ہے

صنمکدہ جو کبھی تھا وہ اب ہے بیت اللہ
وہاں تو روز نیا انتظام ہوتا ہے

18/10/80